گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

# پاکیزہ

کراچی

نومبر 2016



انجم انصار، رفعت سراج کے خوب صورت ناول

مایہ ناز قلمکار نگہت سیما سے دلکش گفتگو

کہنہ مشق قلمکاروں کی لاجواب تحریریں

ماہنامہ
# پاکیزہ
کراچی






نگرانِ اعلیٰ: معراج رسول

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول

مدیرہ: انجم انصار

معاون: آمنہ حماد





رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

## شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا اے حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور سید افراز علی نازش 0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زر سالانہ (اندرونِ ملک) 800 روپے...... جلد: 44 شمارہ: 08 نومبر 2016ء

## اداریہ



## سلسلے وار ناول



## منی ناول



## ناولٹ



## مکمل ناول



## افسانے



## خصوصی مضامین




پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ، مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس ، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن ، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

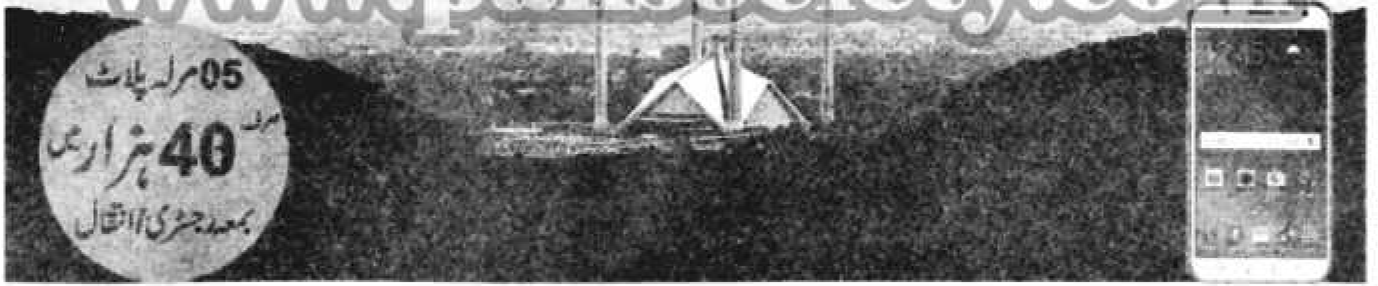




## مستقل عنوانات



Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com


05 مرلہ پلاٹ
صرف 40 ہزار میں
بمعہ رجسٹری انتقال




یہ حقیقت ہے کہ وقت کا پہیا کبھی رکا نہیں کرتا...... وقت کا پہیا چل رہا ہے اور چلتا رہے گا۔

دنیا میں بے شمار دل کو تڑپا دینے والے واقعات ہوتے رہتے ہیں...... مگر وہ وقت کی گرد میں دب جایا کرتے ہیں...... مگر واقعہ کربلا کو انسانیت کی تاریخ کبھی بھلا نہ پائے گی...... اور اس کی خاص وجوہات ہیں۔

واقعہ کربلا جہاں ایک طرف حصولِ رضائے الٰہی کی انتہا ہے وہیں دوسری طرف مصائب کی بھی انتہا ہے۔

کربلا کی جنگ ایک سچائی کی جنگ تھی، حق و باطل اور سچ و جھوٹ کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ...... جس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا اور یہ درس بھی سب کے سامنے آیا......

اسلام سے سچی وفاداری و قربانی کا بے مثل عمل وہی کر سکتا ہے جو واقعتاً اپنی پوری زندگی کے ہر کردار کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا مکمل اطاعت گزار ہو۔

یہی وجہ تھی کہ امام حسینؓ کا پورا کردار ان کی بے مثل تربیت کا شاہد ہے...... جس میں کسی بھی لحاظ سے کوئی کجی نہیں ہے۔

اگر یہ لوٹ مار اور جھوٹ و فریب کی جنگ ہوتی تو حسینیت کے تمام کردار یہ دنیا والے فراموش کر دیتے...... مگر سچائی میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ذہن سے محو نہیں ہو پاتی...... یہی وجہ ہے کہ صدیاں بیت گئیں اور صدیاں بیت جائیں گی مگر واقعہ کربلا ہمیشہ زندہ رہے گا۔

میدانِ کربلا میں امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کا اندازِ رزم جہاں عظیم سیاسی حکمت عملی کے ایک نئے باب کا آغاز کرتا ہے...... وہیں انسانیت کو دین کی بقا اور اسلام کی سربلندی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا بھی درس عطا کرتا ہے۔ (سبحان اللہ)

مدیرہ

انجم انصار

اور ان کے بعض باپ، دادا کو اور ان کی (بعض) اولاد کو اور ان کے بعض بھائیوں کو (بھی ہم نے ہدایت کی) اور انہیں برگزیدہ کیا اور انہیں راہ راست پر پہنچا دیا (۸۷) (دیکھو) یہ اللہ کی ہدایت ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے اس سے ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو بے شک جو (نیک کام یہ) کرتے تھے ضائع ہو جاتے (۸۸) یہ لوگ ہیں جنہیں ہم نے کتاب اور حکمت اور نبوت عنایت کی تھی پس اگر یہ لوگ اسے نہ مانیں تو (جان لیں کہ) بے شک ہم نے اس پر ایسے لوگوں کو مقرر کر دیا ہے جو اس کا (کبھی) انکار کرنے والے نہیں (۸۹) (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت کی تو تم ان کے طریقے کی پیروی کرو (اور ان کافروں سے) کہہ دو کہ میں اس (تبلیغ احکام) پر تم سے کچھ اجرت نہیں مانگتا یہ تو صرف لوگوں کی نصیحت ہے (۹۰) اور انہوں نے اللہ کی اس کے مرتبے کے موافق قدر نہ کی اس وجہ سے کہ انہوں نے کہہ دیا کہ اللہ نے کسی بشر پر کچھ نازل (ہی) نہیں کیا کہو کہ کس نے نازل کی ہے وہ کتاب جسے موسیٰ لائے تھے جو لوگوں کے لیے روشنی اور ہدایت تھی جسے تم اوراق بنا (کر لکھا کر) تے ہو اس (کے کچھ حصہ) کو تو لوگوں پر ظاہر کرتے ہو اور (اس کے) بہت (بڑے حصے کو) چھپاتے اور ہو تمہیں وہ چیزیں تعلیم کی گئیں جنہیں نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ، دادا کہہ دو کہ اللہ نے نازل فرمائی ہے پھر انہیں چھوڑ دو اپنی بحث میں کھیلا کریں (۹۱) اور یہ (قرآن بھی) کتاب (الٰہی ہے) ہم نے اسے بابرکت نازل کیا ہے اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اس سے پہلے ہے اور اس لیے (نازل کیا) کہ تم مکہ (والوں) کو اور ان لوگوں کو جو اس کے آس پاس رہتے ہیں ڈراؤ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن پر (ضرور) ایمان لاتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں (۹۲) اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ افتراء کرے یا یہ کہہ دے کہ مجھ پر وحی پہنچی گئی ہے حالانکہ اس پر کچھ وحی نہ کی گئی ہو اور جو شخص کہے کہ میں (بھی) عنقریب اس کی مثل جو اللہ نے نازل کیا ہے نازل کروں گا (وہ بھی اعلیٰ درجے کا ظالم ہے) اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر تم (ان) ظالموں کو اس وقت دیکھو جب (وہ) موت کی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے اپنے ہاتھ (ان کی طرف) بڑھائے ہوں گے کہ اپنی جانیں نکالو آج تمہیں ذلت کا عذاب اس کے بدلے میں دیا جائے گا جو تم اللہ پر ناحق (افترائی باتیں) کہا کرتے تھے اور اس کے احکام سے سرکشی کیا کرتے تھے۔ (۹۳)

سورۂ انعام آیت نمبر ۸۷ تا ۹۳

# آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا حَاشِرُ

افضل الانبیاء ختمی مرتبت سید المرسلین، سرکار دو عالم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارک میں سے ایک نام حاشر بھی ہے جس کا مفہوم اٹھنے والے، اکٹھا کرنے والے کے ہیں۔

## القرآن

ا: قل انا الاولین والاخرین (۴۹) لمجموعون الی میقات یوم معلوم۔ الواقعہ۔

ترجمہ: تم فرمادو کہ سب اگلے اور پچھلے ایک جانے ہوئے (مقررہ) دن کی معیاد پر ضرور اکٹھے کیے جائیں گے۔

## الحدیث "حاشر" (اکٹھا کرنے والے)

ا۔ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے لیے اپنے نام بیان فرماتے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں محمد ہوں، احمدؐ ہوں، مقفّی ہوں اور حاشر ہوں۔ (یعنی تمام لوگ میرے جھنڈے تلے جمع ہوں گے)
(مسلم)

## اٹھنے والے

ا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "میں ان لوگوں میں سے پہلا شخص ہوں گا جو زمین سے برآمد ہوں گے (یعنی قیامت کے دن جب تمام خلقت اپنی، اپنی قبروں سے اٹھ کر میدان حشر میں آئے گی تو سب سے پہلے میری قبر شق ہوگی اور اپنی قبر سے اٹھنے والا پہلا شخص میں ہوں گا۔

غیر ملکی مفکر تھامس کارلائل کے مطابق غیر متحد لوگوں کے ساتھ اچانک ایک عظیم معجزہ رونما ہوا کہ ایک آدمی اٹھا اور اس نے اپنی شخصیت اور وحی الٰہی کے بالواسطہ دعوے سے ناممکن کو ممکن کر دکھایا یعنی تمام جنگی گروہوں کو اکٹھا کر دیا۔

ایک اور مفکر مغرب ای بلائیڈن کہتا ہے۔ اسلام نے انسانیت کو متحد کیا..... اسلام صرف عربوں تک محدود نہیں تھا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشن اور پیغام پوری انسانیت کے لیے تھا۔

## الفضائل

☆ ہر نماز کے بعد 100 مرتبہ اس اسم پاک حاشر کا ورد کرنے سے کند ذہنی دور ہو جائے گی۔ حافظہ مضبوط ہوگا اور اس پر علم کے دروازے کھل جائیں گے۔ نیز سینہ علم کے نور سے منور ہوگا۔



قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اقتباس

# ہم گم شدہ محبت کے

قسط 10

انجم انصار

انسان نہ کچھ کر سیکھتا ہے، نہ رو کر سیکھتا ہے، جب بھی سیکھتا ہے، یا کسی کا ہو کر سیکھتا ہے، یا پھر کسی کو کھو کر سیکھتا ہے... چونکہ لوگ دل کے امیر کم، کم ہوتے ہیں، اس لیے زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں نہ کرو کہ پنسل سے پہلے ربڑ ختم ہو جائے اور توبہ سے پہلے زندگی...

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا
نہ بہلا وا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر

# ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

## ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

### نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔


ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5 / 79 ڈاکخانہ L.5 / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com



ٹوٹ سا گیا ہے میرے اعتبار کا وجود
اب کوئی مخلص بھی ہو تو یقیں نہیں آتا

بارش تھی کہ طوفان...... پورے شہر میں جل تھل سا ہو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ آج بارش اس کی سہیلی بن گئی ہو۔ نہ وہ رکنے کا نام لے رہی تھی اور نہ ہی شہلا کے آنسو...... شاید اسی لیے وہ دونوں ایک ساتھ ہی آنسو بہا رہی تھیں۔ آج کے اس بپھرے ہوئے ساون نے اس کے زخم بھی ہرے کر دیے تھے۔ سو...... حارث کی ہر بے اعتنائی اسے یاد آرہی تھی۔

''سنیے...... میرا دل چاہ رہا ہے اس کیفے میں گھنٹوں بیٹھے رہیں۔'' ایک شام جب وہ حارث کے ساتھ آئس کریم پارلر میں آئی تھی تو اس نے سرشاری سے کہا تھا۔

''اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ فوراً سے پہلے یہاں سے نکل جاؤں۔''

''کیوں......؟ آپ کو یہ شام حسین نہیں لگ رہی ہے کیا......؟'' اس نے خاصے لاڈ بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

''شہلا...... ہر ایک کی پسند ناپسند میں زمین آسمان کا فرق بھی تو ہو سکتا ہے ناں......''

''ہاں...... ایسا تو ہوتا ہے۔'' وہ سادگی سے بولی تھی۔

''تو کیا اب میں مزید وضاحت بھی کروں......؟'' لہجہ تمسخرانہ تھا۔

''بالکل...... کہ صبح سب کو صبح جیسی فریش ہی لگا کرتی ہے اور رات کی تاریکی میں...... سب کو ہی جھلمل کرتے تارے مسحور کیا کرتے ہیں۔'' وہ بڑے شاعرانہ انداز میں اسے سمجھانے کی سعی کر رہی تھی۔

''بے وقوف لڑکی...... جب میں آئس کریم ہی نہیں کھاتا تو پھر......''

''اوہ تو یہ بات ہے...... مگر آپ کو بتانا تو چاہیے تھا ناں......''

''چلو اب بتا دیا، اب میں یہاں بیٹھ کر کتنا خوش ہو سکتا ہوں...... خود ہی جان لو۔'' وہ اپنی گھڑی پر نظریں جمائے بول رہا تھا۔

''ہاں، بے وقوف تو میں تھی، جو اس وقت بھی نہیں سمجھ پائی تھی کہ میری موجودگی میں اسے وحشت سی ہوا کرتی تھی۔'' اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سوچا۔

اور پھر ایک شام وہ اسے بڑی خوشامدوں سے برگر کھانے ہوٹل لے گئی تھی۔

''یہاں کے برگر کا مزہ علیحدہ ہی ہوتا ہے۔''

''اچھا...... کیا واقعی......؟'' اس نے اسے تیکھے چتونوں سے دیکھا۔

''اور آج تو آپ کو سب سے ہی مختلف لگے گا۔'' وہ اکڑ کر بولی تھی۔

''اچھا، مجھے تو ہر جگہ کا ایک سا ہی لگتا ہے اور آج بھی......'' وہ اس کی ہمراہی میں بھی خوش نظر نہیں آرہا تھا۔

''حارث، آج میرے ساتھ آپ کو یہاں چائے پینے کا لطف دوبالا محسوس نہیں ہو رہا؟''

''بالکل نہیں......'' وہ نہایت سنجیدگی سے بولا تھا۔

''جھوٹ بول رہے ہیں ناں؟'' وہ اس کی بات کو اس کی شرارت کی کوئی ادا سمجھی تھی۔

''لاحول ولاقوۃ! میں بھلا کیوں جھوٹ بولوں گا۔''

''رئیلی حارث......'' وہ روہانسی سی ہو کر اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں بھئی، میں تو سوچ رہا تھا کہ جلدی سے تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کروں اور پھر میں اپنے گھر جاؤں۔''

''کیوں گھر جاؤں؟'' وہ اسے روکنا چاہ رہی تھی۔

''سچی بات بتاؤں شہلا؟'' اب وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاں بتائیں......" اسے لگ رہا تھا کہ وہ کہہ دے گا کہ میں یہ سب مذاق میں کہہ رہا تھا۔
"ایسی جگہوں پر جا کر میں بور ہوا کرتا ہوں۔" کھنکھار کر کہا گیا کہ وہ چونکی سی ہو گئی۔
"حارث، کیا میں آپ کو اچھی نہیں لگتی ہوں؟" وہ پوچھ بیٹھی۔ "میری سنگت میں کیا آپ بور ہوتے ہیں۔"
"اب تمہارے ساتھ آنے کا کیا مطلب ہے؟" وہ الٹا اسی سے پوچھ رہا تھا۔ لہجے میں برہمی علیحدہ رچی ہوئی تھی۔
"اب یہ مطلب ہی تو میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں۔"
"اچھی ہو تم......" کچھ سوچ کر وہ بولا۔
"صرف اچھی......؟" لہجے میں احتجاج تھا۔
"نہیں......بہت اچھی......بہت اچھی۔" وہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ "اب تو خوش ہو یا نہیں؟" وہ اس سے دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔
وہ شرمارہی تھی اور اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ بھی چھپالیا تھا۔
"ٹھیک ہے، اب گھر چلیں۔"
اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے اوپر جبر کر کے اس سے مل رہا تھا۔ شہلا نے سسکی لی۔
اکثر جب رات گئے وہ اسے فون کرتی تو وہ ہڑبڑا کر کہتا۔
"کیا بات ہے بھئی؟ چین نہیں ہے تمہیں کیا؟ اتنی گہری نیند سو رہا تھا لے کر خواہ مخواہ جگا دیا۔"
"میں نے تو سنا ہے کہ عاشقوں کو نیند ہی نہیں آیا کرتی ہے۔" وہ ہنسی کی جھنکار میں پوچھا کرتی۔
"مگر میں رات کو ہمیشہ سویا کرتا ہوں۔"
"کیوں سوتے ہیں؟" اس کا شرارتی لہجہ سیڑھیاں چڑھتا۔
"شاید میں اس کیٹیگری میں نہیں آتا......جس میں تم نے مجھے رکھا ہوا ہے۔"
کتنا واضح انکار تھا اس کا......مگر وہ سمجھ ہی نہیں پائی تھی۔ اور مسلسل اس کو باتیں کرنے پر آمادہ کیا کرتی۔
"سنیے......آپ مجھے یہ تو بتا دیں کہ دن میں کتنی مرتبہ میری یاد آئی تھی؟ دس مرتبہ، بیس مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ؟"
"پتا نہیں بھئی......پلیز فون بند کرو۔" اور وہ اس سے مزید کوئی بات کرنے سے پہلے ہی اپنا فون آف کر دیتا۔
ایک مرتبہ......جب حارث سے پورے ہفتے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تو وہ بے چین ہو گئی تھی۔ اور جب حارث آفس میں آیا تو وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تھی اور ریحان سر اور دیگر لوگوں کو دیکھے بغیر......اس کے سامنے شکایات کا دفتر کھول دیا تھا۔
تب اس نے ایسی بے اعتنائی سے اسے ٹریٹ کیا تھا کہ وہ ہکا بکا سی رہ گئی تھی۔ "شہلا صاحبہ......آپ ریحان کے ادارے میں جاب کرتی ہیں اور میں آپ کا زر خرید ملازم نہیں ہوں......جو آپ کے ایک فون پر کسی بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو جاؤں گا۔"
"مگر......میں تو......آپ کو یاد کر رہی تھی۔" اس نے خاصا کھسیا کر کہا تھا۔
"جو شخص اپنے آپ کو بھولا بیٹھا ہو......وہ کسی کو کیسے یاد کر سکتا ہے۔" اس کے لہجے میں رکھائی تھی اور ریحان سر کو مسکراتا ہوا دیکھ کر وہ خاصی خجل بھی ہوئی تھی۔
اور جب بعد میں اس کے اس آف موڈ پر احتجاج کیا تھا تو وہ کس صفائی سے اسے بے وقوف بنا گیا تھا کہ ایسا

کچھ اس نے کہا ہی نہیں ہے۔

''نہیں حارث...... تم نے سب کے سامنے میری بیٹی (بے عزتی) کی تھی۔''

''سنو شہلا! میں صرف اس بات کا ذمے دار ہوں جو میں نے کہی...... نہ کہ ان باتوں کا جو آپ نے سمجھیں۔''

اور تب اس نے واقعی اپنے آپ کو کم عقل سمجھ لیا تھا۔

اور پھر جب اس نے اس کی سالگرہ پر ڈھیر سارے گفٹس بذریعہ ڈاک اس کے گھر بھیجے تو بجائے خوش ہونے کے وہ اس پر چڑھ آیا تھا۔

''بڑی لاٹ صاحب کی بچی ہو ناں تم...... تمہارے گھر میں پیسے درخت پر لگے ہوئے ہوتے ہیں کیا؟ اتنے پیسے غارت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''آپ کی سالگرہ تھی...... آپ کو میری جانب سے گفٹ ملے ہوں گے تو آپ کو اچھا تو لگا ہوگا ناں......''

''ہاں بچہ ہوں ناں میں نے کارڈز اور گفٹس دیکھ کر خوب تالیاں بجائیں...... خوب اچھلا...... اور مارے خوشی کے رونے بیٹھ گیا۔ تم جیسی بے وقوف لڑکیاں خوشی میں بھی رویا کرتی ہیں ناں۔'' وہ تمسخر بھرے لہجے میں بولے چلا جارہا تھا۔ ''سنو...... شہلا...... یہ سب لڑکیاں ضرور کیا کرتی ہوں گی...... مگر مجھ جیسے لڑکے ایسی باتوں سے کبھی خوش نہیں ہوا کرتے۔''

''تو آپ کو...... واقعی کوئی خوشی نہیں ہوئی؟'' اس کا دل بھر آیا۔ اور آنسو پلکوں کی منڈیروں تک آگئے۔ تب چونک کر اس نے اسے دیکھا اور زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجا کر بولا۔

''مجھے اس بات کا زیادہ رنج ہوا کہ تمہارے ڈھیر سارے پیسے خرچ ہوگئے...... جاب کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنے پیسے بیکار میں اڑادو...... یہ پیسے تم اپنے اوپر خرچ کرتیں تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔'' اس نے اپنے لہجے کو نرم کیا۔

''اور اب آئندہ تم ایسا بالکل نہیں کرو گی...... بلکہ کسی پر بھی ایسے خرچ نہیں کرو گی۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب میری سالگرہ آئے گی...... تو آپ بھی مجھے کوئی تحفہ نہیں دیں گے...... کہ آپ کے نزدیک پیسے جمع کیے جاتے ہیں، خرچ نہیں کیے جاتے۔''

''اچھا......؟'' اس نے ایک لمحے سوچا اور پھر کہا۔

''میں تمہیں تحفہ ضرور دوں گا...... اور تمہاری پسند کے حساب سے۔''

''آپ کو میری پسند ناپسند کا کیا پتا؟'' اس نے قابلہ بن کر پوچھا۔

''کسی وجہ سے ہی تو کہہ رہا ہوں...... تمہاری پسند کے حساب سے اور وہ ایسے کہ تمہیں پیسے دے دوں گا تم خود ہی خرید لینا...... سمپل......''

''جی نہیں...... یہ تحفے دینے کا سب سے واہیات طریقہ ہے۔'' شہلا کو غصہ ہی تو آگیا تھا۔ ''تحفہ نہ ہوا مہینے کا سودا ہوگیا...... کہ اتنے پیسے میں لے لو۔''

''پھر خوب صورت طریقہ کیا ہے، وہ بھی مجھے بتادو۔''

''آپ مجھے اپنے ساتھ مال لے کر جائیں گے اور مجھے گفٹس دلوائیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ہامی بھر لی تھی۔ ''اب تو خوش ہونا چلو ہنس بھی دو۔''

تب شہلا ایسے خوش ہوگئی تھی کہ چند منٹ پہلے کی اس کی کڑوی کسیلی باتیں تک بھول چکی تھی...... اور اس کی ہنسی بھی نہیں رک رہی تھی۔

بادل پھر زور سے گرجا..... اور بارش کی چھما چھم میں بھی تیزی آئی۔

حارث نے ..... دروازے کو جنونی انداز میں دھڑ دھڑایا مگر بارش کے شور میں ہلکی سی دستک اسے سنائی دی اور وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"چلے جاؤ حارث ....." اس نے جیسے سسکی بھری۔ "اب تم سے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھنا ..... بالکل بھی نہیں۔ بہت بے وقوف بن چکی ہوں میں ..... اور اب میں مزید بے وقوف نہیں بنوں گی۔"

اور حارث کو ایسا لگ رہا تھا..... جیسے اس بارش نے اس کے دل پر چڑھا کوئی غلاف ہی اتار پھینکا ہو۔ شہلا کے آنسو..... اس کے دل کو ایک عجیب سی ایذا سی پہنچا رہے تھے۔

وہ لڑکی..... جس سے وہ ہمیشہ عاجز سا رہا کرتا تھا..... جس سے ملنے اور بات کرنے کو بھی اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ آج اسے کیسی اپنی، اپنی سی لگ رہی تھی..... اس کا رونا..... اسے دکھی کر رہا تھا۔

اور اس وقت تمام بھولی ہوئی باتیں..... بھی اسے یاد آ رہی تھیں۔

جب پہلی مرتبہ..... اپنے بینک میں اس نے بڑی حیرت سے شہلا کا دیا گیا محبت نامہ پڑھا..... اور ایک نظر اپنے سامنے بیٹھی ہوئی شرمائی ہوئی لڑکی کو دیکھا تو اسے وہ لڑکی بری نہیں لگی تھی..... مگر اس کے بھونڈے اظہار کا یہ طریقہ اسے واقعی پسند نہیں آیا تھا۔

اور جب اس کے سامنے اس نے اس کا خط پھاڑ کر ڈسٹ بن میں ڈالا تھا..... تو جھک کر جب نظریں اٹھائی تھیں ..... تو وہ واقعی ساکت سا رہ گیا تھا۔

شہلا کے آنسو ..... تواتر سے اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ شدتِ کرب سے وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی..... اور آواز اندر گھٹ گئی تھی۔ اس ایک لمحے کو اس کا دل چاہا تھا..... اپنی انگلیوں کی پوروں سے وہ ان موتیوں کو سمیٹ لے..... (مگر صرف ایک لمحے کے لیے) وہ اس لیے کہ حارث دل کی باتوں پر کان دھرنے والا لڑکا تھا ہی نہیں اور جب وہ بینک کے کسی کام سے باہر نکلا..... تو اسے باہر کھڑا روتے دیکھ کر وہ پریشان سا ہو گیا تھا۔ اس نے اسے پکارا بھی تھا..... شاید وہ اسے سمجھانا بھی چاہتا تھا۔ مگر شہلا برہمی سے دیکھتے ہوئے تیزی سے چلی گئی تھی۔

اور اس کی وہ آنسو بھری آنکھیں..... کئی روز تک اسے بے چین کرتی رہی تھیں۔ اور وہ جان ہی نہیں پایا تھا..... اپنی اضطرابی طبیعت کی وجہ..... وہ شہلا ہی ہے۔

جوں، جوں وہ بارش میں بھیگ رہا تھا اس کی محبت کا تناور پودا سرعت سے سر اٹھا رہا تھا اور اب اسے شہلا کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

"ساجد ایک بدقماش شخص ہے..... وہ اپنی جھوٹی کہانیوں کے جال میں شہلا کو بہ آسانی پھانس سکتا ہے۔ اور وہ سیدھی سی لڑکی اس کی باتوں پر یقین بھی کر بیٹھی ہے کہ میری بہن نے ساجد کے ساتھ محبت کا ناٹک رچایا تھا۔ اس پاگل کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ میری تو کوئی بہن ہی نہیں ہے..... میرے تو چچا، تایا اور خالہ کے ہاں بھی کوئی لڑکیاں نہیں ہیں..... جنہیں وہ میری بہن سمجھا ہو۔" اب وہ دروازہ پیٹ رہا تھا۔ "شہلا، ساجد ایک جھوٹا شخص ہے۔" وہ ساتھ، ساتھ کہے جا رہا تھا۔ "تم اس کی باتوں میں ہرگز نہیں آنا۔ تم اب اس کے آفس گئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا..... سنا تم نے تم بالکل نہیں جاؤ گی اس کے آفس....."

مگر شہلا کوئی جواب ہی نہیں دے رہی تھی اور نہ ہی دروازہ کھول رہی تھی۔

تھک ہار کر وہ باہر بینچ پر ہی بیٹھ گیا۔ بارش اس وقت بھی بہت تیز تھی۔

اس نے اپنے دونوں بازوؤں میں اپنا چہرہ چھپا لیا اور پھر اسے پتا ہی نہیں چلا..... کہ بارش کب رکی یا رات

کتنی گزری......

☆☆☆

پتا نہیں کیوں بارش میں اسے وحشت ہی ہوا کرتی تھی۔ اسے یوں لگا کرتا تھا جیسے یہ بارش سب کچھ بہا کر لے جائے گی اور وہ بے مایہ سا ہو کر رہ جائے گا...... بارش کی وجہ سے وہ آج بھی...... منع کر رہا تھا کہ کینسل کر دیں۔ مگر ماموں، ممانی نے بصد اصرار ڈنر پر بلایا ہوا تھا...... اور عامر کو نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا تھا...... کہ فرزانہ کو بارش کی تقاریب حد سے زیادہ پسند تھیں۔

ایک تو کھانا ہی خاصی تاخیر سے کھایا گیا پھر بارش ہو جانے کے سبب...... فرزانہ نے سب کو اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی کشمیری چائے کا ٹریلر کچھ اس انداز میں دکھایا کہ امی کے ساتھ بڑی خالہ بھی اسی کی حامی بن گئیں۔ اور وہ اتنی دیر میں بنا کر لائی جیسے اصل میں کشمیر سے لائی ہو...... عامر بار، بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ صبح آفس بھی جانا تھا، موسم کے تیور بھی خاصے خراب تھے اور اس کی ماں تو اپنے بھائی کے گھر جا کر بھول ہی جاتی تھیں کہ انہیں واپس اپنے گھر بھی جانا ہے۔

ابھی چائے کا دور ہی چل رہا تھا...... کہ ممانی نے اپنی شاپنگ دکھانی شروع کر دی...... جو وہ فرزانہ کے جہیز کے لیے جمع کر رہی تھیں۔

''یہ میں نکاح کے بعد عامر کو پہناؤں گی۔'' ایک سونے کی ہیرے جڑی انگوٹھی دکھاتے ہوئے وہ بولیں۔ امی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھیں۔ اور عامر کو یہ سب بہت معیوب سا لگ رہا تھا۔

اور پھر اچانک ہی وہ ہوا...... جسے دیکھ کر عامر کو سکتہ سا ہو گیا۔

فرزانہ نے وہ انگوٹھی اپنے ہاتھ میں لی...... عامر کو دکھائی اور پھر سرعت سے وہ انگوٹھی عامر کو پہنا دی۔

''ارے، ارے...... یہ کیا کر رہی ہو۔ اور یہ قبل از وقت کیوں پہنوں میں......'' عامر نے انگوٹھی اتارنے کی سعی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کے لیے ہی آئی ہے ناں...... تو آپ پہن لیجیے...... منگنی کے لیے تو پھپو نے منع کر دیا ہے۔ اچھا ہے کم از کم آپ یہ رنگ تو پہن لیں۔'' وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔

''مگر سونا پہننا تو مردوں کے لیے حرام ہے۔'' عامر جز بز سا ہو رہا تھا۔

''ٹھیک ہے...... شادی کے بعد آپ مجھے دے دیجیے گا۔ میں پہن لیا کروں گی۔''

''مگر ممانی تو یہ نکاح کے موقع پر پہنانا چاہتی تھیں ناں۔'' عامر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا بہانہ کرے...... جس سے اس انگوٹھی سے چھٹکارا پالے۔

''ارے بیٹا...... ہماری ایک ہی تو بیٹی ہے...... دل میں ارمان ہی ارمان ہیں...... کوئی ایک انگوٹھی ہی تھوڑی پہنانی تھی۔ اللہ رکھے، گھڑی، چین، کف لنکس سب ہی نہایت اعلیٰ اور قیمتی لے کر آئی ہوں۔''

''آپ سمجھیں کہ بس یہ آپ کی منگنی کی انگوٹھی ہے۔'' فرزانہ نے قہقہہ لگایا۔

''چلو تمہاری منگنی کی انگوٹھی ادھار رہی۔'' خالہ نے قہقہہ لگایا۔

''میں ادھار پر یقین نہیں رکھتی۔'' فرزانہ نے رئیسہ بیگم کے ہاتھوں میں پڑے کڑوں میں سے ایک کڑا اتار کر خود ہی پہن لیا۔

رئیسہ بیگم کو اس کی یہ حرکت پہلے تو بری لگی اور بعد میں سب کو مسکراتا دیکھ کر خود بھی زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولیں۔

"لو بھئی......تم نے تو اپنی منہ دکھائی کا تحفہ پہلے ہی سے لے لیا۔" اور فرزانہ ان کی بات پر ہنستی ہی چلی گئی۔

عامر کو پتا نہیں کیوں......یہ سب بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا ظاہر داری سے اسے شروع سے ہی چڑ تھی۔ ممانی کی مالی حالت ان سے زیادہ اچھی تھی......اس لیے وہ اکثر اوقات اس کی نمائش بھی کر دیا کرتی تھیں۔ اور رشتہ طے ہونے کے بعد ان کی یہ اوچھی حرکتیں مزید بڑھ گئی تھیں۔ یکبارگی اس کا دل چاہا اپنی انگلی سے وہ بیش قیمت انگوٹھی اتار کر کہیں پھینک کر چلا جائے......مگر وہ انگوٹھی تو اس کی انگلی میں آ کر یوں پھنس گئی تھی جیسے وہ اب کبھی نکلے گی ہی نہیں۔

"عامر آپ کی انگوٹھی سے زیادہ اچھا میرا کڑا ہے۔" اسے انگلی میں انگوٹھی گھماتا دیکھ کر فرزانہ بولی۔

"ہاں، جب دل چاہے، اتار تو سکتی ہو۔" وہ بولا۔

"جی نہیں، میں کیوں اتارنے لگی......یہ تو میری منگنی کا گھیرا ہے......اور اس گھیرے نے مجھے یہ بتا دیا ہے کہ اب میری دنیا اسی کے اندر ہے۔" بادل کہیں زور سے گرجا......تو عامر نے کہا۔

"امی اگر یہ بارش ساری رات نہیں رکی تو کیا آپ گھر نہیں جائیں گی؟"

"ہاں، ہماری پھپو تو بالکل بھی نہیں جائیں گی آپ نے رکنا ہے تو آپ بھی رک سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم اپنی دونوں پھپوؤں کو روکو میں تو چلا......صبح مجھے آفس بھی جانا ہے۔" یہ کہہ کر وہ گاڑی کی چابی اپنی انگلی میں گھماتا اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

کانوں میں اذان کی آواز آئی تو شہلا ہڑبڑا کر اٹھی......روتے، روتے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی اسے پتا ہی نہیں چلا تھا۔

وہ گھبرا کر اٹھی، وال کلاک پر نظر پڑی صبح کے پانچ بج رہے تھے......اسے حارث کا خیال آیا اور کتنی دیر تک اس کی دستک کی صداؤں نے اس کے دل کو دکھی بھی کیا تھا......مگر وہ اس سے بہت زیادہ ناراض تھی۔

"گھر جا کر سوچا تو ضرور ہوگا کہ کوئی ان کو بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

کھڑکی کا پردہ برابر کرنے کے لیے وہ آگے بڑھی تو یہ دیکھ کر حیران اور پریشان رہ گئی کہ حارث کھلے آسمان تلے باہر بینچ پر بے سدھ سا پڑا تھا۔

"کیا......یہ ساری رات بارش میں بھیگتے رہے......اور اپنے گھر نہیں گئے۔" اس کو یوں چپ چاپ سا پڑا دیکھ کر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ مر تو نہیں گیا ہے۔

"اللہ نہ کرے اسے کچھ ہو......" وہ لرز ہی تو گئی۔

وہ تیزی سے باہر نکلی تو وہ مدہوش سا پڑا تھا اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو وہ بری طرح جل رہی تھی اور زندگی کی حرارت اس میں موجود تھی۔

"حارث، حارث......" اس نے بے قرار ہو کر اسے پکارا......اسے ہلایا جلایا۔ مگر اس نے تو آنکھیں کھول کر بھی اسے نہیں دیکھا۔

"پلیز حارث آنکھیں کھول لیے ناں......" وہ روتے ہوئے اس پر جھکی......اس کے آنسو اس کے چہرے پر گر رہے تھے تھوڑی دیر بعد حارث نے اپنی سرخ آنکھیں بہ مشکل کھول کر اس سے پوچھا۔

"کیا تم نے مجھے معاف کر دیا ہے......؟ پلیز شہلا صرف اتنا بتا دو۔"

"ہاں......معاف کر دیا ہے مگر پہلے اندر چلیں آپ کو بہت تیز بخار ہے۔" اس کو سہارا دے کر وہ بہ مشکل اپنے

فلیٹ تک لائی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔
''امی تیز بخار میں ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہیں۔'' اس نے بھی برف کے پانی کی پٹیاں رکھنی شروع کردیں۔ اس کا بخار ہلکا ہوا...... تو حارث نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی گرم چائے اور ابلے ہوئے انڈے لے آئی تھی۔ ہلکا سا ناشتا کرا کے اسے درد اور بخار کی گولی دی...... جسے کھا کر اس کے بخار میں مزید کمی آئی۔
''تم نے تو یہ بات مجھے بتائی ہی نہیں کہ کسی اسپتال میں تم مسیحا کے طور پر بھی کام کیا کرتی تھیں۔ واقعی میرے سر میں شدید درد تھا۔'' شہلا نے اس کا سر دبانے کے لیے اس کی پیشانی پر اپنے ہاتھ رکھے۔
''نہیں شہلا...... یہ ہاتھ اس لیے نہیں ہیں۔''
''مگر آپ کے سر میں درد جو ہے، ساری رات بھیگنے کی وجہ سے آپ کی یہ حالت ہوگئی ہے۔''
''درد میں اب کمی ہے میں تھوڑی دیر میں گھر جاتا ہوں۔''
''آپ کی امی تو آپ کو دیکھ کر پریشان ہوجائیں گی۔''
''شکر ہے امی گھر پر نہیں ہیں۔''
''اگر گھر پر کوئی نہیں ہے تو پھر آپ یہاں رکے رہیں...... تاکہ طبیعت تو بحال ہوجائے...... اس حالت میں تو آپ صحیح سے ڈرائیونگ بھی نہیں کرسکیں گے۔''
''اچھا، ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ جنہیں بہ مشکل کھول کر وہ اس سے بات کر رہا تھا۔ اور جب دن چڑھے وہ اٹھا تو اپنی طبیعت خاصی بہتر محسوس کر رہا تھا۔
اس کے بیدار ہوتے ہی وہ اس کے لیے گرم، گرم سوپ بنا لائی تھیں...... جسے پی کر اسے مزید طبیعت بہتر محسوس ہوئی۔
''واہ شہلا...... تم تو بہت اچھی تیماردار ہو...... اب تو میرا بار، بار بیمار پڑنے کو دل چاہے گا۔''
''اللہ نہ کرے۔'' اس نے اس کے لبوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ جنہیں تھام کر اس نے گہرے لہجے میں کہا۔
''تم وعدہ کرو اب ساجد کے آفس بالکل نہیں جاؤ گی۔''
''کہیں آپ یہ تو نہیں سوچنے لگے کہ میں ساجد سے شادی کروں گی۔''
''نہیں، ایسا تو میں تصور تک نہیں کرسکتا...... مگر تم اب کہیں نہیں جاؤ گی...... نہ ساجد کے آفس اور نہ ہی ریحان کے آفس۔ تمہارے امی، ابو...... عمرے سے آجائیں...... میری امی تمہیں میرے لیے مانگنے آجائیں گی۔'' شہلا نے اس کی بات سنی اور کچھ سوچ کر کہا۔
''حارث، اب اگر میں نے ساجد کو یہ نہیں بتایا کہ مون تمہاری بہن نہیں ہے تو اصل کہانی کہیں اور چلی جائے گی اور وہ شخص آئندہ بھی تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے......''
''تم اسے اگر یہ بتاؤ گی کہ حارث کی کوئی بہن نہیں ہے تو اسے یہ یقین آجائے گا کہ اس کے پاس میں نے ہی تمہیں بھیجا ہے۔''
''اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوں...... سر ریحان کے آفس میں بہت سے مذاکرے دیکھے ہیں کہ بائیو ڈیٹا کس، کس طریقے سے معلوم کیا جاتا ہے۔''
''مگر شہلا...... اگر اس نے تمہیں کوئی نقصان پہنچایا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔''
''سنیں اب میری طاقت میں آپ کی محبت کی طاقت بھی شامل ہوگئی ہے اور وہ مجھے ہرگز زک نہیں

پہنچا سکے گا۔''

''انشاء اللہ......'' حارث نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور شہلا اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھنے لگی کہ اب بخار کتنا ہے۔

''ڈاکٹرنی صاحبہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں، اب اجازت دے دیجیے، آپ کا مریض بھلا چنگا ہے۔''

''ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں مگر کل شام چیک اپ کروانے ضرور آجایئے گا تاکہ مجھے اپنے مریض کو دیکھ کر تقویت بھی ہو۔''

''آپ بے فکر رہیے......اب تو یہ بندہ سر کے بل آئے گا......اپنے مسیحا سے دوری برداشت کرنا کہاں آسان ہوتا ہے۔'' حارث نے شرارت سے کہا تو شہلا شرما سی گئی۔

☆☆☆

سبین آپا کی ساس عدت میں تھیں، اس کے باوجود سبین آپا اپنی والدہ اور ندیم خان کے ساتھ باقاعدہ طور پر اس کا رشتہ مانگنے آئی تھیں...... بلکہ آتے ہی صبا کی انگلی میں ندیم کے نام کی انگوٹھی بھی پہنا دی تھی۔

''ہماری ایک ہی بیٹی ہے اور ہمارے اپنے سمدھیانے سے بے حد اچھے تعلقات ہیں......اس لیے ان کی ساس کی عدت پوری ہوتے ہی ہم ندیم کی بارات لے آئیں گے اور اپنی بیٹی کو لے جائیں گے۔''

خالہ اور امی نے ندیم کو مٹھائی کھلاتے ہوئے ان کی ہر بات سے اتفاق کیا تھا۔ اور امی نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ جب انہوں نے پہلی بار ندیم کی تصویر دیکھی تھی تو اسی وقت انہیں ایسا لگا تھا کہ یہ لڑکا تو میرا داماد ہونا چاہیے۔

''اور مجھے بھی صبا کی تصویر بے حد اپنی، اپنی سی لگی تھی۔'' ندیم کی ماں نے محبت سے کہا تھا۔

''جس کا جو نصیب ہو وہی اسے ملا کرتا ہے......اتنے عرصے انتظار کرنے کا مطلب ہی یہ نظر آتا ہے کہ صبا کو ندیم کا انتظار تھا۔'' سبین آپا نے کہا تو ندیم بے اختیار ہنس دیا۔ اور صبا شرما کر رہ گئی۔

''کل آفس آرہی ہو کیا......؟'' رات کو ندیم نے فون کر کے اس سے پوچھا۔

''ہاں، آؤں گی......سر فرید نے کہا ہے کہ اب چھٹی نہیں کرنی۔''

''ٹھیک ہے آجاؤ......'' ندیم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''آپ نے آفس میں کسی کو بتایا تو نہیں ہے ناں......'' اس نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

''کیا نہیں بتایا؟''

''یہی......اپنی انگیجمنٹ کا۔''

''ہم شوبز کے لوگ تو ہیں نہیں جو اپنی انگیجمنٹ اور شادی کو لوگوں سے چھپاتے پھریں......فرید کا فون آیا تھا وہ میرے آفس نہ آنے کی وجہ پوچھ رہا تھا......تو میں نے اسے بتا دیا کہ آج میں اپنی سسرال جا رہا ہوں......امی نے میری دلہن کا انتخاب کر لیا ہے۔''

''مگر یہ تو نہیں بتایا ناں......کہ آپ کی منگیتر کون ہے؟''

''بھئی نہ اس نے پوچھا اور نہ میں نے بتایا۔''

''یہ بھی اچھا ہی ہے......ورنہ آفس کے لوگ سمجھتے کہ ہمارا کوئی افیئر چل رہا تھا۔''

''ایسا تو واقعی تھا......'' ندیم خان نے شوخی سے کہا تو وہ بھی ہنس دی۔

☆☆☆

لانگ ویک اینڈ تھا......عامر گھر پر آرام کر رہا تھا موبائل آف تھا تاکہ کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے۔ آج وہ اپنے آپ

سے باتیں کر رہا تھا۔

''صبا کو نہ ملنا تھا نہ ملی...... اس سے زیادہ میں اسے نہیں ڈھونڈ سکتا تھا...... جتنا کہ میں نے اسے ڈھونڈا۔ اب اس کا چیپٹر کلوز ہو گیا ہے تو پھر میں کیوں فرزانہ سے یوں اکتایا، اکتایا سا رہتا ہوں۔ وہ میری ہونے والی بیوی ہے، مجھے اس کے ساتھ ایسا سوکھا اور قدرے برہم سا رویہ تو نہیں روا رکھنا چاہیے۔ ہاں یہ تو اس کے ساتھ واقعی زیادتی ہے کہ میں اس کی خوشی کو خوشی سمجھوں ہی نہیں۔'' وہ خود کلامی کی کیفیت میں تھا۔

''اب اگر اس نے مجھے انگوٹھی پہنا دی تھی تو مجھے یوں اکھڑ سا انداز نہیں اپنانا چاہیے تھا۔ مجھے بھلا کیوں برا لگا......'' اس وقت وہ اپنے آپ سے خود پوچھ رہا تھا۔

''وہ لوگ جن کی بیوی مر جاتی ہے، وہ بھی تو دوسری شادی کر کے اپنی زندگیاں سکون کے ساتھ بسر کیا کرتے ہیں۔''

''مگر صبا مری تو نہیں ہے؟'' اس کے دل سے کہیں ایک آواز آئی۔

''ہمارے لیے تو صبا زندہ یا مری برابر ہے......'' اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی...... وہ اکثر صبا کا ذکر سن کر ہی پہلا جملہ یہی بولا کرتی تھیں۔

''ہاں، جب تم ہو ہی نہیں تو مر ہی تو گئیں......'' اس نے جیسے اپنے آپ کو یقین دلایا پھر اپنا والٹ کھولا اور اس کے اندر کے خانے سے صبا کی پرانی تصویر نکالی...... اور پرزے، پرزے کر کے اسے ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔

اپنے اس اقدام پر اسے خود حیرت ہوئی...... مگر پھر اس نے اپنے آپ کو مزید سمجھایا۔

''مجھے اپنی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہی اپنے ذہن پر سوار تمام پریشانیوں کو، تمام فکروں کو اور تمام چاہتوں کو اٹھا کر پھینک دینا ہو گا...... کہ جس چیز کا کوئی مصرف نہ ہو وہ بیکار ہوتی ہیں اور ہمیں بہت سارے دکھ، ناکارہ چیزوں کے طفیل بھی ملا کرتے ہیں۔'' تصویر کو ٹکڑے، ٹکڑے کرنے کا رنج اب وہ از خود ختم کرنے کے درپے تھا۔ اسی لیے اپنے آپ کو سمجھائے چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

سر فرید کی جانب سے پورے اسٹاف کو زبردست ہائی ٹی دی گئی تھی۔ اور اس پارٹی کے بعد انہوں نے سب کو بتا دیا تھا کہ ''اس پارٹی کا بل ندیم خان دیں گے کیونکہ انہوں نے ہم سب کو بتائے بغیر اپنی انگیجمنٹ کر لی ہے۔''

''کس سے کی ہے؟'' ناعمہ نے پوچھا۔ (دل ہی دل میں اسے ایک دھچکا سا تو لگا تھا)

''ضرور ٹی وی سے تعلق ہو گا...... سر کے چکر ان دونوں چینل پر بہت لگ رہے ہیں۔'' یہ ساجد کی رائے تھی۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر ندیم کسی جاب کرنے والی لڑکی سے شادی کریں...... یہ یقیناً ان کی فیملی کی کوئی لڑکی ہو گی...... اور میٹرک کر کے گھر میں چادریں کاڑھ رہی ہو گی...'' فرزانہ نے مسکرا کر کہا۔

''یہ کیونکر سوچا آپ نے۔'' اس کی باتیں سن کر ندیم کو ہنسی بھی آ رہی تھی۔

''سر اگر آپ ایک دوسرے کے ساتھ کام کر رہے ہوں تو اپنے ساتھی ورکرز کی پسند ناپسند سے تو آگاہ ہو ہی جاتے ہیں۔''

''تم لڑکیوں پر واقعی مجھے حیرت ہے کہ عشق کی اس خوشبو کو پہچان نہیں سکیں جو گزشتہ ایک سال سے ہمارے آفس میں پھیلی ہوئی تھی۔'' سر فرید ہنسے اور پھر مسکرا کر بولے۔

''مس صبا رحیم آپ کو مبارک ہو...... ندیم خان...... میرا سب سے اچھا دوست ہے، ایسا دوست جس پر صرف فخر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور ایسا دوست کہ اس جیسا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔''

''تھینک یو سر......'' میں شرما کر بولی۔

''مگر تم تو کبھی یا تی ہی نہیں تھیں کہ سر ندیم کو تم پسند کرتی ہو...... جبکہ میں نے بارہا ان سے کہا بھی تھا۔'' اب فرزانہ کھسیا کر کہہ رہی تھی۔

''مجھے معلوم ہی نہیں تھا...... ایسا سب کچھ۔'' اب اس کے سوا میں کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

''حد ہوگئی بھئی...... یہاں تین فلور تک تمہاری عاشقی کی دھوم مچی ہوئی تھی...... اور تم کو سب سے آخر میں پتا چلا...... واہ بھئی......''

''سر یہ محبت کرنے والے اتنے لاعلم کیوں رہتے ہیں کہ انہیں کسی بات کا پتا سب سے آخر میں ہی چلا کرتا ہے۔'' صفدر نے تمسخر بھرے لہجے میں کہا تو سب ہی ہنس پڑے۔

''گائز میں آپ سے یہ کہنا چاہوں گا...... صبا چند ماہ آپ کے ساتھ ضرور ہیں مگر شادی کے بعد یہ جاب کو خیر باد کہہ دیں گی۔'' اس ضمن میں ندیم خان نے پہلی مرتبہ مجھے بھرپور انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ اتنی ٹیلنٹڈ لڑکی کو شادی کے بعد گھر بٹھانا چاہتے ہیں۔'' لڑکیوں نے برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔

''یہ بات نہیں ہے، دراصل صبا پروڈکشن ہاؤس میں، اپنی مرضی کے حساب سے کام کرنے کی خواہش مند ہے...... اور میں بھی ضرور چاہوں گا پاکستان میں ایسے بھی ڈرامے بنیں جس سے عام آدمی گھر میں بیٹھ کر بہت سی معلومات بھی حاصل کرلے...... مثلاً گٹکا کھانے سے منہ کا کینسر ہو جاتا ہے، پاکستان میں اس کی خرید و فروخت پر پابندی بھی لگ چکی ہے مگر پھر بھی اس کا کاروبار زور و شور سے جاری ہے تو اس کے لیے یہ طریقہ ہی نہیں کہ اسے بند کردیا جائے اور جرمانے اور گرفتاریاں ہوں...... اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بتایا جائے کہ اس شوق کے طفیل جب گھر اجڑا کرتے ہیں تو اس سے کتنے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور یہ ہی ایک معاشرتی ڈرامے کی کامیابی ہے...... کہ اس کا پیغام اس طرح پہنچے جو کہ کورٹ کچہریاں نہ پہنچا سکیں۔''

''ویل ڈن۔'' سر فرید تالیاں بجا رہے تھے...... اور مجھے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''صبا آپ اپنا پروڈکشن ہاؤس ضرور چلایئے گا مگر اس اخبار سے بالکل کنارا نہ کرلیجیے گا کہ اس اخبار نے آپ کو آپ کی زندگی کا سب سے بڑا تحفہ ندیم خان کی صورت میں دیا ہے۔''

اس سے قبل ان کی تقریر مزید گوہرافشانیاں کرتی میں نے ان کی بات کاٹی۔

''سر ابھی تو میں کہیں نہیں جا رہی۔'' میں نے کہا۔ ''اور جب جاؤں گی تو کالم لکھنے کا سلسلہ تو انشاء اللہ جاری رکھوں گی۔''

''ہاں مسز ساحر کے نام سے لکھنا چاہو تو لکھ سکتی ہو۔'' سر فرید مسکرا کر بولے تو میں ندیم کو دیکھ کر مسکرا کر رہ گئی۔ جو اپنی ہنسی روکے بیٹھے تھے۔

☆☆☆

''کیا ضرورت تھی...... اپنے مستقبل کے پلان بتانے کی، ابھی ہماری شادی ہوئی نہیں ہے اور آپ شادی کے بعد کے پلان تک لوگوں کو بتا رہے ہیں۔'' میں نے گھر پہنچتے ہی فون پر ندیم خان سے شکایتی لہجے میں کہا۔

''سچ بولنے کی عادت ہے، زندگی کی سب سے بڑی بات کے بارے میں کیسے جھوٹ بولتا...... شادی سے بڑی بات تمہاری نظر میں کوئی دوسری ہے؟''

''مگر آج کل کوئی اپنے دل کی بات یوں نہیں بتایا کرتا جیسے آپ بتاتے پھرتے ہیں۔''

''چلو...... اب تمہاری طرح اپنے دل کی باتیں دل میں ہی چھپا کر رکھا کروں گا...... اب خوش......''

''سنیے اگر شادی کے بعد...... میں سر فرید کے اخبار میں جاب کرتی رہوں تو......؟''

''میں تو تمہاری خوشی کے لیے کہہ رہا تھا...... جیسے تمہاری مرضی۔''

''میرا مطلب ہے، پروڈکشن ہاؤس فوراً ہی تو شروع نہیں ہو سکتا...... اس کے لیے ہمیں پہلے اس کا ہوم ورک تو کرنا پڑے گا ناں......''

''تم ذرا بھی فکر مند مت ہونا...... میرے بہت سے دوستوں کو اس کا تجربہ بھی ہے اور ان کے اپنے ایسے ہاؤسز بھی ہیں......''

''پھر تو ٹھیک ہے، مجھے اپنی مرضی کے حساب سے کام کر کے واقعی مزہ آئے گا۔''

''صبا...... مجھے صرف تمہاری خوشی ہی چاہیے...... جو چیز، جو کام تمہیں اچھا لگے، وہی کرنا۔''

''واؤ...... آپ تو بہت اچھے ہیں۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''اب قائم رہنا اپنی اس بات پر۔''

''آپ کا خیال ہے، کیا میں اس کہی بات سے مکر بھی سکتی ہوں؟''

''اب کیا کہہ سکتا ہوں میں...... اخبار میں کام کرنے والے...... اپنی غلط بات کو بھی اتنے ہی وثوق کے ساتھ کرنے کے عادی ہوتے ہیں...... جتنی کہ سچی بات مگر میں ان میں شامل نہیں ہوں۔''

''اگر آپ شامل نہیں ہیں تو میں کیسے شامل ہوں گی۔''

''وہ اس لیے کہ تم تو اپنی محبت کو بھی نہیں پہچان پائی تھیں جو تمہیں مجھ سے تھی......''

''اگر پہچان نہ پاتی تو خواہ مخواہ گولی کے آگے آ جاتی۔'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''اوہ...... تو یہ محبت کا تقاضا تھا۔'' اب وہ شوخ ہو رہا تھا۔

''پتا نہیں۔'' شرما کر میں نے فون ہی بند کر دیا تھا۔ اور بعد میں دیر تک میرا چہرہ شرم سے گلابی ہوتا رہا۔

یہ ندیم جو بظاہر سنجیدہ سے ہیں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کہہ دیتے ہیں جو شوخی کے زمرے میں آ جاتی ہے۔

یہ ابھی کل ہی کی تو بات تھی...... جب میں نے کہا تھا۔ ''میرا پاسپورٹ ایکسپائر ہو گیا ہے وہ رینیو کروانا ہے۔'' تو انہوں نے بڑی بے پروائی سے کہا تھا۔

''بعد میں کرا لینا۔ تم نے کون سا ابھی کہیں باہر جانا ہے۔''

''مگر پھر بھی اگر پہلے سے تیار ہو تو بہتر رہتا ہے۔''

''کیا ہنی مون پر باہر جانے کا ارادہ ہے۔'' بے دھڑک پوچھ ڈالا۔

''یہ میں نے کب کہا ہے؟'' میرا لہجہ کھسیایا ہوا سا تھا۔

''تم ہی تو کہہ رہی ہو ناں...... اگر پہلے سے ہی تیار ہو تو بہتر رہتا ہے۔'' انہوں نے میرے ہی لہجے میں میری نقل اتاری۔

''سنیے...... میں اپنا ہر کام اپ ٹو ڈیٹ کرنے کی عادی ہوں، اس لیے یہ بات کہہ دی تھی۔''

''اور میں بھی مگر......'' وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر مسکرائے۔

''آپ اپنی بات پوری کیجیے۔'' میں نے کہا تھا۔

''میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد پاسپورٹ بنواتا تاکہ ولدیت کے بجائے شوہر کے خانے میں میرا نام آ جائے اور ہم ساتھ، ساتھ کہیں بھی جائیں تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔''

''اوہ...... اسی لیے آپ کہہ رہے تھے کہ میں تھوڑے دن رک جاؤں۔'' میں نے کہا۔

''اور کیا......'' وہ ہنسے۔

''سنیے...... پہلے ہم عمرے کے لیے چلیں گے۔'' دل کی بات فوراً ہی لبوں پر آ گئی۔

''چلو شادی کے بعد کے پروگرام بنالو...... کہاں، کہاں جانا ہے۔'' ان کا لہجہ شوخ ہو رہا تھا۔ اور میں پھر شرم سے سرخ پڑ رہی تھی۔

☆☆☆

وقت، وقت کی بات ہے، کبھی شہلا...... فون پہ فون کیے جاتی اور حارث اس کی کال ریسیو کرنا ضروری نہ سمجھتا۔ اور آج وہ اسے فون کر رہا تھا...... اور اس کی کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی اور جب گیارھویں مرتبہ اس نے اسے فون کیا تو فوراً ہی اٹھا لیا گیا۔

''کہاں تھیں تم...... کب سے فون کر رہا ہوں...... ریسیو کیوں نہیں کر رہی تھیں؟''

''ابھی، ابھی گھر میں داخل ہوئی ہوں۔'' شہلا نے کہا۔

''اتنی دیر سے آئی ہو...... شام پانچ بجے تو تمہاری چھٹی ہو جاتی ہے۔''

''آج ساجد مجھے پانچ بجے کے بعد باہر لے گئے تھے۔''

''کیوں گئیں تم اس کے ساتھ؟''

''میں جاب کر رہی ہوں...... اور ابھی میرا کام مکمل بھی نہیں ہوا۔''

''کہاں گئی تھیں...... تم اس منحوس شخص کے ساتھ۔''

''ہوٹل گئے تھے...... چائے پینے کے لیے۔''

''وہاں کوئی بات ہوئی میرے حوالے سے؟''

''نہیں، آپ کے اور آپ کی بہن کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔''

''میری کہاں سے کوئی بہن آ گئی۔'' حارث جل ہو کر بولا۔

''مگر وہ تو یہی سمجھتے ہیں۔''

''تو پھر کچھ نہ کچھ بکواس تو ضرور کی ہو گی اس نے۔''

''ہاں، اب وہ مجھ سے شادی کے خواہش مند ہیں۔''

''تم نے بتایا نہیں کہ تمہارا رشتہ طے ہو چکا ہے۔''

''ہاں بتایا تھا...... مگر وہ اس ضمن میں کچھ سننے کو تیار نہیں ہے۔''

''کیا مطلب...... وہ تم سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے؟''

''ہاں، وہ جنونی انداز میں بات کر رہا تھا...... اس لیے میں نے اس کی آس نہیں توڑی۔''

''تو کیا کہا تم نے؟'' حارث کو اب اپنے آپ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''یہی کہ پہلے آپ اپنے ادھورے کام مکمل کر لیں...... اتنے میں، میں اپنی امی کو بھی اپنا ہمنوا بنا لوں گی...... کہ مجھے آپ جیسا جیون ساتھی کہاں مل سکے گا۔''

''تمہاری یہ بکواس سن کر تو وہ خوش ہو گیا ہو گا۔'' حارث جل کر بولا۔

''ہاں۔ اور اس نے اپنی انگلی سے ایک انگوٹھی اتار کر مجھے پہنا دی۔''

''اور تم نے وہ خوشی، خوشی پہن بھی لی۔'' وہ بڑی برہمی سے بولا۔

''ظاہر ہے اب میں اسے کسی شک و شبے میں تو نہیں ڈال سکتی تھی۔''

''تم تو دل میں خوش ہو گئی ہو گی، اس کی قیمتی انگوٹھی پا کر...... میں تو ساری زندگی تم کو قیمتی تحائف نہیں

دے سکتا۔‘‘

’’حارث، میں لعنت بھیجتی ہوں اس کے تحائف پر...... میں تو جس مقصد کے لیے گئی ہوں، وہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ تم شاید کچھ معلومات حاصل کر نہ سکو...... مگر وہ اپنے مذموم مقاصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔‘‘

’’آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟‘‘

’’تم پر تو ہے مگر اس شخص پر نہیں......‘‘

’’ایک لحاظ سے وہ بھی لوگوں کا ڈسا ہوا شخص ہے۔ غلط تو اس کے ساتھ بھی ہوا ہے۔‘‘

’’اسی لیے اب وہ لوگوں کو ڈس رہا ہے۔‘‘ حارث نے تلخ لہجے میں کہا۔

’’یہ سب باتیں چھوڑیں......‘‘ اور بتایئے آپ کی طبیعت کیسی ہے؟‘‘ شہلا نے بات بدلنے کو کہا۔

’’اب میرا بخار، میرے دماغ پر چڑھ گیا ہے سمجھیں تم۔‘‘ یہ کہہ کر فون منقطع کر دیا۔

اور اس کی یہ جھنجلاہٹ محسوس کر کے وہ یک دم چپ سی ہو گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی...... حارث کو اس کا ساجد کے آفس میں جانا اچھا نہیں لگ رہا ہے...... مگر وہ تو حارث کی پریشانی حل کرنا چاہتی تھی۔

اور اُدھر حارث یہ سمجھ رہا تھا کہ اگر اس نے اس کی بات نہیں مانی تو پریشانیوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا...... اور جس میں شہلا اپنے آپ کو مشکل سے ہی بچا پائے گی۔

☆☆☆

ہر شخص اپنے آپ کو جتنی اچھی طرح سمجھا سکتا ہے اتنا شاید دوسرا نہیں...... یہ لاجک بھی عامر کی ہی تھی...... اور وہ کئی روز سے اپنے آپ کو خود سمجھا رہا تھا...... یا اپنے آپ کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اچھے کے لیے ہو رہا ہے۔

فرزانہ اس کی لائف پارٹنر بہت اچھی رہے گی...... اور اب ان دونوں کو ہی مل کر اپنی زندگی کو مزید خوب صورت بنانا ہے۔ اس لیے آج اس نے خود فرزانہ کو فون کیا تھا اور اس کے ساتھ باہر چلنے کی خواہش بھی کی تھی...... وہ جانتا تھا کہ فرزانہ کو گھر میں بیٹھ کر انجوائے کرنے کے بجائے باہر گھومنا پھرنا زیادہ پسند ہے۔

اور آج وہ دونوں شہر سے دور خوب صورت جگہ پر ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے...... فرزانہ اس کے اس محبت بھرے رویّے پر بے حد شاداں و فرحاں تھی۔ اور اس کو خوش دیکھ کر عامر بھی خوشی محسوس کر رہا تھا۔

’’اگر ہم شادی کے بعد امریکا جائیں تو؟‘‘ فرزانہ نے پروگرام بناتے ہوئے کہا۔

’’امریکا تو نہیں جانا مجھے؟‘‘

’’وہ کیوں......؟‘‘

’’سنا ہے وہاں تو صبا رہتی ہے۔‘‘ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ذکر آ ہی گیا۔

’’تو کیا پورا امریکا صبا کا ہو گیا...... وہ ہمیں وہاں نہیں آنے دے گی۔‘‘ فرزانہ کا لہجہ تمسخر آمیز ہو گیا۔

’’میرا یہ مطلب نہیں ہے۔‘‘ وہ جزبز ہو کر بولا۔

’’پھر کیا مطلب ہے؟ مجھے بھی تو پتا چلے......؟‘‘

’’میں نہیں چاہتا...... کہ اب وہ کبھی مجھ سے کہیں ٹکرائے۔‘‘ دل کی بات یا دل کا چور سامنے آ ہی گیا تھا۔

’’اس سے اتنی نفرت ہو گئی ہے آپ کو......‘‘ فرزانہ نے بات کا رخ ہی مشرق سے مغرب کی طرف پھیر دیا۔

"نفرت اور محبت کی تو بات ہی نہیں ہے بس اب میں اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔"
"دیکھنا تو میں بھی نہیں چاہتی......" فرزانہ بولی۔
"کیا تم ایسی کوئی بات نہیں کر سکتیں......جس میں صبا کا ذکر نہ آئے۔" عامر نے برہم لہجے میں کہا۔
"میں تو اس کا نام بھی نہیں لینا چاہتی......آپ ہی نے اس کا ذکر کیا ہے۔" فرزانہ نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
"یہ لڑکی ہے ہی بہت چالاک......میرا پیچھا چھوڑتی ہی نہیں۔" یہ سب اس نے دل میں سوچا تو ضرور مگر کچھ بولا نہیں۔
"اب خاموش کیوں بیٹھے ہیں......کیا سوچ رہے ہیں۔"
"یہی کہ اب گھر چلو......" وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور فرزانہ نے ایک لمحے کچھ سوچا اور پھر کھسیا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
"یہ شخص تو میری سوچ سے بھی زیادہ مشکل ثابت ہو رہا ہے۔" اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔
"میرا نام بھی فرزانہ ہے، اگر نہ تمہیں فتح کیا تو تم کیا سب ہی دیکھیں گے۔" اور اب وہ ہنستی مسکراتی گاڑی میں اس کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔
اور عامر ایک تناؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی گاڑی کو نہیں چلا رہا بلکہ کوئی راکٹ اڑا رہا ہے سو اس کی گاڑی تمام سگنل توڑتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

سب کو ہی ایسا لگ رہا تھا یا شاید صرف میں ہی ایسا محسوس کر رہی تھی کہ ہمارے اخبار کے آفس کا ماحول خاصا شگفتہ سا ہو گیا تھا۔
ساجد اب مجھے صبا کے بجائے شرارت میں میڈم کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ فرزانہ شوخی میں مجھے بھابی بلانے لگی تھی اور ندیم خان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے آفس میں ہی رو کے رکھے۔
ناعمہ کا خیال تھا کہ میں اپنے کپڑوں کا چونکہ بے حد خیال رکھتی ہوں اس لیے سر ندیم کو میں نے بہ آسانی متاثر کر لیا۔ اس لیے اب وہ میری خوشامدیں کرنے لگی تھی کہ میں شاپنگ کرنے میں اس کی ہیلپ کروں۔
"مگر اب تم کس کو متاثر کرنا چاہتی ہو، صفدر تو بغیر کسی وجہ کے تم سے بہت متاثر ہے۔"
"شادی تو میں کسی امیر لڑکے سے کروں گی، اپنے جیسے گھرانے کے کسی لڑکے سے شادی کر لی تو میں شاید مسکرانے کو ہی ترس جاؤں۔"
"ناعمہ اصل چیز پیار ہوتا ہے، جس سے ہم پیار کریں اور اس سے ہماری شادی بھی ہو جائے تو وہ بڑی خوش قسمتی ہوا کرتی ہے۔" میں نے ناعمہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
"اب ایسی بات تم تو نہ کہو......" ناعمہ برا سے منہ بناتے ہوئے بولی۔
"ایسا کیوں کہہ رہی ہو تم......؟" مجھے عجیب سا لگا۔
"تم نے ہی بتایا تھا ناں......بچپن میں تمہاری منگنی تمہاری پسند کے حساب سے کسی لڑکے سے ہو گئی تھی......اور تم جدا ہونے کے باوجود ایک عرصے اس کا انتظار کرتی رہیں۔"
"تو پھر......؟" اب مجھے اس کی باتوں سے الجھن سی ہو رہی تھی۔
"میرا مطلب ہے، تمہیں تمہارا پیار تو نہیں ملا ناں......مگر ایک امیر لڑکے سے انگیجمنٹ کے بعد تمہاری خوشی

میں کوئی کمی تو نہیں آئی ناں......"

"ایسا صرف ہماری ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سے ہے ناعمہ......!" میں نے زچ ہو کر اس سے کہا۔

"تمہاری ذہنی ہم آہنگی تو تمہارے سابقہ منگیتر کے ساتھ بھی تھی...... اور اب ندیم خان کے ساتھ بھی ہو گئی ہے...... ماشاءاللہ تمہارے مزاج میں بڑی لچک ہے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ میں واقعی تمہاری یہ گول مول باتیں سمجھ نہیں پائی ہوں۔"

"سیدھی سی بات ہے...... تمہارا منگیتر تمہیں چھوڑ گیا...... تو تم نے اس کی یادوں کو دفعان کیا...... اور ندیم خان پر لٹو ہو گئیں۔"

"ناعمہ تمہیں کیا پتا...... میں نے عامر کا کتنا انتظار کیا تھا اور تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ ندیم خان پر میں لٹو نہیں ہوئی تھی۔"

"اوہ، جب ہی ان کی جان بچانے کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہو گئیں۔"

"اگر یہ سب کچھ صفدر کے لیے ہوتا اور اس موقع پر تم بھی موجود ہوتیں تو کیا ایسا نہ کرتیں؟"

"نہیں، میں تو اس کمرے میں ہی نہ جاتی جہاں مشکوک شخص کو جاتا دیکھتی۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم کو صفدر سے محبت تو کیا انسیت بھی نہیں ہے۔" مجھے اس کی بات کا یہی جواب سمجھ میں آیا تھا۔

"پیاری صبا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ندیم خان پر عرصے سے فدا تھیں اور جب ان کی جان پر بنی تو آپ میدان میں کود پڑیں۔"

"ہاں، یہی بات تھی...... پھر۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "اب وہ میرے منگیتر ہیں اور چند ماہ کے اندر ہماری شادی ہونے والی ہے اور برائے مہربانی آئندہ اس قسم کی گفتگو نہ کیجیے گا۔"

"وہ تو میں کبھی نہ کرتی...... مگر آج تمہاری وجہ سے میں صفدر کی جانب سے ایک بڑا انعام جیت گئی ہوں...... جس نے کہا تھا صبا پر...... ندیم خان لٹو ہوئے تھے، ورنہ وہ بیچاری تو انہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ تب میں نے کہا تھا ندیم خان جیسی شاندار شخصیت پر صبا عاشق نہ ہوئی ہو میں یقین ہی نہیں کر سکتی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ تم نے خود اقرار کر لیا کہ یہی بات تھی۔"

"تم اور بھی جتنے اقرار کروانے چاہو کروا لو کہ اب ندیم خان کے سوا مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔" میرے لہجے میں زعم مزین تھا۔

"سر فرید ٹھیک ہی تو کہتے ہیں ہمارا اخبار چلے تو کیسے چلے...... یہاں کے ورکرز کو اپنے، اپنے مفاد کے سوا کچھ نظر کہاں آیا کرتا ہے......" صفدر مٹھائی کا ڈبا ہمارے کیبن میں لاتے ہوئے بولا تو میں کھسیا سی گئی جبکہ ناعمہ دو، دو گز کے قہقہے لگا رہی تھی۔

☆☆☆

"کس قدر جھوٹا شخص ہے یہ ساجد بھی...... خواہ مخواہ کے بہتان مجھ پر باندھے ہوئے ہے کہ مونا میری بڑی بہن تھی اور اس سے ملنے میری امی کئی مرتبہ ملک سے باہر گئیں ایسے جھوٹ جن کا کوئی سر پیر ہی نہیں۔"

شہلا سے فون پر بات کرنے کے بعد حارث اپنے کمرے میں بلند آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی امی چائے لے کر اس کے کمرے میں پہنچیں تو وہ چونک سی گئیں۔

"کہیں وہ شخص منورہ کو تو تمہاری بہن نہیں سمجھ رہا تھا؟" وہ پریشانی میں بولیں۔

”کون منورہ......؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”یاد کرو، جب تم میٹرک میں پڑھتے تھے تو ہم نے اپنے مکان کی پچھلی انیکسی ایک ائر ہوسٹس کو کرائے پر دے دی تھی۔“

”ہاں یاد آیا، جن کو میں آپا کہا کرتا تھا۔“

”ہاں اور وہ مجھے آنٹی کے بجائے ماں جی کہتی تھی۔“

”مگر وہ تو بہت مختصر مدت کے لیے ہمارے ہاں کرائے پر آئی تھیں۔“

”ہاں ائر لائن کے کسی فرد سے شادی کر کے وہ کینیڈا چلی گئی تھی بلکہ اس کی شادی بھی کینیڈا میں ہی ہوئی تھی۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہیں امی آپ اس لڑکی کی ان دنوں ساجد سے دوستی رہی ہوگی اور ساجد اسے میری بہن سمجھا ہوگا۔“

”اور جب تمہارے ماموں سے ملنے میں دو مرتبہ کینیڈا گئی تو اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں منورہ سے ملنے گئی ہوں جس کو اس کے تمام ملنے والے مونا کہا کرتے تھے۔“

”ہاں شاید یہی غلط فہمی...... مجھے تباہ کر گئی اور اتنا تو شاید انہوں نے ہماری انیکسی کا کرایہ بھی نہیں دیا ہوگا جتنی بھاری چپت ان مون آپا نے مجھے پہنچادی۔“

”تم ساجد کی غلط فہمی دور کر سکتے ہو بیٹا۔“ امی نے کہا۔

”یہ غلط فہمی تو اب شہلا ہی دور کرے گی۔“ مگر اب وہ دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا...... اور پرانے منظر اس کی آنکھوں میں روشن ہو رہے تھے۔

منورہ جب اپنی فلائٹ سے واپس آتی تو حارث کے لیے چاکلیٹس اور سینڈوچز ضرور لایا کرتی...... اور جب ائر لائن کی گاڑی چھوڑنے آتی یا وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ واپس آتی تو حارث بھاگ کر جاتا...... اور آپا کہہ کر اس کا بیگ تھام کر گھر میں لاتا شاید ساجد بھی انہیں کبھی ڈراپ کرنے آیا ہوگا...... اور اسے آپا کہتے دیکھ کر اس کا چھوٹا بھائی ہی سمجھا ہوگا۔

ایک شام کوئی شخص لان میں بھی آکر بیٹھا تھا۔

”میں آپ کے لیے چائے لاؤں آپا؟“ حارث نے اس سے کہا تھا۔

”امی نہیں ہیں کیا گھر پر......؟“ اس نے حارث سے پوچھا تھا۔

”وہ پڑوسن کے ساتھ مال گئی ہیں...... آپ نے بھی تو ان سے اپنے لیے لان کے سوٹ لانے کو کہا تھا۔“ حارث نے انہیں یاد دلایا۔

”ارے، میں تو واقعی بھول گئی تھی۔“

”سنیے...... آپ اس چھوٹے سے گلوگار سے کوئی گانا سنیے اتنے میں، میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

مگر اس شخص نے حارث سے کوئی گیت نہیں سنا تھا۔ اس نے صرف یہی پوچھا تھا۔

”اس گھر میں، اور کون، کون رہتا ہے؟“ تب حارث نے سادگی سے اسے بتایا تھا۔

”میں، امی اور ہماری آپا۔“

”تمہارے ابا نہیں ہیں؟“

”نہیں، ان کا تو انتقال ہو گیا ہے اور مجھے تو اپنے ابا بالکل بھی یاد نہیں ہیں۔“

اور جب کھانے کی کوئی چیز لیے آپا کو آتے دیکھا تو وہ ان سے کہنے لگا۔

”اب کے آئیں گے تو تمہارے گانے اور سنیں گے...... اس وقت تو یہ کباب کھائیں گے۔“
اور حارث اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔
اسے آپا کے ملنے والوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اور پھر آپا ایک دن اچانک ہی چلی گئیں۔ امی نے بتایا تھا۔ ان کے پاس کینیڈا کی نیشنلٹی تھی...... اب انہیں وہاں اچھی جاب بھی مل رہی ہے اور ان کی شادی بھی وہیں ہوگی...... اس سے زیادہ جاننے کی امی خواہش مند بھی نہیں تھیں۔ مونا آپا، امی کی ایک پرانے ملنے والی کے طفیل ان کے ہاں پے انگ گیسٹ کے طور پر آئی تھیں...... سال سوا سال کے اندر چلی بھی گئیں۔
اس عرصے میں ان کا ساجد کے ساتھ کیسا افیئر چلا...... ان سب باتوں سے حارث تو کیا اس کی امی بھی لاعلم تھیں۔
”بیٹا، تمہیں خود ساجد کے پاس جا کر اس کی یہ غلط فہمی دور کرنی چاہیے......“ والدہ نے اسے فوراً ہی کہا تھا۔
”امی، آج کل سب سے بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ کوئی کتنا ہی سچ بولے، اس پر یقین نہیں کیا جاتا۔“
”تو پھر نہیں بتاؤ گے اسے؟“
”بتاؤں گا مگر کسی دوسرے کے ذریعے سے۔“
”مگر یہ سب اسے پتا تو چلنا چاہیے ناں......“
”ہاں، پتا چلے گا...... مگر وقت کے حساب سے ہی۔“ حارث نے سوچتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

”ساجد میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے مونا کے اور کتنے بہن بھائی ہیں، نادرا کا فیملی سرٹیفکیٹ نکلوایا تو معلوم ہوا کہ وہ تو اکلوتی ہے اور اس کے والد کا نام راشد ہے۔“ شہلا اور ساجد لنچ کر رہے تھے تب اچانک شہلا نے کہا۔
”ارے...... آج کل جھوٹے سرٹیفکیٹ بنوانے کا رجحان عام ہے۔ تمہیں کیا معلوم...... اس بے ایمان نے کتنے ناموں سے اپنے کارڈز بنوائے ہوئے ہوں گے۔“
”یہی سوچ کر تو میں نے اس کے بھائی حارث کا بھی فیملی سرٹیفکیٹ باہر نکلوایا تو معلوم ہوا کہ اس کی ولدیت کے خانے میں تو فیاض احمد لکھا ہوا ہے...... اور حارث اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔“
”تم بھی کس پریشانی میں پڑ گئیں...... یہ جھوٹے لوگوں کا خاندان ہے، تم کھانا کھاؤ۔“ ساجد بے پروائی سے بولا۔
”مگر میں تو آپ کی پریشانی دور کرنا چاہتی ہوں۔“
”تمہارے آنے سے میری آدھی سے زیادہ پریشانیاں دور ہوگئی ہیں۔ اور بقیہ پریشانیاں بعد میں...... ہے ناں۔“ وہ اپنے ہاتھ سے اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولا۔
”میرا مطلب ہے، ہمیں اپنا کام خوب سوچ سمجھ کر کرنا ہوگا...... اور خوب چھان بین کے ساتھ...... کہ کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہیں ہونے پائے۔“ شہلا نے سنبھل کر اس سے کہا۔
”سب سے زیادہ نقصان تو میرا ہوا، میرے ارمانوں کا خون ہوا، میری معصوم محبت کو اس عیار لڑکی نے لوٹا...... اور مجھے اپنی انگلیوں پر خوب نچایا۔ اور اب نہ وہ اور نہ اس کا خاندان...... میرے غیظ و غضب سے بھی بچ سکتے ہیں۔“
”کیا آپ حارث کے ساتھ ان کی امی کو بھی مار دیں گے؟“ شہلا نے پوچھا۔
”بالکل...... ایسا ہی ہوگا؟“ اس نے جواب دیا۔

''بھائی اور ماں کے مرنے میں وہ ضرور آئے گی تب اس کی قبر بھی اپنی ماں اور بھائی کے برابر بن جائے گی۔''
اب ساجد ہنس رہا تھا...... اور شہلا اندر ہی اندر کانپ رہی تھی۔

☆☆☆

رئیسہ بیگم نے گھر کی صفائی ستھرائی کا کام شروع کروادیا تھا۔ فرسٹ فلور پر دو کمرے تھے، ان میں رنگ وروغن کا کام شروع کروادیا تھا۔ اسی لیے عامر اب اپنا سامان لے کر نیچے آگیا تھا۔

''امی آپ ماموں کو منع کر دیں...... فرزانہ کو زیادہ جہیز نہ دیں ہمارا گھر اتنا کشادہ نہیں ہے کہ اس میں وہ رکھا جاسکے......''

''میں تو یہ سن رہی ہوں وہ کوٹھی سیٹ کر کے دے رہے ہیں۔'' رئیسہ بیگم نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے کہا۔

''آپ انہیں منع کریں...... اور بتائیں۔ ہم تو خود اپنے گھر کو ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں۔''

''وہ تو میں بعد میں اس کو کرایے پر چڑھادوں گی اس لیے صفائی ستھرائی کروارہی ہوں؟'' وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''مگر یہ تو زیادتی ہے ناں...... کوئی اپنی لڑکی بھی دے اور اپنا سب جمع جتھا بھی دے دے۔''

''اگر میرا بھائی اپنی بیٹی کو جہیز دے رہا ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ میں اسے بھلا روکنے والی کون ہوتی ہوں۔ فرزانہ اگر زیور لائے گی تو خود ہی پہنے گی ناں...... ورنہ چالاک لوگ تو دوسروں کا مال لے کر ہڑپ بھی کر جاتے ہیں...... تمہارے باپ نے صبا سے منگنی پر کتنا زیور چڑھادیا تھا...... میرے منع کرنے کے باوجود بھی ڈھیروں زیورات اس ٹانگ برابر کی بچی کو دے دیے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ فقیر سب کھاپی کر برابر کر گئے ہوں گے۔''

''امی، اس وقت صبا اور زیورات کا کہاں سے تذکرہ آگیا۔ ایک لڑکی جو کہیں مرکھپ گئی، آپ اس سے وابستہ چیزوں کورورہی ہیں۔''

''میں تو بیٹا ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی۔'' رئیسہ بیگم نے بھی سنبھل کر کہا۔

وہ باتوں کی روانی میں بہت کچھ بول جایا کرتی تھیں اور یہ تو انہوں نے بھی سوچ رکھا تھا کہ اب وہ عامر کے سامنے صبا کا ذکر کبھی نہیں کریں گی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا۔ اگر وہ منحوس مری نہ ہو...... اور کہیں زندہ بھی بیٹھی ہو تو میں اسے زیور کو اپنے بیٹے کا صدقہ سمجھ کر بھول جاؤں گی۔''

''پھر وہی بات...... پھر اس کا ذکر......'' عامر نے ماں کو دیکھ کر دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا کچھ نہیں کہہ رہی بھاڑ میں جائیں وہ زیورات...... وہ سامان...... جو ہم نے صبا کو دیا تھا۔ اب خوش......''

''نہیں......'' یہ کہہ کر عامر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

یہ کمال وقت کے ہی ہیں...... کہ وہ لوگوں کی ترجیحات بدل دیا کرتا ہے۔ وہ حارث جسے شہلا کے نام سے ہی چڑ تھی۔ جسے اس کا فون ریسیو کرنا ہی جان کا عذاب محسوس ہوا کرتا تھا۔ اب خالی بیٹھا ہوتا تو بھی اسے سوچے چلے جاتا۔

اس کی معصومیت، اس کی ہنسی...... اس کی شوخی اور پھر اس کی والہانہ محبت وہ تو اس کی خاطر...... خطروں میں کود پڑی تھی اور وہ کیسا تماشائی بنا رہا تھا۔ اسے اپنے آپ اور اپنے رویوں پر تاسف ہو رہا تھا۔ ایک دن اسی تناؤ کو لیے وہ ریحان کے آفس میں بیٹھا تھا۔

''کئی دن سے ان چھمک چھلو کا فون نہیں آیا، تمہارے پاس آیا؟'' ریحان نے پوچھا۔

''یہ تم کس طرح ذکر کر رہے ہو شہلا کا...... کیا لڑکیوں کا احترام کرنا بالکل ہی بھول گئے ہو......'' وہ برہم سے لہجے میں بولا۔

''میرا مطلب ہے ایک سادی سی لڑکی جب تیار شیار ہو کر اپنے آفس جاتی ہے تو پٹاخہ سی تو لگا کرتی ہے ناں......''

''لگتی ہوگی...... مگر وہ اس ٹائپ کی نہیں ہے۔''

''یہ تو میں شروع سے ہی کہتا تھا کہ بالکل بے وقوف سی لڑکی ہے۔'' ریحان کا لہجہ بے پروائی لیے ہوئے تھا۔

''وہ کہاں سے بے وقوف ہو گئی۔'' حارث نے برا مانا۔

''مجھ سے زیادہ تو تم کہتے تھے...... بلکہ تم تو اس کو پاگل تک کہا کرتے تھے......'' اب ریحان ہنس رہا تھا۔

''وہ اس لیے کہتا تھا کہ میں خود پاگل تھا۔'' وہ لفظ چبا کر بولا۔

''اوہ...... یہ بات ہے۔'' ریحان کو صورت حال کی تبدیلی کا احساس ہوا۔

''اچھا...... تو میڈم کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہی ہوں گی۔''

''وہاں آفس تو جا رہی ہیں ناں......؟''

''ہاں...... اور ساجد اس پر عاشق ہو گیا ہے۔''

''خوب صورت لڑکیوں کو سب ہی پسند کرتے ہیں، اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔''

''ساجد شادی کرنا چاہتا ہے...... شہلا سے۔'' حارث نے کہا۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے...... شہلا شادی کے بعد بھی ہمارے لیے اپنے شوہر کے معمولات کی رپورٹنگ مزید آسانی سے کر سکے گی۔''

''لگتا ہے...... تمہاری عقل کہیں گھاس چرنے چلی گئی ہے۔'' اس کی باتیں سن کر حارث کو غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

''میرا مطلب ہے شہلا کو کہیں نہ کہیں شادی تو کرنی ہی ہے ناں...... اس کی اپنی فیملی میں تو کریم، شاہد، ناصر جیسے لڑکے ہی ہیں...... جو کماتے خاک نہیں ہیں...... مگر کماتی ہوئی بیوی لانے کا بہت شوق رکھتے ہیں۔''

''وہ کیوں کرنے لگی ایسی جگہ شادی......'' حارث نے کہا۔

''تو کیا وہ کہیں شادی نہیں کرے گی؟'' ریحان کلس کر بولا۔

''میں کروں گا اس سے شادی......''

''اپنی ناپسندیدہ لڑکی سے تم شادی کرو گے......'' باقی لفظ ریحان کے منہ میں ہی رہ گئے۔

''ہاں، اب اس سے بڑھ کر مجھے کوئی دوسری عزیز ہو ہی نہیں سکتی۔''

''ٹھیک ہے...... یہ فیصلہ تو تمہیں اسی وقت لے لیا ناچاہیے تھا...... جب وہ تمہارے بینک میں، تمہیں دیکھنے کے لیے روز چلی آیا کرتی تھی۔''

''اس وقت میں اسے سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔''

''چلو دیر سے ہی سہی...... مگر سمجھ میں تو آئی...... حالانکہ یہ لڑکیاں تو سمجھ میں آنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتیں۔'' ریحان نے شوخ لہجے میں کہا تو حارث کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اب پریشانی کیا ہے؟''

''وہی ساجد......''

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



''اب کوئی کسی سے زبردستی تو شادی کرنے سے رہا...... اپنی جاب پر لات مار کر وہ گھر آجائے...... سمپل......'' ریحان نے اسے سمجھایا۔
''مگر وہ فی الوقت جاب نہیں چھوڑنا چاہتی۔'' حارث نے بتایا۔
''کہیں یہ وجہ تو نہیں کہ ساجد اسے اچھی تنخواہ بھی دے رہا ہے۔''
''وہ صرف اس کی یہ غلط فہمی ختم کرنا چاہتی ہے کہ منورہ میری بہن نہیں تھی...... بلکہ وہ ہماری کرائے دار تھی۔''
''تو وہ بتادے اسے، کسی بھی طریقے سے۔''
''ہاں اس نے کہا ہے کہ وہ موقع دیکھ کر بات کرے گی......؟ مگر وہ خاصا شاطر شخص ہے، اپنی زیادہ سناتا ہے، اس کی کم سنتا ہے۔''
''چلو ہفتہ بھر میں تو موقع مل ہی جائے گا...... تو پھر بائے، بائے کر کے وہ آجائے۔''
''ہاں، دیکھتے ہیں کہ کب ملتا ہے، اسے یہ موقع......'' حارث نے کہا۔

☆☆☆

اور پھر شہلا کو موقع مل ہی گیا...... جب وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر کافی پی رہا تھا۔
''سر میں نے مونا کا بائیو ڈیٹا معلوم کر لیا ہے...... مختلف جگہوں سے مگر ہر جگہ سے ایک ہی بات معلوم ہوئی ہے۔''
''کیا پتا چلا...... میرا مطلب ہے اب مزید کیا جھوٹی باتیں معلوم ہوئیں۔''
''یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ سچی ہیں یا جھوٹی...... مگر پتا یہ چلا ہے کہ یہ کچھ عرصے پاکستان میں دو جگہوں پر رہیں، ایک جگہ فلیٹ میں کسی خاتون کے ساتھ شیئر کر کے اور پھر دوسری جگہ...... حارث نامی بینکر کے گھر انیکسی میں وہاں وہ پے انگ گیسٹ تھیں۔''
''تو پھر میں کیا کروں...... رہتی ہو گی وہ......''
''سر یہ بتا رہی ہوں...... کہ پاکستان میں ان کا کوئی رشتے دار نہ تھا اور نہ ہے...... کینیڈا میں شادی کے بعد اب وہ جاب بھی شاید نہیں کر رہی ہیں۔''
''ظاہر ہے کہ کسی موٹی اسامی سے شادی کی ہو گی...... جس کے پاس اتنی دولت ہو گی...... جسے وہ گھر میں بیٹھ کر اُڑا رہی ہو گی۔''
''جی سر...... مگر ان کا یہاں کسی سے نہ کوئی تعلق ہے اور نہ ہی کسی سے رابطہ۔''
''نہیں ہو گا۔'' وہ جمائی لے کر بولا۔ ''اور اب اس منحوس لڑکی کا میرے سامنے ذکر بھی نہیں کرنا۔''
''تو پھر آپ اس کی بابت اتنے پریشان کیوں رہتے ہیں؟''
''اب تو نہیں رہتا......'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔
''اس کا مطلب ہے کہ وہ اب آپ کو یاد نہیں آتی؟''
''ہاں، نہیں آتی یاد......''
''شکر ہے...... آپ کی خواہ مخواہ کی ٹینشن تو ختم ہوئی۔''
''ہاں...... اور اس کی وجہ نہیں پوچھو گی۔'' ساجد اب اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔
''جی بتایئے۔'' اب وہ اس کی جانب متوجہ تھی۔
''صرف تم ہو، صرف تم...... تم تو مونا سے بھی زیادہ پیاری ہو۔ معصوم ہو، بس مجھے دھوکا مت دینا...... مجھے دھوکا دینے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔''

''میرا آپ سے ایسا کون سا مالی معاملہ ہے...... جو میں دھوکا دوں گی۔ میں تو آپ کے ہاں جاب کرنے آئی ہوں...... میری جاب بھی تو عارضی ہی ہے۔''

''ہاں، جاب تو تمہاری عارضی ہی ہے۔''

''سر، میرے والدین عمرے کی ادائیگی کر کے آنے والے ہیں...... میں آپ کی یہ جاب اب چھوڑ دوں گی۔''

''تو کیا تم مسز ناصر کے گھر سے اپنے گھر شفٹ ہو جاؤ گی؟'' ساجد نے پوچھا۔

شہلا نے حیرت سے اسے دیکھا...... اس نے تو ایک بار بھی مسز ناصر کے فلیٹ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔

''بھئی مسز ناصر...... کا پارلر ہے ناں...... اور وہ ہماری کلائنٹس کا میک اپ برائے نام پیسوں میں کیا کرتی ہیں۔''

''جی...... جی...... آنٹی سے ہمارے فیملی مراسم ہیں...... ہمارے گھر ان کا خاصا آنا جانا ہے...... اس لیے انہوں نے کہا تم میرے آجانا۔ اکیلی گھر میں مت رہنا۔''

''اچھی بات ہے...... اچھی بات ہے...... حالانکہ مسز ناصر تو اتنی بری عورت ہے کہ اس کے پاس خود اپنے لیے وقت نہیں ہوتا۔''

اب ساجد پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہا تھا۔ اور شہلا متوحش سی اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''کیا ہوا...... کہاں چلی گئیں۔ کہاں ہو...... مون......'' اس نے لاڈ سے پکارا۔ شہلا اسے دیکھنے لگی۔

''آپ مسز ناصر کے بارے میں بالکل صحیح کہہ رہے ہیں کہ واقعی ان کے پاس وقت نہیں ہوتا۔''

''اُف خدایا...... تم اپنا قیمتی وقت اس فضول عورت کے بارے میں خرچ کر رہی ہو...... جو پہلے ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں کام کرتی تھی اور جب اس کا یہاں دل نہیں لگا...... تو اس نے اپنا بیوٹی پارلر کھول لیا۔''

''مگر وہ اپنے بیوٹی پارلر...... پر اتنی سنجیدگی سے توجہ کہاں دیتی ہیں۔'' وہ چاہ رہی تھی کہ ساجد کے دل و دماغ میں جتنی بھی باتیں مسز ناصر کے بارے میں ہیں وہ آج ساری کی ساری حاصل کر لے۔

''بیچاری کا بیٹا سائیکی ہے...... اس کو چھوڑ کر لاہور چلا گیا ہے۔ بس وہ اس کے لیے پاگل سی رہتی ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ...... مگر پھر بھی ہمدرد قسم کی ہیں...... مجھ سے کہا جب تمہارے امی، ابو سعودی عرب میں ہیں تو تم میرے پاس رہو...... اور میرے پارلر میں اپنا ہاتھ بھی صاف کرو تا کہ اگر کبھی تمہارا دل جاب کرنے کو چاہے تو اپنا ذاتی کام کر سکو...... آخر بیوٹی پارلر کا کام تمہیں آتا تو ہے ہی تو پھر ٹریننگ کرنے کا کیا فائدہ کہ اسے کام میں بھی نہ لاؤ۔''

''اس پاگل عورت نے تمہیں بھی پاگل پنے کا ہی مشورہ دیا ناں......''

''آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔'' شہلا کو اس کی برہمی پر حیرت سی ہوئی۔

''جب میں تم سے شادی کرنے کو تیار ہوں...... تو تمہیں کیا ضرورت ٹھہری کہ تم الٹے سیدھے کام کرتی پھرو گی۔ تم تو آرام سے گھر میں بیٹھنا اور میرے دل پر راج کرنا۔''

''میری شادی کا فیصلہ تو میرے والدین ہی کریں گے۔'' اس نے کھسیا کر کہا۔

''تم کیا سمجھتی ہو...... تمہارے والدین کو مجھ جیسا داماد مل سکتا ہے۔''

''یقیناً نہیں...... بلکہ کسی بھی لحاظ سے نہیں......''

''تو پھر یہ تصور بھی مت کرو کہ وہ میرا رشتہ قبول نہیں کریں گے۔''

''مگر ڈریں گے تو ناں......''

''کیسا ڈر...... میں سمجھا نہیں۔''

''ایک کروڑ پتی، ارب پتی شخص...... ایک غریب لڑکی سے کیوں شادی کر رہا ہے۔''
''صرف تمہاری خوب صورتی کی وجہ سے...... میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں۔''
''مگر یہاں تو ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت لڑکیاں آپ کے اپنے ادارے میں، آپ کے اپنے حلقۂ احباب میں ہر طرف ہیں...... تو پھر میں ہی کیوں؟''
''وہ اس لیے کہ تم میری مون ہو اور بس......''
''اس کا مطلب ہے آپ اپنی پہلی محبت کو نہیں بھولے۔''
''کیا کوئی بھی شخص اپنی پہلی محبت کو بھول سکتا ہے؟''
''ہاں، اس نفسانفسی کے دور میں تو ایسا ہی ہو رہا ہے۔ خوب سے خوب لڑکی کی تلاش میں آج کے لڑکے، لڑکیاں اپنی پہلی تو کیا دوسری، تیسری محبتوں کو بھی بخوشی خیر باد کہہ کر راہیں الگ کر لیا کرتے ہیں۔''
''اور تمہارا اپنا کیا خیال ہے...... میرا مطلب ہے تم نے اگر محبت کی تھی تو وہ کیسی تھی؟''
''سر...... اب اس معاملے میں، میں کہاں سے آگئی۔''
''اس معاملے میں تم ہی تو ہو......'' وہ ہنسا۔
''مگر میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔''
''رئیلی......'' اپنی سگریٹ...... لائٹر کی مدد سے جلاتے ہوئے وہ مسکرایا۔
''ہاں کسی سے بھی نہیں......''
''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ پر ٹرسٹ نہیں کرتیں۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں...... کہ تم نے کسی سے محبت نہیں کی یا تم سے کسی نے نہیں کی۔''
''اب بے تکی محبتوں کا ذکر کرنا بھی کیا ضروری ہوتا ہے۔''
''ہاں ہوتا تو ہے۔'' وہ پُرشوق نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
''میرا کزن مجھے پسند کرتا تھا بلکہ محبت کے عامیانہ جملے بھی بولنے کی کوشش کرتا تھا...... مجھے وہ کسی بھی لحاظ سے اچھا نہیں لگتا تھا...... جبکہ میری سوتیلی بہن اس کو بہت چاہتی تھی...... یوں ان دونوں کی شادی ہوگئی۔''
''اور تم نے اپنی بہن کو خواہ مخواہ چارا بنا دیا......''
''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''
''جو شخص کسی لڑکی کو پسند نہ کرے وہ اس سے شادی نہیں کیا کرتا۔''
''ہاں، ایسا تو اس نے کہا تھا۔'' اس کے لبوں سے نکلا۔
''تو پھر...... یہ سمجھ لو...... کہ اس کے دل میں تم آج بھی بسی ہو۔''
''میں اس کا منہ نہ توڑ دوں گی۔'' شہلا نے کہا
''وہ جلد اپنی بیوی سے جان چھڑا کر آئے گا...... اور تمہارے گرد گھومے گا۔''
''میں اسے جان سے مار دوں گی۔'' شہلا اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔
''گڈ...... یہی میں چاہتا ہوں۔'' وہ ہنسا۔
''جی......'' اب وہ لرزتے ہوئے ساجد کو دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں، اسے اس شخص سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ ساجد کے قہقہے فلک شگاف تھے جو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اور پھر شہلا خوف اور ڈر سے ساکت سی ہوگئی۔

(جاری ہے)





# فیصلہ

ثمینہ عظمت علی

"دانیہ، اٹھ جاؤ اب۔" ماہم نے میرے سر سے کمبل گھسیٹتے ہوئے کوئی تیسری مرتبہ کہا۔

"کیا مصیبت ہے یار...... چھٹی والے دن.. انسان سو بھی نہیں سکتا، کیا آفت آئی ہوئی ہے؟" میں نے سخت جھنجلا کر کہا۔

"جیسے تم جانتی نہیں ہو کہ کیا آفت آئی ہوئی ہے یا آنے والی ہے۔" ماہم نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

میرا دل جل کر رہ گیا (کم بخت اپنی اداؤں سے سب کو اسیر کر لیتی ہے)

اسی وقت امی اندر داخل ہوئیں۔

''دانیہ! شرم کرلو..... دوپہر ہونے کو آئی تمہاری نیند پوری نہیں ہو رہی...... ماہم بیچاری صبح سے میرے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اسے فریش بھی ہونا ہے۔''

''اُفوہ امی، رشتہ ہی تو آ رہا ہے کوئی بارات تو نہیں آ رہی ناں، آپ لوگوں کی شاہی تیاریاں ختم ہونے کو نہیں آ رہیں۔ کون سا پھوپا اور پھپھو پہلی بار آ رہے ہیں اور ازین تو ہر وقت ہی یہیں پایا جاتا ہے۔'' میں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا تو ماہم کا چہرہ ذرا سا بجھ گیا۔ امی کو تو خوب ہی غصہ آیا۔

''جانتی بھی ہو کہ آج کے آنے اور ہمیشہ کے آنے میں فرق ہے اور کب ازین ہر وقت یہاں آتا ہے اور آتا بھی ہے تو اس کا اپنا گھر ہے لیکن اب وہ ہمارا داماد بننے والا ہے۔ تو ظاہر ہے فرق تو ہوگا۔''

میں منہ بناتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔ میں نے سارے گھر کا جائزہ لیا۔ خوب چمک رہا تھا امی اور ماہم نے مل کر بہت سی تبدیلیاں کی تھیں۔ فواد بھی ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ابو بھی بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہے تھے۔ میرے دل کو عجیب سی بے کلی نے آگھیرا۔ میں کچن میں چلی آئی۔ وہاں کا سماں ہی الگ تھا گویا بہت بڑی دعوت کی تیاری ہو رہی ہو۔

''لگتا ہے کہ امی آج ہی ماہم کی شادی کر دیں گی۔'' میں غصے سے بڑبڑائی۔

''کیا ہوا بیٹا...... خوب سوئیں آج، ناشتا دوں؟'' ہماری پرانی ملازمہ جنہیں ہم خالہ کہتے تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگیں۔

''بس مجھے چائے بنا دیں۔'' میں نے نروٹھے لہجے میں کہا اور ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی جہاں ابو بیٹھے ٹینس کا میچ دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہوا بھئی، بڑی خاموش ہو، آسٹریلین اوپن فالو نہیں کر رہیں؟'' ابو نے خوش دلی سے پوچھا۔

''ماہم بھی تو نہیں دیکھ رہی۔'' میں نے خواہ مخواہ چڑ کر کہا۔

''ہاں۔'' اس کی بات اور ہے۔''

''ہاں، میں نے دل میں تائید کی۔'' اس کی بات اور ہے۔ اسے اب کسی کی ہار اور جیت سے کیا لینا۔''

''سنیے......'' اسی وقت امی چلی آئیں۔ ''ماہم کی کچھ فرینڈز کو نہ بلالیں، ذرا رونق ہو جائے گی۔''

''کیا ضرورت ہے امی۔'' ابو کے بولنے سے پیشتر ہی میں بول اٹھی۔

''ابھی تو صرف رشتہ ہی آ رہا ہے، آپ اتنی ایکسائٹڈ کیوں ہو رہی ہیں۔''

میرے یوں ایک دم بولنے سے امی اور ابو چپ سے ہو گئے۔ پھر ابو نے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہی تو ہے منگنی میں بلا لینا سب کو۔''

''رشتہ تو ہو ہی چکا ہے۔'' امی نے آہستہ سے کہا۔

''کون سا اب 'ہاں' اور 'نہ' کا فیصلہ کرنا ہے۔''

''ہاں، رشتہ تو ہو ہی چکا ہے۔'' میں نے ذرا سا طنزیہ کہا۔

''اچھا، تم ذرا گفٹس پیک کر دو جو آپا (پھپھو والوں کے لیے ہیں)۔''

''اچھا کر دوں گی۔'' میں نے کہا۔ گفٹس پیک کرتے ہوئے میں سوچنے لگی کہ مجھے اتنا روکھا ہونے کی کیا ضرورت ہے جو ہونا تھا ہو چکا... اب کیا فائدہ بدمزگی کا میں نے خود کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

شام بڑی خوشگوار تھی۔ پھپھو اور پھوپا خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی سے ماہم کو رخصت کروا کے لے جائیں اور امی، ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ تارے توڑ کر ازین کے قدموں میں رکھ دیں۔ ماہم کے لیے پھپھو نے آج کے دن کے لیے خاص ڈریس پہلے سے ہی بنوا کر بھیج دیا تھا جو کہ مجھے معلوم تھا کہ ازین کی پسند ہی کا تھا۔ جسے پہنے ماہم اٹھلاتی پھر رہی تھی۔ پیاری تو وہ پہلے ہی تھی لیکن

آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ سنہری بالوں کے حلقے میں اس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا اور سب کی نظریں بچا کر جب ازین اسے دیکھتا تو ماہ و سال کی گردش میرے لیے رک جاتی تھی۔

سب کچھ کتنا مکمل تھا یہاں۔ ابو خوش تھے کہ بہن سے ان کا رشتہ مضبوط ہو رہا تھا۔ امی، خوش تھیں کہ وہ کتنی اچھی بھابی ثابت ہوئی تھیں۔ پھپو لاڈلی بھتیجی کو بہو بنانے کے خیال سے نہال تھیں اور پھوپا...... ان کے ساتھ خوش...... فواد تو ویسے ہی ازین کا دیوانہ تھا۔ اس کا فیورٹ کزن...... اب اس کا بہنوئی بن رہا تھا۔

ماہم اور ازین کی تو بات ہی کچھ اور تھی وہ تو گویا زمان و مکان سے پرے کسی اور ہی دنیا کی سیر کر رہے تھے۔

اور میں......؟ میں چپکے سے باہر نکل آئی......

رات سرد تھی اور آسمان خاموش۔

''اللہ ماہم اور ازین کو خوش رکھے......'' میں دل سے دعا گو تھی لیکن اسی دل کے کسی حصے میں ایک خلش، ایک کسک، ایک درد سا تھا۔

''مجھے ازین سے محبت تھی۔''

☆☆☆

ازین میری پھپو کا بیٹا تھا۔ وہ مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑا تھا۔ ماہم مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی اور اس سے پانچ سال چھوٹا فواد تھا۔ پھوپی کے روایتی تعلقات کے برعکس ہمارے تعلقات ان کے ساتھ مثالی تھے۔ ابو اور پھپو دو ہی بہن بھائی تھے اور ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اِدھر امی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں تو رشتے داری کے نام پر بس ہم دو گھرانے ہی تھے ایک دوسرے کے لیے سو دونوں گھرانوں میں بڑی محبت تھی بلکہ یہ ایک ہی گھرانا محسوس ہوتا تھا۔ ازین، میں اور ماہم ایک ساتھ پڑھتے، جھگڑتے اور کھیلتے بڑے ہوئے...... ہمیں کہیں لانے، لے جانے کے لیے ابو، امی ہمیشہ ازین پر بھروسا کرتے تھے اور وہ بھی ہماری مدد کرنے پر ہر وقت آمادہ رہتا۔ جب تک ہم بڑے نہیں ہو گئے راوی ہر طرف چین ہی چین لکھتا تھا۔ اس وقت کوئی بھی کسی خصوصی جذبے سے آشنا نہ تھا۔

☆☆☆

''یار، یہ تمہارا کزن کتنا ہینڈسم ہے۔'' ماریہ نے بے ساختہ کہا۔ ہم ان دنوں میٹرک میں تھے۔ ماریہ میری نئی دوست تھی۔

میں فواد کی سالگرہ کی تصویریں اسکول لے کر گئی تھی۔

''کون؟ ازین...... ہاں اچھا ہے یہ میری پھپو کا بیٹا ہے۔''

''صرف اچھا......'' ماریہ نے حیرت سے کہا۔

''دیکھو تو پورا ہیرو لگ رہا ہے، کیا ارادہ ہے بھئی۔'' اس نے شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب......؟'' میں نے سادگی سے کہا کیونکہ سچ مچ ہم نے تو پورا بچپن بہن، بھائیوں کی طرح ہی گزارا تھا۔

''الو کہیں کی...... grow up now بچی نہ بنو۔''

میں نے یونہی الجھ کر ایک نگاہ تصویر پر ڈالی تو پہلی بار احساس ہوا کہ واقعی ازین تو...... اب وہ انٹر کر چکا تھا، اس کا قد اچانک ہی دراز ہو گیا تھا۔ چہرے سے بچپن رخصت ہو چکا تھا اور وہ ایک نہایت خوش شکل نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا۔

وہ پہلی مرتبہ تھا جب میں نے اپنے دل میں دھیمی، دھیمی موسیقی محسوس کی...... یوں جیسے کوئی دور چاندنی رات میں وائلن بجا رہا ہو۔

''تم بھی ناں......'' میں نے ماریہ کو جھاڑا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں نے اس سے کہا۔

''ایسی کوئی بات ہو جانے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

☆☆☆

''ہاں کیا حرج ہے؟'' میں نے گھر آ کر خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچا۔ جس طرح میں نے

ازین کو غور سے نہیں دیکھا تھا، اس طرح میں خود سے بھی انجان رہی تھی۔ آج خود کو دیکھا تو حیران رہ گئی۔ میرا قد لمبا ہوگیا تھا۔ چہرے پر نوجوانی کی سرخی تھی۔ سیاہ بال کندھوں سے نیچے تک آگئے تھے۔ میری اور ماہم کی شکل بہت ملتی تھی۔ بس میرے بال سیاہ تھے اور اس کے سنہرے۔

میرا دل زور، زور سے دھڑکنے لگا۔

''کیا ہوگیا ہے۔'' ماہم نے کہا۔ ''آئینے کے سامنے سے ہٹ ہی نہیں رہیں تم۔'' میں بری طرح۔ گڑبڑا گئی۔

''وہ...... وہ ماریہ کہہ رہی تھی کہ مجھے آئی بروز بنوانی چاہئیں۔'' میں نے بات بنائی۔ ''پتا نہیں امی اجازت دیں یا نہیں۔''

''بنوالو......'' ماہم نے اپنی ازلی بے پروائی سے کہا۔ ''امی نے کب ہم پر بے جا پابندی لگائی ہے۔ زیادہ او ور تو ہم ہوتے نہیں۔''

''ہاں......'' میں نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کہا۔

شام میں ازین آیا تو میں اس سے پہلی سی بے تکلفی سے بات نہ کرسکی۔

''کیا ہوا ہے دانی...... ٹیسٹ میں نمبر کم آگئے ہیں؟'' اس نے حسبِ عادت میری ناک مروڑ دی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو میں اسے جوابی گھونسا رسید کرتی لیکن اس دن ناک کے ساتھ میرا پورا چہرہ سرخ ہوگیا اور میں جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

''تم کیا ازین سے ناراض ہو؟'' رات کو ماہم نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں تو کیوں بھلا؟'' میرا دل دھک، دھک کرنے لگا۔

''تم کمرے میں آکر بیٹھ گئی تھیں۔''

''وہ...... وہ میرا ٹیسٹ ہے ناں کل...... تو میری تیاری نہیں تھی۔''

''اچھا......'' ماہم بے پروائی سے کہہ کر اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی۔ یوں بھی وہ کھلنڈری سی تھی۔ زیادہ غور نہیں کرتی تھی کسی بات پر......

میں دل ہی دل میں ماریہ کو کوستی رہی جس نے میرے دل ودماغ کو کسی اور ہی راہ پر لگا دیا تھا۔

☆☆☆

اور آنے والے دنوں میں وقتاً فوقتاً ماریہ کو میرا کوسنا جاری ہی رہا...... جب بھی ازین سامنے آتا میں کھوسی جاتی۔ پھر یوں ہوا کہ اس کا ایڈمیشن میڈیکل میں ہوگیا۔ میڈیکل کالج تو شہر میں ہی تھا لیکن سخت پڑھائی کی وجہ سے اس کا آنا جانا نسبتاً کم ہوگیا۔ میں نے بھی پڑھائی میں دل لگالیا اور خود کو یہ بھی سمجھایا کہ ابھی ہماری عمران باتوں کی نہیں ہے۔

☆☆☆

سیکنڈ ایئر کے بعد ابو، امی کی خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔

''دانیہ بیٹا تمہارے تو مارکس بھی اچھے ہیں اور ویسے بھی میرے خیال میں انٹری ٹیسٹ تمہارے لیے مسئلہ نہیں...... ازین بھی ہے، گائڈ کرنے کے لیے۔'' امی نے مجھے سمجھایا۔

لیکن میں امی کو سمجھا نہیں سکی کہ شاید ازین ہی کی وجہ سے میں میڈیکل سے اجتناب کر رہی ہوں میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم دونوں ایک ہی پروفیشن میں ہوں، گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ میرے دل میں یہ خیال پختہ ہوگیا تھا کہ مستقبل میں میری زندگی کا ساتھی ازین ہی ہوگا۔ حالات و آثار بھی یہی تھے۔ ظاہر ہے پھپھو کو ازین کی شادی کے لیے سب سے پہلے میرا ہی خیال آنا تھا۔ خود میری اور ازین کی بہت اچھی دوستی اور انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ابو، امی کا وہ ویسے ہی لاڈلا تھا۔ میں یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ ہمارے درمیان کوئی ظالم سماج نہیں آنے والا تھا۔

''کوئی بات نہیں امی۔'' ماہم نے درمیان میں کہا۔ ''دانیہ جو پڑھنا چاہتی ہے اسے پڑھنے دیں۔''

میڈیکل میں، میں چلی جاؤں گی۔"

"ارے میری بچی......" امی نے نہال ہو کر ماہم کو گلے لگا لیا اور میں بھی مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

ماہم کا ایڈمیشن میڈیکل میں ہو گیا۔ میں اپنے شوق کے مطابق لٹریچر پڑھ رہی تھی۔ ازین اب فائنل ایئر میں تھا۔ ماہم کے ایڈمیشن کے بعد اکثر وہ اسے کالج لے جانے یا ڈراپ کرنے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ اگر سہولت ہوتی تو مجھے بھی ڈراپ کر دیتا تھا۔ وہ شروع سے ہی ابو، امی کا بڑا بیٹا بن کر رہا تھا۔ اسی اپنائیت اور بے تکلفی کی وجہ سے کوئی یہ نہیں جان پایا کہ میرے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہیں اور نہ ہی کبھی میں نے اپنے جذبات اس تک پہنچانے کی کوشش کی۔

ماہم سے بھی اس کی ایسی ہی بے تکلفی تھی۔ جیسی مجھ سے یا فواد سے بلکہ ماہم کی اس سے زیادہ بنتی تھی اور میں مسکرا کر سوچتی۔ "ٹھیک ہے بھئی، ہونے والا بہنوئی ہے اس کا......"

اس سارے پُرسکون ماحول میں ہلچل اس وقت مچی جب امی کی دوست آنٹی مدیحہ اپنے بیٹے کے لیے میرا پروپوزل لے کر آئیں۔ ان کا بیٹا فراز بیرون ملک سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ اپنے ملک اور باہر دونوں جگہ سیٹ ہونے کے آپشنز تھے اس کے پاس۔ آنٹی مدیحہ امی کی بہت پرانی دوست تھیں اور بے حد ملنسار اور شفیق خاتون تھیں۔ ابو، امی کو تو یہ رشتہ بے حد پسند آیا جبکہ میں ششدر رہ گئی۔ ایک مکمل تصویر کے بیچ میں سے کوئی ایک ٹکڑا اٹھا لے تو کیسا لگے گا یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟

"امی، یہ کس طرح ممکن ہے......کیا انہیں علم نہیں کہ......" میں رک گئی۔ کیسے کہہ دیتی۔ میں نے ہمیشہ سے ایسا سوچا تھا کہ گویا میرا اور ازین کا رشتہ طے ہوا اور سب کو معلوم ہوا۔

"امی ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں......" میں نے گھسا پٹا بہانہ دہرایا۔

"پڑھائی سے کون منع کر رہا ہے۔" امی نے کہا۔

میں حیران رہ گئی۔ امی اتنے آرام سے کیسے کہہ سکتی ہیں مجھ سے......کیا ان کی خواہش نہیں ہے کہ ازین ان کا داماد بنے؟

میں عجیب کشمکش کا شکار تھی اسی الجھن میں پھپو کے گھر چلی آئی......اتفاق سے ازین لان میں ہی مل گیا۔ اس کے دوست شاید ابھی ابھی وہاں سے اٹھ کر گئے تھے۔

"ارے، دانی کیا حال ہیں؟" وہ ہمیشہ والی خوش دلی سے بولا۔

میں وہیں بیٹھ گئی اور ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں؟

"میرے دوست کی شادی ہے، دیکھو تو پتا ہی نہیں چلا......ہم اتنے بڑے ہو گئے۔" اس نے ہنس کر کہا اور یہ بات کر کے اس نے میری مشکل آسان کر دی۔

"پھر تمہارے کیا ارادے ہیں؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"ہم......" وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

"سوچ رہا ہوں میں بھی......" وہ مجھے دیکھتے ہوئے کہنے لگا تو میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

"اچھا......" میں نے بہ مشکل کہا۔ "کوئی لڑکی ڈھونڈی؟"

"ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مطلب......؟"

"مطلب یہ کہ لڑکی تو موجود ہے۔"

"یعنی یہ کہ تم لڑکی پسند کر چکے ہو اور ہمیں بتایا تک نہیں۔" میں نے خود اعتماد نظر آنے کی کوشش کی۔

"لڑکی تو میں برسوں سے پسند کر چکا ہوں۔" اس نے انکشاف کیا۔ "دیکھا......" میں نے دل میں کہا۔ "ازین بھی میری طرح ہی سوچتا ہے۔ شاید میری طرح اس نے بھی کبھی نہیں سوچا تھا میں کسی اور کی بھی

ہو سکتی ہوں۔'' میں نے یہ موقع مناسب جانا۔

''امی کی دوست ہیں ناں...... آنٹی مدیحہ وہ میرے لیے اپنے بیٹے کا پروپوزل لائی ہیں۔''

''اچھا......؟ کب؟ وہ فراز......؟'' اس نے اتنی بے چینی سے پوچھا کہ میرے دل کو چین آ گیا اب میں مطمئن تھی۔ میں گھر آ کر اطمینان سے سو گئی کہ اب ازین خود ہی سب ٹھیک کر لے گا۔

☆☆☆

''ماہم...... ازین......؟'' میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ خبر تھی یا دھماکا جس نے میرے وجود کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

''آپا نے کئی سال پہلے ہی مجھ سے بات کر لی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ جب تک بچے بڑے نہیں ہو جاتے یہ بات ظاہر نہ کریں۔'' ابو نے کہا۔

''میں نے بھی کہا تھا کہ دانیہ بڑی ہے، جب اس کا رشتہ طے ہوگا پھر ہی آپ لوگ بات کیجیے گا۔'' امی نے بتایا۔

''میں نے تو کم عمری میں ہی فیصلہ کیا تھا کہ ماہم سے شادی کروں گا۔'' ازین نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے بھی معلوم تھا۔'' ماہم نے شرما کر میرے سامنے اعتراف کیا۔

''تو کبھی بتایا کیوں نہیں۔'' کسی اور کے آگے تو نہیں لیکن ماہم کے آگے میں پھٹ پڑی۔

''تم اتنی چالاک ہو...... کبھی خبر نہیں ہونے دی۔'' میں غرائی۔

''ارے، ہم کون سا بریلی پہاڑیوں پر گانے گاتے تھے۔'' ماہم کی وہی ازلی بے پروائی...... ''یا کبوتر کے ہاتھوں خط بھجواتے تھے یا چھپ چھپ کر ملتے تھے۔'' وہ کھلکھلائی۔

''یہ تو...... matter of fact قسم کی بات تھی۔ کیا بتاتی۔'' آخر میں اس نے اسی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

کس قدر بے وقوف تھی میں...... میں نے سوچا کہ دونوں کو ایک پروفیشن میں نہیں ہونا چاہیے اور ان دونوں نے مل کر ایک ہی فیلڈ میں جانے کا فیصلہ کیا...... میں ان کی بے تکلفی کو جس رشتے کی نظر سے دیکھتی رہی، وہ رشتہ میرے اور ازین کے درمیان ہو رہا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے سب میرے خلاف سازش میں مصروف تھے۔

امی، آخر ماں تھیں، شاید میرے دل کی حالت سمجھ گئیں جبھی وہ مجھے کچھ اداس سی نظر آئیں۔

''دانیہ بیٹا! فراز بہت اچھا لڑکا ہے، مدیحہ نے مجھے بتایا کہ وہ تمہیں بہت پسند کرتا ہے اور تمہارے ساتھ کا دلی خواہش مند ہے، جیسے ازین، ماہم میں شروع سے انٹرسٹڈ ہے، ایسی شادی کامیاب رہتی ہے بیٹا۔'' انہوں نے درپردہ مجھے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''امی آپ انہیں منع کر دیں، مجھے نہیں کرنی شادی۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔

امی نے مجھے بے بسی سے دیکھا اور شاید مجھے وقت دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے آنٹی مدیحہ کو منع کر دیا۔ ابو سے کیا کہا میں نہیں جانتی۔ میں اپنی ذات کے بحران میں مبتلا تھی۔

☆☆☆

''تم نے فراز کے لیے کیوں منع کر دیا؟'' ازین نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہیں کیوں اس سے اتنی ہمدردی ہے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''ہمدردی تو نہیں...... میں ایک بار ملا تھا اس سے کافی عرصہ پہلے...... وہ تو باہر ہی رہتا ہے زیادہ...... لیکن اچھی فیملی ہے اتنا تو معلوم ہے مجھے۔''

''کیا یہ واقعی اتنا انجان ہے؟'' میں نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' میں

نے آہستہ سے کہا۔

اور یوں ہی آہستہ، آہستہ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی۔ میں کیوں سب سے بدگمان ہو رہی تھی۔ کسی نے میرے ساتھ دھوکا نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے ابو، امی زبردستی تو نہیں کر سکتے تھے کہ ماہم کو چھوڑ کر دانیہ کا رشتہ لے لیں...... پھر کیا اس صورت میں ازین مان جاتا......؟ اور میں ماہم کو کیا منہ دکھاتی۔ ازین نے کبھی مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جس کی بنیاد پر میں نے اپنے خوابوں کے محل کھڑے کیے تھے۔ وہ سب میری اپنی اختراع تھی......لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب خود کو اچھی طرح سمجھانے کے لیے مجھے وقت درکار تھا۔

☆☆☆

ماہم اپنے کالج کے ٹرپ پر مری، بھوربن وغیرہ جانے کے لیے بضد تھی جبکہ امی، ابو کچھ ہچکچا رہے تھے۔

''کیا ہے......امی، میری ساری کلاس فیلوز جا رہی ہیں، آپ لوگ اتنے کنزرویٹو تو نہیں ہیں۔'' اس نے لاڈ سے کہا۔

''بیٹا یہ بات نہیں ہے۔ بس تم لوگوں کو کبھی اکیلے اتنی دور بھیجا نہیں اور حالات......'' ابو نے پیار سے سمجھایا۔

''اور اتنی بار تو گئے ہیں، مری، اسلام آباد وغیرہ......'' امی نے ٹوکا۔

''امی، کلاس فیلوز کے ساتھ تو نہیں گئی ناں......ہر کمپنی کا اپنا ایک الگ مزہ ہوتا ہے، فیملی کا الگ، فرینڈز کا الگ......'' ماہم بولی۔

اور پھر حسبِ معمول ازین اس کی مدد کو آن پہنچا اور ازین کے پاس تو جادو کی چھڑی ہوتی تھی جسے گھماتے ہی ابو، امی موم ہو جایا کرتے تھے۔

''تمہاری ضد کی خاطر مانا ہوں میں بھی۔'' ازین نے بعد میں اس سے کہا۔

''تھوڑا عرصہ صبر کرتیں پھر ساتھ چلتے ہم دونوں۔'' ازین نے ماہم کو چھیڑا تو وہ جھینپ گئی۔

ساری حقیقت کو دل سے تسلیم کر لینے کے باوجود ان کی محبت کے یہ مظاہرے میرے دل کو بجھا کر رکھ دیتے تھے۔

☆☆☆

ماہم کو گئے تیسرا دن تھا۔ ابو ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ پیچھے امی اور میں ڈائننگ ٹیبل پر کراکری خشک کر رہے تھے۔ کچھ مہمان کھانے پر مدعو تھے۔ بریکنگ نیوز کے مخصوص میوزک پر ہم ذرا چونک سے گئے گو کہ اب پل، پل کی بریکنگ نیوز ان نیوز چینلز کا وتیرہ بن چکی ہیں۔ لیکن آج کے یہ الفاظ ہی ایسے تھے کہ سب کو چونکا کر رکھ دیا۔

''میڈیکل کالج کی طالبات کی گاڑی کو حادثہ ہو گیا۔'' امی کے ہاتھ سے پلیٹ گر گئی۔ میں نے جا کر انہیں سنبھالا۔ ابھی کوئی تفصیل نہیں آئی تھی۔ میڈیکل کالج بہت سے ہوتے ہیں، لاتعداد گاڑیاں ہوتی ہیں اور ان گنت طالبات......

ہم ایک دوسرے کو تسلی دینے کی کوشش کرتے رہے، فون اِدھر اُدھر فون کر رہا تھا۔ پھپو، پھوپا، ازین سب ہمارے گھر جمع ہو گئے تھے۔ دعائیں پڑھ، پڑھ کر ہمارے ہونٹ خشک ہو گئے۔ دل میں لاتعداد خدشات تھے۔ ایک دوسرے سے نظریں چراتے، چراتے بہت وقت گزر گیا۔ حتیٰ کہ اسلام آباد سے آنے والے ایک فون نے ہمارے بدترین خدشات کی تصدیق کر دی۔

☆☆☆

ماہم کی تصویر آنکھوں سے لگا کر میں سسک پڑی۔ چھ ماہ ہو گئے تھے لیکن ہمارے زخم اسی طرح ہرے تھے۔ گویا آج ہی یہ قیامت ہم پر گزری ہو، وہ معصوم سی کھلنڈری سی لڑکی، لگتا تھا کہ گھر کی ساری رونق اسی کے دم سے تھی۔ اس کے جانے کے بعد گھر کے درودیوار خاموش ہو گئے تھے۔ ہر وقت، ہر طرف وحشت کا راج تھا۔ ابو کمرے سے دو، دو دن باہر نہ نکلتے، امی جائے نماز پر بیٹھی آنسو بہاتی رہتیں۔

میں خاموش بیٹھی ماہم کی چیزوں کو تکتی رہتی۔ ہمارا کمرا مشترکہ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ابھی کمبل اچھال کر اٹھے گی، ابھی باتھ روم سے نکلے گی۔ ہر طرف اس کے کپڑے، جوتے، کتابیں، مجھے ہر پل اس کی یاد دلاتے رہتے اور میرا دل چاہتا کہ یہ سب یوں ہی رہے۔ میں وہاں سے کچھ بھی ہٹانے کو تیار نہیں تھی۔ فواد بیچارہ سب سے چھوٹا تھا، وہ اِدھر سے اُدھر پھرتا رہتا۔ ایک پرانی ملازمہ تھیں جو ہم سب کو زندہ رکھنے کی سعی میں ہلکان رہتیں۔ کبھی زبردستی دو نوالے کھلا دیتیں، کبھی چائے کبھی دودھ لیکن ازین کو دیکھ کر ان کا ضبط ختم ہو جاتا اور اسے گلے سے لگا کر آنسو بہانے لگ جاتیں۔

ازین کی تو حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ پتا نہیں کیسے وہ زندہ تھا۔ اس کا بس چلتا تو اس دنیا میں ایک پل نہ رہتا جہاں اس کی ماہم نہیں تھی۔

''امی، مجھے ماہم سے بڑی محبت تھی۔'' میں امی کے گلے لگ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ امی کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کی جھڑی جاری ہو گئی۔

''امی، میں نے کبھی اس کا برا نہیں چاہا۔ کبھی اسے بددعا نہیں دی۔'' میں نے آخر اس احساسِ جرم کا اعتراف کر لیا جو مجھے ہر وقت گھیرے رکھتا تھا۔ میں آدھی رات کو اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں نے ان دونوں کی خوشیوں کو نظر لگا دی۔ شاید میری آہ ان کو لگ گئی۔ پھر میں اپنے آپ کو ہی صفائیاں دینے لگ جاتی کہ میں نے کبھی ان کا برا نہیں چاہا تھا۔ جو حقیقت تھی اس کو تسلیم کر لیا تھا۔

''میں جانتی ہوں میری بچی......'' امی نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''تم اپنے دل پر ایسا کوئی بوجھ نہ رکھو۔ کیا ماہم کی جدائی کا بوجھ کم ہے؟'' وہ پھر سے رونے لگیں۔ ہم دونوں گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

☆☆☆

ماہم کو جدا ہوئے ایک سال سے اوپر ہو گیا۔ دل میں ایک ابدی زخم لیے ہم سب بھی آہستہ آہستہ زندگی کی طرف لوٹنے لگے۔ میں گھر کے کاموں میں خالہ کے ساتھ مدد کرنے لگی۔ فواد اپنی پڑھائی میں...... ازین اپنی جاب پر جانے لگا۔

میری دوست ماریہ کی شادی تھی۔ وہی ماریہ جس نے پہلی بار میرے دل میں ازین کی محبت کا چراغ جلایا تھا لیکن بعد میں جب ماہم اور ازین کی منگنی ہوئی تو میں نے اس سے یہی کہا کہ مجھے ازین سے اس طرح کی کوئی دلچسپی نہیں ہے...... ماہم کی موت کے بعد ماریہ نے میرا بہت خیال رکھا تھا اور اس نے شادی پر نہایت اصرار سے بلایا تھا۔ اس نے امی سے وعدہ لیا تھا کہ وہ مجھے اس کی شادی پر ضرور بھیجیں گی۔

''چلی جاؤ بیٹا! بہت اصرار کیا ہے اس نے۔'' امی نے مجھے سمجھایا۔

''میرا دل نہیں چاہتا امی۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''چلی جاؤ دانیہ...... کیا کر سکتے ہیں، اپنے غم کی وجہ سے کسی کی خوشی خراب نہیں کرتے، تمہارے بچپن کی دوست ہے، بہنوں جیسی ہے، میں نے ازین سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہیں لے جائے گا۔'' امی نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔

میں نے کمرے میں آ کر الماری کھولی اور بے دلی سے کپڑے دیکھنے لگی۔ ماہم کے جانے کے بعد سے میں نے کوئی شاپنگ نہیں کی تھی۔ یوں ہی بے خیالی میں، میں نے ماہم کے کپڑوں کی سائڈ کھول لی، ہم دونوں کے کپڑوں کا ایک ہی سائز تھا۔ ہم اکثر ایک دوسرے کے کپڑے پہن لیا کرتے تھے۔ لیکن ماہم لاابالی تھی، وہ جینز، ٹراؤزر، ٹی شرٹس وغیرہ زیادہ پہنتی تھی جب کبھی اسے کسی مکمل شلوار قمیص اور دوپٹے کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ مجھ سے ہی رجوع کرتی تھی۔ لیکن منگنی پر پھپو نے اسے کئی بے حد خوب صورت فینسی ڈریس دیے تھے۔ میں خیالوں میں کھوئی اس کے کپڑوں پر ہاتھ پھیر، پھیر کر دیکھ رہی تھی۔ یہ سب ابھی اس نے پہنے بھی نہیں تھے۔ میری آنکھوں

میں نمی آگئی۔

نہ جانے اس وقت کس جذبے سے مغلوب ہو کر ماہم کا ایک ڈریس نکال کر پہن لیا۔ ازین مجھے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔

''یہ......'' الفاظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔

''اوہ......'' مجھے شرمندگی نے آگھیرا۔ یقیناً اس نے ماہم کے کپڑے پہچان لیے تھے۔ اسے ماہم کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی یاد تھی۔ ہوسکتا ہے یہ کپڑے اسی نے خریدے ہوں یا دونوں نے ساتھ خریدے ہوں۔

مجھے بری طرح خفت محسوس ہوئی۔

''دراصل، میں نے کافی عرصے سے کوئی شاپنگ نہیں کی۔'' میں نے گڑبڑا کر کہا۔

''اٹس آل رائٹ......'' مجھے لگا جیسے وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔

شادی ہال پر اترتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

''تم اگر بال ڈائی کروالو تو بالکل ماہم لگو گی۔''

بڑی مدت کے بعد میرا دل اپنے پرانے انداز میں دھڑکنے لگا۔

☆☆☆

''بیٹا دانیہ......! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔'' شام کو میں ابو کے کمرے میں گئی چائے لے کر تو انہوں نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بات شروع کی۔

''جی ابو......'' میں نے ان کی طرف دیکھا اور جب بھی ان کی طرف دیکھتی تھی میرا دل دکھ سے بھر جاتا تھا۔ میرے اتنے زندہ دل ابو بالکل مرجھا کر رہ گئے تھے۔

''بیٹا یہ بات تمہاری امی کے کرنے کی ہے......لیکن وہ جس جذباتی کرائسس میں ہیں۔'' ابو نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''میں سمجھتی ہوں ابو......'' میں نے ان کا مفہوم سمجھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا ماہم کی جدائی ہمارے لیے بہت بڑا صدمہ

ہے۔ اس کی کمی ہماری زندگی میں ہمیشہ رہے گی لیکن......“ ان کی آواز بھرا گئی۔ ”موت برحق ہے ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔“ انہوں نے چائے کے دو تین گھونٹ لیے۔

”شکریہ دانیہ بہت اچھی چائے بنائی ہے۔“ انہوں نے اپنے چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے کہا۔

”تو بیٹا میں سمجھتا ہوں کہ اب موو آن کا وقت آگیا ہے، ہمیں آگے بڑھنا ہوگا۔ اپنی، اپنی زندگیوں کی طرف...... خصوصاً تمہیں...... ازین کو...... فواد کو۔“ مجھے ہلکی سی کپکپی ہونے لگی۔

”ابو کیا کہنے والے ہیں...... کیا پھپو نے ان سے کچھ کہا ہے۔ اس موو آن کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا تعلق مجھ سے اور ازین سے ہے۔“

گزشتہ دنوں ازین ہمارے گھر پھر سے ریگولر آنے لگا تھا۔ امی، ابو کے ساتھ بیٹھتا، میرے اور فواد کے ساتھ وقت گزارتا۔ آنکھوں میں بسی مستقل اداسی کے باوجود کبھی کبھی مسکرانے بھی لگا تھا۔ یہ وہ گھر تھا جہاں قدم، قدم پر ماہم کی یادیں بکھری تھیں۔

”بیٹا گزشتہ سال بھی بہن مدیحہ نے اپنے بیٹے کے رشتے کی بات کی تھی۔ اس وقت شاید آپ تیار نہیں تھیں اب انہوں نے دوبارہ بات کی ہے۔ ان کے بیٹے کی شادی نہیں ہوئی اب تک۔ وہ اب بھی ہمارے گھرانے میں ہی انٹرسٹڈ ہیں۔“

”اُف......“ میں نہایت کوفت کا شکار ہوئی۔

”یہ آنٹی مدیحہ کہاں سے ٹپک پڑتی ہیں ہر بار۔“

”آپ دوبارہ اس پر سوچیں پھر اپنی امی کو جواب بتا دیجیے گا۔“ ابو نے کہا۔

”جی ابو۔“ میں نے فرمانبرداری سے کہا۔

☆☆☆

”دانیہ......“ امی نے میرے کمرے میں جھانکا۔ میں یوں ہی ایک کتاب لیے بیٹھی تھی لیکن میرا ذہن خالی تھا۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر امی کو دیکھا تو مجھے ان میں کچھ نیا پن محسوس ہوا۔ ماہم کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب امی کا چہرہ قدرے کھلا کھلا سا تھا۔ ان کی آنکھوں کی ویرانی میں بھی کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے لگا کہ امی کی خوشی کا سبب آنٹی مدیحہ ہیں، شاید امی کو لگتا تھا کہ اس بار میں ہاں کر دوں گی۔

”تمہارے ابو نے تم سے مدیحہ کے بیٹے والی بات کی ہوگی۔“ وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”اوہ...... تو گویا میں ٹھیک ہی سمجھی تھی۔“ میں نے سوچا۔

”انہوں نے یہ بات شاید تمہاری پھپو کو بھی بتا دی۔“

”پھر......؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ اب اس بات کا پھپو سے کیا تعلق تھا۔

”ارے......“ امی بے ساختہ ہنس پڑیں۔

”تمہاری پھپو اور پھوپا تو خفا ہی ہو گئے۔ فوراً دوڑے چلے آئے، ابھی ابھی گئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دانیہ تو ہماری بیٹی ہے، ماہم کے بعد آپ لوگوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم دانیہ کو کہیں اور جانے دیں گے۔ انہوں نے ازین کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔“

میرے چہرے پر پھیلتے رنگ امی کی نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔

”تم تو جانتی ہو، ازین ہمیں کتنا عزیز ہے، ہم نے ہمیشہ اسے اپنا ہی بیٹا سمجھا ہے، ماہم نہ رہی، اللہ کو یہی منظور تھا۔ ان کے لیے تم میں اور ماہم میں کوئی فرق نہیں۔“

”اور ازین......؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”بھئی...... اس کی مرضی کے خلاف وہ اتنا بڑا قدم کیسے اٹھا سکتے ہیں بلکہ اسی نے کہا ہے۔“ مجھے لگا میرے کمرے میں کہکشاں اتر آئی ہے۔

یہ سب قدرت کی طرف سے تھا۔ میں نے کبھی ان کا برا نہیں سوچا، نہ درمیان میں آنے کی کوشش کی، نہ کوئی گھٹیا چال چلی...... ماہم کا جانا مقدر میں تھا اور شاید ازین کا ساتھ میری تقدیر میں ہی لکھا تھا۔ اس میں کیا غلط تھا مجھے کسی نہ کسی سے شادی کرنی ہی تھی پھر

وہ ازین کیوں نہیں اور ازین کو کسی نہ کسی سے شادی کرنی ہی تھی پھر وہ میں کیوں نہیں...... میرا دل مطمئن تھا۔ میں نے اپنا سر تکیے پر رکھا اور سنہری سپنوں کے سمندر میں خود کو بہہ جانے دیا۔

☆☆☆

آج دس سال بعد میں وطن واپس آئی تھی۔ گھر کے سامنے رک کر میں نے گھر کو دیکھا اور بچپن سے لے کر شادی تک کے واقعات میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔

میری فیملی کے اندر داخل ہوتے ہی خوشگوار ہلچل مچ گئی۔ ہم دونوں اور ہمارے دو بچے...... ریان اور انعم...... فواد کی شادی تھی اور ڈھولکی رکھی جا چکی تھی۔

ہم دونوں لاؤنج میں لگے ماہم کے فل سائز...... پورٹریٹ کے آگے رک گئے۔

میں نے دیکھا دو اور لوگ بھی وہاں آکر رک گئے تھے۔

''دانیہ اپنی بہن کو ایک لمحہ بھی نہیں بھولتی۔'' فراز نے کہا۔

''ازین بھی اپنی اس کزن کا بہت ذکر کرتے ہیں۔'' الوینہ نے کہا۔

میں نے اور ازین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

جی ہاں، اس دس سال پہلے والی رات کی صبح اٹھ کر میں نے فیصلہ فراز کے حق میں دیا تھا۔ امی، ابو سے میں نے یہ ہی کہا تھا کہ میں نے ازین کو ہمیشہ ماہم کے حوالے سے دیکھا ہے۔ اسے کوئی اور حیثیت دینا میرے لیے مشکل ہے۔ اور یہ اس لیے کہا۔ کیونکہ ازین کے لیے ماہم کے بعد کسی کو ''وہ'' حیثیت دینا ممکن نہ تھا۔

فرق یہ تھا کہ ازین کی بیوی کوئی اور عورت ہوتی تو وہ اس بات سے ناواقف رہتی لیکن میں یہ بات کیسے بھول جاتی؟ میں ان کی محبت کی پل، پل کی گواہ تھی۔

اس رات میں بہت خوش تھی۔ مجھے نیند نہ آئی تو اٹھ کر بیٹھ گئی اور خود کو آئینے میں دیکھا۔

''اگر تم بال ڈائی کروا لو تو بالکل ماہم دکھو گی۔'' ازین کی آواز میرے کانوں میں گونجی...... یعنی وہ مجھ میں ماہم کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ کس کو دھوکا دیتا، مجھے یا خود کو...... میں نے اس رات ماہم کی الماری سے اس کے گفٹس، کارڈز سب نکال کر دیکھے، اس کے موبائل میسجز...... وہ جنون کی حد تک اس سے محبت کرتا تھا۔

اگر وہ مسلسل ماہم کی محبت میں مبتلا رہتا تو میری اپنی سگی بہن کے لیے محبت، رقابت اور پھر نفرت میں بدل جاتی۔

وہ مجھ سے محبت کرنے لگتا تو میں مشکوک ہی رہتی یا شاید اس دکھ میں مبتلا ہو جاتی کہ مرد کی محبت کتنی ناپائیدار ہے اس نے کیسے اتنے آرام سے ماہم کو بھلا دیا۔ وہی گھر، وہی فیملی، وہی ماحول، وہی سسرال...... ہم کبھی ماہم کے خیال سے دامن نہ بچا سکتے اور ایک دن ایسا آتا کہ میری اپنی سگی بہن اور ازین کی محبت ہمارے درمیان ایک تکلیف دہ موضوع اور وجۂ تنازع بن جاتی۔ فراز کی محبت نے میری ساری محرومیاں دور کردیں۔ ازین بھی اپنی بیوی الوینہ کے ساتھ خوش نظر آتا تھا۔ اس کے نزدیک ماہم، ازین کی کزن تھی جو عین جوانی میں یہ دنیا چھوڑ گئی تھی۔

میں نے دیکھا، ماہم کی تصویر کے آگے میں اور ازین کھڑے تھے۔ فراز کو بچے ڈھولکی کی رونق دکھانے گھسیٹ لے گئے تھے۔ الوینہ بھی شاید اس ہلے گلے میں چلی گئی تھی۔

ہم دونوں نے تصویر کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔

ازین کی آنکھوں میں جو نمی تھی اس کے لیے اسے مجھے کوئی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

میری آنکھ سے جو آنسو ٹپکا تھا وہ رقابت کا نہیں محبت کا تھا۔

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبداللہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماءے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ناولٹ

دوسرا حصہ

# من جانبازم

سحر ساجد

''کیسے مزاج ہیں اس پھولن دیوی کے؟''
رات کو کھانے کی میز پر ذوالفقار صاحب نے عنبرین سے پوچھا تھا۔
''میں نے تو صبح کی جنگ کے بعد اس کی کچھار میں قدم رکھنے کی غلطی نہیں کی...... آپ ہی ملاحظہ کریں اس کے مزاج......'' عنبرین کانوں کو ہاتھ لگانے والے انداز میں بولی تھیں۔
''روم فریج یقیناً خالی نہیں ہوگا جبھی راوی چین ہی

چین لکھ رہا ہے۔'' وہ کھانا نکالتے ہوئے بولے تھے۔

عنبرین بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔ یہ وہ ہی تھیں جنہوں نے اس کی بھوک ہڑتال کے زمانے میں بھی روم فریج کو خالی نہیں رہنے دیا تھا۔

''ویسے اسے یوں روتا دیکھ کر میں نے سوچا ہے کیوں نہ اسے ایک دفعہ اور موقع دیا جائے...... کیا ہے؟ اتنی لڑکیاں جوائن کر رہی ہیں اب آرمی...... ''عنبرین نے ان کے سامنے رکھے ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال کر ان کی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''بات ضد کی نہیں ہے عنبر...... بات یہ ہے کہ وہ نہیں کر سکتی...... وہ نہیں جانتی کہ وہ اس شوق کی اہل بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ اتنے نخروں اور نازکی سے پلی ہے۔ سولہ سال کی عادتیں چند سالوں میں نہیں بدلتیں...... وہ بھاگ کر آجائے گی لکھوا لو مجھ سے۔''

''بھاگ کر آنے کو ہی.... اسے یہ موقع تو دیں......'' اب کہ وہ کھانے سے ہاتھ روک کر بولی تھیں۔

اس بات پر انہوں نے بھی رک کر بیوی کو دیکھا تھا۔

''رہ لو گی اس کے بغیر...... سچی بات ہے مجھ سے تو نہیں رہا جاتا۔''

''مگر وہ......''

''چلو دیکھتے ہیں۔'' وہ ان کی بات کاٹ کر بولے تھے۔

''پتا نہیں غصے کے معاملے میں یہ لڑکی کس پر چلی گئی ہے...... ہماری فیملی کا تو کہیں سے بھی اور کوئی بھی سلسلۂ نسب پھولن دیوی سے جا کر نہیں ملتا......'' وہ سر جھٹک کر ذرا سی خفگی سے کہہ رہی تھیں اور اس بات پر...

ذوالفقار صاحب نے بے اختیار قہقہہ لگایا تھا...... وہ خود بھی مسکرا دی تھیں مگر...... مگر اگلے ہی لمحے ان کی مسکراہٹ ایک آواز سے فوراً غائب ہوئی تھی۔

''کرلیں...... کرلیں...... دونوں مل کر میری غیبتیں...... میرے ہی گناہ معاف ہوں گے۔ خود یہاں دونوں کتنے مزے سے کھانا کھا رہے ہیں اور میرا کوئی خیال ہی نہیں۔'' غصے سے بھرا لہجہ ہمیشہ کی طرح آنسوؤں سے بھرائی آواز پہ ختم ہوا تھا اور وہ شوں شوں کرتی...... پاؤں پٹختی کمرے کی طرف بھاگ گئی تھی۔

''یہ کب نازل ہوئی؟'' ان دونوں نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر دونوں کے تاثرات ہی بیچارگی میں بدل گئے تھے۔

کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا اس کا...... ایسا ڈیفالٹڈ پیس تھی وہ...... اور پھر وہ دونوں گہری سانس بھر کر پھر سے کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے یہ تو روز کا معمول تھا...... اس کے لیے اب بھوکا تھوڑی رہا جا سکتا تھا۔

☆☆☆

ان دونوں کی ہر بات جہازوں سے شروع ہو کر PAF پر ختم ہوتی تھی...... وہ جاگتی آنکھوں سے اس دن کا خواب دیکھا کرتے تھے کہ جس دن وہ PAF رسالپور میں ہوں گے۔

سعد مجیب عالم...... اسے آپ موی کی ایکسٹینشن سمجھیے...... بس یہ کہ وہ لڑکا تھا...... جنون وہ تھا کہ دیوانگی کی حدوں سے پار ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ وہ موی کی طرح اسکیچ بناتا تھا...... نہ ہی ریموٹ سے ایرو پلینز اڑاتا تھا۔

لڑکے پیدائشی انجینئر ہوتے ہیں...... سو سعد مجیب عالم بھی تھا۔ شروعات کاغذ کے جہازوں سے ہوئی تھی...... سعد کو بس کوئی نہ کوئی کاغذ چاہیے ہوتا تھا...... پرانے اخبار، پرانی ہوم ورک کی نوٹس بکس غرض ہر وہ کاغذی چیز جس کا جہاز بنایا جا سکے سعد مجیب عالم کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکی تھی...... اسکول سے آنے کے بعد جب گل ان دونوں کو سلانے کے لیے بھیجتی تھیں کہ شام میں ان کے ٹیوٹر نے آنا ہوتا تھا...... تو سعد چپکے سے لان میں نکل کر آیا کرتا تھا اور بس پھر...... کاغذ ہوتے اور ان کے جہاز بنتے چلے جاتے۔

شروع، شروع میں اس کے کاغذی جہاز بھی دور تک اڑ نہیں پاتے...... نوک کے بل زمین پر گر جاتے تھے۔

''اوہ...... یہ بھی کریش ہو گیا......''

وہ کہتا...... مگر اس کے کہنے میں افسوس کا عنصر

ہرگز شامل نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات جیسے bult in تھی کہ ایک دن وہ اس طرح کا کاغذ کا جہاز بنائے گا جو کہ نوک کے بل زمین پر نہیں گرے گا۔ وہ ایک لمبی مستی بھری اڑان بھرتا ہوا بحفاظت لینڈ کرے گا۔ اور یہ جنون تھا کہ اسے ایسا کاغذی جہاز بنا کر اڑانا تھا جو کہ صحیح طرح سے اڑتا...... اِک مستی بھری اڑان بھرتا...... دوپہر کا سونے کا وقت ہوتا اور سعد کے جاگنے کا۔ دنیا بھر کے ردی کے کاغذ ہوتے اور اس کے دو چھوٹے، چھوٹے ہاتھ...... کاغذ، جہاز بنتے، اڑتے کوئی اس کے عین قدموں کے پاس ہی گر جاتا...... کوئی ذرا سا آگے جا کر بے ڈول ہو کر گر پڑتا۔ کوئی دائیں، کوئی بائیں۔

ہاتھ نئے سے نیا جہاز بناتے جاتے اور اڑاتے جاتے اور گھر کا لان کاغذی جہازوں سے بجتا چلا جاتا۔ اور جب اسے معلوم ہوتا کہ اب ممی جگانے آئیں گی تو اس وقت سے ذرا سا پہلے وہ سارے کاغذی جہازوں کو لان سے اٹھاتا اور ڈسٹ بن میں ڈال دیتا اور پھر خاموشی سے آ کر اپنے بیڈ پر لیٹ جاتا۔

☆☆☆

پھر وہ دن بھی آیا جب ایک یونیورسٹی میں space week کا اعلان ہوا اور اس میں راولپنڈی اور اسلام آباد کے مختلف اسکولز نے حصہ لیا۔ ایک اسکول نے paper plane competition میں حصہ لیا تھا۔ وہ مقابلہ ایک سات سالہ بچے نے جیتا تھا۔ اس کا جہاز دور تک اور اِک مستی بھری اڑان بھرتا ہوا اڑا تھا۔ وہ بچہ کوئی اور نہیں یقیناً "سعد مجیب عالم" ہی تھا۔

وہ ہی سعد مجیب عالم جو بچپن سے ہی دوپہر کے سونے کے ٹائم پر ردی کاغذوں سے جہاز بنایا کرتا تھا۔ مزید یہ کہ ان دونوں بہن، بھائیوں کو کالونی کے لین میں آئس کریم بیچنے والے سے آئس کریم لے کر کھانے کی عادت تھی۔ مومی آئس کریم اسٹکس پھینک دیتی تھی جبکہ سعد وہ تو تھا ہی پیدائشی انجینئر...... ایک دن آئس کریم اسٹک پھینکنے سے پہلے اس کے ذہن میں یک دم کوئی خیال آیا تھا...... اس نے اسٹک کو آنکھوں کے قریب لے جا کر دیکھا اور پھر ذرا دور لے جا کر...... اور پھر اس نے شہادت کی انگلی کو اسٹک کے آخری اوپری سرے سے ذرا نیچے رکھ کر دیکھا۔ انگلی ہٹائی...... پھر رکھی...... پھر ہٹائی اور ایک دفعہ پھر سے رکھی۔

"یا میرے خدا...... وہ تو جہاز جیسی دکھ رہی تھی۔" اور بس...... اسی دن سے اس نے اسٹکس جمع کرنا شروع کر دی تھیں۔ کاغذ کے جہازوں کا دور ختم ہوا...... اسٹکس کے جہاز بننے لگے...... صلیب کے نشان جیسے جہاز...... دو آئس کریم اسٹکس کو جوڑ کر بنائے گئے جہاز......

ذرا اور بڑا ہوا تو ویڈیو گیمز کا چسکا پڑ گیا...... اور اب وہ دوپہر کے ٹائم میں ویڈیو گیمز کھیلتا تھا، ممی سے چھپ کر نہیں...... ان کے سامنے ہی...... ڈانٹ کھاتے ہوئے مگر یہ جو جنون ہوتا ہے ناں...... یہ انسان کو نیم پاگل بنا ڈالتا ہے۔

"ڈانٹ" اس جنون کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی جو جنون خون کے اندر دوڑتا تھا اور سعد مجیب عالم کو اکساتا تھا۔

"ہاں، ہاں تمہیں جہاز اڑانا ہے۔" مگر...... اس دن تک انتظار کون کرے...... کہ کب وہ دن آئے اور وہ PAF کا جنگجو جہاز اڑا سکے۔ اور جب پاکستان ڈے پریڈ ہو تو وہ شیر دل فارمیشن کا حصہ ہو۔ کون کرے اتنا لمبا انتظار...... وہ ویڈیو گیمز کھیلتا، جہاز اڑاتا اور اس حس کی تسکین کرتا جو کہ اسے جنونی بناتی تھی...... اس کے ہاتھ بے تاب تھے۔ F-16 کے اسٹیئرنگ کو تھامنے کے لیے۔

☆☆☆

"ٹھک ٹھک ٹھک......" دروازے پر بہت ہلکی سی مگر متواتر دستک ہوئی۔

ہنیا نے غصے سے بھری ایک تیز لیزر شعاعوں جیسی نظر دروازے پر ڈالی تھی۔ یوں جیسے اس کی نظر

دروازے میں ضرور ہی سوراخ کرے گی اور ضرور ہی دوسری طرف موجود شخصیت کو تباہ کر کے لگے گی۔

اس کے گھر میں تیسری وہ تھی اور چوتھا اور کوئی نہیں...... وہ جانتی تھی کہ پہلی دو شخصیات میں سے ہی کوئی ایک باہر دروازے پر موجود ہے۔ امی کو پھر مارجن دے دیتی تھی وہ مگر ابو...... نہ جی آج کل سخت دشمنی کے دن تھے۔

دروازے پر ایک دفعہ پھر دستک ہوئی...... مدھم تواتر کے ساتھ۔

ہنیا نے ایک دفعہ پھر لال سرخ آنکھوں سے لیزر جیسی نظر ڈالی اور پھر ہینڈل آہستگی سے نیچے ہوا۔

اس سے پہلے کہ دروازہ کھلتا...... وہ برق رفتاری بلکہ چیتا رفتاری سے اٹھی اور بھاگ کر دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی جسے ہنیا نے پشت کے بل زور لگا کر ناکام بنا دیا تھا۔ ایک دفعہ پھر سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اب کی ذرا پہلے سے زیادہ زور لگایا گیا۔ ایک دفعہ پھر سے...... ہنیا کی طرف سے اسے ناکام بنایا گیا مگر اب کہ اس نے نہایت غصے کے ساتھ کمر کو دروازے سے ٹکراتے ہوئے دروازہ بند کر دیا تھا۔

ذوالفقار صاحب چاہتے تو...... ہنیا کا زور ان کے زور کے آگے ٹھنڈا پڑ جاتا...... مگر وہ تو صرف اسے بہلا رہے تھے۔

”ہنیا...... میرا بچہ، دروازہ کھولو ناں......“ اب کے اسے بری طرح سے پچکارا گیا۔

”نہیں ہوں میں آپ کا بچہ......“ غصے سے مگر بھرائی آواز میں جواب دیا گیا۔

”آ آ آ...... ہنیا...... ایسے بولتے ہیں ابو کے ساتھ؟“ عجیب شرمندگی کا احساس دلاتا ہوا لہجہ تھا۔

اور وہ ہو بھی گئی...... مگر ڈھیٹ بن گئی۔

”آ آ آ...... ابو...... ایسے کرتے ہیں اپنے بچے کے ساتھ۔“ ویسا ہی شرمندگی کا احساس دلاتا ہوا لہجہ...... مگر ابو ذرا بھی نہیں ہوئے۔

”تو جانی میں نے جو کیا سو کیا...... مانا میں نے مگر آپ کو بھی تو اپنی تیاری رکھنی چاہیے تھی ناں...... آپ کو تو معلوم تھا کہ میں نے بالآخر مان ہی جانا ہے۔ آج سے پہلے کون سی بات ٹالی ہے آپ کی۔“ اور بس وہ جو ان کی بات کے دوران بھرتی جا رہی تھی۔

”یعنی کہ آپ کہنا چاہتے ہیں کہ سارا قصور میرا ہے۔“ دروازہ کھول کر وہ پھٹ پڑی۔

”نہیں میرا ہے۔“ ابو نے بڑے جذب سے کہا۔ دروازہ کھلوانا تھا سو کھلا گیا تھا۔ اس نے پھر سے انہیں لیزر جیسی نظروں سے گھورا۔

”آ آ آ آپ......“ ہمیشہ کی طرح آنسو......

”اچھا...... بس کرو ناں جانی...... اب بس کرو...... سنو تو سہی میں کہنے کیا آیا ہوں۔“ بڑے دلار سے اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتے ہوئے انہوں نے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

اس نے بچوں کی طرح منہ بسورا۔

”اچھا بات تو سنو ناں بیٹا......“ انہوں نے بچوں کی ہی طرح اسے بہلایا تھا۔ اور یوں ہی بہلاتے، پچکارتے اسے بیڈ روم کے اندر لے آئے تھے۔ اسے بیڈ پر بٹھا کر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئے تھے...... ذوالفقار صاحب نے اپنا بازو اس کے شانوں کے گرد پھیلاتے ہوئے بڑے پیار سے اسے دیکھا تھا اور ہنیا نے ایک لمبی سے شوں کر کے آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے۔ قدرے ناراضی سے انہیں دیکھا تھا۔

”بس بھی کرو ناں بیٹا......“ ایک دفعہ پھر سے پچکارا گیا۔

وہ بات کرنے سے پہلے تمام تر ناراضی ختم کرنا چاہتے تھے تاکہ وہ ان کی بات کو سمجھ سکے۔

اتنے پچکارنے پہ اس نے منہ بنا کر نظریں جھکا لی تھیں یعنی...... اب سگنل گرین تھا۔ بات کی جا سکتی تھی۔

ذوالفقار صاحب کو ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔

”میرا بچہ......“ انہوں نے پیار سے اس کا سر

چوما تھا اور ہنیا نے لاڈ سے سر ان کے کندھے پر ٹکایا تھا۔ دونوں باپ بیٹی اپنی، اپنی بات منوانے کے چکروں میں تھے۔

"ہنیا تم میری اکلوتی اولاد ہو۔"

"اور آپ میرے اکلوتے ماں باپ ہیں۔" اس نے چڑ کر کہا۔ خواہ مخواہ میں بلیک میل نہیں ہوتی تھی وہ۔ ابو بے ساختہ ہنس پڑے۔

"اچھا ناں..... بی سیریس....." اس کے گھورنے ..... پر وہ بولے تھے۔ "تم کیڈٹ کالج جانا چاہتی ہو..... ٹھیک ہے جاؤ، ٹیسٹ کی تیاری کرو۔ پاس ہو اور جوائن کرو۔ مگر ہنیا اس سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتادوں کہ تم اس کی اہل نہیں ہو، بات کو سمجھو بیٹا..... تم میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔ جس طرح سے میں نے تم کو پالا ہے اور جیسی تمہاری فطرت ہے، تم یہ نہیں کر پاؤ گی بچے۔ بہت مشکل ہے سوچو اگر تم وہاں سے بھاگ کر آگئیں تو سارا خاندان کیا کہے گا تمہیں؟ بھگوڑی....." ہنیا خاموشی سے انہیں سنتی رہی۔

"ابو..... میں نازک مزاج ہوں، میں جانتی ہوں..... مگر ابو..... یہ جو شوق ہوتا ہے ناں یہ بندے میں سے ساری حیا نکال کر باہر پھینک دیتا ہے۔ بس پھر "شوق" ہی بچتا ہے..... مجھے جانے دیں..... ایک دفعہ تو آزمانے دیں..... مجھے خود سے تجربہ کر کے دیکھنے دیں کہ میں یہ کر سکتی ہوں کہ نہیں..... آپ نے ٹیسٹ کو ہی ایشو بنالیا....." اور پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

"آئی ایم سوری بیٹا....." ابو اس کا سر تھپکتے ہوئے بولے تھے۔

"ڈونٹ بی۔" (don ,t be) اسی بھرائی آواز میں شوں شوں کرتے ہوئے کہا گیا تھا۔

"غلطی میری بھی تو تھی۔ مجھے تیاری کرنی چاہیے تھی۔"

"یہ سال ضائع کر کے ایک اور غلطی کرو گی تم لکھوالو۔" وہ باز نہیں آئے تھے چھیڑنے سے۔

"کرنے دیں ہاں مجھے، میری زندگی، میرا سال، آپ کو کیا ہے؟" وہ خواہ مخواہ میں تپی ہوئی تھی۔

"چلو اگر تم کامیاب نہ ہوئیں، جو کہ تم نے ہونا کوئی نہیں..... تو تب میں تمہاری شادی کسی آرمی والے سے کروادوں گا۔" انہوں نے جان بوجھ کر پھر سے چھیڑا..... اور وہ چڑ گئی تھی۔

"ابو....." وہ ٹھنکی (جیسے فوجی میرے دروازے کے باہر کھڑا ہے ناں اس نے ٹھنک کر سوچا۔)

"اس طرح بددعائیں دیں گے تو خاک کامیاب ہوں گی۔ دعا کیا کریں، نفلیں پڑھ کر میرے لیے۔"

"بس آرمی والے سے شادی کروادوں گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" اسے سخت تپ چڑھی تھی۔

"ہاہاہا....." اور ذوالفقار صاحب ہنستے چلے جارہے تھے۔ بعض اوقات اچھی بھلی جوان اولاد ویسا ہی بچہ بن جاتی ہے جو آگ کو کھیلنے کی چیز سمجھ کر بار، بار اس کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔ ماں جانتی ہے کہ یہ آگ ہے، بچہ نہیں جانتا..... نہ سمجھتا ہے..... تو محض اس کے جاننے کے واسطے ماں کو اس کا ہاتھ آگ کے قریب لے جا کر بتانا پڑتا ہے کہ "بیٹا یہ آگ ہے..... اور یہ جلاتی ہے۔" پھر وہ یہ سبق ساری عمر نہیں بھولتا۔ کہ وہ آگ تھی اور اس نے جلایا بھی تھا۔

☆☆☆

حبیب عالم کی شادی تھی، مہندی کا فنکشن تھا اور وہ منہ بنائے بیٹھی تھی۔ جہازوں کے بعد اگر مومنہ کو کوئی شوق تھا تو وہ چوڑیوں کا تھا..... کانچ کی چوڑیاں، ہر لباس کے ساتھ میچنگ چوڑیاں..... چاہے وہ گھر میں پہننا ہو یا کسی فنکشن میں پہن کے جانا ہو کچھ اور ہو نہ ہو..... میچنگ چوڑیاں ضرور ہونی چاہئیں۔ اب بھی وہ اورنج کلر کے لباس میں منہ بنائے بیٹھی تھی کہ..... اورنج کلر کی چوڑیاں بازیاب نہیں ہوسکی تھیں..... اس کے چوڑیوں کے اسٹاک میں سے۔

"عین ٹائم پہ منہ بنا کر بیٹھنے کا فائدہ..... پہلے بتادیتیں تو دلوادیتی ناں میں۔ اب میچنگ چوڑیاں نہ ہونے کی وجہ سے کوئی تمہیں فنکشن سے نکال باہر کرنے سے تو رہا۔" گل آرام سے اسے

سمجھا رہی تھیں، مومنہ نے نظریں بچا کر باپ کو دیکھا کہ وہ اس کی "ہر امید" تھے۔

"چوڑیاں چاہئیں؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

جواب دینے کے بجائے موی نے ماں کو دیکھا تھا۔

"لے جائیں...... ورنہ اس کا موڈ خراب ہی رہنا ہے۔" گل کہتے ہوئے اٹھی تھیں۔ معصوم موی کے چہرے پر مسکراہٹ ...... چمک کر پھیلی تھی۔ گولڈن اور اورنج کلر کا فینسی لباس، سادہ چہرہ...... شانوں پر پھیلا دوپٹا اور دونوں کلائیوں میں یہ بھر بھر کر اورنج اور گولڈن کلر کی چوڑیاں...... یہ تھی مومنہ مجیب عالم اور یہ تھی اس کی تیاری...... مجیب عالم اسے بازار لے کر گئے، چوڑیاں دلوائیں اور پھر وہ فنکشن کے لیے نکلے تھے۔

PAF اس کا جنون تھا۔ اور چوڑیاں اس کے لڑکی ہونے کا ثبوت...... بھلے اور کوئی بات لڑکیوں والی ہو نہ ہو...... یہ ضرور تھی۔ چوڑیاں رنگ برنگی...... زندگی کے رنگوں سے بھی چوڑیاں...... اور ان چوڑیوں سے بھی مومنہ مجیب عالم......

☆☆☆

مجیب عالم نے اپنی ایک قد آدم فوٹو فریم کروائی تھی۔ وہ اسے لاؤنج میں لگانا چاہتے تھے مگر مومنہ بضد تھی کہ اسے اس کے کمرے میں لگایا جائے۔

"مومنہ! تمہارے کمرے کی کوئی دیوار خالی ہے جو اسے وہاں لگایا جائے؟" گل چڑ کر بولی تھیں۔

"موی...... یہیں لگانے دو...... میرا خیال ہے یہیں اچھی لگے گی۔" مجیب عالم نے کہا تھا۔

"لگا دیں......" گو کہ وہ راضی نہیں تھی...... مگر مان گئی تھی۔ اس طرح سے وہ قد آور تصویر لاؤنج کا حصہ بن گئی تھی۔

جس میں مجیب عالم PAF کی مخصوص dangri پہنے بلیک گاگلز لگائے ہونٹوں پر ایک خوب صورت مسکراہٹ لیے...... 130 کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کا بایاں ہاتھ C-130 کے اوپر تھا اور دوسرا ہاتھ پاکٹ میں تھا۔

وہ تصویر بے حد اچھی تھی...... دور سے ہی اپنی خوب صورتی بیان کرتی تھی۔

موی صبح شام...... کالج آتے جاتے اسے دیکھ، دیکھ کر جیتی یوں جیسے وہ تصویر آکسیجن فراہم کرنے کا کوئی منبع ہو...... اگر وہ صوفے پہ بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے کچھ کھا رہی ہے اور یک دم تصویر پہ نظر پڑ گئی ہے تو...... وہ اس تصویر کو ہی دیکھے جائے گی...... مگن اور بے اختیار ہو کر...... وہ بھول جاتی تھی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے تک وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی اور کچھ کھا رہی تھی۔

حسن وہاں تصویر میں تھا مگر جنون ان آنکھوں میں تھا جو کہ منہمک ہو کر اسے دیکھتی تھیں۔ وہ باپ تھا، وہ خواب بھی تھا، محبت صرف باپ سے ہی نہیں تھی۔ وہ اس لباس (ڈانگری) سے بھی تھی جو کہ اس کے باپ نے زیب تن کر رکھا تھا۔

وہ تصویر...... تصویر نہیں تھی، وہ عنوان تھی۔ مومنہ مجیب عالم کے خواب کا، سعد کا اظہار موی کی طرح نہیں ہوا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس تصویر کو دیکھ کر کہا کرتا تھا۔

"میں بھی بابا جیسا بنوں گا...... ایسے ہی کپڑے پہنوں گا اور یوں ہی گاگلز پہن کر تصویر کھنچواؤں گا۔ اور پھر وہ باپ کے سے پوز میں کھڑے ہو کر دکھاتا...... اکثر بچوں کو باپ جیسا بننے کا شوق ہوتا ہے مگر وہ دونوں بہن، بھائی...... شوق کا لفظ ان کے لیے کم تھا اور جنون کا لفظ ان دونوں پہ پورا اترتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔

فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی!

☆☆☆

بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ گرج رہے تھے، بجلی کڑک رہی تھی۔ آندھی کے جھکڑ درختوں کو دہرے ہو جانے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ طوفان تھا۔ گل سارے گھر کی کھڑکیاں، دروازے بند کر رہی تھیں اور جب وہ لاؤنج کا دروازہ بند کرنے آئیں تو موی کو یوں لان میں، مٹی پہ بے حس انداز میں بیٹھا دیکھ کر بری طرح چونکی تھیں۔

"مومی ......" لب بے آواز ہلے تھے اور دوسری نظر بے ساختہ اوپر کو اٹھی تھی۔ چند دنوں بعد اس کے فائنل ایگزامز تھے اور وہ یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھی؟ اسی اثنا میں بجلی بھرپور شدت سے کڑکی اور گل دہل کر رہ گئیں اور وہ مومی...... وہ اسی طرح سے اپنے آپ میں مگن بیٹھی رہی...... ہوا کے تھپیڑے ایسے تھے کہ وجود کو دھکیلتے تھے۔ گل ان تھپیڑوں سے بچتی، بچاتی اس تک آئیں۔

"مومی! اٹھو بیٹا...... یہاں کیوں اس طرح بیٹھی ہو، دیکھتی نہیں کتنا طوفان ہے؟" اسے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے وہ بولی تھیں۔ مومی ہلی تک نہیں تھی۔

"مومی...... ! اٹھو ناں......" اب کہ انہوں نے زور دے کر اسے اٹھایا...... انہیں حقیقت میں اس خراب موسم سے خوف محسوس ہو رہا تھا اور وہ...... وہ سارے خوف جانے کدھر رکھ آئی تھی۔ کدھر بھول آئی تھی۔

"مومی اٹھ جاؤ...... اور جاؤ جا کر ایگزامز کی تیاری کرو۔ کیوں یہاں بیٹھ کر ٹائم ویسٹ کرتی ہو۔" گل نے اسے اب کی بری طرح ڈپٹا تھا۔ اس نے ہلنا تھا یا نہیں ان کی اس بات پر وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے ان کی آنکھوں میں عجیب سے انداز میں دیکھتی رہی تھی اور بجلی کڑکی تھی کہ بپھری ہوا درختوں کی کمر پہ ضربیں لگاتی تھی۔ بادل زور، زور سے گرجتے تھے۔ اس نے ماں کو کندھوں سے پکڑا...... اپنا چہرہ ان کے منہ کے قریب لائی۔

"مجھے کوئی ایگزام نہیں دینا...... سنا آپ نے۔"

وہ چیخی تھی گل کو بجلی کی کڑک بھول گئی۔ وہ شاکڈ ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"مومی تمہیں تو پائلٹ ......" مری ہوئی آواز میں محض آدھا جملہ ہی منہ سے ادا ہو سکا تھا۔

"نہیں بننا مجھے پائلٹ۔" اب وہ دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر حلق پھاڑ کر بولی تھی اور...... اور بجلی عین اسی وقت اتنی شدت سے کڑکی کہ پہلے یوں کبھی نہ کڑکی تھی۔ اتنے شور کے باوجود وہاں سناٹا سا چھا گیا تھا...... گہرا سناٹا اور اس سناٹے میں ایک ہی آواز گھوم پھر کر کسی بدروح کی طرح چکرا رہی تھی۔

"نہیں بننا مجھے پائلٹ...... پائلٹ، پائلٹ......" اور بدمست تیز ہوا ان دو ساکت کھڑے وجودوں کے ساتھ سر پٹختی تھی تو کیا اس نے خود کو برباد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟

☆☆☆

سال 2001ء موسم گرما۔ آج بارش کی پیش گوئی تھی۔ زندگی اپنے معمول پہ رواں دواں تھی۔ ایسے میں اوپر آسمان پر اک شور سا بلند ہوا۔ کاک پل کے آسمان کے اوپر وہاں کے باسی اس شور پر سر اٹھا کر آسمان کو دیکھنے پر مجبور ہوئے تھے...... اور جب انہوں نے گردنیں اٹھا کر آسمان کی جانب نگاہ کی تو انہوں نے بھلا کیا دیکھا۔

وہ ایک طیارہ تھا کہ جس کا انجن بے حد شور کر رہا تھا اور طیارہ دائیں، بائیں جیسے ڈول رہا تھا۔ پوری فضا گڑگڑا رہی تھی، لرز رہی تھی اور اسی پُر شور گڑگڑاہٹ نے وہاں کے باسیوں کو سر اٹھا کر اس آواز کی سمت دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔

"مگر آج تو بارش کی پیش گوئی تھی۔"

ایک طیارہ جو زمین کی طرف چلا آ رہا تھا اور اب زمینی سطح سے اتنے فٹ کی دوری پر تھا کہ طیارے کے vertical stabilizer پہ موجود سبز جھنڈے کو بآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ منظر اگرچہ ان باسیوں کے لیے نیا نہیں تھا، وہ ایسے کئی مناظر دیکھنے کے عادی تھے۔ یوں نیچی پرواز کرتے ہوئے مختلف ائر لائنز کے طیارے، فوجی طیارے، ہیلی کاپٹرز۔

یہ اسلام آباد ائر پورٹ کے قریب کا علاقہ تھا اور وہ ان تمام آوازوں اور ان آوازوں کے شور سے ناآشنا ہرگز نہیں تھے مگر اس طیارے کی حالت نے انہیں معمول سے ہٹ کر چونکایا تھا۔

طیارہ سیدھا زمین کی طرف آ رہا تھا اور اس کے انجن میں...... آگ بھڑک چکی تھی۔

وہ بے ڈول جیسے فری فال زمین کی طرف آ رہا تھا۔ فضا کی خوفناک گڑگڑاہٹ کے بعد جس چیز سے ٹوٹی

تھی وہ لوگوں کی چیخیں تھیں...... آوازیں، بے ہنگم شور...... آہ و بکا...... افراتفری کا عالم...... بھاگ دوڑیوں جیسے وہ لوگ آسمان کی وسعتوں اور زمین کی حدود سے نکل جانا چاہتے ہوں اور وہاں پناہ لینا چاہتے ہوں کہ جہاں سر پر کم از کم ایسا آسمان نہ ہو......طیارہ تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آرہا تھا اور......اور لوگ مسلسل چیخ رہے تھے، بھاگ رہے تھے، پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ کششِ ثقل کے اصول کے مطابق طیارہ سیدھا زمین کی طرف چلا آرہا تھا اور چند لمحوں بعد اسے زمین سے ٹکرا کر نیست و نابود ہو جانا تھا کہ یکا یک...... اچانک ایک غیر معمولی بات وقوع پزیر ہوئی نیچے بہت سی جانیں تھیں، رہائشی آبادی تھی اور اوپر، اوپر اس طیارے میں دو جانیں، دو لوگ اور بس......مگر آج تو بارش کی پیش گوئی تھی، آگ کی نہیں پھر عجب ہوا مگر یہ عجب تو ہوتا ہی آیا ہے کہ جب، جب سامنے عوام ہوں تو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر عوام کو بچانا ہی فوجی کا عزم ہوتا ہے۔ طیارہ جب عین آبادی کے اوپر تھا وہ فری فال کی پوزیشن سے نکلا، سنبھلا اس طرح کہ پھر بھی بے ڈول دکھتا تھا۔ پائلٹ اسے دوبارہ اوپر لے جانے کی کوششوں میں تھا یا پھر... کم از کم فضا میں ہی رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے زمین پر گرنے نہیں دینا چاہتا تھا اور جیسے ہی طیارہ ذرا سا، تھوڑا سا اوپر ہوا محض چند فٹ اور اوپر تو......تو اِک زبردست دھماکا......اِک زوردار گونج کی سی آواز سے آگ کا منبع اِک دھماکے کے ساتھ دائرے کی صورت پھیلا سب کچھ اِک لمحے کے لیے حالتِ سکون میں آیا اور پھر......طیارے کے پرزے...... آگ لگے پرزے بے شمار چھوٹے، چھوٹے بھی اور بڑے، بڑے بھی ذرات کی طرح بے توازن ہو کر...... تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگے......فری فال یوں جیسے دوزخ کا منہ کھول کر اسے زمین والوں پر الٹ دیا گیا ہو۔ جیسے کسی بھڑ بھڑ جلتی لکڑیوں والے تندور کو پیندے سے پکڑ کر اوندھا کر دیا گیا ہو اور جیسے، جیسے وہ آسمان، آسمان نہ رہا ہو۔ اِک دہکتا الاؤ بن چکا ہو۔

آج، آج تو بارش نے برسنا تھا تو پھر یہ کیا تھا جو برسا تھا......؟ کیا تھا جو برسا......؟ ایسی کوئی پیش گوئی تھی کیا؟ بھڑکتے، جلتے، دہکتے، شہاب ثاقب سے ٹکڑے تیزی کے ساتھ زمین کی طرف آرہے تھے اور زمین والے کہ جن کے سروں کے عین اوپر آگ اپنا رقص پیش کرتی تھی......وہ عجب مخبوط الحواسی اور نفسا نفسی کے عالم میں بھاگ دوڑ رہے تھے کہ دفعتاً وہ سب دہکتے، جلتے، بھڑکتے شہاب ثاقب سے ٹکڑے زمین کے ساتھ اِک گونج دار آواز سے آن ٹکرائے تھے۔ کچھ کھلی زمین پر گرے، بچت ہوئی۔ کچھ فصلوں پر گرے پھر بھی بچت ہی تھی۔ کچھ نالے میں گرے اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ کچھ نے بربادی کا تھوڑا سا سامان کیا اور وہ رہائشی آباد کے مکانات پر جا گرے۔ شور ذرا اور برپا ہوا......افراتفری آہ و بکا......چیخیں۔

آگ، آگ، آگ......

جلنے والی اور جلا دینے والی۔

جلا کر بھسم، راکھ کر دینے والی۔

وہ جلی اور اس نے جلایا بھی اور پھر......

دھواں، دھواں سیاہ کالا دھواں......

فضا میں جلنے کی بو تھی، جو کبھی نہ ختم ہونے کے لیے رچ بس چکی تھی فضا میں مگر اس جلنے کی بو میں جسموں کے جلنے کی بو نہ تھی۔ اتنے سارے جمادات کے جلنے میں حیات کے جلنے کی بو کیسے آتی تھی ہاں...... کیسے آتی تھی؟ کیسے سونگھتا کوئی، اتنے کل پرزہ جات میں، جسم کے جلنے کی چراند......مگر، مگر سوال یہ کہ کیا ان کے جسم اس قابل رہے تھے کہ وہ جلتے......اس دھماکے میں طیارہ...... ایلومینیم باڈی پرزے، پرزے ہو کر بکھرا تھا تو جسم......؟؟ آگ کے ٹکڑے، چھوٹے، بڑے اب بھی گر رہے تھے، برس رہے تھے، لوگ چیخ رہے تھے، رو رہے تھے، پناہ مانگ رہے تھے، کچھ... سویلینز زخمی ہوئے مگر جانی نقصان......

وہ زمین پر نہیں ہوا تھا، وہ تو اوپر ہی اوپر آسمان و زمین کے درمیان شاید بس ہو چکا تھا اب تو بس آگ برستی تھی، دھواں پھیل، پھیل جاتا تھا۔ مگر آج تو بارش

نے برسنا تھا... مگر یہ کیا تھا جو برسا تھا۔

☆☆☆

زندگی روانی سے بہتی تھی، ہر کوئی اپنے، اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھا۔ ایسے میں اِک خبر بریکنگ نیوز کے طور پر دن 1.00 بجے چلی تھی۔ کچھ ملا جلا سا ردِعمل آیا...... افسوس کا اظہار ہوا اور پاکستان کی اٹھارہ کروڑ عوام کی زندگی بِنا کسی تعطل کے پھر سے چلنے لگی تھی مگر ٹھہریئے...... ان اٹھارہ کروڑ عوام میں سے آپ تین نفوس نکال دیجیے...... ہاں باقی لوگوں کی زندگی چل رہی تھی، دوڑ رہی تھی یوں کہ جیسے اسے کبھی رکنا ہی نہیں اور وہ تین نفوس...... مسز مجیب عالم بھی کچن میں تھیں...... وہ بھی اپنے سعد کے لیے کھانا بنا رہی تھیں کہ وہ بھی ذرا بھوک کا کچا تھا۔ ان کے گھر کے لاؤنج میں بھی ٹی وی چل رہا تھا۔ وہ بھی ائر کریش کی خبر سن کر بے اختیار کچن سے نکلی تھیں۔ ہاتھ میں چمچ لیے ہوئے ذرا ٹھہر کر خبر سنی اور چمچ ان کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ ہائے کہہ سکیں اور نہ ہی افسوس کا اظہار ہو سکا تھا۔ وہ PAF کا C-130 طیارہ بتایا جا رہا تھا اور ان کا ایک منٹ میں 72 بار دھڑکنے والا دل اس ایک منٹ میں 172 بار دھڑک اٹھا تھا۔ ابھی تک پائلٹ کا نام اور عہدہ کنفرم نہیں کیا جا رہا تھا۔

''موی......!'' انہوں نے چیخ کر مگر کانپتی آواز کے ساتھ بیٹی کو پکارا...... اور موی جو کہ کمرے میں بند ہو کر انٹر کے ایگزامز کی تیاری کر رہی تھی کہ اس کے ایگزامز سر پر تھے، وہ پری انجینئرنگ کی اسٹوڈنٹ تھی۔ ہل، ہل کر پڑھتی ہوئی اونچی، اونچی آواز میں رٹے لگاتی ہوئی۔ کیمسٹری کے موجد کو کوستی ہوئی۔ ''خود مر گئے۔ ہمیں عذاب میں ڈال گئے۔'' جیسے طعنے دیتی ہوئی۔ موی اِک پل کو ساکت ہوئی، دوسرے ہی لمحے کتاب کو بیڈ پر پھینکا، پاؤں نیچے کر کے چپل پہنی اور سڑپ سڑپ چلتی ہوئی اور پھر دھڑ دھڑ کرکے سیڑھیاں اتری تھی۔

''جی ممی!'' ذرا سا اکتایا ہوا انداز کہ ممی کو تو عادت تھی یوں بات بے بات آوازیں دینے کی۔

''ائر بیس کا نمبر ملاؤ...... جلدی......'' ممی کے تو انداز ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس غیر متوقع انداز و سوال پر وہ ٹھٹکی اور ٹھٹک کر ماں کا چہرہ دیکھا۔

''فون ملاؤ موی......'' گلے کی آواز خراش زدہ تھی اور وہ ہاتھوں کی مٹھیاں کھول اور بند کر رہی تھیں۔ ان کی پریشانی یک دم موی پہ بھی حملہ آور ہوئی تھی اور اس نے ان سے وجہ پوچھنی چاہی مگر...... نیوز چینل پہ خبر ذرا وقفے کے بعد اور اپ ڈیٹس کے ساتھ پھر سے چلنے لگی تھی اور اب موی کا ایک منٹ میں 72 بار دھڑکنے والا دل اس ایک منٹ میں ایک بار بھی دھڑک نہ سکا تھا۔ وہ وہیں پہ مرنے والی ہوگئی تھی۔

''فون ملاؤ موی......'' مسز مجیب عالم نے قدرے بے چینی کے ساتھ اس کا کندھا ہلایا تھا، وہ ہوش میں آئی اور اس سے پہلے کہ وہ نمبر ملاتی فون خود بول اٹھا تھا۔ بیل کی آواز پورے گھر میں صورِ اسرافیل کی طرح پھیلی تھی اور کیا ہی کریہہ آواز تھی۔ اس وقت اس سے بری آواز کوئی اور ہو سکتی تھی نہ ہی تھی۔

موی نے ماں کو دیکھا اور ماں نے موی کو...... سانس کا ہونا کیسے عذاب بن جاتا ہے۔ یہ کوئی ان دونوں سے پوچھتا۔ فون چیخ، چیخ کر خموش ہوا۔ خموشی نے پھر سے پورے گھر کو حتیٰ کہ ان دو کھڑے ساکت وجودوں کو بھی اپنے مہیب سناٹے میں لپیٹ لیا تھا...... آہ...... فون ایک دفعہ پھر سے بول اٹھا۔ خموشی پھر سے چیخ گئی۔ موی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ وہ اٹھا ہی نہیں سکی تھی۔

مسز مجیب عالم نے بے جان ہوتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا تھا۔

''آہ! کہ سرخ روشنائی سے لکھی گئی چٹھیوں کا رواج اب ختم ہوا، ختم ہوا اب۔''

اِدھر مسز مجیب عالم نے ریسیور اٹھالیا اور اُدھر نیوز چینل والے مکمل اپ ڈیٹس کے ساتھ خبر دے رہے تھے۔ شہید ہونے والے پائلٹ اور کو پائلٹ کا نام اور عہدہ کنفرم کیا جا رہا تھا۔ مسز مجیب عالم نے کیا سنا اور کس کا فون تھا۔ موی تو اُدھر متوجہ ہی نہیں تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسکرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سرخ بیک گراؤنڈ کے اوپر کالے لکھے گئے حروف، سیاہ حروف...... اس پل ہاں ٹھیک اسی پل کہ جب موی ٹی وی کی اسکرین پہ نظر آنے والے نام کو دیکھ کر اور اس کی ماں فون کو سن کر ساکت تھیں، اسی پل ہاں ٹھیک اسی پل میں کتنے ہی آن ڈیوٹی پائلٹس کی ماؤں، بہنوں، بیویوں، بھائیوں اور باپوں نے شکر کی ایک اطمینان بھری سانس لی ہوگی اور وہ سیاہ الفاظ، وہ سیاہ حروف کہ جن کی سیاہی اور ایسی سیاہی جو زندگی جیسی روشن چیز کو کھا گئی تھی تو یہ ان کی زندگی تھی جو کہ رک گئی تھی اور یہ ان کا غم تھا جو ڈھے پڑا تھا اور اب وہ معمولاتِ زندگی سرانجام دینے سے قاصر تھے۔ وہ تو اب لگتا تھا کہ زندگی کو ہی انجام دینے سے قاصر تھے۔ تو جب کئی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بھائیوں اور باپوں نے کھل کر سانس لی تھی تو کوئی ان دونوں سے پوچھتا وہ دونوں کہ جن میں سے ایک بیٹی تھی اور دوسری بیوی......

کہ تم نے کبھی سانس بھی لی تھی یا نہیں...... کیا تم نے کبھی یہ لذت چکھی تھی بھی یا نہیں بولو ناں...... بتاؤ ناں، کیا تمہیں کبھی سانس آئی تھی؟ یا یہ کہ تم نے اب بھی سانس لینی بھی ہے یا نہیں۔

''مجیب عالم اپنے معاون پائلٹ کے ساتھ حادثے کا شکار ہو کر شہادت کا رتبہ حاصل کر چکے تھے۔''

بابا کی لاڈلی، تم رونا مت کہ بابا تکلیف محسوس کریں گے۔ ان کو سونے دینا...... وہ زندگی جینے کے لیے کہ جس کا شعور تم کو نہیں ہے بابا کی پیاری...... اپنے آنسوؤں کو تھام لینا۔ گرنے نہ دینا، بہنے نہ دینا کہ بابا پریشان ہوں گے۔ تمہیں معلوم ہے ناں وہ تمہارے رونے سے پریشان ہو جاتے ہیں، وہ زندہ ہیں، بس تم کو شعور نہیں...... وہ آنکھیں نہیں ہیں تمہارے پاس کہ اب کے بعد جن سے تم ان کو دیکھ سکو...... نہ بابا کی موی نہ...... خود کو مرنے مت دینا کہ بابا اب تمہارے ذریعے

سے زندہ ہوں گے۔ مت مرنے دینا خود کو، ہرگز بھی نہیں، خود کو مرنے نہ دینا، دیکھو ایسا مت کرنا کہ تم اب بابا کے وجود کا حصہ نہیں ہو، تم اب سے مجیب عالم ہو۔

"اسکواڈرن لیڈر مجیب عالم......"

☆☆☆

فون کا ریسیور ان کے ہاتھ سے گرا......اور گر کر جھولنے لگا۔ وہ بے دم ہو کر پشت کے بل دیوار سے ٹکرائیں اور لڑکھڑا کر گرنے والے انداز میں نیچے گھسٹتی چلی گئی تھیں۔ ان کے کانوں نے ایسا کیا سن لیا تھا۔ انہیں لگا سینے پر کوئی وار ہوا تھا۔ سانس کہیں اٹک گئی تھی۔ ٹانگیں اکٹھی کرتے ہوئے، گھٹنے موڑ کر پیٹ تک لے جاتے ہوئے، اب کہ وہ دائیں رخ کے بل زمین پر گری تھیں۔

"مجیب......" ایک سسکی کی طرح نام ادا ہوا اور سسکی وہ جو کہ بین کرتی ہوئی لگتی تھی۔

"مجیب......" اب کہ کانپتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ نام ادا ہوا۔ یوں جیسے اس نام کو ادا کر کے وہ خود کو زندہ رکھنے کی کوشش میں تھیں، زندگی کو محسوس کرنے کی کوشش میں ہاں......اب انہیں ایسا ہی تو کرنا تھا۔

"مو......جی ی ی ی......ب......" اب کہ یہ سسکی نہ تھی شدتِ غم سے بولنے کی وجہ سے ان کے گلے میں خراشیں پڑی تھیں۔ اور اب وہ اونچا، اونچا رو رہی تھیں۔ دائیں رخ زمین پر گری دونوں گھٹنوں کو شدت سے موڑے، ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے، وہ اس کرب سے روئی تھیں کہ لگتا تھا کہ اس کے بعد وہ مر ہی جائیں گی۔

موی جو ابھی تک آنکھیں پھاڑے ٹی وی کو دیکھے جا رہی تھی جس پر اب کوئی اشتہار چل رہا تھا۔ اس درد بھری چیخ نما پکار پر اس نے مڑ کر اس عورت کو دیکھا۔ وہ کون تھی بھلا......؟ اور وہ کیوں اس طرح سے روئی تھی......؟ اس نے پھر سے اس بلکتی عورت کو دیکھا۔ آنکھوں سے بصیرت کا تعلق ٹوٹا......ذہن سے فہم الگ ہوا۔ کانوں نے بہرے ہو جانا چاہا اور زبان قوتِ گویائی سے محروم......وہ کیا عالم تھا۔ وہ عالم بے خودی تھا۔ آہ کہ نہیں......وہ اچانک ڈھے پڑنے والا غم تھا جو کہ جب حواسوں پر گرتا ہے تو انہیں چھین کر ہی دم لیتا ہے۔ اس نے پھر اس بین کرتی عورت کو دیکھا۔ پھر اپنے آپ کو دیکھا......اور ہر گھر کے در و دیوار کو......چیخنے کی آواز پھر سے آئی۔ وہ سرعت سے آواز کی طرف متوجہ ہوئی۔ گل اسی طرح زمین پر گرے ہوئے چیخ رہی تھیں، وہ آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے ان تک آئی اور گھٹنوں کے بل ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور آنسو بہانے سے زیادہ وہ چیخ رہی تھیں۔

آنکھوں کے بس گوشے نم سے تھے۔ موی نے ان کی زور سے بھینچی ہوئی آنکھوں کو دیکھا آنکھوں کے ان نم کناروں کو دیکھا......

"نہیں......" مومنہ مجیب عالم اب اس کالے جادو کے زیرِ اثر تھی کہ جس کے بعد انسان پتھر کا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا......کوئی ذریعہ، کوئی طریقہ کام نہیں آتا۔ اس کے جسم میں وہ برے اثرات والی سوئیاں کھب چکی تھیں کہ جس کے بعد شہزادی سو سال تک کے لیے سو جاتی ہے۔ وہ بھی سونا چاہتی تھی......وہ ماں کو بے خودی بلکہ بے بسی کے عالم میں گھور رہی تھی۔ وہ یک دم خاموش ہوئیں اور آنکھیں کھول کر اسے اپنے بے حد قریب دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر چونکیں اور پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک دفعہ پھر سے بے آواز روئی تھیں۔

"موی، بابا......" اور پھر روتے ہوئے کہہ کر انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اپنی دونوں باہوں میں سمو لیا تھا......اسے سینے سے لگائے وہ بلک، بلک کر رو پڑی تھیں۔ موی ہر جذبے سے عاری......اپنے لب بھینچے ان کے سینے میں دبکی تھی۔ اور اس طرح سے خاموش تھی کہ بس آج کے بعد کچھ نہیں بولنے والی تھی وہ۔

☆☆☆

گل مجیب عالم بھلا کون تھی وہ ایک شہید کی بہن تھی۔

وہ ایک شہید کی بیٹی تھی۔

اور اب......وہ ایک شہید کی بیوہ تھی۔ یہ تھا اس کا اصل تعارف......وہ اس نسل سے تھی کہ جو نسل در نسل اپنے

باپ بھائی، بیٹے اور شوہر قربان کرتی آئی تھیں۔ وہ عام عورت نہیں تھی۔ یہی اصول تھا، یہی چلن تھا، یہی وتیرہ تھا۔

خوف، اضطراب، گھبراہٹ ان تینوں کو یکجا کرو تو مومنہ مجیب عالم بنتی تھی۔ گو کہ اس وقت سے اب تک اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا اور گو کہ وہ اب تک خاموش تھی مگر گھر میں آتے ہوئے لوگوں اور رشتے داروں کو دیکھ، دیکھ کر وہ سخت بے چین تھی۔ صوفے پر بیٹھی ٹکر، ٹکر سب کو دیکھتی...... اضطراب سے ہونٹ کاٹتی کبھی روتے ہوئے سعد کو دیکھنے لگتی اور کبھی گلی کی چیخوں سے خوف زدہ ہو کر کانوں پر ہاتھ رکھ کر دونوں پاؤں اوپر کیے صوفے میں دبک جاتی۔

وہ ''عالمِ وحشت'' میں تھی یا خود ''وحشت'' کا مفہوم تھی...... سمجھنے سے بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ حبیب عالم آئے، اسے سینے میں بھینچ کر بلند آواز سے روئے تھے۔

اس نے چاچو کی شرٹ کو دونوں مٹھیوں میں سختی سے جکڑا تھا۔ اور خوف زدہ انداز میں ان کے سینے میں دبک گئی تھی۔

ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تو کیمسٹری کے موجد کو وہ کوس رہی تھی کہ اس کے ایگزامز ہونے والے تھے۔ اور محض چند ہی گھنٹوں کے بعد...... وہ اپنی اس چیز سے محروم ہو گئی تھی جسے ''عقل'' کہا جاتا ہے۔

''موی......'' حبیب چاچو نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھاما تھا۔

''بابا، بابا نہیں رہے۔'' انہوں نے اسے سنانا چاہا...... اور اب کی بار اس نے سن لیا مگر کیا یہ الفاظ تھے؟ کیا وہ ایسی کوئی زہریلی گرم مائع نما چیز نہیں تھے جو کہ اس کے کانوں میں انڈیلی گئی تھی۔ وہ زہریلی چیز جو کہ اس کے دل تک جا پہنچی تھی اور پھر سارے جسم میں آہ! کہ جسم اس زہر سے مر کیوں نہیں جاتا۔ مرنا...... اس تکلیف کی نسبت آسان تھا جو اس نے زندہ ہو کر محسوس کی تھی۔

''چاچو......'' اس نے بے یقینی سے کہا اور پھر سختی سے ان کے دونوں ہاتھ جھٹکے تھے اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی کہ بیل کی آواز گونجی تھی، ڈور بیل کی آواز...... کوئی اور متوجہ نہیں ہوا تھا وہ بس موی تھی کہ جس کی سماعتوں نے برق رفتاری سے ریسپانس کیا تھا۔

چاچو سے اپنا آپ چھڑا کر وہ گیٹ کی طرف بھاگی تھی۔ دروازے پر PAF کے فوجی تھے۔ ایک تابوت۔ جس میں اس حادثے میں محفوظ رہ جانے والی مجیب عالم کی چیزیں تھیں۔ موی نچڑے ہوئے چہرے کے ساتھ اس تابوت کو آتا دیکھتی رہی۔

اس کے گمان کے مطابق، تابوت نہیں، گیٹ سے مجسم مجیب عالم کو اندر آنا تھا مگر یہ کیا تھا؟ اس نے مڑ کر اندرونی سمت نگاہ کی۔ جہاں سے رونے کی آوازیں یک دم شدت اختیار کر گئی تھیں۔

اس نے اپنی ماں کو آنِ واحد میں ڈھتے ہوئے دیکھا...... اس نے سعد کو اِک لمحے میں مرتے دیکھا۔ تو وہ کیسے اپنے پیروں پر کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی؟ کیسے......؟ آخر کیسے؟ اس نے اندرونی سمت سے نگاہیں ہٹا کر پھر سے تابوت کو دیکھا۔

ایک فوجی تہہ شدہ پاکستانی سبز پرچم حبیب عالم کو دے رہا تھا کہ اس جھنڈے میں اب اس تابوت کو لپیٹا جانا تھا۔ نہیں...... اسے ایسا کوئی منظر نہیں دیکھنا تھا۔ نہیں، وہ تیزی سے اس فوجی تک گئی تھی۔ ایک جھپٹا مار کر اس نے فوجی کا گریبان پکڑا تھا۔

''میرے بابا کہاں ہیں؟'' وہ چیخی تھی۔ فوجی نے اِک خاموش نظر سے اسے دیکھا۔

''وہ فلائٹ کے دوران حادثے کا شکار ہو کر شہید ہو گئے ہیں۔ ان کے جہاز کے انجن میں اچانک آگ بھڑک اٹھی تھی۔'' نگاہیں نیچی کر کے جواب فوجی نے دیا تھا۔ اس نے بے یقینی سے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس فوجی کا چہرہ دیکھا۔

''کیا کہا...... ان کا جہاز......؟''

''مگر وہ تو ماہر ہوا باز تھے...... ایک بہترین پائلٹ تھے تو ایسا کیسے ہوا؟'' وہ بولتی نہیں تھی اس کی آنکھیں بولتی تھیں اور اس طرح سے سوال کرتی تھیں کہ جواب دینے والا لاجواب کھڑا رہ گیا تھا۔

موی اس فوجی کے چہرے کو دیکھتی رہی اور پھر......دکھ، بے یقینی اور جو تیسری چیز اس نے محسوس کی وہ شدید اشتعال کی لہر تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی۔ غم نے اس پر اپنا الٹا اثر دکھایا تھا وہ یوں ہو گئی جیسے کسی نے اس کو ننگے پاؤں دہکتے ہوئے انگاروں پہ لاکھڑا کیا تھا۔ اس نے طیش بھری نظروں کے ساتھ فوجی کو دیکھا...... اور پھر آگے بڑھ کر اس کی یونیفارم پر لگا PAF کا ونگ اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

یہ ری ایکشن سمجھ سے باہر تھا۔ سب اچنبھے سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس فوجی نے اسے روکا نہیں تھا۔ اس نے چاہا کہ موی کا aggression نکل جائے مگر یہ اب ایسے تھوڑا ہی ممکن تھا۔

اس کو وہاں سے ہٹانے کی کوشش میں ناکام ہوتے ہوئے موی نے ایک دفعہ پھر سے اس کی یونیفارم کا ونگ اکھاڑنے کی کوشش کی تھی۔

اب کہ حبیب عالم نے کندھوں سے پکڑ کر اسے پیچھے ہٹایا تھا مگر اس اکا ایگریشن کم ہو کے نہیں دے رہا تھا۔ شدید طیش میں اس نے اپنے کندھے حبیب عالم سے چھڑوائے اور اندر کی طرف بھاگی تھی وہ اپنے کمرے کی طرف گئی تھی کس لیے گئی تھی؟ یہ تب سمجھ آیا جب اس کے کمرے سے پہلی چیز باہر آگری تھی۔ وہ کچھ اور نہیں تھا ایک جہاز کا ماڈل تھا۔ اور وہ بس شروعات تھی اس کے بعد غیظ و غضب سے پُر......وہ ایک کے بعد ایک جہاز توڑتی چلی تھی، کھینچ کھینچ کر الماری سے جہازوں کے ماڈلز اور کھلونے نکال، نکال کر زور، زور سے زمین پر پٹختی رہی......ان کے اوپر شدت سے، پوری طاقت سے پاؤں مار، مار کر انہیں تباہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ دیواروں سے پوسٹر اکھاڑ کر پرزہ، پرزہ کر کے پھینکے......سی ڈیز اٹھا کر ہاتھوں سے دو ٹکڑے کر کے گرائیں۔ پی سی کو ہاتھ مار کر گرایا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی......صرف غیظ و غضب اور جارحیت کا اظہار تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ حبیب عالم اس کے کمرے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔

گل، سعد کو سینے میں بھینچے، اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے گھٹی، گھٹی آواز میں روئے جا رہی تھیں۔

عائلہ (موی کی چچی) خوفزدہ انداز میں دم سادھے ان سب کو دیکھ رہی تھیں۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ چلو......اس کا سکتہ تو ٹوٹا مگر......آہ......سکتہ ضرور ٹوٹ گیا تھا مگر اب کیا تھا جو ہو رہا تھا اور ہونے والا تھا۔

موی کے ہاتھ جو آخری چیز لگی وہ وہی ڈرائنگ تھی جو اس کے بابا نے بنائی تھی......اور اس نے لیبل کی تھی اس نے اسے پھاڑنا چاہا اور اس کے ہاتھ گرے، دل کانپا اور لرزتے ہاتھوں سے وہ صفحہ اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا تھا اور پھر لرزش صرف ہاتھوں تک ہی نہیں رہی تھی وہ اس کے پور، پور میں پھیل گئی تھی۔ اس کی رنگت یک دم فق ہوئی تھی۔ زمین پہ وہ صفحہ نہیں گرا تھا......وہ، وہ اس کی توانائی تھی کہ جس کے ساتھ وہ جیتی تھی، اسی لرزتے ہوئے جسم کے ساتھ وہ کمرے سے باہر آئی کہ یہ کپکپی اس کے قابو سے باہر تھی اور غضب ہوا، غضب ہی تو ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں سیدھی لاؤنج میں آویزاں اس قد آدم تصویر پر جا پڑی تھیں کہ جس میں اس کا باپ PAF کی dangri (مخصوص لباس) پہنے مسکراتا ہوا C-130 کے ساتھ اور وہ تصویر کہ جسے وہ مگن ہو کر گھنٹوں تکا کرتی تھی مگر اب اس کے جسم کی لرزش کچھ اور بڑھی تھی دوسرے ہی لمحے کوئی گرم تیز رو......برق جیسی چیز اس کے پورے بدن میں پھیلی تھی اشتعال پھر سے عود کر آیا تھا۔ طیش سے پُر مگر بے دم ......وہ لڑکھڑاتی، گرتی پڑتی تصویر کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کو یوں اس تصویر تک جاتے دیکھ کر گل کے رونے کی آواز بے اختیار اونچی ہوتی تھی۔ حبیب عالم نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی آواز کو اونچا ہونے سے روکا اور عائلہ......بے ساختہ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی اور اس کے بعد......

وہ ہوا جو کسی کے گمان میں نہیں تھا تصور تک نہیں تھا کہ ایسا ہوگا......وہ اس صوفے پر چڑھی کہ جس کے عین اوپر تصویر تھی۔ مومی نے پوری قوت سے پوری جان لگا کر دونوں ہاتھوں سے کئے شیشے پر دے مارے تھے۔ چند آوازیں ابھریں مگر وہ آوازیں زور دار چھناکے کی آواز میں دب کر رہ گئی تھیں۔ اور پھر خاموشی، سکوت، سناٹا شیشہ چکنا چور تھا یا مومی......؟

''مومی......'' گل بے اختیار چیخی تھیں......سعد ماں سے چمٹ کر خوفزدہ ہو کر اور اونچی آواز سے رونے لگا تھا۔ حبیب عالم بھاگے، عائلہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے اسے دیکھتے ہوئے وہیں نیچے بیٹھتی چلی گئی تھیں۔

اور وہ......وہ کیا کر رہی تھی؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس نے ایسا باپ کی تصویر کے لیے کیا؟ باپ کے لمس کو پانے کو یا اس کے چہرے کو بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھنے کے واسطے......کیوں کیا؟ اور وہ کیا کر رہی تھی؟ اِک جنون کا سا عالم تھا اور وہ تھی...... بے خودی یا مدہوشی یا کہ بے خبری......نہیں......وہ ''غم'' تھا بس غم ہی تو تھا۔ شاید جان لیوا غم......منہ سے خر، خر کی آوازیں لاشعوری طور پر نکل رہی تھیں۔

وہ وہ دونوں ہاتھوں کے ناخنوں سے اس C-130 کی تصویر کو کھرچ رہی تھی دونوں ہاتھوں سے دیوانہ وار، پاگلوں کے سے انداز میں......کانچ کی کرچیوں کی پروا کیے بغیر......یوں جیسے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتی ہو۔

''مومی......'' گل پھر سے چیخ کر اس کی طرف بھاگی تھیں۔ سعد نیچے جا گرا تھا وہ دیوانہ وار کھرچے چلی جا رہی تھی اور اس کے ہاتھوں سے بہنے والا لہو ان کے دل پر گر رہا تھا۔

''مومی......'' گل نے پیچھے سے آکر اسے کھینچا......اور اب اس کے لہو سے مجیب عالم کا مسکراتا چہرہ رنگتا جا رہا تھا۔

''مومی......'' گل نے پھر سے کھینچا۔ مگر ان کی طاقت ناکافی تھی۔

جنون، دیوانگی اور غصہ......

''مومی......'' اب کہ گل نے اسے بازوؤں میں بھر کر پیچھے کھینچنا چاہا وہ لڑکھڑائی......مگر......اپنا آپ پھر سے چھڑا کر کھرچنے لگی۔

مجیب عالم کا مسکراتا چہرہ خون میں بھیگ رہا تھا۔ خون کی بے ترتیب لکیریں اسے ڈھانپ رہی تھیں۔

''مومی......'' گل بے بس ہو کر اس کی پشت سے سر لگا کر رونے لگیں۔ اور وہ کھرچتی رہی۔ اِک عالم وحشت تھا اور وہ تھی۔

''مومی......'' اب کہ حبیب عالم نے اسے کھینچا اور اس طرح کھینچا کہ صوفے سے نیچے اتار کر دونوں بازوؤں میں جکڑا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی پھر وہ چاچو کو مارنے لگی......سینے کے اوپر خون بھرے ہاتھوں کے ساتھ......خر، خر کی آوازیں نکالتے ہوئے۔

''اس نے مار دیا بابا کو......مار دیا......میرے بابا کو مار دیا۔'' جملے بولتے ہوئے وہ بے قابو تھی۔

''مومی......'' حبیب عالم نے اسے جھٹکا دیا......تاکہ وہ ہوش میں آئے لیکن وہ ان کو مارے چلی جا رہی تھی۔

''مومی ہوش کرو......'' دکھ کی شدت سے ان کی آواز پھٹ گئی تھی۔ اس کے شانوں سے پکڑ کر انہوں نے ایک زوردار جھٹکا دے دیا۔ وہ ہوش میں آتی؟ بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔

''مومنہ......'' اب کی بار انہوں نے پوری قوت لگا کر زور سے کہتے ہوئے اس کے کندھوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا تھا۔ اور مومنہ یک دم رک گئی۔ اس کے ہاتھ ساکت ہوئے، آنکھیں پتھرائیں اور اس کے بعد وہ بے دم ہو کر چاچو کے بازوؤں سے پھسلنے لگی تھی۔

''مومی......'' گل پوری قوت لگا کر چیخیں......عائلہ بے ساختہ ان کی طرف دوڑی تھی مگر وہ، وہ مومنہ مجیب عالم......بابا کی پیاری، مجیب عالم کی مومی، وہ تو گرتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک وقت میں کئی کام شروع کرنے والی......اور پھر کسی بھی کام کو مکمل نہ کرنے والی وہ ......وہ ہر کام بلا سوچے سمجھے شروع کرنے والی......اور پھر سوچ، سوچ کر ہلکان ہونے والی کہ ہائے......میری عقل کہاں تھی کہ جب فلاں، فلاں کام کیا تھا......ہاں...... بیچاری عقل تب ہی تو نہیں تھی جب وہ فلاں، فلاں کام کیا تھا۔

وہ، وہ ہنیا ذوالفقار...... اب ارادہ تھا کہ وہ کیڈٹ کالج کے ٹیسٹ کی تیاری کرے گی۔

ہاں ارادہ تھا......مگر وہ مستقل مزاجی کہاں سے لاتی جو کہ اس کی فطرت کا حصہ ہی نہیں تھی۔ دن چڑھے تک سوتی رہتی......رات گئے تک FB کھول کر چیٹنگ میں مصروف رہتی......نیند تب ہی آتی تھی جب وہ کسی کورس کی کتاب کو ہاتھ لگاتی تھی۔ یوں جیسے وہ کوئی نشہ آور دوا تھی۔ اِدھر کتاب کو ہاتھ لگایا نہیں اُدھر نیند کا حملہ ہوا کہ بس ہوا کوچنگ سینٹر جوائن کرر کھا تھا۔ احسان تھا اس کا جو وہ وہاں لیے جانے والے ٹیسٹ کی تیاری کر لیا کرتی تھی۔

بیچارے کوچنگ سینٹر والے بڑے ہی ممنون تھے کہ نہ صرف یہ کہ ہنیا صاحبہ نے وہاں داخلہ لے رکھا تھا......بلکہ احسان در احسان کہ وہ......وہاں روزانہ جاتی بھی تھی اور ٹیسٹ بھی تیار کر ہی لیتی تھی اس طرح کہ نمبرز دکھانے والے نہیں ہوتے تھے۔ وہ نالائق نہیں تھی مگر ایک سال کا گیپ اسے بور کر رہا تھا......یوں جیسے وہ مرکز سے ہٹ گئی ہو۔ آرمی شوق تھا، جنون نہیں اور یہ جنون ہی ہوتا ہے جو آپ سے کچھ کرواتا ہے، شوق بنا جنون کے کچھ نہیں......حقیقتِ حال یہ تھی کہ فوج سے زیادہ فوجیوں میں کشش محسوس ہوتی تھی۔ وقت کے ساتھ، ساتھ محور بدل چکا تھا۔ اس کا پہلا کرش فوجی تھے۔ خواہ......کوئی بھی ہو......بس وہ پاک آرمی کی وردی میں ہو دوسرا، تیسرا اور آخری کرش بھی فوجی ہی تھے۔ خواہ کوئی بھی ہو......بس یہ کہ پاک آرمی کی وردی میں ہو خیر......تو وہ کر رہی تھیں ٹیسٹ کی تیاری...... ہاں جی......ہو رہی تھی ٹیسٹ کی تیاری مگر وہ سپر لیس اس دن ہوئی کہ جس دن رول نمبر سلپ آئی تھی۔ گو کہ مورال ڈاؤن تھا۔ وہ اتنی کانفیڈنٹ بھی نہیں تھی۔ پچھلی ناکامی کی وجہ سے وہ کافی ڈاؤن ہو رہی تھی لیکن بہر حال......ٹیسٹ اس نے کلیئر کر ہی لیا تھا۔

ذوالفقار صاحب کو اس کے پورے سال کی کارکردگی کی بنا پر یہ امید تو نہ تھی لیکن ان کی امید بر آئی۔ اور جب اس کا رزلٹ آیا تو......تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔

''مبارک ہو ابو......آپ کی ساری سازشی عورتوں جیسی چالیں ناکام ہو گئیں۔ میں نے ٹیسٹ کلیئر کر لیا ہے۔'' ذرا چہک کر اور طنز سے اطلاع دی گئی تھی۔ وہ چہکتی تھی اور امی، ابو کے دل کو ہاتھ پڑا تھا......اکلوتی اولاد......ایبٹ آباد......ہاسٹل......

وہ کیا کریں گے اس کے پیچھے؟ تو کیا وہ ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ، دیکھ کر ہی دل بھر لیا کریں گے؟ کیا وہ یوں اکیلے اکتا نہیں جایا کریں گے لیکن ذوالفقار صاحب وعدہ کر چکے تھے۔ بات مان کر اب مکر نہیں سکتے تھے......دل پہ کتنی ہی بھاری سل رکھ کر اسے بھیجا تھا۔ کاش کہ وہ دیکھ پاتی۔

جب وہ اسے کیڈٹ کالج کے ہاسٹل چھوڑ کر آ رہے تھے......تو وہ تو خوشی، خوشی چلی گئی تھی اور عنبرین......وہ یوں رو پڑی تھیں جیسے کہ وہ کوئی چار سال کی بچی ہو......

''فکر نہ کرو عنبرین......تم دیکھنا یہ چار دن کی چاندنی ثابت نہ ہوئی تو میرا نام بدل دینا۔'' ذوالفقار صاحب نے بڑے وثوق سے کہا تھا اور کچھ غلط نہیں کہا تھا۔

چلو چار دن کی نہ سہی......چار ماہ کی ہی سہی......چار ماہ میں ہی اس کا آرمی آفیسر بننے کا شوق ناک کے رستے باہر نکلا تھا۔ صبح، صبح اٹھ کر پی ٹی پھر کالج اور اوپر سے ہاسٹل کی سخت روٹین......وہاں کے کھانے، اکیلا پن......امی، ابو کے ساتھ، ساتھ ثنا بھی یاد آتی تھی۔ اور یاد بعد میں آتی تھی حسبِ توقع رونا پہلے

حاضری لگوایا کرتا تھا۔ اس کی رنگت میں صاف طور پر جھلکتی پیلاہٹ دیکھی جا سکتی تھی۔ آنکھوں کے نیچے کی جلد سیاہ ہوتی محسوس کی جا سکتی تھی۔ دبلی تو تھی ہی اب تو یوں لگتا تھا کہ وہ چند دن کی مہمان ہے اور بس...... اس نے کب یہ سب سہا اور گھر سے دوری برداشت کی تھی۔ ماں ابھی تک نوالے منہ میں ڈالتی تھیں۔ جب کیڈٹ کالج آئی تو لگ پتا گیا کہ کس بھاؤ بکتی ہے۔

تو پھر چار دن کی نہ سہی...... چار ماہ کی ہی سہی...... شوق پورا ہو چکا تھا۔

وہ اسی کیڈٹ کالج کو چھوڑ کر لات مار کر واپس آئی تھی کہ جس کے لیے اس نے ایک محاذ کھڑا کر دیا تھا۔ اِک جنگ لڑی تھی اور پھر جیتی بھی تھی اور اب وہ اپنی مرضی سے ہار گئی تھی۔

☆☆☆

کالج چھوڑ کر آنے پر ابو کو محسوس ہوا تھا کہ اب کہ تو خاص طور پر ٹشو پیپر والوں کو آرڈر کرنا پڑے گا...... احتیاطاً وہ کافی ڈبے لا کر رکھ بھی چکے تھے مگر وہاں تو الٹا ہی ریسپانس تھا۔

اسے چپ لگ گئی تھی...... اور اس طرح سے لگی تھی کہ لگتا تھا کہ اب کہ کھا کر ہی چھوڑے گی اسے۔

اس کے امی، ابو دونوں خاموش تھے اور وہ چاہتے تھے کہ وہ سنبھلنے کے لیے وقت لے...... اور وہ خموشی سے اس کی خاموشی کو دیکھ رہے تھے۔ مگر اس کی یہ چپ اس کے رونے سے زیادہ خطرناک تھی۔

وہ بولتی اچھی لگتی تھی...... طوفان اٹھاتی...... سب کچھ الٹ پلٹ کرتی ہوئی پیاری لگتی تھی۔ بس اب اسے یہ کون سمجھائے؟

اسے کون بتائے جب وہ پٹر، پٹر بولتی ہے تو اتنی کیوٹ لگتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ ذرا اس کے گال پر اِک چٹکی بھر کر تو دیکھیں۔

وہ ایسے خاموش بہت بری لگتی ہے...... بہت ہی بری...... اتنی کہ ابو اور امی کے دل کو تکلیف ہوتی ہے مگر...... اسے کون بتلائے......؟ اسے کون سمجھائے......؟

اس نے خود کو سزا دی اور بحث کا دروازہ بند کر دیا تھا خود پر...... زندگی میں ناکامیاں تو آتی ہی رہتی ہیں...... اور بعض اوقات یہ ان چیزوں کو آپ سے دور ہٹانے کے لیے بھی آتی ہیں...... جو کہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہوتیں۔ تب سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کوئی تعویذ ہے...... رد بلا کا...... اور بس...... یہ درست ہے کہ جس وقت آپ اپنی قسمت کی ایک ناکامی کا سامنا کرتے ہیں...... ٹھیک اسی وقت آپ اپنی قسمت کی ایک کامیابی کے قریب ہوتے ہیں...... اپنی کامیابیوں کو تلاش کریں بالکل اسی طرح جس طرح آپ اپنی قسمت کے رزق کو تلاش کرتے ہیں...... ناکامی کے خمیر سے ہی کامیابی جنم لیتی ہے۔

”ولیس للا انسان الا ماسعیٰ

”نہیں ہے انسان کے لیے مگر جتنی وہ کوشش کرے...... (القرآن)

☆☆☆

اور ادھر اس نے کوشش کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اسپیشل سروسز دوزخ ہے۔ وہ واقعی تھی۔ اس طرح کی ٹریننگ تھی کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ انسانوں کو دی جانے والی ٹریننگ ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ جائے۔ ہاں یہ اتنی ہی سخت ہوتی ہے۔ پچیس فیصد لوگ ہی کامیاب ہو پاتے ہیں اور جو نہیں ہو پاتے وہ ظاہر ہے ناکام ہوتے ہیں یا بھاگ جاتے ہیں اور پھر ساری عمر یہی کہتے رہتے ہیں۔

”اسپیشل سروسز دوزخ ہے دوزخ......“ تو ایک دفعہ اس کا بھی دل چاہا کہ وہ بھاگ جائے...... جب 36 میل کی rugged terr ian یاد کرنی پڑتی ہے۔ محض 9 گھنٹوں میں اور وہ بھی فل combat load کے ساتھ تو ہر ایک کا دل ایک دفعہ تو ضرور ہی چاہتا ہے...... وہ بھاگ جائے اس سے بھلی آرمی کی جنت...... جنت بھی وہ جو بظاہر جنت ہی نظر آتی ہے۔

مگر ہر دفعہ بھاگنے سے پہلے اسے یاد آتا تھا وہ جملہ جو کہ اس کے باپ نے کہا تھا۔

اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ کل کو وہ بھی ایسا ہی کوئی جملہ کسی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اپنے بیٹے کو کہے...... وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ بھاگنے کی سزا اس سے بدتر تھی۔ وہ جان لڑا دینا چاہتا تھا اپنا بیسٹ دینا چاہتا تھا اور اس نے لڑا دی جان اپنی...... اپنی تمام تر قوتوں کو آزما لیا۔ مگر اس کے باوجود سروائیول ٹریننگ نے اسے ناک کے بل گرا دیا تھا...... یہ اب تک کی سب سے مشکل ترین ٹریننگ تھی جو اس کے لیے بھی لوہے کے چنے ثابت ہوئی تھی۔ جو اسے دانتوں تلے چبانے ہی تھے۔

یہ اب تک کی ٹریننگ کا سب سے مشکل حصہ ثابت ہوئی تھی کہ اس میں combatant مکمل طور پر unarmed ہوتا ہے۔ وہ، وہ بری طرح سے زخمی ہوا تھا۔ اسپتال میں بھی رہا تھا مگر ہمت نہیں ہاری تھی اس نے...... اور ہر کمانڈو بننے والے کا پہلا وصف یہی تو ہوتا ہے۔

''ہمت......'' اسے بڑی شرم آتی تھی اس بات سے کہ کل کو وہ بھی کہیں یہ کہتا ہوا نہ پایا جائے...... کہ ایلیٹ فورسز دوزخ ہے دوزخ...... وہ مرد تھا اور ''انا'' ہی بڑا مسئلہ تھا اس کا...... اوپر سے ایک فوجی بہادر اور محبِ وطن ہو۔

اور اس نے کر دکھایا بہادری کا کام...... اب کی بار وہ ہارا اور نہ زخمی ہوا...... اس نے کر دکھایا ٹریننگ کا سب سے مشکل مرحلہ اور انعام میں کیا ملا بھلا؟ Maroon beret کہ ساری دنیا میں کمانڈو اسی میرون بیرٹ سے پہچانے جاتے ہیں یہ ان کے elite ہونے کی نشانی ہے۔ اس کی کمپنی ضرار تھی جو کہ counter, terrorism کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا فخر تھا وہ wing جو کہ اس کے سینے پر آویزاں ہو گیا تھا۔ اگر وہ گردن اکڑا تا تھا تو ٹھیک اکڑاتا تھا۔ وہ اپنی ماں کا فخر تھا اور باپ کا مان...... کہ وہ عام انسان نہیں تھا۔ ''وہ ایک کمانڈو تھا۔'' وہ ایک قیمتی انسان تھا...... ہم اور آپ سے زیادہ قیمتی کہ وہ رکھوالا بنایا گیا تھا۔ وہ اکڑتا تھا تو ٹھیک اکڑتا تھا کہ اسے اکڑنے کا حق تھا کہ اس سر پر میرون بیرٹ رکھی گئی تھی اور یہ ''ہما'' سے کم تر تو نہ تھی۔ کسی بھی لحاظ سے کسی بھی طرح...... یہ ''ہما'' سے ہرگز، ہرگز کم تر نہیں تھی۔ اس کے سینے پر وہ wing آویزاں تھا جو کہ زندوں کا نشانِ حیدر تھا۔

اور اس کے بائیں بازو پر وہ بیج سجا تھا کہ جو اسپیشل سروسز کے کمانڈوز کی پہچان تھا۔ اس کا حق تھا کہ اسے امتیازی سمجھا جائے۔

کیسے ہو سکتا تھا وہ عام آدمی......؟ اور نہیں تھا وہ عام آدمی۔ وہ خاص تھا...... غیر معمولی...... کہ وہ ایک کمانڈو تھا۔ the few,the proud,the commandos

من جانبازم، من جانبازم، من جانبازم

☆☆☆

''ہنیا بچے کیا ہو گیا ہے، دنیا آرمی پر تو ختم نہیں ہوتی ناں......'' وہ امی تھیں جو بڑے لاڈ سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہہ رہی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو وہ ان کی گود میں منہ چھپا کر لیٹی تھی اور خوش تھی۔ ضرورت سے زیادہ ان کی اس بات پہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔

''امی، ابو ٹھیک کہتے تھے...... میں اس کی اہل ہی نہیں تھی...... میرے لیے مشکل کاموں میں سے ایک کپڑے دھونا اور دوسرا برتن مانجھنا ہے...... کتنا ٹھیک کہا تھا ابو نے ناں...... پتا نہیں کیوں ہم بچوں کو خود سے تجربہ کرنے کے بعد ہی سکون آتا ہے۔ اور یہ اچھا ہو گیا ناں امی...... میں اب کبھی آرمی کا نام ہی نہیں لے سکوں گی۔'' وہ آزردہ تھی اور آزردگی اس بات کی زیادہ تھی کہ وہ اب کسی ملٹری مین کو نہیں دیکھ سکے گی۔

''تو کیا ہوا...... اور بھی تو فیلڈز ہیں ناں......''

امی نے اس کے چہرے پر آئے بالوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

وہ افسردگی سے مسکرائی۔ اب کیا بتاتی امی کو...... اپنے پہلے، دوسرے، تیسرے اور آخری کرش

کے بارے میں۔

''تم کوئی اور اچھی سی فیلڈ جوائن کرلو......''

''معلوم نہیں......اب تو جو ابو کہیں گے وہ ہی کروں گی۔'' وہ یوں بولی تھی جیسے آرمی نہیں تو کوئی بھی سہی......کیا فرق پڑتا تھا۔

''یوں چپ نہ ہوا کرو ہنیا......اس گھر میں اور کون ہے بولنے والا؟ تم چپ ہوتی ہو تو دنیا اندھیری سی لگتی ہے۔ ایسے نہ کیا کرو بچے......'' امی کہہ رہی تھیں اور اس نے چونک کر امی کی آنکھوں دیکھا......

اور بھلا کیا دیکھا؟ اس نے کس قدر غلط کیا تھا......''آئی ایم سوری امی......اور۔'' اس نے دوبارہ منہ ان کی گود میں چھپایا۔

''تم افسردہ کیوں ہوتی ہو! آرمی نہ سہی......ہم تمہاری شادی ہی کسی فوجی سے کرادیں گے۔'' یہ خالصتاً مذاق تھا۔ اور پہلے بھی ہوتا آیا تھا مگر اب ان حالات میں اِک معطر جھونکا ثابت ہوا تھا۔ آرمی نہیں تو نہ سہی......فوجی تو بہر حال موجود ہی تھے ناں......وہ کدھر بھاگے جارہے تھے۔ وہ تو یہیں تھے ناں اس نے امی کی گردن میں دونوں بازو ڈال کر ان کے گال چومے تھے۔

''پاگل!'' اس کے سر کو ہاتھ سے ٹھوکا دیتے ہوئے وہ بولی تھیں۔

☆☆☆

اس نے پھر بی ایس سی آنرز.... میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ قائداعظم یونیورسٹی میں انوائرمینٹل سائنسز (enviornmental sciences) کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اور ان چار سالوں میں مکمل طور پر اس کا عشق فوج سے فوجیوں تک منتقل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کمانڈوز یا پاکستانی فوجیوں کے متعلق ہی تو تھے......اور اس کے اسٹیٹس بھی کچھ اسی قسم کے ہوتے تھے......مثلاً

''ہائے......زندگی میں اور کچھ ملے نہ ملے بس ایک فوجی مل جائے......''

''میری امی کے ہونے والے داماد اگر تم فوجی نہ ہوئے تو اللہ کرے کہ تم ہو ہی نہ......''

''زندگی کتنی حسین ہو، اگر اس میں ایک عدد فوجی ہو اور مزید یہ کہ وہ میرا شوہر ہو۔''

''اُف، کوئی فوجی میرے اسٹیٹس پڑھ کر ہی مجھ پر عاشق ہوجائے۔'' ایک اداس emoticon۔

''کیا سارے فوجی محاذ پر چلے گئے جو مجھے کوئی ملا ہی نہیں......'' پھر سے اداس شکل والا emoticon۔

"I love maroon berets"

"man janbazam"

"I ishq commondos"

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے

جو کہلاتے ہیں ssg کے فرزند......

''یقین کرو اگر تم میری زندگی میں نہ ہوئے تو میری زندگی بھی کوئی زندگی ہوگی بھلا......؟'' تو یہ تھے چند جملے جو کہ ہنیا ذوالفقار کے f.b اسٹیٹس کی زینت بنے رہتے۔ فوجی سے شروع ہونے والی محبت آکر ختم ہوئی تھی کمانڈوز کے عشق پر......

چار سالوں میں بی ایس سی آنرز.... تو ہوا سو ہوا......مگر یہ بھی ضرور ہی ہوا تھا۔ اور اب یہ ڈھکی چھپی بات تو نہیں تھی کہ ہنیا کسی کمانڈو سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اور پھر آخری سمسٹر آگیا۔ اس کے آخری سمسٹر میں تھیسس شامل تھا اور یہ تھیسس اسے ناک رگڑنے پر مجبور کررہا تھا۔

اسے لیب میں ایک مخصوص قسم کی مٹی میں پودے اگانے تھے......وہ ہی پودے جو کہ ایک عام کسان اپنے کھیتوں میں بڑے آرام سے بیج بو کر اگالیتا ہے۔ مگر اس کے پودے اُگ کے ہی نہیں دے رہے تھے۔

وہ نہ جانے روز کیا کیا پڑھ، پڑھ کر ان پر پھونکتی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھلکے ہوئے مرجھائے ہوئے پودوں کے ساتھ، ساتھ ہنیا کا بھی ڈھلکا ہوا مرجھایا ہوا منہ......اور ایک وہ تھا اس کا کمانڈو......جو کہ مل کے ہی

نہیں دے رہا تھا۔ اور ایک یہ تھے...... اس کے پودے جو کہ اُگ کے نہیں دے رہے تھے۔

روزانہ وہ رونی صورت بنائے یونیورسٹی سے آتی تھی۔

"چلو ہنیا...... تمہیں کسی کسان سے ملواتا ہوں...... اس سے پوچھ لو......" اس دن ابو نے پھر سے اس کی رونی صورت دیکھ کر کہا تھا۔

"ابو......" وہ شاکڈ ہی تو رہ گئی تھی۔

"یہ پلانٹ اگر کسی زمین پر اگانا ہوتا تو ہر کوئی اگا سکتا ہے۔ یہ لیب میں اگانے ہیں...... اور وہ بھی loamy siltsoil میں...... جس کا آپ کو پتا بھی نہیں میں اینوائرمینٹل سائنسز پڑھ رہی ہوں۔ کوئی کسانیات نہیں اور یہ کہ مجھے کسان نہیں بننا......" ناک چڑھا کر تپ کر اس نے کہا تھا۔ امی بے اختیار ہنسی تھیں۔

"آپ ہنس لیں...... جبکہ میری جان پہ بنی ہوئی ہے۔" وہ کھانا چھوڑ کر منہ بنا کر بیٹھ گئی تھی۔

"کیا اس سلسلے میں کمانڈوز سے رابطہ نہ کیا جائے۔ سنا ہے وہ ہر طرح کے آپریشنز......" ذوالفقار صاحب نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ اور ابو کی اس بات پر اس نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں اس طرح دیکھا تھا کہ......

"ہاہاہا......" انہیں بات ادھوری چھوڑ کر قہقہہ لگانا پڑا تھا۔

بس اب یہی کسر رہ گئی تھی کہ لوگ اسے "کمانڈوز" کے حوالے سے چھیڑا کریں گے اور وہ بھی اس بات پر کہ اس بات پر کہ اس کے پودے نہیں اُگ کے دے رہے تھے۔

اس کے ساتھ دوسرا ہونے والا حادثہ...... ثنا کی بالکل ہی مختلف فیلڈ جوائن کرنے کا تھا۔ ایک سال ضائع کرنے کی وجہ سے وہ ثنا سے بھی پیچھے رہ گئی تھی۔ ثنا اب CSS کی تیاری کر رہی تھی۔ ملاقات اب بھی ہوتی تھی مگر...... Fb پہ زیادہ روبرو کم...... اس دن بالکل ہی غیر متوقع طور پر ثنا کی کال آئی تھی۔

"فری ہو......؟" چھوٹتے ہی اس نے پوچھا۔

"نہ بالکل بھی نہیں...... تھیسس میری جان کو آ گیا ہے۔" وہ بالکل ہی بے مروت ہو گئی تھی۔

"DFM" (در فٹے منہ) ثنا بے اختیار بولی تھی۔

اور وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"اچھا...... بتاؤ کیا کام ہے؟" اس نے جیسے احسان کیا تھا۔

"لائبریری جانا ہے، کچھ کتابیں چاہئیں CSS کے لیے تم چلو ناں میرے ساتھ۔"

"کیوں پھر کہیں گاڑی مار دی تم نے؟" وہ بھی ہنیا تھی، اس کی دوست اور بچپن کی دوست...... اس سوال پہ ثنا نے سیل فون کان سے الگ کر کے اسے گھورا...... یہ بھی ناں شیطان کی رشتے دار ہی ہے۔

"ہاں......" اور پھر نہایت ہی کانفیڈنس سے جواب آیا تھا۔

"تو یوں بولو ناں...... چڑا...... تمہیں مجھ سے زیادہ میری گاڑی کی لفٹ چاہیے۔"

"ہاں تو کیا...... دوست کہیں ہو تم پی...... یا رے...... والی۔" اور ساتھ ہی اس نے ایک عدد بوسہ فون کو کیا تھا۔ جو کہ دوسری طرف سے سنا گیا تھا۔

"اچھا لے چلوں گی۔ کب جانا ہے؟" وہ ہلکے سے ہنس دی۔ اور پھر ثنا اسے بتانے لگی تھی۔

سب کچھ طے کرنے کے بعد اس نے سیل فون بند کر کے گہری سانس لی تھی۔ یہ انتہائی سڑے ہوئے دنوں میں کسی معطر جھونکے جیسا تھا...... ثنا سے ملنا اور ایک پورا دن...... مستی بھرا دن...... گزارنا...... یہ نہایت خوش کن تھا...... دوستوں سے ملنا اور وہ بھی بے حد...... پرانے اور قریبی دوستوں سے ملنا...... یہ انسان کو اندر تک خوشگواریت سے بھر دیتا ہے۔

ہنیا بھی بھر گئی تھی...... خوشگواریت سے اور وہ بھی اندر تک......

☆☆☆

مومنہ کا بی پی شوٹ کر گیا تھا...... اتنا کہ وہ برین ہیمبرج سے بال، بال بچی تھی۔

وہ بے ہوش تھی اور ICU میں تھی۔

اس کے باپ کی نماز جنازہ بھی ہو چکی تھی اور علامتی قبر بھی PAF کے قبرستان میں بن چکی تھی۔

مگر وہ بے ہوش تھی......اور ICU میں تھی۔

کیا تھی اب اس کی زندگی......بابا کے بغیر......اس کے ہونٹ اب بابا کہنے کو ترسا کریں گے۔اس کی بانہیں اس لمس کو ڈھونڈا کریں گی۔وہ کس کے سینے پر سر رکھے گی اب؟ اور کس کو مان بھری آنکھوں سے دیکھے گی اور کون اسے چوڑیاں دلوانے لے جائے گا۔

''کیا اب بھی وہ ایسی ہی فرمائشیں کرے گی؟''

''اب کس کو وہ اسکیچ بنا، بنا کر دکھائے گی......

ہاں کس کو......؟'' گل ICU آکے باہر......اس حالت میں تھیں کہ کس کو روئیں۔ عجیب عالم کو......یا موی کو......

موی کی حالت ہی ایسی تھی کہ دل کرتا تھا کہ سر پہ ہاتھ مار، مار کر رویا جائے۔

سعد......بار، بار پوچھتا تھا۔'' موی کو کیا ہوا ہے ممی......؟''

''ممی...... کیا ''موی'' بھی بابا کی طرح چلی جائے گی؟''

''ممی......کیا موی......بھی اب نظر نہیں آئیں گی؟'' وہ نویں سال میں تھا اور مرنے کے مطلب سے آشنا ہوا تھا۔ معنی و مفہوم کے ساتھ نہ سہی......مگر اتنا تو جان ہی گیا تھا اب کہ جو مر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے، نظر نہیں آتے......تو وہ سوال کرتا تھا اور خوفزدہ تھا کہ کہیں موی بھی بابا کی طرح......

اور وہ تو بچہ تھا...... معصومیت سے سوال کرتا تھا مگر ایسا کرتے ہوئے نہیں جانتا تھا ماں کے دل پہ کیا گزرتی تھی؟

''ممی......'' اب کی بار اس نے گل کی کالی چادر کا کونا کھینچ کر منہ بسورا تھا۔

گل نے تھک کر اسے دیکھا......اور اندر جاتی نرس کو روکا تھا۔

''اسے اس کی بہن سے ملا لائیں پلیز......'' گل نے اس بیچارگی سے کہا کہ نرس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔

اس نے ہلکے سے سر اثبات میں ہلایا اور مسکرا کر سعد کو دیکھا۔

''آؤ، اندر چلیں۔'' نرس نے اپنا ہاتھ بڑھایا تھا۔

''تمہاری بہن سے ملیں گے۔'' اور بہن کا نام سن کر اس نے اپنا ہاتھ نرس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

اندر موی نلکیوں میں جکڑی لیٹی تھی......دونوں ہاتھ پٹیوں میں بندھے اور بے ہوش تھی۔

اسے دیکھ کر وہ خوفزدہ ہوا۔

''موی مر جائیں گی؟'' اس نے منہ بسور کر پوچھا تھا۔

''نہیں تو......موی تو سو رہی ہے۔'' نرس نے ہلکی سی سرگوشی کی اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر کہا تھا۔

''وہ ایسے تو نہیں سوتیں۔'' اس نے موی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''وہ تھوڑی سی بیمار ہے۔ اس لیے ایسے سوئی ہے......ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔''

سعد نے بے یقینی سے نرس کو دیکھا۔

''ہو جائے گی......پرامس......'' اب کے نرس نے اس کا ہاتھ تھام کر پرامس کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آؤ باہر چلتے ہیں۔'' اور پھر اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہی اس نے باہر کی طرف کا رخ کیا تھا۔ سعد اس کے ساتھ چلتے ہوئے بار، بار چہرہ موڑ کر موی کو دیکھتا تھا کہ......

''وہ ایسے تو نہیں سوتی تھیں۔'' باہر آتے ہی اس کی نظر ماں پر پڑی تھی کہ جو دیوار سے سر ٹکائے کھڑی ایک خاموش مرثیہ لگتی تھیں۔

نرس نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ وہ چونکیں۔

اس نے سعد کی انگلی گل کو پکڑائی تھی۔

''وہ ٹھیک ہو جائے گی۔'' اور پھر تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ گل نے آہستگی سے سر ہلایا اور پھر سر

دیوار کے ساتھ لگالیا۔ سدرہ ماں کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹتے ہوئے دونوں بازو اس کے وجود کے گرد لپیٹتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔ اور وہ خاموش کھڑی تھیں۔

وہ روم میں آئیں تو وہ بیڈ پر نہیں تھی۔ کل رات ہی اسے ICU سے روم میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ اسے بیڈ سے غائب دیکھ کر ان کے دل کو دھچکا لگا تھا۔

''موی.....'' وہ بے طرح سے بوکھلائی تھیں۔

بوکھلاہٹ اس لیے بھی زیادہ تھی کہ اسے تو ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کسی خدشے کے تحت ڈرپ کی پن کو دیکھا۔ اور ان کا خدشہ درست نکلا تھا۔

ڈرپ کی سوئی پہ بلڈ لگا ہوا تھا۔ یقیناً اسے کھینچ کر نکالا گیا تھا۔ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ مڑی تھیں اور سامنے سے دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ایک لمحے کا سکون اور پھر سے سکون غارت..... ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلی مرتبہ ان دونوں کا ٹاکرا ہوا تھا۔

اور آج مجیب عالم کی شہادت کو چوتھا دن تھا۔ گل کا دل چاہا کہ وہ اس دکھ پہ مل کر اکھٹے روئیں مگر وہ دونوں اپنی، اپنی جگہ پہ ساکت تھیں۔

گل کے ہونٹ پھڑ پھڑائے..... اور آنکھوں سے پانی پھسل، پھسل کر بہنے لگا..... وہ خاموش، پیلا زدہ چہرہ لیے کھڑی رہی..... اور پھر آگے بڑھ کر ان کے پاس سے ہو کر بیڈ پر آبیٹھی تھی۔

اس کی بائیں آستین ابھی تک فولڈ کی ہوئی تھی اور وہاں سے کھینچ کر ڈرپ کی سوئی نکالنے کی وجہ سے خون نکلنے کے بعد جم سا گیا تھا۔ دونوں ہاتھ پٹیوں میں بندھے ہونے کے باوجود سوجے ہوئے لگتے تھے۔

''کدھر گئی تھیں؟'' اپنے آنسو صاف کر کے لرزتی آواز میں انہوں نے پوچھا۔

جواب..... خاموشی۔

اتنی اور ایسی خاموشی کہ گل کو پلٹ کر دیکھنا پڑا۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں رکھے مٹھی میں کچھ دبائے خاموش نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے ٹانگیں سیدھی کر رکھی تھیں اور بیڈ کی کراؤن کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھی۔

اس خوشی پر انہیں اور رونا آیا۔

ڈر کے مارے اس سے کوئی بابا کا ذکر نہیں کر رہا تھا کہ کہیں پھر سے وہ..... اور نہ ہی یہ سوال کیا کہ ''ڈرپ کیوں اتاری۔''

''کچھ لاؤں کھانے کو۔'' آنسوؤں کو پیتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

گل مڑنے لگیں کہ اچانک ان کی نظر اس کے ہاتھ پہ جا پڑی۔

''موی.....'' ان کے اوسان خطا ہوئے..... اور انہوں نے جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے وہ چیز چھیننی چاہی تھی۔

''مجھے مرنے کی ضرورت نہیں رہی ممی..... یہ نیند کی گولیاں ہیں۔'' ماں کو دیکھتے ہوئے اور پٹی والا ہاتھ ان کے سامنے کھولتے ہوئے وہ بولی تھی۔

گل کے ہونٹ کپکپائے اور انہوں نے اس کپکپاہٹ کو روکنے کے لیے ہاتھ ہونٹوں پر رکھا..... مگر ہاتھ..... وہ بھی اس لرزش کو روکنے میں ناکام رہا۔

''کچھ کھانے کو دے دیں..... تاکہ میں یہ کھا سکوں۔'' اس نے پھر ہاتھ کی ہتھیلی کو ان کے سامنے کیا تھا۔

اس کا چہرہ بے تاثر اور اتنا سپاٹ تھا کہ گل کو حیرانی ہوئی۔

وہ حیران ہی تو کرتی آرہی تھی۔

اور پھر یک دم انہیں ادراک ہوا کہ اس کا سو جانا ہی بہتر تھا۔ ہاں کم از کم ابھی اس وقت اس کا سونا ہی ٹھیک تھا۔ کبھی، کبھی انسان کے پاس کچھ نہیں بچتا..... کچھ بھی تو نہیں..... ماسوائے راہِ فرار کے.....

☆☆☆

گاڑی کے ٹائر اچانک اور غیر متوقع طور پر چرچرائے تھے۔ ''یہاں کیوں روک رہی ہو، اِدھر نہیں ہے، آگے ہے لائبریری۔'' ثنا نے ایک دھپ اس کے کندھے پر لگاتے ہوئے کہا مگر وہ اور اس کے اندازِ

بے پروائی اس نے گاڑی کو بیک کیا اور پرفیکٹ پاتھ کے ساتھ لا کھڑا کیا تھا۔

ثنا اس کی کارروائیوں پہ ہی حیران تھی۔

"کیا تماشا ہے بھئی۔" اس نے ثنا کی تمام تر گھوریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیک ویو مرر اپنے اوپر سیٹ کیا۔ پرس سے لپ گلوز نکالا...... اس کی ایک عدد تہہ ہونٹوں پر جمائی ہونٹ سکیڑ کر پہلے دائیں رخ سے اپنا جائزہ لیا اور پھر بائیں رخ سے۔

دوپٹا جو کہ گلے میں تھا پہلا کر شانوں پر کیا اور پھر نہایت سلیقے سے اس کو آدھے سر پر جما لیا تھا۔ ایسے سلیقے سے کہ انتہائی سلیقہ مند خواتین دانتوں تلے انگلی چبانے پر مجبور ہو جائیں۔

سن گلاسز ڈیش بورڈ سے اٹھا کر آنکھوں پر لگائے، سیٹ سے پرس اٹھا کر اس کے اسٹریپ کو کندھے پر ڈالا اور پھر نہایت ہی احتیاط کے ساتھ پاؤں باہر نکالا تھا گاڑی سے۔

"یہ ہو کیا رہا ہے؟" ثنا کی حیرت تھی کہ بس مزید سے مزید تر ہوتی جا رہی تھی۔

گاڑی سے باہر نکل کر اس نے اپنے کپڑے ٹھیک کیے، وہ گھٹنوں تک آتی شرٹ اور گھیر دار شلوار میں ملبوس تھی۔ آہستہ، آہستہ نازکی سے بے پرواسی چال چلتی ہوئی بظاہر بے حد کانفیڈنٹ مگر اندر سے دھک، دھک کرتے دل کے ساتھ وہ اس طرف جا رہی تھی۔

"آخر وہ کس طرف جا رہی تھی؟" ثنا منہ کھولے اسے اس طرف جاتے دیکھ رہی تھی اور پھر جیسے ہی اس کی سمت کچھ واضح ہوئی تو ثنا کا دل چاہا کہ وہ رکھ کر کسی توپ کا گولہ اس پر دے مارے۔ وہ ایک عدد فوجی کی طرف جا رہی تھی۔

"ایکسکیوزمی......!" اس نے بڑے ہی انداز سے گن پکڑے سختی کا سا تاثر لیے لانگ بوٹ پہنے ڈیوٹی پر مستعد کھڑے اس فوجی سے کہا تھا۔

"السلام علیکم......!" اس کے ایکسکیوزمی کا جواب آیا تھا۔ وہ سٹپٹائی...... اور ذرا سی ہڑبڑائی......

"وعلیکم السلام...... وہ...... وہ یہاں لائبریری......"

اور پھر ہکلائی۔ اس نے سلام کیوں نہ کیا۔

"میڈم یہ لائبریری کا بیک گیٹ ہے، یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے، آپ وہ جو CSD کا گیٹ نظر آ رہا ہے ناں اس سے اندر داخل ہو کر سیدھا چلے جائیں اور آگے جا کر رائٹ ٹرن لیجیے گا۔ وہاں ہے لائبریری کا مین گیٹ آپ کو نظر آ جائے گا۔ گاڑی اندر لے جائیں آپ۔" وہ اپنی پوری کوشش کے ساتھ اسے سمجھا رہا تھا۔ اور وہ...... وہ......

☆☆☆

"ہائے اللہ، کوئی تو پکڑو اسے...... کہیں لڑکی بیچاری جان سے ہی نہ جائے۔" کہ کس قدر تمیز سے میڈم، میڈم کہہ کر وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ مگر پھر ہوا کیا کہ یہ ثنا کہاں سے آ گئی تھی اس کے پیچھے۔

"بہت شکریہ بھائی فوجی...... ہیا تم بھی شکریہ ادا کرو ناں فوجی بھائی کا۔"

برا ہو اس ثنا کی بچی کا...... عین وقت پر نہایت ہی غلط ٹائم پر آ گئی تھی۔ اس نے دانت پیس کر اک جھٹکے سے مڑ کر اسے دیکھا جواب دانت نکوسے اسے دیکھ رہی تھی۔

"شکریہ......"

اور پھر پتھر دے مارنے والے انداز میں شکریہ ادا کرتی وہ کھٹ، کھٹ کرتی گاڑی کی طرف مڑی تھی۔

قسم سے ثنا کو کچا چبا جانے کو دل کر رہا تھا۔ ثنا اپنی ہنسی روکتے ہوئے اس کے پیچھے، پیچھے آئی تھی اور گاڑی میں بیٹھتے ہی یہ بڑا سا قہقہہ اس نے لگایا تھا۔ اور پھر ہنستی ہی جا رہی تھی، ہنستی ہی جا رہی تھی۔

"منہ بند کرو اپنا ورنہ میں......" گاگلز ڈیش بورڈ پر پھینکتے ہوئے اس نے نہایت تنگ کر اسے دھمکی دی تھی اور دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی کہ ثنا کو ابھی لائبریری جانا تھا۔ بے حد برے موڈ کے ساتھ وہ گاڑی اندر لے کر گئی تھی۔

قسمت سے آج ایک موقع ملا تھا مگر وہ بھی ثنا کی بچی نے بھائی کہہ کر غارت کر دیا تھا۔

ہاں ہوتے ہوں گے فوجی جوان ساری مخلوق کے بھائی لیکن نہیں تھے تو بس ہنیا ذوالفقار کے نہیں تھے۔

''خبردار جو کسی نے بھائی کہا۔ ہاں...... اور جس نے بولنا ہے وہ اپنا منہ سنبھال کر آئے (ثنا کے علاوہ) سلامت نہیں رہے گا۔'' گاڑی کو پارک کر کے وہ مین گیٹ پہ ID کارڈ نکال کر اندر آئیں تو اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔ وہاں ایک عدد توپ رکھی ہوئی تھی اور بھی دوسرے ایسے ماڈلز تھے جو کہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ یہ جگہ فوجیوں کے زیرِ تسلط ہے۔

''ثنا یہ کون سی لائبریری ہے؟'' بے دھیانی میں اس نے ثنا سے پوچھا۔ اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے۔

''پتا نہیں، مجھے تو انکل سرور نے کارڈ دیا تھا اپنا کہ یہاں سے دیکھ لوں بکس اور بتایا تھا کہ CSD کے پاس ہے۔ لوگ یہاں CSS کی تیاری کرنے آتے ہیں۔'' وہ بھی سحر زدہ سی اردگرد دیکھتے ہوئے چلتے ہوئے بول رہی تھی۔

''ہاں بولو......'' ہنیا جو کہ اردگرد کے نظاروں میں مصروف تھی ذرا سی بے پروائی سے بولی تھی۔

''لے بھئی بیٹا تیری تو لاٹری نکل آئی۔'' اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر ثنا نے کہا تھا۔

ہنیا نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر اس کی انگلی جو کہ کارڈ کے اوپر لکھے گئے الفاظ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

انکل سرور اس کے تایا تھے اور سول سرونٹ تھے۔ ان کی سفارش پہ ثنا کو خصوصی اجازت ملی تھی۔

''دکھاؤ ذرا کارڈ......'' اور وہ لائبریری کے انٹرنس گیٹ پر رک کر بیگ سے کارڈ نکالنے لگی تھی۔

اور جب اس نے کارڈ نکال کر دیکھا تو

''ہنیا......''

"Army public library" ہنیا نے یونہی ایک نظر ڈالی اور پھر جیسے کرنٹ لگا تھا اسے۔

''آ...... آر...... آرمی۔'' وہ بے طرح سے بکلائی۔ اور اس کی سانس اکھڑی۔

''چیخ مت مارنا...... چیخ مت مارنا پلیز۔'' ثنا نے بوکھلا کر دونوں ہاتھوں سے اسے کول ڈاؤن کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

''آرمی، آرمی۔'' جوش سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''ہاں، ہاں حوصلہ، حوصلہ......'' ثنا نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''اندر فوجی ہوں گے۔'' بے حد اشتیاق سے پوچھا گیا۔

''ہاں مگر سول کپڑوں میں۔'' ہنیا نے اس کے جوش پر رکھ کر ٹھنڈا پانی بہا دیا تھا۔

اس نے منہ بنا کر ثنا کو دیکھا اور پھر گیٹ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

وہ اپنی آنکھوں کو اس طرف جانے سے روک نہیں پائی تھی...... باوجود اس کے کہ اس نے انتہائی کوشش کی تھی کہ وہ اس طرف نہ دیکھے مگر......

دیوار خالی تھی۔

اس نے سختی سے دانت پر دانت جمائے۔ مضبوطی سے پیروں کو زمین پر جمائے رکھا...... اور سر جھکا لیا...... آنکھیں بند کر کے کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ گلے سے کچھ نیچے اتارا پھر گل سے بازو چھڑوا کر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگتی چلی گئی۔ وہ عائلہ اور موی اس وقت لاؤنج کے داخلی دروازے پر کھڑی تھیں۔ گل نے بے حد بیچارگی سے عائلہ کو دیکھا۔

''یہ روتی کیوں نہیں ہے؟ اس طرح کرے گی تو مرجائے گی۔'' عائلہ نم لہجے میں بولی تھیں۔

گل خموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں کہ کچھ غموں کا علاج آسمانوں سے ہی اترتا ہے جو انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہوتا۔ سعد بھاگتا ہوا عائلہ کے پاس آیا تھا۔

''عائلہ آنٹی...... موی کدھر ہیں؟''

''کمرے میں گئی ہے۔'' وہ اسی طرح بھاگتا ہوا اس کے کمرے تک گیا تھا۔

''موی......!'' اسے دیکھ کر وہ یک دم دروازے پر ہی رک گیا تھا۔ وہ جوش میں اس سے لپٹ جانا چاہتا تھا مگر اس کا انداز دیکھ کر وہ رک گیا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے...... بے تاثر سی سامنے والی دیوار کو دیکھے جا رہی تھی۔

''موی......!'' اب کہ اس نے مومنہ کے پاس جا کر اس کا بازو ہلایا۔ اس نے چونکے بنا رخ بدل کر سعد کو دیکھا۔

''آپ کو کیا ہوا تھا؟'' اور پھر اس کے دونوں بازوؤں پہ اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر اس نے پوچھا تھا۔

موی نے اس سے نظریں پھیر کر اپنے بازوؤں پہ دھرے اس کے ہاتھوں کو دیکھا۔ اس نے چاہا کہ سعد کے لمس سے اسے ویسی ہی حرارت ملے جیسے کہ بابا...... آہ...... کہ وہ محروم ہو چکی تھی۔

''سعد......'' اس نے سعد کے دونوں ہاتھ اپنے پٹیوں میں بندھے ہاتھوں میں لیے۔

''تم نے بڑے ہو کر کیا بننا ہے؟'' اس کا لہجہ اتنا عجیب تھا کہ سعد سہم گیا تھا۔

''پائلٹ......'' سہم کر ہی سہی مگر جواب دے دیا تھا اس نے۔ اور اس نے ایسی نظروں سے سعد کو دیکھا کہ وہ خوفزدہ ہوا تھا۔

''تم نے پائلٹ بننا ہے، ہاں تم نے پائلٹ ہی تو بننا ہے۔'' اس کا لہجہ بھی عجیب تھا۔ وہ ہسٹریک ہو رہی تھی۔ سعد نے منہ بسورا تھا۔

''موی بابا کہتے تھے ناں اور آپ نے بھی پائلٹ بننا ہے۔'' اسی بسورتے ہوئے منہ کے ساتھ اس نے کہا تھا۔ ''ہاں تمہیں PAF کو ہی جوائن کرنا ہے اور پھر مر جانا ہے۔ چھوڑ جاؤ گے تم بھی ناں تم بھی چھوڑ جاؤ گے ناں؟'' وہ سعد سے پوچھ رہی تھی اور اس کی آواز کپکپائی نہ ہی آنکھیں نم ہوئی تھیں...... وہ ابنارمل سی دکھتی تھی۔ اتنی کہ سعد کو وہ اپنی موی محسوس نہ ہوئی۔ وہ کوئی اور تھی...... کوئی اور پھر سعد نے اپنے

ہاتھ اس سے چھڑائے اور روتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگ گیا۔ مومنہ نے قہر آلود نظروں سے اسے روتے دیکھا تھا۔ اور ہونٹ کاٹ، کاٹ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی مگر......اور پھر اس نے پٹی میں بندھا ہاتھ مار کر سائڈ ٹیبل پر پڑا پانی کا جگ گرا دیا تھا۔

☆☆☆

مجیب عالم کی طرح حبیب عالم پائلٹ نہیں تھے لیکن وہ بھی PAF کے ہی ملازم تھے۔ مجیب عالم کی شہادت کو ایک ماہ گزر چکا تھا۔ کسی نے بھی مومی سے ایگزامز کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ اس سے یہ بات کی جاتی؟ سب خاموشی سے اس وقت کے انتظار میں تھے کہ جب وہ نارمل ہو کر اس دکھ کو اپنانے پر راضی ہو جائے۔ سعد باقاعدگی سے اسکول جا رہا تھا۔ اور مومی......

وہ......کبھی اونچی آواز میں میوزک سنتی رہتی یا پھر گھنٹوں سوئی رہتی......نیند کی دوا کے زیرِ اثر......کوئی اس سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔

اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کی حالت اسے کچھ کہنے سے روکتی تھی۔ منع کرتی تھی اور یہ کہتی تھی کہ اسے وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا جائے۔

اب بھی وہ کافی دیر سے نظر نہیں آتی تھی۔

''مومی......مومی کہاں ہے؟'' گل نے یک دم بری طرح چونک کر پوچھا تھا اور لاؤنج میں موجود عائلہ نے ذہن پر زور دیا کہ آخری بار اس نے مومی کو کہاں دیکھا اور کب......

''کمرے میں ہوگی، میں دیکھ کر آتی ہوں۔'' اور پھر عائلہ نے اسے بیڈ پر آڑھا ترچھا لیٹا دیکھا وہ سو رہی تھی۔

ایک سکون بھری سانس ان کے اندر تک اتری تھی مگر اس سکون میں بھی بے چینی تھی ہاں مومی کے لیے شدید بے چینی......وہ کافی دیر کھڑی مومی کو دیکھتی رہی تھیں جو شدید گرمی میں بھی بند پنکھے میں بے سدھ سو رہی تھی۔ نیند کی دواؤں کا اثر تھا انہوں نے مڑ کر دوبارہ مومی کو دیکھا اور پھر نظر پلٹتے، پلٹتے بے ارادہ مومی کی ڈریسنگ ٹیبل پر جا پڑی تھی۔ اور ان کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ چوڑیوں کا اسٹینڈ خالی پڑا تھا۔ یوں جیسے کہ چوڑیاں کبھی اس میں رکھی ہی نہیں گئی تھیں۔

وہ بے آواز روتی رہی تھیں۔ اور پھر ڈھیر سارا رونے کے بعد اور خود کو ہلکا کرنے کے بعد وہ گل کے پاس آئی تھیں۔

''وہ یوں ہی نیند کی دوا کھاتی رہی تو ایڈکٹ ہو جائے گی بھابی۔'' نارمل آواز میں کہتے ہوئے وہ ان کے پاس بیٹھی تھیں۔ ان دیورانی، جیٹھانی کا رشتہ بہنوں سے بڑھ کر تھا۔ یہ سب آپس میں کزنز تھیں۔ گل نے عائلہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ کتنی نارمل تھی یہ اس کا چہرہ بتا رہا تھا۔

''میں اور کیا کروں عائلہ......اس کے بی پی کا مسئلہ ہی نہیں حل ہو رہا ہے نارمل ہی نہیں ہوتا۔'' گل نے بیچارگی سے جواب دیا۔ اسی بیچارگی کے عائلہ کو پھر سے ہونٹوں کو بھینچ کر گلے سے کچھ نیچے اتارنا پڑا تھا۔ یہ پانی کا ذخیرہ آخر یہ کب خشک ہوگا......آخر کب......؟

☆☆☆

اس کے گلے میں کچھ چبھا......

''مومی......'' اور ایک سرگوشی کرتی ہوئی آواز......اس کے ہونٹ خشک پڑنے لگے۔

''مو......می......'' پھر سے سرگوشی ابھری۔ وہ نیند ہی میں کسمسائی۔ زبان پھیر کر خشک ہونٹوں کو تر کرنا چاہا۔

''مومی......'' اور وہ سرگوشی کرتی ہوئی آواز......پھر یہ ہوا کہ زبان بھی خشک ہو چکی تھی۔

''مومی......'' اب کی بار ہونے والی سرگوشی کے بعد اس نے چاہا کہ اسے اپنے گالوں پر پھر سے وہ ہی لمس محسوس ہو سکے لیکن ایک دم اس کی آنکھ کھلی تھی، سانسیں رکیں۔ وہ چت لیٹی تھی اور نظر کی گرفت میں سب سے پہلے آنے والی چیز تیز چلتا ہوا پنکھا تھا۔ اک لمحہ لگا اور اس پہ بدترین انکشاف ہوا......اس لمس کو اب وہ خواب میں بھی محسوس کرنے سے قاصر تھی۔ وہ ساکت لیٹی تھی، گلے میں پھر سے کچھ چبھا۔ اور اس شدت

سے چھا کہ اسے پانی کی طلب محسوس ہوئی تھی۔ بیڈ سے پاؤں نیچے لٹکا کر چپلیں پہنے بنا وہ کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اور اسے اتنا تک محسوس نہیں ہوا کہ سعد کا بیڈ خالی تھا۔ وہ باپ کی شہادت کے بعد سے ماں کے پاس سو رہا تھا اور یہ موی کے علم میں نہیں تھا۔ فریج میں سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے وہیں کھڑے، کھڑے ہی بوتل منہ سے لگائی تھی۔ حالانکہ مجیب عالم منع کرتے تھے یوں پانی پینے سے مگر آج...... پانی پیتے، پیتے وہ مڑ کر کچن سے باہر آئی اور...... اور...... بوتل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پیندے کے بل زمین سے ٹکرائی اور پانی چھلکا اور پھر بوتل لڑھک کر بہنے لگی۔ وہاں، وہاں مجیب عالم تھے...... وہ تھے...... باخدا وہ ہی تو تھے...... لاؤنج کا داخلی دروازہ اور کچن کا دروازہ آمنے سامنے تھا اور وہ وہ لاؤنج کے داخلی دروازے سے اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ ڈانگری (مخصوص یونیفارم) پہنے ہوئے تھے۔

''موی کو نہ جگایا جائے...... اللہ کے واسطے اسے نہ جگایا جائے۔'' وہ سانس کو بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اس کے جسم میں گردش کرتی۔

حبیب عالم لاؤنج کے دروازے سے اندر داخل ہوئے اور ان کے پیچھے عائلہ تھی...... جس نے لاؤنج کا دروازہ بند کیا تھا۔ وہ ابھی ابھی آئے تھے۔ مگر موی کو یوں کھڑا دیکھ کر پہلے وہ پریشان ہوئے اور پھر اسی پریشانی کے عالم میں اس تک آئے تھے۔

''موی۔'' انہوں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ ''جگا دیا تھا ناں اسے۔''

وہ چونکی...... سکتہ ٹوٹا...... اور پھر سب بکھر گیا۔ کسی دھوئیں کی طرح تحلیل ہوتا گیا۔ اس نے چاچو کا چہرہ دیکھا...... اور پھر اس دروازے کو...... سب اس dangri کا قصور تھا۔

''آپ یہ پہن کر میرے سامنے مت آیا کریں...... یہ پہننا ہے تو یہاں سے چلے جائیں۔'' دو قدم پیچھے ہٹ کر اس نے بدتمیزی سے بہت بری طرح شاؤٹ کیا تھا۔ حبیب عالم شاکڈ ہوئے۔ تیزی سے وہ ان کے پہلو سے ہو کر نکلی تھی اور کمرے تک نہیں جا پائی تھی۔

وہ چند قدم چل کر وہیں زمین پر سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھتی چلی گئی تھی۔

''آہ......'' بے ساختہ وہ کراہی تھی۔

''موی......'' حبیب اور عائلہ اس کی طرف بھاگے۔

''بی پی ہائی ہو گیا ہے اس کا......'' عائلہ نے گھبرا کر کہا۔ حبیب عالم تیزی سے آپریٹس لینے بڑھے۔

''موی...... اٹھو، یہاں صوفے پر آؤ۔'' عائلہ نے اسے اٹھانا چاہا۔ اس نے بازو چھڑوایا اور کھڑی ہو گئی مگر لڑکھڑا گئی تھی۔ عائلہ نے زبردستی اس کا بازو پکڑ کر کھینچ کر اسے صوفے پر بٹھایا تھا وہ ابھی تک سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئی تھی۔ وہاں بہت سی سرگوشیاں تھیں جو اس کے اندر ابھر، ابھر کر ڈوب رہی تھیں۔

''موی......'' آوازوں کی بھنبھناہٹ تھی۔

''تمہیں چوڑیاں لینی ہیں؟''

''میری بیٹی چیتنس ہے چیتنس......''

''ہاں تم پائلٹ بنو گی PAF کی پائلٹ......''

''موی......'' وہ سرگوشیاں نہیں احساس تھا بس تھا جو کہ مار رہا تھا۔ کاٹ رہا تھا۔ زندگی جیسی چیز کو بدن سے رفتہ، رفتہ، آہستہ، آہستہ کھینچ رہا تھا۔ اس کے تنفس کی رفتار تیز ہوئی۔

''موی......'' عائلہ گھبرا کر اس کی پشت سہلانے لگی۔

''حبیب!'' پھر انہوں نے گھبراہٹ میں آواز دی۔

''تمہارے بابا یہ اڑاتے ہیں۔'' اور وہاں جملے بازگشت کی طرح اس کے ذہن میں آتے پرزوں کے مانند ہو گھومتے تھے۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا...... اس کے چہرے پر تکلیف اپنی پوری شدت سے نمودار ہوئی تھی۔

''موی......'' عائلہ نے گھبرا کر اس کا چہرہ تھپتھپایا اور موی یک دم آگے جھکی تھی۔ اسے قے آئی تھی اور......

''حبیب......'' عائلہ نے اب کہ چیخ کر پکارا تھا۔

(باقی آئندہ)

# عزت دار

قانتہ رابعہ

اماوس کی کالی راتوں میں سے یہ بھی ایک کالی رات تھی۔ ہولناک سناٹا چاروں جانب پھیل چکا تھا۔ تاریکی نے اپنی چادر ہر سو پھیلا رکھی تھی...... اس ہیبت ناک سناٹے کو کبھی کبھار مینڈکوں کے ٹرٹرانے یا جھینگر کی آواز ختم کرتی۔

نور پور سے گزرنے والی ریلوے پٹری سے... بہ مشکل ستائیس اٹھائیس قدموں کے فاصلے پر پکھی واسوں کی خیمہ بستی آباد تھی۔ انہی تاریک راتوں میں

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ان خیموں اور جھگیوں میں کسی نہ کسی فرد کا اضافہ ہوتا...... لالٹین، چارجنگ بیٹری اور موبائل کی اسکرین کے ذریعے روشنی کا کچھ نہ کچھ بندوبست ضرور ہوتا...... آبادی میں اضافہ ایک تو فطرت کی طرف سے نئی روح دنیا میں بھیجنے کے طریقے سے ہوتا یا پھر کسی نہ کسی خیمے میں کوئی لڑکا کسی لڑکی کو بھگا کر لاتا یا پھر لڑکی خود بھاگ کر آجاتی...... اردگرد کی آباد بستیوں اور کالونیوں کے لیے یہ جرم ہوگا لیکن ان پکھی واسوں کے لیے یہ ایک عام سی بات تھی۔ شاید ہی کوئی چاند ایسا غروب یا طلوع ہوا ہو جب تاریک رات کا یہ کھیل ان جھگیوں کا مقدر نہ بنا ہو۔

ایسی ہی ایک تاریک رات تھی جب دھماکے کی آواز سے سارے ہڑبڑا کر اٹھے۔ دھماکے کی آواز اس قدر شدید تھی کہ بچے تو سہم کے چپ رہے مگر عورتوں نے بہ آواز بلند رونا شروع کردیا۔ پھر جھگی اور خیمے سے ایک، ایک کرکے مرد نکلے اور دھماکے کی آواز کی سمت میں اندھادھند بھاگے جارہے تھے۔ دھماکے کی شدت سے جھگیوں کی ہر شے اور بلند ہوکر نیچے گری ریلوے پٹری تک پہنچتے، پہنچتے انسانی چیخیں، شور کی آوازیں غالب آگئیں۔ یہ آوازیں اتنی بھیانک تھیں کہ اردگرد کے گاؤں کے لوگ بھی اٹھ بیٹھے...... چند لمحوں کی دیر تھی ایمبولینس کی آوازیں شروع ہوگئیں۔

''اوئے میں مرجاواں' یہ تو گڈیوں کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔'' مائی جیناں نے کلے پیٹے۔

''وے غوث توں وی اٹھ...... جا ویکھ کوئی مر مرا تو نہیں گیا۔'' غوث کی ماں جیناں نے غوث کو اٹھانے کی کوشش کی جو بھینسوں کی طرح سو رہا تھا۔ وہ پھر بولی۔

''اوئے وہ دیکھ کریما...... نادر، مختار سب جارہے ہیں...... اٹھتا ہے کہ نہیں۔'' پر غوث بے سدھ سویا رہا۔

جھگی سے نکلتے، نکلتے غوث کے باپ دلدار نے نظر ڈالی۔ سارے ہی گبرو جوان پٹڑی کی طرف بھاگنے والوں میں موجود تھے سوائے غوث کے..... بھاگتے دوڑتے اس نے موٹی سی گالی غوث کی طرف لڑھکائی...... ''ہونہہ ادھی راتی منگ کو سناتا رہا ہوگا...... اب کہاں اٹھے گا۔'' اس کے ساتھ جانے والے نادر نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

''ہاں بھرا...... عزت دار گھرانے کی منگیت ہے ناں......'' غوث کے باپ کو اندازہ نہ ہوا کہ وہ طنز کررہا ہے یا عام سی بات...... بہرحال دھماکا جتنا شدید تھا نقصان اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا۔ کچھ مسافر زخمی ضرور ہوئے تھے مگر بچت ہوگئی...... ایک، ایک کرکے سارے پکھی واسے واپس آنا شروع ہوگئے۔ واپسی کے سفر میں نادر نے پھر سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

''ویسے بھرا جو کام بغیر دام کے ہوسکتا ہو اس پر دام لگانا کہاں کی عقلمندی ہے پر شاوا بھئی شاوا، آج کل کی پود کا ہر کام ہی وکھرا...... جھلے کہیں کے۔''

غوث کا باپ شرمندہ سا ہوگیا بات تو سولہ آنے صحیح کی تھی نادر نے...... پر وہ کیا کرتا...... بیٹا بھی رب نے ایک دیا وہ بھی رج کے بے وقوف...... بچپن کی منگ سے چٹا انکار کرکے ضد پکڑ لی ویاہ کرنا ہے ماے کی دھی نوری سے...... اس کا پیو کویت جاکے راج مزدوری کیا کرنے لگا سارے طور طریقے ہی بدل ڈالے۔ غریب آباد میں تین مرلے کا پلاٹ لے کر تین منزلہ مکان بنایا...... شہری لوگوں والے سارے نخرے بھی ساتھ ہی آگئے...... غوث کے باپ دلدار نے بیٹے کو پہلے تیوریاں ڈال کر دکھائیں پھر طعنے تشنیع سے کام لیا۔ ہاتھا پائی، خرچہ پانی بند کرنے کی دھمکی بھی دے ڈالی مگر وہ بہت ہی ڈھیٹ ہڈی کا بنا ہوا تھا۔ ہر بات کا ایک ہی جواب۔

''جتھے چاہ اوتھے راہ......'' سارے رشتے داروں نے مل کر کلیجا چھلنی کردیا۔ بھانت، بھانت کی بولیاں...... ''اوئے بے غیرتا فرمائش سنی ہے اپنے ماے کی۔ ویاہ کرنا ہے تو چار بندے لے کر آؤ' ساتھ میں بری کے دو جوڑے، جوتے، ہار سنگھار بھی ہو، سونے کی مندری بھی ضرور ہو...... پھر ویاہ کے اگلے دن پوری برادری کی روٹی بھی کرو......''

دوسری آواز آئی۔'' ہے ڈب کے مرجا غوث،

آج تک ایسے نہیں ہوا۔ جب بھی ویاہ کرتے ہیں اپنے سے نیچوں میں کریں یا اوپر......بس ایک تھالی ایک توا اور جگی کا خیمہ دیتے ہیں، یہ بڑے نواب زادے آگئے۔ ہونہہ روٹی وی کرو، کٹے کے گوشت کا سالن اور دیگ بھر کے مٹھے چاولوں کی پکاؤ......" حقارت کی وجہ سے کہنے والے نے بائیں طرف تھوکا۔ غوثا ہنستا رہا......وہ جانتا تھا انگور کھٹے ہیں، اِک واری اس کی منگ، اس کے مامی کی دھی نوری کو دیکھ کر سب کا جی چاہتا ہے اپنی زنانی بنانے کو......یہ تو کھیڈ مقدراں دی ہے۔ رب نے غوثے کی مراد پوری کی......بستی کے مردوں نے تو جولعن طعن کی سو کی اس کی دادی سب سے زیادہ بھڑک اٹھی۔

"وے غوث، لکھ لعنت تیرے چاہ تے تیرے ویاہ تے، اِک نہ دو پورے سولاں ستراں ہزار کا خرچہ کر کے ویاہ کرے گا......اِک نوری رہ گئی ہے دوہٹی بنانے کو دفع دور......" غصے سے وہ منہ پھیر لیتی۔ "پہلے پتر نے اپنے پیو کی نہ سنی اب اس پیو کی پتر نہ سنے گا......شاوا بھئی شاواہ......" غوثا ماں کی طرف دیکھ کے چپ ہو گیا۔ اس کی ماں کی اپنی ساس سے کبھی نہ بنی تھی، اب ماں کے علاوہ اس کی سگی بھتیجی آ کر اس بڑھیا کے سینے پر کیا، کیا مونگ نہ دلے گی......کوئی دکھ سا دکھ تھا غوث کی دادی کو......

"آئے ہائے......" وہ ٹھنڈی سانس بھر کے نواسیوں کی گنتی کرتی، شاداں فرحانہ، زرینہ، رضیہ، گلزاراں......کبھی مولا اس جھلے کا دل بدل دے وہ اپنے مانوں کی دھی نوری سے آنکھیں پھیر لے اس کی نواسی پر دل ٹک جائے......بس اک توا، اک تھالی، تیسری تو کوئی چیز بھی نہ مانگنا پڑے۔

کیا دادی، کیا چاچا، کیا تایا سب سمجھا کے تھک گئے مگر غوث کی ہاں نہ میں نہ بدلی......رانجھا اور پنوں بھی اس دوڑ میں کہیں پیچھے رہ گئے۔

☆☆☆

ریل کی پٹڑی کے ایک طرف غوثے کی جگیوں کی بستی تھی دوسری طرف غریب آباد کے مکانات ......دو سے پانچ مرلے کے مکانات انہی میں سے ایک سربفلک مکان غوثے کے مامے کا تھا جس کی دھی نوری عرف رانی کو وہ دل دے بیٹھا تھا۔

ماں، باپ نے نام نوری رکھا تھا تو سوچ کے ہی رکھا ہوگا دل کا نور آنکھوں کا سرور اور اگر اسے نوری کے ساتھ ماما، مامی، رانی کہتے تھے تو وہ تھی رانی......مہارانی......صراحی دار گردن، سنہری دمکتا رنگ، سرخ سیب جیسے گال، بڑی، بڑی آنکھیں جیسے جھیل......کالے سیاہ بالوں کی ناگن کی طرح چٹیا باندھ کے چلتی تو غوثے کے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی۔

غوثا تھا بھی بڑا شدت پسند......جھلا......رانی کو صبح نہ دیکھ لیتا تو صبح ہی نہیں ہوتی۔ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھوتا، ماں سے چائے کا پیالہ بنوا کر سُڑک کر چائے پیتا، پائے کھاتا اور منہ پونچھتا مامے کے گھر روانہ ہو جاتا۔ بغیر کچھ کہے بغیر کچھ بولے ایک نظر رانی پر ڈالتا اور دروازے سے باہر نکل آتا......زندگی کی طرف لوٹ آتا اس کا خیال تھا جس دن وہ رانی کو دیکھے بغیر روزی، روٹی کے لیے نکلتا اس دن ضرور کھٹا کام ہو جاتا ہے، کسی سے جھگڑا، نقصان یا کچھ اور......زندگی کی صراحی میں دن رات ایک، ایک کر کے گر رہے تھے۔ غوثے کی ماں اکثر اسے لے کر بیٹھ جاتی۔

"پتر میرا میکا بڑا ٹور اور عزت والا ہے کوئی ایسا کم نہ کر بیٹھنا کہ میری بھتریہہ (بھتیجی) کی عزت پر حرف آئے۔ اسے لانا بڑا سوکھا ہے، وی پنجی (بیس، پچیس) ہزار ہی لگیں گے مگر رکھنا بڑا اوکھا ہے۔ میرے بھرا کے گھر میں روز ہانڈی پکتی ہے، روز کپڑے دھلتے ہیں، بول اگر اتنا خرچہ برداشت کرے گا تو پکا کم کروں ورنہ ایک توے اور تھالی کے بدلے اپنے چاچے، پھوپی کی دھی سے رشتہ جوڑ لے۔"

ماں کی بات سن کر غوث نے اپنے ڈولوں والے بازوؤں کی طرف ایسے دیکھا جیسے کوئی باڈی بلڈر دیکھتا ہے اور بولا

''اماں...... یہ بازو رب نے کما کے کھانے اور کھلانے کے لیے دیے ہیں، بتا مجھے ہے کسی کا میرے جیسا کاروبار...... تجھے بھی روز کا پورا سو روپیہ دیتا ہوں، خود اپنا بھی خرچہ پانی رکھتا ہوں اب کو بھی ضرورت .... پڑتی ہے تو مجھ سے ہی مانگتا ہے، کیا اپنی زنانی کو بھوکا ماروں گا؟''

ماں چپ ہوگئی...... کہتا تو ٹھیک ہے...... رب نے بڑا آسرا بنایا ہے۔'' وہ صبح سویرے پلاسٹک کی بوتلیں، چھان بورا، اخبارات کی ردی کے لیے نکلتا۔

رات کو واپس آتا تو جیب پیسوں سے بھری ہوتی...... گلی گلی، کونے کونے میں جانا، دن میں دو دفعہ پھیرا لگانا...... پورے علاقے میں چکر لگا، لگا کر وجود تھک جاتا مگر ذہن تروتازہ ہی رہتا۔ اسے اپنے کام سے عشق تھا، اخبار کے انہیں صفحات، باسی روٹیوں کے انہی ٹکڑوں اور بوتلوں میں رب نے اس کا رزق رکھا تھا اور اسی رزق کے بدلے میں رانی اس کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ خالی پیٹ تو پیار محبت کی باتوں کا مول بھی خربوزے کے چھلکے کی طرح ہوتا ہے۔

دولھوں کی خوشبو کے بعد بسا ند ہی بساند اس کے بس میں ہو تو سونے کی مندری کیا رانی پوری کو ہی سونے میں تول دیتا مگر سونے کا ریٹ بھی تو آسمان کی طرف چھلانگیں مار رہا تھا۔ دل کا وہ غنی تھا، جمع جتھا کرنے والا ہوتا تو سونے کی مندری بھی بنا ہی لیتا۔ خیر جنونیوں کی طرح عید، شب برات پر بھی وہ ایک پھیرا لگا کر دو چار سو کما ہی لیتا تھا...... اس کا دل پسند کام شام کے وقت دس، دس کے دن بھر کے نوٹوں کو جمع کرنا، گننا اور شادی کے لیے مطلوب رقم کا حساب لگانا رہ گیا تھا۔

رانی اس کا تصور تھی، خیال تھی، منبر و محراب تھی۔ اس کی حیاتی تھی۔ جب وہ گلیوں میں چھان بورے کی صدا لگاتا، رانی کی آواز اس کے کانوں میں رس گھولتی، چلتے، چلتے ٹھٹکنے لگتا تو پوری چھب سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔

''جب تک رانی میرے دل کی مہارانی نہیں بنے گی۔ میری کمائی اپنے اوپر خرچ کرنا حرام ہے۔'' باپ کی کمائی سے دو ایک سوٹ سلواتا اور آرام سے پورا سال گزار لیتا۔

اس کا حوصلہ جوان تھا اچانک منزل اس کے سامنے آگئی۔ جھک کر اس کے قدموں تلے آگئی...... اخبارات کی ردی میں سے نئے نویلے کڑکڑاتے دس بارہ نیلے نوٹ نیچے گرے...... آئی لکشمی کو کون ٹھکراتا ہے...... بازار گیا اپنی رقم ملائی سونے کی مندری، چاول چینی، گوشت لے کر گھر پہنچا۔

باجوں گاجوں کے ساتھ بارات رانی کے دروازے پر تھی۔

غوثے کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔

بستی والوں کے لیے یہ انہونی چیز تھی۔

''اتنا خرچہ...... تین جھگیاں نئی بن جائیں اتنی رقم میں۔'' دادی نے کلس کر کہا۔

رانی سرخ چمکیلے سوٹ، نتھ، ٹیکے اور پھولوں کے زیور میں نئی نکور جھگی میں داخل ہوئی۔ یہ جھگی اس نے تحفے کے طور پر بنوا کر دی تھی۔ جھگی میں اس کا بری اور جہیز کا سامان اس کی ساس نے بڑے سلیقے سے سیٹ کیا ہوا تھا۔ جھگی میں داخل ہو کر اس نے پڑی کے پار میکے پر نظر ڈالی چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اپنا نور ان پر نچھاور کر رہا تھا...... اس کے پیچھے ہی غوثا اندر داخل ہوا۔

''دیکھو کیسے مستیاں کر رہا ہے، چودھویں کا چن......'' اس نے رانی کو مخاطب کیا۔

ساری رات دونوں کی باتیں بھی ختم نہ ہوئیں یہاں تک کہ کھیا کا مرغا بانگ پہ بانگ دینے لگا۔

غوث نے اگلے دن مامے کے گھر سے زیادہ اچھا کھانا دیا۔

میٹھے چاولوں کی دیگ...... کٹے کا شوربے والا گوشت، تندور کی روٹیاں اور مولی، گاجر کا سلاد...... مامے کے خاندان کے لیے تو اس نے نلکیوں سے پینے والی بوتلیں بھی منگوائی ہوئی تھیں۔ اپنی برادری

کو اس نے جگنیوں کے سامنے دری بچھا کر کھانا کھلایا جبکہ مامے کے گھر والوں کے لیے اس نے کرائے کی میز کرسیاں منگوائیں۔ سوڈے واٹر کی بوتلیں اپنے ہاتھوں سے کھول کر انہیں پیش کیں......اس کا انگ، انگ خوش تھا۔ آخر کو عزت دار لوگ ہیں پورے شہر میں ان کی عزت ہے......اس کا ماما عبدالکریم کو پتیا مشہور تھا۔ وہ کیسے مامے کی آج اتنی عزت نہ کرتا۔

ویسے کے بعد بہت عزت سے وہ ان کو پٹری تک رخصت کرنے گیا۔ ہر آنے والا دن رانی سے اس کی محبت میں اضافہ کر رہا تھا۔ کچھ اس کی محبت اور کچھ زیور......سرخی پاؤڈر نے اسے زمانے بھر کی حسینہ بنا دیا تھا۔ اس کا باپ دلدارا اکثر ہنکارا بھرتا۔

''شدائی نہ ہو تو ریڑھی پہ ساتھ بٹھا کر لے جایا کرو......ہونہہ......'' غوثا ترنت جواب دیتا۔

''ہاں گریہ بھی واسوں کی ہوتی'' جلنے بھننے والی دادی بھی مر مرا گئی۔ چاچے، تائے کی بیٹیاں بھی اپنے گھروں کی ہوگئیں......رب نے اس کے آنگن کو بھی اوپر تلے کی تین بیٹیوں سے آباد کر دیا۔ سندری، خالدہ اور زیتون، رانی اب اسے زیتون کے ابا کہا کرتی۔ غوثا بھی رانی، میری رانی، سندری کی ماں کہہ کر بلاتا......سردیاں ہوتو گرما گرم پکوڑے یا جلیبیاں لاتا، گرمیاں ہوتو قلفی، آئس کریم، فالودہ۔

تین بیٹیوں کے بعد بھی اسے رانی سے پہلے دن جیسا پیار تھا۔ ہر کسی سے بے نیاز ہو کر اس کی گود میں سر رکھتا، ناز نخرے اٹھواتا، دونوں ایک دوسرے پر مرتے اور ایک دوسرے کے لیے جیتے۔

ہاں بس ایک چیز دونوں کے درمیان رقیب تھی......نند نہ ساس، دیورانی نہ جیٹھانی پھر بھی ایسی ظالم چیز کہ دونوں کی لڑائی اسی کی وجہ سے ہوتی......شادی کے ان سات سالوں میں جب بھی لڑائی کا طوفان آیا اسی منحوس کی وجہ سے......ایک کو اس سے جتنا عشق تھا دوسری کو اتنی ہی کراہیت......درمیانہ راستہ کبھی نہ نکل سکا۔ رانی ہتھیار ڈالتی نہ غوثا پیچھے

ہوتا......تو تکار، گالی گلوچ سے سلسلہ شروع ہوتا اور مار پیٹ تک نوبت آجاتی...... لاتوں سے مارتا، گھونسوں سے مارتا......بچاؤ کی کوشش میں اکثر رانی کا ہونٹ پھٹ جاتا۔ کپڑے خونم خون ہو جاتے۔ منہ پر سوجن آجاتی لیکن بلی کی طرح پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتی، غراتی، چیختی، اس کے شوق کو کوسنے دیتی۔

''اوئے بدبختے میرے شوق کو کچھ نہ کہا کر میرے اسی شوق نے تجھے میری محبوبہ بنایا ہے۔'' غوث دہاڑتا۔

''ہونہہ......محبوبہ......'' وہ نفرت سے تھوکتی۔

''زہر لگتا ہے یہ تیرا ڈبا۔'' وہ کلس کر کہتی۔

''اے سوچ کر بات کر زنانی ہے میری تو زنانی بن......میرا شوق تجھے زہر لگتا ہے، تو میں کیسا لگتا ہوں، بتا......بول......؟'' وہ اس کی طرف بڑھتا۔

رانی ٹھنڈی پڑ جاتی......سسکیاں بھرنے لگتی۔

اسے سسکیاں لیتے دیکھ کر وہ بھی ٹھنڈا پڑ جاتا......اسے بہلاتا، معافی مانگتا۔

''دیکھ جب میں ایشوریا کو دیکھتا ہوں، کترینہ کو دیکھتا ہوں تو، تو مجھے بھی ویسے ہی لگنے لگتی ہے۔''

''آیا بڑا......مجھے اس کتی......رینہ کے ساتھ ملانے والا، میں نے ایک دفعہ کہہ دیا سو دفعہ کہہ دیا۔ مجھے یہ ناچ گانے والی واہیات فلمیں نہیں پسند......یا مجھے پسند کر لو یا ان فلمی ستاروں کو......'' وہ وارننگ دیتی۔

''ہاہاہا......'' وہ قہقہہ لگا کر ہنستا۔ ''تو میرا دل ہے وہ میرے دل کی دھڑکن۔''

''ہونہہ بڑا ڈائیلاگ مارا ہے۔'' وہ جلے بھنے لہجے میں کہتی۔

خیر رات کے وقت تک دونوں میں صلح ہو جاتی۔ لڑائی کی آواز سب تک اگر پہنچی تھی تو کیا ہوا۔ صلح کی جلیبیاں بھی تو سب کے گھروں میں پہنچ جاتیں۔ صلح سے اگلے دن وہ دھلا جوڑا پہنتی، پھولوں کے گجرے ہاتھوں میں پہنتی......سرخی لگاتی، ارد گرد کی ساری رشتے دار کھی کھی کر کے ہنستیں۔ ''دونوں ہی رج کے جھلے ہیں پہلے لڑتے مرتے ہیں پھر صلح کر کے ہیرو

ہیروئن بن جاتے ہیں۔'' شادی کے کچھ عرصے بعد ہی رانی کو اس کے اس شوق کا پتا چل گیا تھا۔ ایک آدھ فلم شدید تھکن میں اس کے لیے وہی کام دیتی جو چائے کی پیالی دیتی ہے۔

سال چھ مہینے رانی چپ چاپ دیکھتی رہی...... منہ پہ تالا لگائے اس کا شوق برداشت کرتی رہی۔ پہلی بچی دو تین ماہ کی تھی جب غوث نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اپنی چارپائی پہ بٹھایا۔ ''لے بھئی تو وی آجا...... اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر...... ہیما مالنی کی پرانی فلم ہے بڑی تگڑی، سارے مسالوں سے بھری......''

رانی منہ پھلائے کام کرتی رہی، جونہی بازو سے پکڑ کر اسے پاس بٹھایا وہ کرنٹ کھا کے پلٹی...... ''باز آئی میں تیرے اس شوق سے، خود ہی دکھ بے غیرت کہیں کا۔''

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' وہ حیران سا اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

''کہہ تو دیا ہے لے جا اپنی ہوتیوں سوتیوں کو کہیں اور میرا کلیجا جلانے کو آئے دن دیکھنے بیٹھ جاتا ہے۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''ا...... و...... ئے تو ان کو کہہ رہی ہے میری فلموں کو؟'' وہ ہنوز حیران تھا۔

''ہاں تو اور کیا، میرے بس میں ہو تو آگ لگا دوں تمہارے اس ٹی وی کو اور کیسٹوں کو......'' وہ تنفر سے بولی۔

''اے، میں نے کہا، باز آجا باز...... خبردار جو تو نے ان کے متعلق ایک لفظ کہا اور تیرے ساتھ پیار کے جتنے بول بولتا ہوں انہی سے تو سیکھتا ہوں۔'' وہ تحمل سے بولا۔

''آگ لگے ان محبت بھرے بولوں کو......'' اس نے حقارت سے چارپائی کے دوسری طرف تھوکا۔

''ایک فلم میں کسی کی رن (بیوی) بنی ہیں تو دوسری میں کسی اور کی...... میں بھی زنانی ہوں، مجھے نہیں پسند یہ بات...... آج کے بعد تو یہ (موٹی سی گالی) لگانا تو سہی......'' اس نے دھمکی دی۔

''لگاؤں گا، ستر دفعہ لگاؤں گا، تو روک کے تو دیکھ، تیری جرأت......'' غوث نے للکارا، رانی نے پلگ نکالا اور تار جھگی سے باہر پھینکی...... ٹی وی کو ٹھڈا مار کر دل کی بھڑاس نکالی...... غوث کی آنکھوں میں خون اتر آیا...... اس نے الٹے ہاتھ کا جھانپڑ اس کے نرم و نازک وجود پر دے مارا...... وہ چکرا کر نیچے گری۔

یہ پہلی لڑائی تھی سات سال اور دو ماہ قبل کی...... اس کے بعد ایسی لڑائیاں ہر دو تین ماہ کے بعد ہوتیں...... دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے، غوث رکا نہ رانی پیچھے ہٹی...... اسی لڑائی، مار کٹائی اور پیار محبت سے صلح میں ان کا بیٹا بھی دنیا میں آگیا۔ محمد بشیر...... رانی کے پاؤں خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، جب تک بیٹا نہیں ہوا تھا اس کے دل میں کانٹے کی چبھن سی تھی، بیٹے کی پیدائش نے غوث کے دل میں اس کا مقام اور بڑھا دیا۔ جس دن محمد بشیر کا ختنہ ہوا...... سب کو اس نے لڈو بھجوائے، خوشیاں منائیں اور دیکھنے کے لیے درجن بھر فلمیں بھی...... کئی مہینوں کے بعد آج اسے فلمیں دیکھنے کا دورہ پڑا تھا۔ رانی نے پہلو بدل کر روکا...... غوث نے سنی ان سنی کر دی۔

''اے بشیرے کے ابا! میں نے کہا بند کرو یہ مجرے......'' وہ نرمی سے بولی۔

''چپ کر جا، کروٹ بدل کر سو جا...... میں تو ساری رات جاگ کر یہ مجرے ہی دیکھوں گا۔'' غوث نے بھی تحمل سے جواب دیا۔

دو چار منٹ خاموشی سے گزر گئے۔ بیٹا دنیا میں لانے کا نیا، نیا نشہ تھا اس نے پھر ٹوکا...... ''رکتے ہو یا بند کرواؤں...... اے زیتون، سندری آکے بند کرو یہ......'' اس نے پھر گالی دی۔

''اور اگر نہ بند کروں تو پھر......؟'' خدا جانے غوث کو کیا ہوا۔

''کرنا پڑے گا۔'' ساتھ ہی رانی نے اٹھ کر سی ڈی پلیئر کو دھکا دیا۔ لکڑی کی ناقص سی میز سے سی ڈی پلیئر نیچے گرا۔

غوث نے ایک دو تین تھپڑ اس کے چہرے پر مارے۔

''دفع ہو جا...... طلاق دی میں نے تجھے...... طلاق، طلاق...... لے جا اپنا کاغت...... (طلاق کا کاغذ) اور دفع ہو جا۔''

''ہائے یہ کیا بول بولے۔'' رانی حیرانی سے بولی۔ ''طلاق، کاغت۔'' سارا دن سر پر دوپٹا لپیٹے وہ چارپائی پہ روتی رہی...... رات گئے غوث آیا وہی جلیبیاں، گرم پکوڑے اور ہوٹل کی کڑک چائے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

''بشیر کے ابا تو نے مجھے کاغت دے دیا...... میں تیری زنانی نہیں رہی اب۔'' اتنا علم تو رانی کو بھی سن سنا کے مل گیا تھا۔

''اے جھلی، غصے میں طلاق ہوتی ہے نہ مذاق میں۔'' رات گئی بات گئی...... محمد بشیر کے تین ماہ کی عمر ہونے تک یہ ڈراما تین چار دفعہ چلا...... ہر بار طلاق کے الفاظ بندوق سے فائرنگ کی طرح نکلتے، ہر بار رانی کی روح چھلنی ہوتی اور ہر بار غصے میں طلاق نہیں ہوتی کہہ کر دونوں مطمئن ہو جاتے۔ تاہم بیٹے کی ماں بن کر رانی میں وقتی طور پر ویڈنگ ہونے کا جو احساس پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ غوث نے بھی ٹی وی اپنے بہنوئی کو دے دیا۔

''لے جا بھرا یہ منحوس ڈبا...... دیکھنے کو جی چاہا تو تمہارے ہاں آ جاؤں گا...... روز، روز لڑنے کا بھی حوصلہ نہیں رہا۔''

رانی نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا...... بیٹے کا پنڈا اگرم لگا تو ہاتھ لگا کے محسوس کیا۔ کئی گھنٹوں سے وہ مسلسل رو رہا تھا۔ صبح روشنی میں سے اس کے جسم پر سرخ دھبے پڑے نظر آئے...... دونوں میاں بیوی پاگلوں کی طرح لے کر بھاگے۔ اتوار کا دن تھا سرکاری اسپتال بند تھا، بچوں کا ایک ڈاکٹر شہر کے پرلے سرے پر بیٹھتا تھا وہاں پہنچے ابھی دس نہیں بجے تھے ڈاکٹر دس بجے کے بعد آتا تھا۔ دونوں بچے کو لے کر انتظار گاہ میں بیٹھ گئے اوپر دیوار پر لگے ایل ای ڈی پر کوئی مولوی طلاق و نکاح کے مسائل بیان کر رہا تھا۔

دونوں نے بغیر کسی ارادے کے مولوی کو سننا شروع کر دیا۔

''ناظرین و حاضرین میرے محبوبؐ خدا کی حدیث ہے کہ قیامت سے پہلے میری امت میں شادی شدہ لوگ زنا کی زندگی گزاریں گے آئیں اب اس کی مختلف صورتیں دیکھتے ہیں کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جو شادی شدہ زندگی کو زنا کی زندگی بناتی ہیں۔ نمبر ایک طلاق نکاح کے مسائل کا علم نہ ہونا...... جہالت کی حد یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی کہتے ہیں غصے میں طلاق نہیں ہوتی، مذاق میں طلاق نہیں ہوتی، ماہواری میں طلاق نہیں ہوتی...... حمل میں طلاق نہیں ہوتی، طلاق ان حالات میں دینی نہیں چاہیے میرے بھائیوں میں بار بار کہتا ہوں طلاق ان حالات میں دینی نہیں چاہیے مگر طلاق ہو جاتی ہے، کیا سمجھے آپ......؟ طلاق۔''

رانی اور غوث ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ دونوں کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا...... خدا جانے کب ڈاکٹر آیا کب گیا، کیا کہا اور کیا نہ کہا...... دونوں کے قدم ایک ساتھ اٹھ رہے تھے مگر جگی میں دونوں ہی داخل نہ ہوئے...... رانی آہستہ چال چل رہی تھی۔ غوثا اس کے انتظار میں جگی کے باہر کھڑا تھا۔ رانی پہنچی مگر اندر داخل نہیں ہوئی۔

غوثے نے کہا۔ ''اندر کیوں نہیں جاتیں......؟ اندر جا میں دوائی لے آؤں۔''

''اندر میں جاؤں گی یا تو جائے گا......'' رانی کا چہرہ سپاٹ اور لہجہ اندوہ ناک تھا۔

''اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے، غلطی بندہ بشر سے ہی ہوتی ہے۔'' غوث نے پھسپھسے لہجے میں کہا۔

رانی شیرنی کی طرح غراتی ہوئی اندر آ گئی۔

''وڈا آیا بندہ بشر...... اوئے معافی غلطی کی ہوتی ہے، بخشش گناہ کی ہوتی ہے یہ تو حرام کام ہوا...... زنا کا کام ہوا...... اخ تھو......'' کراہیت سے رانی نے تھوکا۔ ''پہلے میں تیری زنانی ضرور تھی زانی نہیں...... نکل جا یہاں سے یا مجھے جانے دے...... میں

نہیں رہ سکتی یہاں......نہیں سمجھ آتا تو کسی مولوی سے مسئلہ پوچھ لے۔ بھرا ریاض سعودی عرب کے شہر مدینہ میں دس سال رہ کے آیا ہے اس سے ہی پوچھ لے۔'' رانی نے غوث کے تایا زاد بھائی کا نام لیا...... جو اتفاقاً ان دنوں پاکستان آیا ہوا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے تو یہیں پر رک، میں اسے لے کر آتا ہوں۔'' غوث کے قدم من، من بھر کے ہو رہے تھے اس کا رواں، رواں پکار رہا تھا اللہ کرے بھرا ریاض کہے کوئی بات ہی نہیں۔ چند منٹوں میں سفید دھلا سوٹ پہنے سر پر ٹوپی اوڑھے بھرا ریاض ان کی جھگی میں بیٹھا تھا۔

''بھرا ریاض قسم کھا کے بتا اگر مرد اپنی زنانی کو دن میں کئی، کئی وار طلاق بول دے تو تو طلاق پڑ جاتی ہے ناں؟'' رانی دبنگ ہو کر بولی۔

بھرا ریاض حق دق ان کا منہ دیکھ رہا تھا۔ معاملے کی کچھ، کچھ سمجھ تو اسے آ ہی گئی تھی مگر چپ ہی بھلی......وہ خاموش رہا۔

''بھرا ریاض بتا بھی اب۔'' غوث کا سانس رک رہا تھا۔

''کہنے کو میں کہہ دوں مگر سوہنے نبیؐ کے شہر میں بارہ سال رہ کے آیا ہوں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ طلاق تو پڑ گئی۔'' غوث نے تھوک نگلتے ہوئے بات مکمل کی۔

''خواہ غصے میں دی ہو۔'' غوث نے پوچھا۔

''بالکل بھرا غوث، بے شک مذاق میں دی ہو یا غصے میں......'' ریاض نے کہا۔

''اللہ معاف نہیں کر دے گا؟'' غوث نے منت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''اللہ نال مذاق ہے یہ......وہ کیسے اس کو معاف کر دے۔ اس نے اپنی پاک کتاب میں طلاق کا سارا طریقہ بتا دیا ہے ویسے ہی دینی چاہیے اگر ویسے نہیں دو گے تو اس کی نافرمانی نہیں اس کے کلام کا مذاق......توبہ استغفار......'' بھرا ریاض نے کلے پیٹے۔

''کوئی صورت؟'' غوثا زندگی موت کے بیچ اِک راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔

''اب کوئی رستہ نہیں، یہ تجھ پر حرام ہے، تیری زنانی نہیں رہی......ہاں عدت پوری کر کے جس کی مرضی زنانی بن جائے تو روکنے والا کون؟'' بھرا ریاض غصے میں تھا۔

''کسی اور کی زنانی......؟'' غوث کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

''آرام سے بھرا، آرام سے، جب تیری زنانی نہیں رہی تو جہاں مرضی جائے۔''

غوثا اونچی آواز سے رونے لگا......اس کے رونے سے ارد گرد کی جھگیوں سے بھی لوگ بھاگ آگئے۔

رانی کی آنکھیں دنیا کے سب سے بڑے صحرا کی طرح ویران اور خشک تھیں......وہ جلدی، جلدی سامان سمیٹنے لگی۔

''بھرا ریاض، میں تیری منت کرتا ہوں اسے کہہ یہ یہیں رہ لے، کہیں نہ جائے......میں چلا جاتا ہوں، میں کراچی چلا جاتا ہوں، تیرے ساتھ سعودی عرب چلا جاتا ہوں، میں خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں جب تک میری حیاتی ہے اسے خرچہ بھیجوں گا۔ بچوں کے پڑھنے کا سارا بندوبست کروں گا۔ میں خود ڈھور ڈنگروں کی طرح محنت کروں گا، قصور میرا ہے، گناہ میرا ہے، یہ کیوں در بدر بھٹکے۔ سزا بھی میں ہی لوں گا......رب کے قنون (قانون) سے کھیلنے کا کفارہ بھی میں ہی دوں گا۔'' سفید لٹھے جیسا چہرہ لیے دو کپڑوں میں ہی وہ جھگی سے رخصت ہو گیا۔ ریل کی پٹری کے ساتھ چلتے ہوئے کئی بار دل چاہا رانی......دل کی مہارانی پر ایک نظر ڈال لے......مگر رانی تو منہ پر کپڑا ڈالے جھگی سے اوٹ کیے بال بچوں کے لیے کھانا بنانے میں مصروف تھی......اس کے اندر حوصلہ ہی نہیں تھا کہ وہ جانے والے پر ایک نظر ڈالے......وہ اس کی نظروں میں کہاں سما سکتا تھا۔ جھگی سے نکلتے ہوئے رانی نے آخری نظر اس پر ڈالی تھی۔ اسے غوث کا قد قطب مینار سے بھی لمبا لگا......اونچا اور اونچا آسمانوں تک پہنچا ہوا......اصل عزت دار تو وہ تھا۔



# بٹیانہ کیجو

ہما بیگ





الارم کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔
''بند کرو یہ شور...... آخر کب تک سوتی رہوگی۔''
عامر نے غصے سے بیوی کو جھنجوڑا۔
''سوری، سوری بس اٹھ گئی۔ ابھی تو فجر کی نماز پڑھ کر لیٹی تھی۔'' عمرانہ نے کسمسا کر گھڑی دیکھی۔
''میرے خدا چھ بج گئے! بچوں جلدی سے اٹھو تیار ہو، اسکول کی بس نہ نکل جائے۔'' بچوں کو آواز دیتی ہوئی وہ باورچی خانے میں آگئی۔ ساتھ، ساتھ کھلے

بالوں کو لپیٹتے ہوئے جوڑا بنا لیا تھا۔ ایک چولہے پر چائے کا پانی رکھا، دوسرے پر دودھ رکھا اور فریج سے انڈے نکالے ٹوسٹر میں توس ڈالے۔ وہ جلدی، جلدی کررہی تھی۔ دس سالہ عنبرین نے باورچی خانے میں آکر ماں کی مدد کرنا شروع کردی۔ انڈے تلے جا چکے تھے۔ جلدی، جلدی توس پہ مکھن اور جام لگایا اور کپ میں چائے نکال کر بہن اور پانچ سالہ بھائی کو دی، ساتھ، ساتھ اپنا بھی ناشتا کرلیا۔ اتنی دیر میں عمرانہ نے بچوں کے لنچ باکس تیار کر کے بیگ میں رکھ دیے تھے۔ یونیفارم تو رات کو ہی استری کر کے ہینگر پر لٹکا دیتی تھی۔ بچوں کے جوتے، موزے بھی تیار رکھے ہوتے تھے۔ ابھی وہ ناشتے کے آخری مراحل میں تھے کہ بس کا ہارن بج گیا۔ بھاگتے ہوئے تینوں بچوں نے ماں کو اللہ حافظ کہا اور اسکول روانہ ہوگئے۔ بچوں کو رخصت کرکے اس نے اپنے لیے چائے بنائی اور عامر کے لیے پراٹھے کا آٹا گوندھنے لگی۔ ایک طرف پراٹھا اور دوسری طرف اس کے لیے آملیٹ فرائی کرلیا۔

گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے سات بج چکے تھے۔ اب اتنا ٹائم نہیں تھا کہ وہ ناشتا کرتی یا برتن دھوتی۔ الماری سے ایک جوڑا نکال کر بغیر استری کیے ہی پہن کر اس نے عامر پر ایک نظر ڈالی آج وہ اپنے کپڑے پریس نہیں کرپائی تھی۔ عامر تو مزے سے سو رہا تھا۔ ایک آہ بھر کر وہ... تیزی سے گھر لاک کر کے بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔

"روز بروز رش بڑھتا ہی جارہا ہے، یا اللہ آج پھر اسکول دیر سے پہنچنے پر پرنسپل سے ڈانٹ پڑے گی، کیا کروں کیا نہ کروں......" عمرانہ دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتے ہوئے بس کے انتظار میں کھڑی ہوگئی۔ خوش قسمتی سے اس کے روٹ کی بس جلدی آگئی اور وہ دھکے کھاتی اور دھکے دیتی بس میں سوار ہوگئی۔

"خالہ، باجی، اماں اب کرایہ!" کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔

"ارے سانس تو لینے دو بھیا۔" ایک خاتون نے کہا۔

"اللہ کرے آج میڈم دیر سے اسکول آئیں۔" دل ہی دل میں وہ دعا مانگتے ہوئے جیسے ہی اسکول میں داخل ہوئی، سامنے ہی مسز ریحانہ سعید اسکول کی اونر اپنی گاڑی سے اتر رہی تھیں۔

"عمرانہ یہ وقت ہے آپ کے آنے کا... بریک میں آکر مجھ سے مل لیجیے گا۔"

رشتے میں تو وہ عمرانہ کی پھوپی لگتی تھی اور عمرانہ کے والد نے ہی ایک زمانے میں ان کے اور ان کے بچوں کے تعلیمی اخراجات اٹھائے تھے مگر وہ خاصی... بدلحاظ واقع ہوئی تھیں۔

ان کا غصہ دیکھ کر عمرانہ کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔ گلا خشک ہوگیا۔ وہ خاصی گرم مزاج واقع ہوئی تھیں۔ شاذو نادر ہی مسکراتی تھیں۔ شادی کے کئی سال بعد ان کے حالات بدلنے شروع ہوئے تو دولت مندی کا غرور سر چڑھ کر بولنے لگا۔ کچھ انسان پتھر جیسے ہوتے ہیں اور کچھ اتنے پیارے، نرم و نازک کہ اچھی نگاہ جیسے ہی ان پر پڑے محبت اور خلوص کا پیغام دے جاتے ہیں۔ دل کو اطمینان سے بھر جاتے ہیں اور کچھ ایسے کہ انہیں دیکھتے ہی سکون و خوشی کے سارے راستے بند ہوجاتے ہیں۔ میڈم ریحانہ بھی کچھ ایسی ہی تھیں۔

"اب کیا ہوگا...... ضرور آدھے دن کی تنخواہ کاٹ لیں گی۔ صرف دس منٹ دیر ہوئی ہے، باتیں بھی سنائیں گی۔" جل تو جلال تو ورد کرتے ہوئے وہ اپنی کلاس کی طرف چل دی۔ سامنے سے کمپیوٹر کے ٹیچر آرہے تھے۔ اگرچہ خاصی عمر کے تھے مگر ہر خاتون کو لائن مارنے سے باز نہیں آتے تھے۔ عمرانہ کو انہوں نے مخصوص مسکراہٹ سے نوازا۔

"آج تو آپ بہت فریش لگ رہی ہیں، صبح سے آپ کو دیکھا نہیں تھا تو ہر چیز پھیکی، پھیکی سی لگ رہی تھی، خیریت تو ہے دیر کیوں ہوگئی؟" انہوں نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ عامیانہ سستے جملے بولے۔

"جی سر شکیل سب خیریت ہے، رش بہت تھا، اب آپ مجھے راستہ دیں، پہلے ہی لیٹ ہوگئی ہوں' میڈم غصے میں ہیں ابھی راؤنڈ پر آرہی ہیں۔" عمرانہ نے چڑ چڑا کر جواب دیا۔ "آپ بھی ہوشیار ہوجائیں۔"

کلاس میں بچوں کو سلام کا جواب دے کر وہ پڑھانے میں مصروف ہوگئی۔ ہوش اس وقت آیا جب بریک کی گھنٹی بجی۔ اس کے ساتھ ہی بھوک کا احساس ہوا، صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

"اوہ، میڈم نے بریک میں بلایا تھا" ان کی ناراضی کا خیال آتے ہی جیسے ہر احساس پر خوف حاوی ہوگیا، اگر انہوں نے نوکری سے نکال دیا تو کیا ہوگا؟

باہر نکلتے ہی فزکس کے سر صمد مل گئے۔

"ارے عمرانہ کہاں ہوتی ہیں آپ؟ ہم تو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترس گئے۔ کبھی تو ہمارے لیے بھی وقت نکالا کریں۔ ایک ہی جگہ رہتے ہوئے ملاقات نہیں ہوتی کسی دن لنچ پر ایک ساتھ چلتے ہیں۔" انہوں نے حریصانہ نظروں سے عمرانہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان کی بات سن کر عمرانہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر غصے سے ان کی طرف دیکھا۔

"آپ کی بیگم اور بچے خیریت سے ہیں؟ بڑی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے ناں آپ کی۔ صمد صاحب میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ کسی کے ساتھ باہر نہیں جاتی۔ جہاں تک ملاقات کا تعلق ہے تو ہم سب یہاں نوکری کرنے آتے ہیں، شغل میلہ کرنے نہیں۔ اور ہمارے کندھوں پر بہت بڑی ذمے داری ہے بچوں کی تعلیم و تربیت کی...... اگر ہم ایسی ویسی حرکتیں کریں گے تو ان پر کیا اثر پڑے گا۔ وہ کیا سیکھیں گے، اخلاقی ذمے داریاں بھی کچھ ہوتی ہیں۔"

وہ شدید تلملا کر بولی۔

عمرانہ، سر صمد کو اچھا انسان سمجھتی تھی لیکن آج اسے احساس ہوا کہ اچھے لوگ اور ان کی اچھی باتیں صرف خوابوں اور خیالوں میں ہی ہوتی ہیں۔ عملی زندگی میں ان کا کیا عمل دخل...... اس کی طبیعت سخت مکدر ہوگئی۔

وہ سر جھٹک کر میڈم کے روم میں ہلکی سی دستک دے کر داخل ہوگئی۔

میڈم ٹیلیفون پر کسی سے باتوں میں مصروف تھیں۔ انہوں نے نہ تو عمرانہ کے سلام کا جواب دیا نہ ہی اسے بیٹھنے کو کہا، وہ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑی رہی۔ فون بند کرکے وہ اپنے سامنے رکھے فیشن میگزین کی ورق گردانی کرنے لگیں۔ عمرانہ نے کھنکھار کر اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

"عمرانہ آپ کام سنجیدگی سے نہیں کر رہیں، آپ کی کئی شکایتیں مجھے ملی ہیں۔ روز لیٹ ہوجاتی ہیں، بچوں کے ہوم ورک اور کلاس ورک کی کاپیاں وقت پر چیک نہیں کرتیں، رپورٹ کارڈز بھی آپ نے لیٹ کر دیے تھے۔ اور یہ کپڑے جو آپ پہنتی ہیں نہ جانے کس زمانے کے ہیں، نئے فیشن کا اگر نہیں ہے تو کم از کم ان کو استری تو کرلیا کریں، والدین سب سے پہلے ٹیچر کا گیٹ اپ دیکھتے ہیں، آپ کی کلاس کی بچی کے والد بھی آپ کی شکایت کر رہے تھے کہ آپ نے ان سے اچھی طرح بات نہیں کی۔"

"آئی ایم سوری میڈم، آج مجھے دیر ہوگئی۔" اس نے ہمت مجتمع کی اور کہا۔ "میرا سارا کام وقت پر ہوتا ہے، اسکول میں میری کلاس کا رزلٹ سب سے اچھا ہوتا ہے۔ ٹاپ کرتے ہیں میرے شاگرد...... رہے میرے کپڑے تو میں سمجھتی ہوں کہ ایک استاد کو سادگی اختیار کرنی چاہیے، وہ بچوں کا آئیڈیل ہوتا ہے، میرے نزدیک جن ویلیوز کی آپ بات کررہی ہیں وہ ظاہری ہیں، ان میں پائیداری نہیں ہوتی۔ حقیقی ویلیو تو بنتی ہیں آپ کے رویے اور اخلاق سے۔ یہی باتیں اور یہی تربیت ہمیں آنے والی نسل کو سکھانی ہے۔ اور رہی بات اس بچی کے والد کی تو میڈم وہ مجھ سے باہر ملاقات کرنا چاہ رہے تھے، میرے منع کرنے پر ناراض ہوکر آپ سے شکایت کردی۔"

"بہت اچھی تقریر کرلیتی ہو...... یہ تمہاری کلاس

نہیں ہے، مجھے ویلیوز سکھانے کی کوشش نہ کرو، آخری چانس دے رہی ہوں، آئندہ گیٹ آؤٹ کر دوں گی۔ آٹھ ہزار روپے کمانے والی لنڈے بازار کے کپڑے پہننے والی اب مجھے ویلیوز سکھائے گی۔"

اپنی بے عزتی پر عمرانہ کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ مگر ان آنسوؤں کو اس نے پلکوں تک نہیں آنے دیا۔ وہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو کمزور نہیں ثابت کرنا چاہتی تھی۔ دل تو چاہا نوکری چھوڑ کر چلی جائے مگر وہ جذبات میں آکر غلط فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا کے سامنے ہارنا نہیں چاہتی تھی اسے اپنے بچوں کا مستقبل سنوارنا تھا جو اس کے شوہر کی تنخواہ اور شاہ خرچی کے سامنے ناممکن تھا۔ کوئی سمجھدار کب آسانی سے خوابوں سے ہاتھ دھونا پسند کرتا ہے جبکہ اسے جیتنا تھا، اس کے سامنے ایک واضح مقصد حیات تھا۔ وہ اپنی ساری زندگی انہی خوابوں کو دیکھنے اور سنوارنے میں لگا رہی تھی۔

ایک کپ چائے ہی مل جاتی تو کتنا اچھا تھا۔ مگر بریک ختم ہونے میں کچھ ہی دیر تھی اور آج مہینے کی آخری تاریخ تھی۔ اگر آج تنخواہ نہیں ملی تو گزارہ مشکل ہو جائے گا، واپسی کا بس کا کرایہ بھی بہ مشکل نکلے گا۔ کولر سے دو گلاس پانی پی کر وہ کلاس کی طرف چل دی۔

☆☆☆

"آج تنخواہ مل رہی ہے، مس عمرانہ چھٹی کے بعد میرے آفس میں آکر رقم لے لیجیے گا۔" آفس کلرک نے چپکے سے عمرانہ کے پاس آکر کہا۔ وہ اپنے مسائل میں گم تھی کہ اچانک کلرک کی آواز سن کر اچھل پڑی۔

"حد کرتے ہیں آپ بھی، ڈرا دیا مجھے۔" عمرانہ نے غصے سے کہا۔

"موقع تو دیں آپ کو خوش بھی کر دیں گے۔" عامیانہ انداز میں کلرک صاحب بولے۔

بغیر جواب دیے عمرانہ اپنے راستے پر چل پڑی۔ تنخواہ ملنے کی خبر سن کر سارے دن کی بدمزگی ذہن سے محو ہوگئی۔

تنخواہ دیتے ہوئے کلرک صاحب نے اس کے ہاتھ کو چھونے کی کوشش کی۔ عمرانہ نے خشمگیں نظروں سے انہیں گھورا اور باہر نکل آئی۔ دو دن لیٹ آنے پر میڈم نے اس کی تنخواہ کاٹ لی تھی۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ سب تلخ باتیں بھلا کر وہ پروگرام بنانے لگی کہ اس مہینے وہ بچوں کے لیے ضرورت کی کون، کون سی چیز لے سکے گی۔

گھر پہنچ کر اس نے حسب معمول آلو ابلنے چولہے پر رکھے۔ پکانے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ آلو کے پراٹھے چائے کے ساتھ چل جائیں گے۔

تھوڑی دیر میں اس کے جگر گوشے اسکول سے آگئے۔ عمرانہ کے چاروں طرف رنگ ہی رنگ بکھر گئے۔ سب کو باری، باری سینے سے لگا کر پیار کیا۔ پڑھائی کے بارے میں پوچھا۔ تینوں بچے اپنی، اپنی روداد سنانے لگے۔

"اب اچھے بچوں کی طرح کپڑے بدلو، یونیفارم ہینگر میں صحیح طرح لٹکاؤ۔ مزے کے آلو پراٹھے بنے ہیں، اچار کے ساتھ کھائیں گے۔" وہ روز انہیں یونیفارم اور جوتوں کے متعلق ہدایات دیتی کھانے کے لیے بلاتی تھی۔

"امی آپ روزانہ یہی پکاتی ہیں یا دال، چاول کوئی نئی ڈش بھی تو بنایا کریں۔ میرے دوست کی امی روز نئی، نئی ڈش بناتی ہیں اور اسکول کے لیے بھی روز نئی ڈشز اور پیسے بھی دیتی ہیں۔" بیٹے نے ماں سے شکایتی انداز میں کہا۔ لڑکیاں تو بچپن سے ہی صابر اور سمجھدار ہوتی ہیں مگر یہ لڑکے اکلوتے لاڈلے منتوں، مرادوں سے پیدا ہونے والے، بیٹے کی بات سن کر عمرانہ کا دل ٹکڑے، ٹکڑے ہوگیا۔ اس نے اپنے آنسو کامیابی سے چھپاتے ہوئے بیٹے کو گود میں اٹھا کر ماتھے پر پیار کیا۔

"سوری ہینڈسم بوائے اب میں اپنے بیٹے کے لیے روز ہی نئی ڈش بناؤں گی۔ اسکول سے واپس آکر ٹائم کم ہوتا ہے ناں۔" عمرانہ نے الزام اپنے ہی سر

لے لیا۔

کھانے کے دوران بچے ہنسی مذاق کرتے رہے اور وہ سوچتی رہی کہ تنخواہ سے وہ اس دفعہ اور کچھ نہیں کرے گی بس بچوں کو اچھے، اچھے کھانے پکا کر کھلائے گی۔ وہ تنخواہ جو اسے لوگوں کی حریص نظریں برداشت کرنے اور ذلیل ہونے کے عوض ملی تھی۔ ٹیلیفون کی گھنٹی نے اس کو خوابوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں پہنچا دیا۔

''سوئٹ ہارٹ اب اٹھ جائیں شام ہوگئی ہے، کتنا سوئیں گی۔'' دوسری طرف عامر تھا۔ سوئٹ ہارٹ کا لفظ سن کر عمرانہ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

''عامر میں سو نہیں رہی تھی کام کر رہی تھی۔ بچوں کو اسکول کا کام دے کر سارے برتن دھوئے، جھاڑو، پوچا کیا، اب کپڑے دھونے شروع کیے ہیں۔'' عمرانہ نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''بیگم آپ کچھ زیادہ ہی کام کا رونا نہیں رونے لگی ہیں۔ یار کام سب کرتے ہیں، میں بھی آفس میں کام ہی کر رہا ہوں، یہ بتاؤ تنخواہ ملی؟''

''تو اس لیے... سوئٹ ہارٹ! جی مل گئی ہے، آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''ایسا کرو شاباش، بھاگ کر قریب والی مارکیٹ سے چار مرغیوں کے تکے بنوا لو اور کبابوں کے لیے قیمہ بھی لے آؤ اور رات کے لیے زبردست سا کھانا تیار کر لو۔ میرے کچھ دوست آرہے ہیں۔'' حکم نامہ صادر ہو گیا۔

عمرانہ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ شوہر کے ساتھ دکھ اور سکھ دونوں مواقع پر اظہار کے لیے الفاظ ہمیشہ ہی مختلف، بہتر اور خاص ہونے چاہئیں اور جب ایسا شوہر ہو جسے نہ سننے کی عادت ہی نہ ہو۔

''دیکھیں عامر، آج آپ کے دوستوں کے کھانے پر میری ساری تنخواہ خرچ ہو جائے گی۔ باقی پورا مہینہ کیسے گزرے گا...... میں نے بچوں سے وعدے کیے ہیں...... سردیاں شروع ہونے والی ہیں۔

## ڈیوٹی

جان!
مجھے بہت افسوس ہے
تم سے ملنے شاید اس ہفتے بھی نہ آ سکوں گا
بڑی اہم مجبوری ہے!
جان! تمہاری مجبوری کو
اب تو میں بھی سمجھنے لگی ہوں
شاید اس ہفتے بھی
تمہارے چیف کی بیوی تنہا ہو گی

انتخاب: خوشبو، از پروین شاکر
مرسلہ: رفعت مبین رفی۔ یو ایس اے

## صرف پیا

سنہری شام کا منظر
ہماری آنکھ کو
کسی کا
منظر بنا تا ہے
تمہاری یاد سے دل کو
جلاتا ہے
سنہری شام کے ہر منظروں میں
تم کو اپنے ساتھ رکھنے کی
میں عادی ہو چکی ہوں اب
مرا دل تمہارے قدموں تلے
آنے والی کلیوں میں
بھٹکتا ہے
تمہارے بن میری سانس
سینے میں اٹکتی ہے

شاعرہ: شہزادی کائنات یونس۔ کراچی

ان کے لیے گرم کپڑے لینے ہیں۔" عمرانہ نے دبے، دبے لہجے میں احتجاج کیا۔

"بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ میرا گھر ہے اور یہ تمہاری کمائی پر نہیں چل رہا ہے جو اس کی دھونس جما رہی ہو، بجائے اس کے کہ شام کو تین چار ٹیوشن کر لو، کل سے گھر پر بیٹھو کوئی ضرورت نہیں نوکری کرنے کی اور ہاں رات کی دعوت کے بارے میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔"

"مگر عامر آپ نے ہی تو مجھے نوکری کے لیے زبردستی بھیجا تھا۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا گھر سے نکلنے کا۔" عمرانہ منمنائی۔

"ہاں، ہاں سارا قصور میرا ہی ہے۔ آج کل ساری عورتیں نوکریاں کر کے اپنا گھر چلاتی ہیں تم کوئی انوکھا کام نہیں کر رہی ہو۔" یہ کہہ کر عامر نے فون بند کر دیا۔

جب جیون ساتھی کا رویہ اس طرح کا ہو تو یہی خراب رویے اور برتاؤ زندگی کو دھوپ کے رخ پر لٹکے ہوئے پردے جیسے بے رنگ اور کمزور کر دیتے ہیں ایسے میں بحث اور گفتگو کا کوئی جواب ہوتا ہے نہ حل۔

چاروناچار وہ بچوں کو گھر پر اکیلا چھوڑ کر گیٹ پر تالا لگا کر بازار کی طرف پیدل چل پڑی۔ اپنی خون پسینے کی کمائی یوں خرچ کرتے ہوئے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ گھر آ کر اس نے دعوت کی تیاری شروع کر دی۔

"ارے امی آپ تو آج ہی مزے، مزے کے کھانے بنا رہی ہیں۔" اسے یوں مصروف دیکھ کر بیٹا خوشی سے بولا۔

"بیٹا جی آج ابو کے دوست ڈنر کے لیے آ رہے ہیں، ان کے لیے پکا رہی ہوں۔" عمرانہ نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ میرے لیے پکائیں گی۔" بچہ بولا تھا۔

"آپ کو بھی ملے گا مگر پہلے ابو اپنے دوستوں کے ساتھ کھا لیں پھر آپ کو دوں گی کہیں کھانا مہمانوں کے سامنے کم نہ پڑ جائے۔"

عامر اور اس کے دوستوں کی تاش کی محفل رات گیارہ بجے تک ختم نہیں ہوئی تھی کہ کھانے کی باری آتی۔ عمرانہ نے بچوں کے سامنے تھوڑا سا کھانا رکھا، صبر سے انہوں نے کھانا کھایا اور سونے چلے گئے۔ بارہ بجے عامر آیا تو عمرانہ کو اپنا منتظر پایا، وہ اپنے اسٹوڈنٹس کا رزلٹ تیار کر رہی تھی۔ اپنے رویے پر اسے ذرا سی شرمندگی نہیں تھی، نہ ہی اس بات کا احساس تھا کہ صبح کی تھکی ہاری بیوی اس کے انتظار میں بیٹھی ہے۔

"ایسا کرو میز پر سارا کھانا رکھ دو ہم کو جب بھوک لگے گی تو کھا لیں گے تم جا کر لیٹ جاؤ۔ ہاں بس تھوڑی دیر بعد...... میرے باس کو سلام کرنے آ جانا۔"

تھکن اور شوہر کی بے حسی نے اس کی بھوک پیاس ختم کر دی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور مارے غصے کے اس نے باس کو سلام کرنے کو ضروری ہی نہیں سمجھا تھا...... وہ سمجھتی تھی کہ وہ سلام کے جواب میں اس کے سر پر کس طرح ہاتھ پھیرا کرتے ہیں۔ شوہر کی اس عادت سے اسے سخت نفرت تھی جب وہ دوستوں کے سامنے بلاتا۔ وہ کس مشکل سے یہ حکم بجا لاتی تھی، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ طوعاً و کرہاً اپنی کمر سہلاتی وہ اٹھ گئی تھی۔ نہ جانے رات کا کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ وہ بے حس پڑا سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ اور اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ اب اس کی بچی بڑی ہو گئی ہے اور اسے ایسی دعوتیں اپنے گھر میں ہرگز نہیں کرنی چاہئیں۔

مگر وہ صرف سوچ کر اور کڑھ کر ہی رہ گئی تھی کہ جب وہ بے خبر سو رہی تھی تو اسے لات مار کر جگا کر وہ اسے اپنے باس کو سلام کروانے کے لیے ہی لے گیا تھا۔

مجھے اس سے چڑ تھی اور بہت چڑ تھی۔ میں جہاں کوئی چیز رکھ کر جاتی وہاں غائب ہو جاتی۔ غسل خانے میں جاتے وقت دوپٹا باہر رکھ کر جاتی اور جب نکلتی تو بقول اس کے سنبھال دیا گیا ہوتا۔ میں کتابوں کو اپنے اردگرد پھیلا کر پڑھنے کی عادی ہوں۔ یہاں کتابیں پھیلائے بیٹھی ہوتی اور دو گھونٹ پانی پینے کیا اٹھتی، وہ دو چار رجسٹر اٹھا کر سنبھال دیتی۔ میرا وجود سارا دماغ کسی نکتے پر مرتکز ہوا ہوتا ہل کر رہ جاتا۔ میں اکثر اس کے بارے میں سوچتی آخر یہ کیا چیز ہے؟

رات کو کبھی صحن کے کونے میں بنے بیت الخلا میں جانے کی ضرورت ہوتی تو وہ کسی نہ کسی کو جگا کر جاتی۔ شاید ڈرتی تھی اور نیند میں بستر سے زیادہ کسی کو کوئی

# نائلہ آپی

**مریم جہانگیر**



دوسری چیز عزیز نہیں ہو سکتی لیکن وہ تو وہاں اتنی، اتنی دیر لگا دیتی کہ کمرے سے خود امی کو یا ہم میں سے کسی کو جا کر دیکھنا پڑتا۔ کہیں وہاں سو ہی نہیں گئی لیکن وہ سوئی کہاں ہوتی' وہ تو صحن میں بے ترتیب پڑے جوتوں کو ترتیب سے رکھنے میں لگ جاتی تو کبھی تار پر پھیلے کپڑے سمیٹنے لگتی، ہم میں سے جا کر کوئی اسے یاد کرواتا کہ وہ گئی کس کام کے لیے اور دوسرے کی نیند بھی خراب کر ڈالی لیکن اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔ خیر بات ہو رہی تھی چڑ کی تو مجھے اس سے واقعی بہت چڑ تھی۔

وہ جہاں ہوتی محفل کی جان بن جاتی۔ بچے اس کا نام لیتے نہ تھکتے، بڑے اس کی اچھائیوں کے گن گاتے۔ میں غور سے دیکھتی رہتی، سمجھنے کی کوشش کرتی کہ آخر اس میں ایسی کیا بات ہے لیکن مجھے کچھ بھی سمجھ نہ آتا۔ جائے نماز پر اتنا عرصہ بیٹھی رہتی کہ وہ اپنے پاؤں پر پڑے نشانات چھپانے لگ جاتی۔ مجھے لگتا کہ ضرور سب کو تسخیر کرنے کے وظائف پڑھتی ہے، میں نے بھی رسالوں سے اسم اعظم کی تلاش شروع کر دی لیکن جو بات اس میں تھی، وہ مجھ میں پیدا نہ ہو سکی۔

میں لامحالہ، شعوری اور لاشعوری طور پر اس سے تقابل کرنے لگ جاتی۔ اس کی کسی کام میں تعریف ہوتی تو میں اس کے کیے کام کو غور سے دیکھتی، سیکھتی اور سمجھتی لیکن کچھ پلے نہ پڑتا یوں بہتر سے بہترین کی طرف کی دوڑ میں، میں بھاگتی رہی پر وہ میرے آگے ہی رہی تھی۔

ایک دن بڑے ابو نے مجھے کہا کہ تمہارے میٹرک میں نمبر نائلہ سے زیادہ آنے چاہئیں' مجھے تم سے امید ہے اور مجھے لگتا ہے کہ تم لے سکتی ہو۔ مجھے امی کا وہ گرم بوسہ یاد آ گیا جو انہوں نے نائلہ کے ماتھے پر اتنے اچھے نمبروں کی خوشی میں ثبت کیا تھا۔ میرے وظائف لمبے اور دعائیں تیز تر ہو گئیں کہ اللہ جی بس اس سے اچھے نمبر آ جائیں۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی لیکن وہی ڈھاک کے تین پات میں سب کچھ کر کے بھی اس سے پیچھے ہی رہی۔ میرے اس سے دس نمبر کم آئے۔ مجھے پشیمانی ہوئی' اس سے زیادہ نہ مانگی بہترین مانگتی تو کیا پتا اس سے بہتر آ ہی جاتے۔ اب ایف ایس سی کے امتحانات ہونے والے تھے۔ ریاضی کے پرچے کے لیے بہت محنت کی لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ جب میں اڑنا سیکھ رہی تھی۔

اسکول کے بعد کالج کا ماحول انسان کو بڑی جلدی ندی اور سمندر میں فرق سمجھا دیتا ہے، ہم نصابی سرگرمیوں میں میرا نام ڈنکے کی چوٹ پر لیا جاتا۔ مجھ سے مقابلہ کر کے لوگ فخر محسوس کرتے لیکن میرا مقابلہ تو گھر میں چل رہا تھا۔ اس نے حیاتیات پڑھی تھی اور میں ریاضی پڑھ رہی تھی۔ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ اب تو اس سے زیادہ نمبر لے کر دکھاؤں گی۔ اس کی دراز کو خاموشی سے آدھی رات میں کھولتی، اس کی مارک شیٹ لے کر اسٹور میں گئی اور ہر مضمون کے نمبر نکال کر دیکھ کر اپنے رجسٹر کے آخری صفحے پر لکھتی گئی۔ ہر نمبر میرا ہدف تھے اس بار یقیناً اسے مات دینی تھی۔ ریاضی کا پیپر دینے بیٹھی تو امتحان والے دن لگتا دماغ بالکل خالی ہو گیا۔ ایک سوال بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ حالانکہ میری ذہانت اور میرے حافظے پر میرا حلقۂ احباب ہمیشہ سے داد دیتا آیا ہے، میں گھر آئی اور چاندنی رات میں چھت کے فرش پر ننگے پیر چل کر افسانوں کی ہیروئن کی طرح خوب غم منایا لیکن شدت پسند طبیعت کو سکون نہ ملا۔ نیچے آ کر دوائیوں والی ٹوکری اٹھائی اور مٹھی بھر دوائیں منہ میں ڈال ہی لیتی کہ اس سے قبل ہی اس نے مجھے ایک تھپڑ مارا میں نے جواباً بدتمیزی کی۔

''مجھے کھانے دو، تم کون ہوتی ہو۔'' اس نے پٹاخ ایک اور تھپڑ لگایا۔ میں اس کی شکل دیکھ رہی تھی اور امی پاس کھڑی تماشا...... شاید تین یا چار اور تھپڑ لگائے ہوں گے لیکن بہرحال اس نے اپنی کسر نکالی۔ میرے اندر دو منفی جذبے شدت سے امڈ آئے۔ یا تو یہ مجھ سے حسد کرتی ہے کہ اس میں مجھ جیسی شدت پسندی نہیں ہے لیکن پھر دماغ نے کہا اس بے وقوفانہ عمل پر حسد کیا یا دوسری بات میرے لیے بڑی پریشان کن تھی یا وہ میری ماں بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

اب وہ پل میں تولہ پل میں ماشہ ہونے لگ

جاتی۔ رات اپنی کالی چادر پھیلاتی تو ہم بہنیں آپس
میں دکھ سکھ بانٹنے لگ جاتیں ۔ارم آپی کو جلدی نیند
آجاتی لیکن وہ میری لن ترانیاں سنتی رہتی۔ میری
دوستوں کے بارے میں نجومیوں کی طرح پیش گوئی
کرتی جو بالکل ٹھیک ثابت ہوتی۔ ایسے موقعوں پر میرا
دل چاہتا کہ اسے کالی زبان والی کہوں لیکن یہ تو وہ خود
مجھے کہہ کر بلاتی تھی۔ میں اس کی نقل بھلا کیسے کرتی۔ کبھی
مجھے سبق پڑھاتی، کبھی مجھے آئینہ دکھاتی، مجھے بہت غصہ
بھی آتا، غصہ کیوں نہ آتا، آخر کو مجھے اس سے چڑ جو تھی۔

مجھے اس سے تب سے چڑ تھی جب وہ میری تصویر
کو سلائی مشین میں رکھ کر میری ناک سینے کی کوشش
کرتی۔ ساتھ، ساتھ کہتی جاتی اس کی ناک بہت موٹی
ہے، جب میں بہت بچپن کی تصویریں دیکھتی اور اس
میں اس نے میرا منہ دبایا ہوتا، جب میں کسی سہیلی کے
گھر جانے کی اجازت مانگتی اور وہ امی کے کان بھرنے
لگ جاتی۔ جب وہ تانگے پر بیٹھ کر اسکول جاتے
ہوئے پہلے اتر جاتی یا پہلے چڑھ جاتی اور اپنا ہاتھ میرے
آگے ایسے کرتی جیسے احسان چڑھا رہی ہو۔

پھر ایک دن مجھے پتا چلا وہ بہت خوب صورت
ہے، شاید پھپو کی شادی تھی اور اس نے گہرے سبز رنگ
کے کپڑے پہنے تھے۔ علاقائی طرز کے لباس کے ساتھ
اس نے سر پر ٹوپی بھی سجا رکھی تھی۔ گھنگرالے بال یہاں
وہاں لہراتی وہ اڑتی پھر رہی تھی اور میں دوسری منزل کی
جالیوں سے لگی کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

”پتا نہیں منہ پر کیا لگا لیا ہے اتنی پیاری لگ رہی
ہے۔“ میرے اس علم کی تصدیق گزرتے وقت نے کی۔
جو دیکھتا تعریف ضرور کرتا...... ذہانت سے چمکتی آنکھیں
اور ستواں ناک...... وہ میری ناک کو ٹھیک ہی موٹا کہتی
تھی اس کی صحیح معنوں میں ستواں ناک تھی۔ نازک
تراشے ہوئے ہونٹ اسے ہزار دفعہ کہا کہ منہ کھول کر ہنسا
کرو اس سے تصویر اچھی آتی ہے لیکن پھر بھی وہ شرمائی،
شرمائی سی ہنسی ہنس دیتی۔ البتہ ایک بات پر میں اسے
یقین دلانے میں کامیاب ہو گئی کہ کاجل یا سرمہ لگا

## غزل

منہ اپنی روایات سے بھی پھیرا نہیں کرتے
دشمن کو اچانک کبھی گھیرا نہیں کرتے

دیوار کے پیچھے کوئی رہزن نہ چھپا ہو
اس واسطے ہم گھر میں اندھیرا نہیں کرتے

جس پیڑ کی چھاؤں بھی لگے دھوپ کی صورت
اس پیڑ پہ پنچھی بھی بسیرا نہیں کرتے

آنکھوں سے نہ پڑھ لے کوئی چہرے کی اداسی
اس ڈر سے کبھی ذکر وہ میرا نہیں کرتے

ہم سینچتے ہیں کشتِ سحر اپنے لہو سے
مانگے ہوئے سورج سے سویرا نہیں کرتے

شاعرہ: کوثر خالد۔ جڑانوالہ

کرتم جگنیوں والی جیسی لگتی ہو۔ قصہ اس کی خوب صورتی
کا چھڑا تھا۔ ہم خریداری کے لیے موتی بازار گئے۔ برقع
پوش دو خواتین میری امی کے پیچھے ہی پڑ گئیں۔

”آپ نے اس کا رشتہ کہیں دے رکھا
ہے؟ آپ ہمیں اس کا رشتہ دے دیں۔“ ایک دکان
سے کنی کترا کر نکلے تو وہ پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے ہی پڑ
گئیں۔ خریداری گئی بھاڑ میں، ہم آفت کی پرکالہ کو
لے کر گھر واپس آ گئے۔

دھوپ چھاؤں مزاج میں جب چھاؤں آتی تو
اتنی گھنیری ہوتی کہ مجھے اپنا آپ اور اس کا اصل ڈھونڈنا
مشکل ہو جاتا۔ مجھے ہم نصابی سرگرمیوں میں تحفے
تحائف ملتے تو وہ بڑی خوشی مناتی۔ اپنی یونیورسٹی کی
دوستوں کو میری شاعری پڑھواتی، مجھے ان سے ملواتی،
واہ، واہ کرواتی۔ کسی بھی سالگرہ پر بارہ بج کر ایک منٹ
سے پہلے یا بعد میں دعائیں دینے کی ضرورت نہیں

پڑی۔ وہ جاگ رہی ہوتی، بچپن میں تو نت نئے طریقے اپناتی، کاغذ پر انگریزی میں سالگرہ مبارک لکھتی اور ڈھیروں کا پیاں کر کے یونیفارم، ٹوتھ برش، جوتوں، بیگ، کنگھی سب کے ساتھ رکھ دیتی۔ مجھے سونے کا تمغہ ملا تو مزہ نہیں آیا اس نے ہم نصابی میدان میں اپنی صلاحیت کے جوہر نہیں دکھائے تھے ورنہ میں اس سے اس میدان میں بھی ہار ہی جاتی۔ میری اس جیت کا اسے بہت مزہ آیا۔ مجھے کارڈز پر ”مجھے تم پر فخر ہے۔“ لکھا ملنے لگا۔ میری اندر کی بچی خوش ہوتی لیکن اس کے دھوپ مزاج سے خائف ہی رہتی۔

اس نے مجھے بتایا کہ بڑوں کو بہت سوچ سمجھ کر چلنا پڑتا ہے، کسی بھی راہ کا تعین کرتے وقت دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ واقعی اس نے کتنا دھیان رکھا جو چیز اس کے ہاتھ میں تھی اس نے اسے جانے دیا۔ صرف اس چیز کو پکڑا جو ہم لوگوں کے لیے مشعلِ راہ بنتی...... اس نے پڑھانا شروع کر دیا صرف مجھے جب تک پڑھاتی تھی اچھی لگتی تھی حالانکہ میں اسے پڑھانے کے قابل نہیں گردانتی تھی۔ اب میرے اور اس کے درمیان اتنے ڈھیر سارے شاگرد تھے، میں جانتی تھی کہ اب فاصلے سمیٹنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ میں اس سے کہنا چاہتی تھی کہ تم جو ہو جیسی ہو مجھے اپنے لیے چاہیے ہو۔ مجھے تم صرف میرے لیے چاہیے ہو لیکن بہت سی مجبوریاں دامن سے لپٹتی گئیں۔ وہ فرمانبردار بیٹی تھی تو مثالی استاد بنی۔

☆☆☆

ایک دن اس کی ایک شاگردہ کے ساتھ میری کسی بات پر ٹھن گئی تو اس نے کھینچ کر مجھے تھپڑ مار دیا۔ مجھے بہت شدید غصہ آیا۔ تیسری منزل اور چھت میں کتنا فاصلہ تھا۔ میں چھت پر جا پہنچی کہ میں تو کود جاؤں گی۔ وہ میرے پیچھے آگئی اور اس کے اندر کی ماں جاگ گئی۔ میں مار کھا کر اچھے بچوں کی طرح واپس نیچے آگئی۔

ایک شادی میں جانا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان پھر تو، تو میں، میں ہو گئی۔ میں نے اپنی ساری کلائی میں چوڑیاں چھولی اور خود کو کمبل میں چھپالیا۔ اس نے تھپڑ لگا کر ساتھ لے جانے پر راضی کیا اگلے دن اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جس سے اس نے مجھے مارا تھا۔ اب میں مار کھانے کی شائق رہتی، میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میرے لیے کہاں تک کیا کیا، کر سکتی ہے۔

سیدھی سادی سی لڑکی چودہ فروری کو چپکے سے ہمارے سرہانے کے نیچے کارڈ اور پھول (کبھی بھالو کبھی کچھ اور) رکھ دیتی۔ بارہ بجے وش کرتی، اپنی ڈائری پر اعلیٰ ذوق کی نمائندہ شاعری لکھتی، مجھے میری ایک سالگرہ پر خود سے نظم لکھ کر دی۔ میں بس اسے دیکھتی اور سوچتی اس لڑکی کی کتنی سمتیں ہیں، میں اس سے بہت باتیں کرنا چاہتی تھی۔ بتانا چاہتی تھی کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں لیکن اب وہ تھکنے لگی تھی۔ وہ بہت جلدی سو جاتی۔ اس کی تھکاوٹ دیکھ کر امی نے فیصلہ کیا کہ اب اس کے ساتھ وہی ہونا چاہیے جو لڑکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

اگر کبھی میں اپنی کسی دوست کے رویّے سے پریشان ہو کر روئی تو اس نے مجھے سمجھایا کہ ہماری ماں نے ہماری تربیت ایسی نہیں کی کہ کسی کے پیچھے بھاگیں بلکہ ہماری تو ایسی تربیت ہے کہ لوگوں کو ہمارے پیچھے بھاگنا چاہیے۔ ہمیں اپنے چلن کو دوسروں سے ممتاز کرنا ہے اور پھر یہ مشوروں کی پٹاری پیا دیس سدھارنے لگی۔ اسے اپنے والدین کے لیے بیٹا چاہیے تھا۔ اس کی ایک ہی فرمائش تھی کہ اسے آسمان سے اترا شہزادہ نہیں چاہیے بلکہ کوئی ایسا ہو کہ اس کی سب بہنیں ہاں کہہ دیں تو وہ بھی رضامند ہو جائے گی۔ مجھے پہلی ملاقات میں ہی بھائی جان کی شخصیت اچھی لگی۔ لیکن نائلہ کے لیے تو پرستان سے شہزادہ گلفام بھی آجاتا تو میں ہاں نہ کہتی...... میں کیسے کسی کو اس کے لیے ٹھیک سمجھتی۔ مجھے خود اس کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ خیر باقیوں کی ہاں میری بھی ہاں سمجھی گئی اور اس کا رشتہ طے ہو گیا۔

وہ اور چھوٹی ہر وقت روتے رہتے، اٹھتے، بیٹھتے

جاگتے ، ہوتے ان کا رونا ہی نہ ختم ہوتا۔ میرے اندر کمینی سی خوشی بیدار ہوجاتی۔ اب میں بڑی ہوں گی کیونکہ ہم دونوں کے درمیان والی تو بھیگی بلی ہے، ان کے رونے سے مجھے لگتا تھا گھر بھر پر نحوست سی طاری ہوگئی ہے۔ یہ الگ بات کہ جائے نماز پر کھڑے ہو کر میں اس کے بغیر گھر کا تصور کرتی تو میری جان ہی نکل جاتی۔ میں ان کے رونے کا مذاق اڑاتی لیکن رات کو میرا تکیہ بھیگ جاتا۔ میں اٹھ کر آدھی رات میں اسے دیکھتی ......وہ تہجد کے وقت ماتھا ٹیکے بیٹھی ہوتی......

شادی خوشی کا نام ہے اور اس نے پرانے زمانے کی ہیروئنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ بارات کے دن میں نے جانے کیسے اس کے رونے پر اتنے زور کا ڈانٹا کہ اس بیچاری کا منہ بن گیا۔ سب نے پوچھا کیوں رو رہی ہو، وہ بولی دل کر رہا ہے اور جب پھٹتی تو بولی میں ہمیشہ سب کی باتیں برداشت کرتی ہوں لیکن ہر وقت مجھے ہی سننا پڑتا ہے پر میں اس سے کہنا چاہتی کہ اس ہمیشہ میں وہ چھٹرکس کھاتے میں جاتے ہیں لیکن نہ کہہ سکی کیونکہ اس بات پر اسے مزید رونا آجاتا۔

وہ جب بھی کسی ٹی وی ڈرامے میں کوئی "ڈراما لڑکی کو" دیکھتی تو کہتی کہ یہ مریم ہے، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ اگر ڈرامے میں کوئی "فلم جیسی لڑکی" آئے تو میں بھی کہہ سکوں کہ یہ نائلہ ہے۔ لیکن وہ تو فلم ہے ناں، وہ ڈرامے میں کیسے سما سکتی تھی۔

زندگی کے نشیب و فراز سے ہم قدم ہوتے ہوئے اسے کچھ وقت لگا لیکن زندگی اس نے ویسے ہی گزاری جیسی وہ گزارتی تھی۔ جیسی وہ پڑھتی تھی جیسی وہ چاہتی تھی۔ اپنے اصلی ہیرو کے ساتھ اللہ کے گھر سے ہو کر آئی تو خوشیوں کی نوید ساتھ لے کر آئی۔ اللہ نے اس پیاری سی لڑکی کو ماں بنادیا۔ اب عبدالرحمن کو گود میں لیے جب وہ پیار کرتی ہے تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے کہ یہ تو خود چھوٹی سی بچی تھی اتنی بڑی کیسے ہوگئی۔

میں اس سے ہمیشہ سے چڑتی تھی سو اب بھی چڑتی ہوں اور کیسے نہ چڑوں میری عادتیں خراب کر کے وہ اگلے گھر چلی گئی ہے۔ میرے کپڑے سنبھالنے والا کوئی نہیں، میری کتابیں اس کے ہاتھوں کا لمس پانے کو..... بے چین رہتی ہیں، میری منصوبہ بندی ان راتوں کو ڈھونڈتی ہے جب وہ اور میں ساتھ ہوتے تھے۔ زندگی کتنی آگے بڑھ آئی ہے، میں کتنی مصروف ہوگئی ہوں، وہ گھر آکر ڈبل بیڈ پر لیٹتی ہے تو اس کے بچے ساتھ اور چھوٹی بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ تو میں بھلا اس کمرے میں کیسے سوسکتی ہوں لیکن اب میں واقعی اس کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں اس سے بہت کچھ سیکھنا چاہتی ہوں لیکن ڈر ہے کہ وہ مجھے سکھاتے، سکھاتے میری ماں ہی نہ بن جائے۔ وہ مجھ سے پیار سے، آرام سے بات کرے، مجھے یہ نہ کہے کہ وہ بہت لاجواب ہے۔ مجھے اس کے لاجواب ہونے پر کوئی شک نہیں ہے۔ میں اسے تسلیم کرتی ہوں پورے دل سے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اب بھی اس سے چڑ ہے، جیسی چڑ شروع سے تھی۔ لیکن اب کئی برسوں بعد کہ جب میں خود بقول اس کے سمجھدار ہوگئی ہوں تو اپنی چڑ جانے والی حالت پر غور کرنے لگی ہوں کہ اصل میں مجھے اس سے چڑ تھی یا میں رفتہ رفتہ اس کی اسی طبیعت کی عادی ہو چلی تھی کیونکہ اس کی شادی سے سب سے بڑا نقصان میرا ہی ہوا۔ اس کی شادی کے بعد میری زندگی میں کچھ بھی ویسا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔ بہت تبدیلیاں آئیں کچھ بھی برا نہ ہوتا اگر وہ پہلے کی طرح ساتھ ہوتی اور میں اسے اپنی ساری مشکلیں بتادیتی۔ میرے چڑنے کے باوجود اس نے میرا کبھی برا نہیں چاہا اس لیے کہ وہ تو مجھ سے نہیں چڑتی تھی ناں... چڑتی تو بس میں تھی اس سے۔ لیکن اب وہ ایسی پیا دیس سدھاری کہ اس سے بڑی کوئی مجنوں کی لیلیٰ کہیں نہیں ہوگی، کوئی نہیں ہوگی کیونکہ بھائی جان کے بغیر اس کی سانس بند ہوجاتی ہے۔ وہ ان کے ساتھ ہی آتی ہے اور ان کے ساتھ ہی واپس چلی جاتی ہے اور میرے چڑنے کی ایک ٹھوس وجہ اور ہوگئی ہے تو آپ ہی بتائیں کہ میرا چڑنا تو بنتا ہے ناں......!

# ......یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بد تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .
آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا . . .
عبادات، معاملات . . .
جنتِ گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 4

اس نے سیٹی بجاتے ہوئے بڑی ترنگ میں بائیک کو یوٹرن دیا جیسے سرکس کے موت کے کنویں میں گھوم رہا ہو۔ حسِ لطیف پھڑک پھڑک کر گدگدیاں سی کر رہی تھی۔

تیز رفتار بائیک کو عین زارا کے سامنے پہنچ کر بریک لگائے۔ زارا اور گارڈ دونوں اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

بائیک کھڑی کر کے اس نے چاق و چوبند سپاہی کی طرح سلیوٹ کیا...... گارڈ بڑے اچنبھے سے زارا کی طرف دیکھنے لگا۔

''تت......تم اس خوفناک بائیک پر مجھے لینے آئے ہو......؟'' زارا وقتی طور پر اپنی پریشانی بھول کر بائیک کی



طرف غصے اور حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''چلتی کا نام گاڑی ہوتا ہے میم...... تھینک گاڈ...... یہ ابھی چلنے کے موڈ میں ہے۔'' ساحل نے بہت پیار بھری نظر سے اپنی بائیک کی طرف دیکھا۔ جیسے نئی، نئی دام میں آنے والی محبوبہ پر گاہے، گاہے نگاہ کی جاتی ہے۔

''مگر میں نے فون پر کہا تھا کہ گاڑی لے کر آنا......'' زارا کی حالت غیر ہونے لگی۔ کتنا روح فرسا تصور تھا کہ اسے اس بے ہنگم سواری پر سفر کرنا ہے۔

''میم...... یہ گاڑی ہی ہے...... انجن پر ہی چلتی ہے......'' ساحل نے بے پروائی سے جواب دیا۔

''تم میرے لیے کوئی ٹیکسی روکو...... میں اس پر نہیں بیٹھوں گی۔'' زارا کے انداز میں قطعیت تھی۔

گارڈ بڑی حیرت سے بار، بار دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا...... اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ بائیک کیوں موضوع بحث بنی ہوئی ہے؟

''بائی داوے...... آپ کی کار کو کیا ہوا؟ اور آپ یہاں تک کیسے آئی ہیں؟'' ساحل کے ذہن میں کلبلانے والا سوال بالآخر زبان سے پھسل ہی گیا۔

''میری کار چھن گئی ہے۔'' زارا نے رونے والے انداز میں کہا...... ساحل کے لیے یہ دھماکا تھا...... اس نے بے اختیار یونیفارم میں ملبوس گارڈ کی طرف دیکھا...... اور بہت توجہ سے دیکھا...... وہ تو گارڈ کو زارا کے حوالے سے ہی دیکھ رہا تھا البتہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ آخر آج گارڈ کو ساتھ لے کر کیوں گھوم رہی ہے۔

''تمہارے پاس 100 روپیز ہیں؟'' اب زارا کو دھیان آیا کہ گارڈ کو اس نے خواہ مخواہ کھڑا کیا ہوا ہے...... اور خود کو مزید تماشا بنا رہی ہے۔

''اوہ...... شیور...... لیکن......'' ساحل جینز کی پاکٹ سے اپنا والٹ کھینچتے ہوئے کچھ کہتے، کہتے رکا...... کار چھننے کا سن کر وہ خاصا سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں...... اس کو پیسے دے دو...... تمہیں گھر جا کر واپس مل جائیں گے، میں نے اس کے موبائل سے ہی فون کیا تھا۔'' زارا نے کوفت و پریشانی کی کیفیت میں وضاحت کی۔

''کوئی بات نہیں میڈم...... پانچ، دس روپے کا بات ہے، ابھی آپ اپنے گھر جاؤ، امارے کو خالی دعا دو۔'' گارڈ نے بہت بڑے پن کا مظاہرہ کیا بلکہ سو روپے کا سن کر خاصا شرمندہ نظر آنے لگا تھا۔

''یہ لٹ جانے کے بعد پہریدار کا ساتھ...... بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔'' ساحل نے والٹ سے سو کا نوٹ نکالتے ہوئے پھر حیرت سے گارڈ کی طرف دیکھا۔

''یہ سامنے سے آیا ہے، اس نے دیکھ لیا تھا جب وہ مجھ سے کار چھین کر لے جا رہے تھے...... یہ سامنے والے بنگلے پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔'' زارا کو چاروناچار وضاحت کرنا پڑی۔

گارڈ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر سو روپے لینے سے انکار کر رہا تھا۔

''بہت مہربانی...... ام پریشان لوگوں سے اتنا سارا پیسہ کس واسطے لے گا...... پانچ، دس روپے کا خرچہ ہے...... اللہ آپ کو دے گا آپ اپنی بیگم کو لے کر سیدھا تھانے جاؤ...... پرچہ کٹاؤ...... ابھی یہ ضروری کام ہے۔ پرچہ کٹانا بہت ضروری ہے...... چھینا ہوا گاڑی واردات میں استعمال ہوگا تو بڑا پریشانی آئے گا...... سلام...... میم۔'' یہ کہہ کر گارڈ بنگلے کی طرف چل دیا...... سو کا نوٹ ساحل کی انگلیوں میں پھڑپھڑا رہا



تھا۔ کھلی جگہ کی ہوا میں بہت زور تھا۔

''بیگم......'' ساحل کی حس لطیف پھڑکی......زارا جزبزی نظر آرہی تھی بلکہ نظر چرا رہی تھی۔

''سیدھا سادہ دیہاتی بندہ ہے، معاف کردیں۔ حالانکہ اچھی خاصی بدتمیزی کرکے گیا ہے......روڈ پر کھڑے ہو کر کسی کو بھی میاں، بیوی بنا دینا بہت غلط بات ہے اور آپ کی تو اچھی خاصی انسلٹ کر گیا وہ......کس قدر عقل سے پیدل انسان ہے......اتنا تو سوچ لیتا......جس لڑکی کے پاس اتنی شاندار کار ہو اس کے شوہر کے پاس اتنی پھٹیچر بائیک کیوں ہوگی۔'' ساحل کی نظر میں اس کی پُرہجوم تمناؤں کے رنگ اترے ہوئے تھے......دل سے گارڈ کے لیے دعا نکلی......ایک ارب پتی لڑکی کو اس کی بیگم سمجھ کر بڑی تقویت پہنچائی تھی اس نے۔ یقیناً......اس کی بھی کوئی پرسنالٹی ہے......وہ کسی مال دار لڑکی کا شوہر ثابت ہو سکتا ہے۔

''اب تم اس احمق کی اسٹوپڈ سی بات پر غور کرتے رہو گے جلدی سے سوچو کیا کرنا ہے......وہ ٹھیک کہہ رہا ہے ہمیں پہلے پولیس اسٹیشن جانا چاہیے۔ اور یاد رہے کار میری نہیں سفینہ کی ہے......میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج اچھی سی کار ڈرائیو کروں......اس کی کار آٹو میٹک ہے......میری کار کا کلچ بہت ہارڈ ہو رہا ہے......لانگ ڈرائیو کرتے ہوئے پاؤں میں درد ہو جاتا ہے۔'' زارا آف موڈ میں ساحل کے دماغ میں دھماکے کرنے لگی۔

''میم سفینہ کی کار......اور......او......تو بہت expansive کار ہے......میم نے لاسٹ ائیر ان کی

برتھ ڈے پر گفٹ کی تھی۔'' ساحل کو اب صحیح معنوں میں بڑا زوردار جھٹکا لگا تھا...... اسے تاجور کے گھر کے پورچ میں کھڑی تمام گاڑیوں کے بارے میں معلومات تھیں...... کیونکہ گاڑیوں کے ٹیکس جمع کرانا بھی اسی کی ذمے داریوں میں شامل تھا۔

''میرے ہینڈ بیگ میں میری کار کی کاؤنٹر فائل تھی...... سفینہ کی کاؤنٹر فائل تو گھر میں ہی ہے۔'' زارا کو اب بہت شدت سے رونا آرہا تھا۔ بہت مشکل سے خود کو کنٹرول کر رہی تھی۔

''ہینڈ بیگ بھی گیا......؟ اوہ......گاڈ......!'' ساحل کے منہ سے تاسف بھرے کلمات نکلے۔

''ظاہر ہے، تب ہی تو گارڈ کے سیل سے فون کیا تھا۔'' زارا جھلائی۔

''اوہ مائی گاڈ......آپ کا آئی فون بھی گیا۔'' ساحل کو ایک اور دھچکا لگا...... اب زارا نے خون آشام نظروں سے ساحل کی طرف دیکھا۔

''اب یہاں کھڑے، کھڑے فاتحہ پڑھتے رہو گے......کوئی ٹیکسی روکو...... یا اپنے سیل سے فون کر کے...... اٹرکیپ بلاؤ......'' وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

''سوری میم...... یہ میری ڈیوٹی میں شامل نہیں ہے۔ آپ کو اسی بائیک پر بیٹھنا ہوگا۔ سوری ٹو سے، میں آپ کی کمپنی میں ملازم ہوں ہوم سرونٹ نہیں ہوں۔ میں آپ کی مدر کو انفارم کر دیتا ہوں بس یہی میری ڈیوٹی ہے۔'' ساحل نے اچانک پینترا بدل کر بڑی انا کا مظاہرہ کیا تھا۔

''مگر یہ تمہاری اخلاقی ذمے داری بھی تو ہے ناں۔'' زارا اس کے بدلے ہوئے انداز پر حیرت و غصے کی کیفیت میں ردِعمل کر رہی تھی۔

''ظاہر ہے اس کے لیے یہ بائیک حاضر ہے......آپ کو نہ کندھے پر اٹھا رہا ہوں نہ پیدل لے جا رہا ہوں۔'' اس نے بدستور اسی انداز میں کہا۔

''میرا خیال ہے میم کو فون پر انفارم کرنا ٹھیک نہیں۔ ان کی بہت امپورٹنٹ میٹنگ چل رہی تھی۔''

''چلیں پہلے درخشاں چلتے ہیں۔'' اس نے نزدیکی پولیس اسٹیشن کے حوالے سے کہا۔

''کیوں فضول باتیں کر رہے ہو......ہم درخشاں کیوں جائیں؟'' زارا ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو چکی تھی...... بے سوچے سمجھے ہی پھٹ پڑی۔

''میں پولیس اسٹیشن جانے کی بات کر رہا ہوں...... یہ علاقہ غالباً درخشاں پولیس اسٹیشن کی حدود میں آتا ہے، چلیں میڈم۔'' ساحل شام کی مائل بہ رخصت نرم دھوپ میں چمکتے زارا کے چہرے کی طرف جی بھر کر دیکھ رہا تھا...... یہ لمحات بہت من چاہے تھے، کوئی اس کے ''دیکھنے'' کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

کار چھن جانے کی خبر شاکنگ ضرور تھی مگر کسی غریب کے لٹنے کا دکھ نہیں تھا۔ اتنے رئیس لوگوں کی قیمتی کار کا جانا تو اس کے نزدیک ایسا ہی تھا جیسے بہتے سمندر سے ایک بالٹی پانی بھر کر کوئی چلتا بنے...... پریشان چہرے کی گلابیاں، تیز روشنی کی وجہ سے مندی، مندی آنکھیں، اڑتے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتی...... جی چاہ رہا تھا کہ اس کی فوراً کچھ تصویریں اتار لے اور فرصت کے لمحات میں کسی دلنواز شاعری کی طرح پڑھا کرے۔

''اب کیا میری شکل دیکھتے رہو گے...... بائیک اسٹارٹ کرو......'' زارا کا اب قدرے پُرسکون ہونے کے بعد دل کھول کر رونے کا جی چاہ رہا تھا۔ تاجور کی متوقع جھاڑ جھپاڑ قیمتی کار سے محرومی کا احساس، سفینہ کے سامنے

شرمندگی کا مرحلہ...... اور پھر اس پر مستزاد ساحل کی اس بائیک پر سفر کرنے کا تصور جس کا ایک دن پہلے وہ جی بھر کر مذاق اڑا چکی تھی۔ ساحل نے روانگی کا عندیہ پاتے ہی بائیک کو کک لگانا شروع کر دی۔ دو تین کک سے اسٹارٹ ہونے کا تو سوال ہی پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ زارا نے ساحل کی طرف سے یوں پشت کر لی جیسے وہ کسی اسٹاپ پر کھڑی وقت سے آنے والی بس کا انتظار کر رہی ہو۔

اللہ، اللہ کر کے بائیک اسٹارٹ ہوئی۔ ساحل فوراً بیٹھ گیا اور زارا کو متوجہ کرنے کے لیے ہارن دیا۔ ہارن کی آواز بھی اتنی نازک تھی جیسے کوئی شرمیلی دلہن دولہا کے اصرار کے بعد لب کشائی کرے۔ زارا نے چونک کر دیکھا پھر طوعاً و کرہاً قدم بڑھائے...... اپنا جدید تراش کا کھلا ڈھلا لباس سنبھالا...... بیٹھتے ہی اڑتے بالوں کو قابو کرنے لگی تو گرتے، گرتے بچی۔ دھپ سے دونوں ہاتھ ساحل کے کندھوں پر جا پڑے۔

بائیک انجن پر دوڑ رہی تھی مگر ساحل ہواؤں میں اڑنے لگا۔ اُف کیسی جانفزا روح پرور اور منچل پرفیوم کی مہک تھی جو اس نے کسی tester سے بھی نہیں سونگھی تھی۔

زارا نے گھبرا کر اپنے ہاتھ ہٹائے تو تھے مگر اڑتے بال اتنا تنگ کر رہے تھے کہ مجبوراً اسے ایک ہاتھ ساحل کے کندھے پر مستقل رکھنا پڑا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ بال سنبھال رہی تھی۔

ساحل جان بوجھ کر اس انداز میں بیٹھا تھا کہ زارا کے حصے میں بہت کم جگہ آئی تھی۔ لامحالہ وہ ساحل کے ساتھ چپکی نظر آ رہی تھی۔ ساحل سوچ رہا تھا کہ کار loss سے اتنے قیمتی لمحات ملتے ہیں تو کبھی، کبھی ایسے نقصانات ہو جانے چاہئیں۔

''آہستہ چلاؤ میں گر جاؤں گی......'' بڑھتی اسپیڈ سے زارا بری طرح گھبرائی۔

''نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو یہ ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی''

ساحل نے بلند آواز سے شعر پڑھا تھا جو اچھا خاصا تو ہوا کے زور پر اڑ گیا اور زارا کے سر سے گزر گیا۔

''زور سے پکڑ لیں مجھے ہی...... جیسے وارداتیے کو پکڑتے ہیں کہ جانے نہ پائے۔'' ساحل اس وقت درحقیقت نشے میں تھا...... وہ جسے دور، دور سے دیکھ کر تمنائیں مچل جاتی تھیں آج اس سے چپکی بیٹھی تھی۔

''تمہیں کیوں پکڑوں؟ تم اسپیڈ آہستہ نہیں کر سکتے؟'' وہ بائیک کے شور کی وجہ سے چلا کر بولی۔

''تو پھر گر کر دکھائیں...... میں آپ کو اٹھا کر دکھاتا ہوں۔'' ساحل نے بھی بلند آواز میں جواب دیا۔

''دیکھنا...... میں اماں کو بتاؤں گی...... تم بہت اوور ایکٹنگ کر رہے ہو۔'' زارا نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

''کیا، کیا بتائیں گی اماں کو...... میرا خیال ہے پہلے تو وہ آپ کو اچھی طرح بتائیں گی...... شور مچانے کے بجائے دعائیں کریں کہ گاڑی اچھی کنڈیشن میں بازیاب ہو جائے۔'' اس نے پھر بلند آواز میں مشورے سے نوازا تھا۔

زارا...... غصے کی شدت سے توازن کھونے لگی۔ اس سے پیشتر پھسل پڑتی اس نے بے اختیار کیفیت میں ساحل کی کمر کے گرد بازو کا گھیرا ڈال دیا...... قربت حد سے بڑھی تو ساحل پر بیچ بیچ شعر اترنے لگے۔ جوان لڑکی کے وجود کی گرمی نے جذبے اور عمر دونوں میں اضافہ کر دیا۔ ہونٹوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی۔

زارا کی آنکھوں میں بے بسی کی کیفیت نے آنسو بھر دیے تھے۔

''اسے تو میں بہت اچھی طرح بتاؤں گی۔ ذرا اس بائیک سے اتر جاؤں۔'' بدلہ لینے کے جذبے نے اس

میں صبر کا جذبہ خود بخود پیدا کر دیا۔

☆☆☆

''زارا کو لینے گیا ہے......؟ کہاں سے لینے گیا ہے؟ اس کے پاس تو اپنی گاڑی ہوتی ہے۔'' تاجور حیران پریشان سیتا کی طرف گھورتے ہوئے سوالات کرنے لگیں۔

''مجھے نہیں معلوم میم...... مس زارا کی کال آئی تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈسٹربڈ لگ رہی تھیں۔ کار اور ڈرائیور بھیجنے کا بول رہی تھیں۔'' لفظ 'ڈسٹربڈ' سن کر تو تاجور از حد پریشان ہوگئیں۔ جلدی سے اپنا سیل فون اٹھایا اور زارا کا نمبر ملانے لگیں۔ سیل کان سے لگایا تو پتا چلا وہ پاور آف ہے...... پریشانی مزید بڑھ گئی جلدی سے ساحل کا نمبر ملانے لگیں۔ سیتا بغور دیکھ رہی تھی اور اگلے حکم کی منتظر تھی۔

''زارا کا سیل آف ہے، ساحل کال نہیں لے رہا...... کیا مصیبت ہے؟'' انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے سیل پٹخنے کے انداز میں ٹیبل پر رکھ دیا۔

''تم جا کر اپنا کام کرو...... میں تھوڑی دیر بعد دوبارہ ٹرائی کرتی ہوں۔'' انہوں نے سر پر مسلط سیتا کو ٹہلایا۔ سیتا سر جھکا کر روم سے باہر چلی گئی۔

''کوئی ڈھنگ کا رشتہ مل جائے تو میں سفینہ سے پہلے اس کی شادی کروں...... ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ اتنا بڑا بزنس سیٹ اپ سنبھالوں...... یا اس لڑکی کو......؟'' وہ پریشانی و غصے کی کیفیت میں خود کلامی کر رہی تھیں۔

☆☆☆

''اللہ سائیں نے جب اتنا نوازا ہے تب ہی تو آپ نے اپنی بیوی کو اتنی قیمتی کار لے کر دی ہے۔ ایک ڈرائیور کیوں نہیں رکھ لیتے ان کے لیے؟'' ایس ایچ او پلکیں جھپکائے بغیر دونوں کو یوں گھور رہا تھا جیسے اس نے وارداتیوں کو رنگے ہاتھوں خود پکڑا ہو۔

پولیس ڈپارٹمنٹ کے دیکھنے کا انداز عام لوگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظر ہی نظر میں مدمقابل کی روح کا ایکسرے نکال رہے ہوتے ہیں۔ شکی نظریں بڑی پھرتی سے طواف کر رہی ہوتی ہیں۔

ساحل کی جیب سے کیا گیا تھا وہ تو بہت ہلکا پھلکا تھا...... زندگی میں آنے والے ان قیمتی لحات سے پورا، پورا حظ اٹھا رہا تھا۔

ایس ایچ او کا مکالمہ سن کر پہلے تو زارا قدرے گھبرائی پھر فوراً غصے میں آ گئی۔

''ایکسکیوزمی آفیسر......!'' اس نے وضاحت کرنا چاہی۔ ساحل نے اپنا پاؤں آہستہ سے زارا کے پاؤں پر رکھ کر اسے بولنے سے باز رکھا۔ زارا نے چونک کر ساحل کی طرف دیکھا۔

''میں تو کب سے کہہ رہا ہوں کہ ڈرائیور رکھ لیں...... ان روڈوں پر ڈرائیو کرتے ہوئے مردوں کے میٹر گھوم جاتے ہیں...... عورت تو پھر صنفِ نازک ہے یہ دبئی یا امریکا کے روڈ تھوڑا ہی ہیں۔ ہیوی وہیکل، کار، سائیکل، گدھا گاڑی سب ایک ہی روڈ پر دوڑتے ہیں پورے دو سو سال پیچھے ہیں ہم ایڈوانس دنیا سے...... انجن کے سامنے گدھا چل رہا ہوتا ہے۔ گدھے کی ٹرمز اینڈ کنڈیشنز پر ڈرائیو کرنا پڑ جاتی ہے۔'' ساحل کی بات پر ایس ایچ او کو خود پر اختیار نہ رہا۔ بڑا زبردست قہقہہ فضا میں ابھرا تھا۔

''گڈ...... ماشاء اللہ...... بہت زبردست لائف پارٹنر ملا ہے آپ کو میم...... ایسے لوگ تو بور نہیں ہونے دیتے۔ بہت دلچسپ گفتگو کرتے ہیں۔'' اس سے پیشتر کہ زارا غصے میں الٹ پڑتی...... ساحل فوراً بول پڑا۔

''تھینک یو ویری مچ سر...''

''پولیس اپنی سی پوری کوشش کرے گی...... ویسے جب اتنی قیمتی کار رکھتے ہیں تو تھوڑا سا خرچہ سیفٹی کے لیے بھی کر لیتے ہیں۔کار چھن بھی جائے تو شہر سے باہر نہیں جا سکتی۔'' ایس ایچ او نے پھر مفت مشورے سے نوازا۔

''ایکچوئلی سر بات یہ ہے۔'' زارا نے لب کشائی کی تو ساحل پھر مخل ہوا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، آپ کی محنت و کوشش سے کار مل جائے تو سب سے پہلا کام یہی کریں گے...... انشاء اللہ۔''

اب زارا نے تلملا کر ساحل کی طرف دیکھا تھا۔

ایس ایچ او جانے کیا سمجھا اس نے فوراً گھنٹی بجا کر سپاہی کو طلب کیا...... سپاہی جن کی طرح پلک جھپکتے میں حاضر ہو گیا اور جم کر سلیوٹ کیا۔

''لال خان مخبر کے ساتھ نکلا ہوا تھا...... دیکھو واپس آیا یا نہیں......؟'' آرڈر دے کر ایس ایچ او پھر دونوں کی طرف متوجہ ہوا۔

''ہمارا ہیڈ محرر باہر نکلا ہوا ہے...... آتا ہو گا وہ آپ کی ایف آئی آر کاٹے گا...... آپ لوگ چائے لیں گے یا ٹھنڈا۔'' ایک حسین، خوش لباس، مال دار مہکتی ہوئی دوشیزہ سامنے ہو تو بہت سے مرد زندگی میں پہلی بار بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔زارا کا موڈ از حد خراب ہو چکا تھا۔

ایک غریب سا منیجر جس کی کھٹیچر سی بائیک پر بیٹھنا کسی جرم کی سخت ترین سزا کے برابر تھا اُس ایس ایچ او کی آئی سائٹ اتنی کمزور تھی کہ وہ ایک رئیس زادی اور عام سے ملازم میں فرق بھی نہیں کر سکتا تھا۔اس سے پیشتر وہ انکار کرتی ساحل پھر بول پڑا۔

''سر چائے پلوا دیں...... سر میں درد کی لہریں اٹھ رہی ہیں۔ابھی تو پتا نہیں کتنی خواری ہو گی۔''

ساحل نے نام کو بھی تکلف نہیں فرمایا تھا۔پولیس اسٹیشن میں اس وقت مفت ملنے والی چائے کی پیالی کی بھی بہت اہمیت تھی۔باہر نکل کر کوئٹہ ہوٹل سے بھی پیتا تو جیب سے پندرہ روپے تو دودھ پتی کے دینا ہی پڑتے۔

زارا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کونے میں پڑی 1857ء ماڈل کی کرسی اٹھا کر ساحل کے سر پر دے مارے۔

☆☆☆

''سیکنڈ ورلڈ وار میں برطانیہ کا بہت بڑا حصہ ہے...... دنیا ہٹلر پر سارا ملبہ ڈالتی رہی ہے، اسے جنگ کا ذمے دار قرار دیا جاتا رہا ہے۔'' لیڈی صوفیہ ایک دفعہ پھر ماضی کھنگال رہی تھیں۔

''مگر ہسٹری میں یہ بات نقش ہو چکی ہے مائی سن وہ بھی پتھر پر پڑے نشانوں کی طرح کہ برطانیہ نے 20-1919ء امن معاہدے کے بعد یورپی معاملات سے نظریں چرائیں...... امن کے قیام میں اپنا حصہ نہیں ڈالا پھر میں اس سرزمین سے کیوں محبت کرتی......؟ جنگ سے بچنے کے لیے کچھ نہیں کیا جب جنگ مسلط ہو گئی تو معصوم لوگوں کو آرام دہ گھروں سے نکال کر لڑنے مرنے کے لیے محاذوں پر بھیج دیا اور جنگ کے بعد راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر امن کی باتیں ہونے لگیں۔بس پھر میں اپنے بچوں کو لے کر پاکستان آ گئی۔مسٹر جناح کی پرسنالٹی غضب کی تھی...... لگتا تھا کہ جناح زمین پر کوئی جنت بسا رہا ہے...... پاکستان آ کر لگا جیسے دوزخ سے نجات پا کر جنت میں آ گئی ہوں۔'' پرنس کچھ دیر قبل سوئمنگ سے فارغ ہو کر لان میں فروٹ کاک ٹیل کھانے میں مصروف تھا۔لیڈی صوفیہ جین آسٹن کا ناول ہاتھ میں لیے بولتی ہوئی اس کے سر پر آ پہنچیں۔

چند قدم کے فاصلے پر نوکر مستعد کھڑا پرنس کے اگلے حکم کا منتظر تھا۔

''گرینڈ مام...... پلیز......'' پرنس نے کاک ٹیل باؤل لیڈی صوفیہ کی طرف سرکایا۔

''نو تھینکس...... میں نے عصر کی نماز کے بعد فریش جوس لے لیا تھا۔'' انہوں نے بدمزہ ہو کر معذرت کی' وہ کچھ خاص باتیں کرنے کے موڈ میں تھیں مگر پرنس ان کے ماضی کے دریچوں کو بڑی سمجھداری سے بند کرتے ہوئے انہیں کھانے پینے کی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

''آج تم بہت مصروف رہے...... میں تمہیں ایک گڈ نیوز سنانے کے لیے بے چین ہوں......'' لیڈی صوفیہ نے ناول میں نشان لگا کر پرنس کی طرف دیکھا اور ناول ٹیبل پر رکھ دیا۔

''گڈ نیوز...... جلدی سے سنائیں گرینڈ مام...... بہت دن ہو گئے کوئی گڈ نیوز ہی نہیں سنی۔'' پرنس نے ڈبے سے ٹشو کھینچتے ہوئے بڑی دلچسپی ظاہر کی۔

''میں نے تمہارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔'' انہوں نے بہت فخریہ انداز میں دھماکا کیا...... پرنس کے لیے تو یہ دھماکا ہی تھا۔

''کیا یہ مذاق ہے......؟'' پرنس نے بے یقینی کی کیفیت میں مسکرا کر دیکھا۔

''میں سنجیدہ ہوں...... اور تم میری بات غور سے سنو۔'' لیڈی صوفیہ نے قدرے برا منانے کے انداز میں جواب دیا۔

''آج میں اتفاق سے اپنی مرحومہ دوست کے گھر چلی گئی۔ اس کی تینوں پوتیاں ایک ہی گھر میں رہتی ہیں، تینوں کے ملا کر دس' بارہ بچے ہیں...... وہاں میں نے ایک لڑکی پسند کر لی ہے وہ ان تینوں میں سے کسی کی بیٹی نہیں بلکہ ایڈاپٹڈ ہے۔ پرشین ہے۔ بے حد حسین جیسے اسے تمہارے برش نے تخلیق کیا ہے۔'' لیڈی صوفیہ کسی گہرے خیال میں ڈوب کر بولتی جا رہی تھیں...... پرنس حیرت سے لب بستہ بس انہیں دیکھنے پر اکتفا کر رہا تھا۔

''اس بچی کا بیک گراؤنڈ بہت اسٹرونگ ہے، یقیناً اس کے DNA میں مستقبل کی بہت شاندار...... بہت گریٹ تصویریں چھپی ہوں گی۔''

''مام...... جسٹ اے منٹ......'' پرنس نے انہیں درمیان میں ٹوک کر اپنی بات کرنے کی کوشش کی۔

''پہلے میری بات مکمل ہونے دو......'' لیڈی صوفیہ کو دھارے میں روک لگانے سے روحانی تکلیف ہوئی...... پیشانی پر ناگواری کی لکیریں کھنچ گئیں۔ ''میں آنے والے دنوں میں اپنی نسل کو پھلتا پھولتا دیکھ رہی ہوں...... میں چاہتی ہوں تم بہت سے عظیم انسانوں کے باپ کہلاؤ۔''

''تھینک یو مام...... مگر...... آپ تو میری شادی کسی غریب لڑکی سے کرنا چاہتی تھیں...... اچانک پروگرام بدل گیا؟'' پرنس نے اپنی بات پہنچانے کا موقع بڑی صفائی سے نکال ہی لیا تھا۔

''وہ اڈاپٹڈ چائلڈ ہے۔ جس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر جائیں، اس سے زیادہ غریب کون ہو سکتا ہے؟'' لیڈی صوفیہ نے برہم ہو کر سوال کیا تھا...... اور فوک سے ایک پائن ایپل کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ غصے میں بھول گئیں کہ کچھ دیر قبل فروٹ کاک ٹیل کھانے کی آفر ٹھکرا چکی تھیں۔

''تو پھر میں بھی بہت غریب ہوں مام...... کیونکہ میرے پیرنٹس بھی اس دنیا سے بہت جلدی چلے گئے تھے۔'' پرنس نے دھیرے سے مسکرا کر کہا۔ یہ سنتے ہی لیڈی صوفیہ غصے سے تھر تھر کانپنے لگیں...... اور اپنی جگہ سے کھڑی

ہو گئیں۔

''میں تمہاری سگی پر دادی پل، پل تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے شاندار خاندان کا اثاثہ ہوں، نشانی ہوں، تمہارا اسٹیٹس سمبل ہوں۔تم کیسے خود کو غریب سمجھ سکتے ہو؟'' وہ عجیب انداز سے بولیں۔ ''اس وقت تم نے مجھے بری طرح ہرٹ کیا ہے پرنس...... میں اکیلی، تنہا ہی تمہارا بہت بڑا خاندان ہوں۔'' لیڈی صوفیہ کو خود پر قابو پانا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

پرنس بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''سوری گرینڈ مام...... مائی گریٹ مام...... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا میں تو آپ سے جواب لے کر اپنا کنفیوژن دور کرنا چاہ رہا تھا۔''

''اوکے، اوکے......'' لیڈی صوفیہ کی تمنا بہت زور آور اور شدید تھی انہوں نے بڑی سرعت سے پوتے کی معذرت قبول کر لی کیونکہ وہ مزید کچھ بتانے کے لیے بے تاب تھیں۔

دوبارہ نشست سنبھالی اور چند گہری، گہری سانسیں لیں۔اس دوران پرنس کو اپنی بات کرنے کا سنہری موقع مل گیا۔

''لیکن میں نے تو اس لڑکی کو دیکھا ہی نہیں...... اس ٹاپک پر آپ سے کیسے پراپر ڈسکس کر سکتا ہوں۔''

''میرا یہ کہہ دینا کافی ہے کہ وہ بے حد حسین ہے، اسے کوئی ریجیکٹ ہی نہیں کر سکتا۔ مرد کو دل بہلانے کے لیے اس کی پسند کی بہت سی عورتیں مل سکتی ہیں مگر شادی خاندان بنانے اور شاندار نسل کی تیاری کے لیے کی جاتی ہے۔ میں تمہیں عشق کی آگ سے بچانے کا تہیہ کر چکی ہوں۔'' ان کا لہجہ حتمی تھا۔

''میں اپنے خاندان کے اکلوتے اثاثے کو دکھوں کی دلدل میں نہیں دھکیل سکتی۔ دکھ اور محرومیاں عمر کی طرح سفر کرتے ہیں، خون میں اتر جاتے ہیں...... آنے والی نسلوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے...... تم اسے دیکھ کر بے پناہ خوشی محسوس کرو گے، وہ تمہیں پا کر اپنی قسمت پر ناز کرے گی۔'' وہ اب اپنی طرف سے اسے خوشیوں کی ضمانت دے رہی تھیں۔

''صحت مند دماغ، مثبت رویے، انسانیت، عظمت...دیکھو میں آنے والی صدیوں کو پلان کر رہی ہوں...... میرے بیٹے مجھے اپنے بچوں کو عشق کی دوزخ سے بچانا ہے۔ انسانی عقل کی حفاظت کرنی ہے۔''

''مام، اگر میں کسی کے عشق میں مبتلا نہ ہوں لیکن کوئی مجھ سے عشق کرے، میرے عشق میں پاگل ہو...... اور مجھے پانے کے لیے جان دینے کے لیے بھی تیار ہو جائے؟ تو آپ کو اس عشق پر تو اعتراض نہیں ہوگا ناں...... صرف اور صرف مجھے سوچنے والی، مجھے چاہنے والی...... ہاتھ اٹھا کر دعاؤں میں صرف مجھے مانگنے والی؟'' وہ سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

''امپاسبل!'' لیڈی صوفیہ نے بڑی طراری سے قطع کلامی کی۔

''یہ خوبیاں تو صرف تمہاری گرینڈ مدر میں ہی ملیں گی...... آج کے دور میں لڑکیوں کو یہ عظیم سعادت نہیں مل سکتی۔'' لیڈی صوفیہ کے انکار میں بڑی شدت اور اعتماد تھا۔

''اگر ایسی لڑکی کو آپ کے سامنے لا کھڑا کروں تو؟'' پرنس، دادی کی ''منتخب حسینہ'' سے نجات پانے کے لیے میدانِ کارزار میں ہتھیار تیز کر کے آخر کار اتر ہی گیا تھا۔

لیڈی صوفیہ خانزادہ کے لیے بڑا روح فرسا انکشاف تھا۔ چند لمحے پلکیں جھپکائے بغیر وہ مبہوت سی پرنس کی

# یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First. All Done

Liked Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

طرف دیکھتی رہیں..... صدی کے آخری عشرے میں قدم رکھتی بوڑھی عورت کے اعصاب بھی فولادی تھے مگر وہ نیت اور ارادے کے باوجود فطرت کو شکست دینے پر قادر نہیں تھی۔

اعصاب کی زندگی قائم رکھنے والا رقیق مادہ، خواب ٹوٹنے کے عمل سے بے انتہا سست رفتاری سے بہاؤ کا عمل برقرار رکھ پار ہا تھا۔ اطلاعی نظام میں حددرجہ خلل واقع ہوا تو الفاظ گم ہو گئے...... یادداشت کے کھڑکی، دروازوں پر دستکیں دینے کی اہلیت جواب دے گئی۔ پرنس کو پردادی کا ایک ٹک دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ان کے ردِعمل کا بہت سکون سے انتظار کر رہا تھا۔

عام حالات میں تو وہ اپنی دُھن میں رہتی تھیں بہت توجہ سے اس کی طرف بہت ہی کم دیکھتی تھیں...... پرنس کے پردادا نے پس پردہ جا کر بھی ان کی ذات کو اپنی مکمل گرفت میں لیا ہوا تھا۔

وہی ہوا جس کا ڈر تھا...... بالآخر ان کی مغموم آواز ماحول میں مرتعش ہوئی۔

''آخر کسی نے جال ڈال کر تمہیں پھنسا ہی لیا۔'' وہ شدید صدمے کی کیفیت میں بہت بے ترتیب سانسیں لے رہی تھیں۔

''گرینڈ مام...... آپ کی فیورٹ رائٹر Charlotte Bronte نے اپنی ایک اسٹوری میں بڑے کمال کا جملہ کہا ہے...... اتفاق سے مجھے یاد آ رہا ہے......''

''اویس...... وہ تو میری پیدائش سے بہت پہلے کی رائٹر ہے...... mid nineteenth century میں تو اس کی ڈیتھ بھی ہو گئی تھی...... البتہ اس کا کلاسک لٹریچر ہمارے گھر کی لائبریری میں ہمیشہ رہا۔'' لیڈی صوفیہ نے پرنس کا جملہ قطع کر کے نئی یادداشت کے روزن سے جھانکنا شروع کر دیا۔

''آپ وہ خوب صورت جملہ تو سنیں جو مجھے یاد آ رہا ہے۔'' پرنس کو ہر صورت ان کی پسندیدہ منتخب لڑکی سے شادی کرنے سے اپنا بچاؤ کرنا تھا وہ اٹھنے سے پہلے یہ باب ہمیشہ کے لیے بند کر دینا چاہتا تھا۔

''اوکے...... اوکے......'' گویا اجازت مل گئی...... اس کے ساتھ ہی پرنس کی طرف بغور دیکھنے لگیں۔

"I am not a bird, and no net ensnares me .I ama free human being with an independend will"

ترجمہ: (میں کوئی پرندہ نہیں ہوں جو کوئی جال بُن کر مجھے پھنسا لے، میں ایک آزاد انسان ہوں، اپنے آزاد اختیارات کے ساتھ)

''تم Bronte کے خیالات کا پرچار اکیسویں صدی میں نہیں کر سکتے۔'' لیڈی صوفیہ تڑپ کر گویا ہوئیں۔

''معاف کیجیے گا گرینڈ مام...... اکیسویں صدی کو ویلکم کہنے والے ایک ینگ مین کو آپ بیسوی صدی میں قید نہیں کر سکتیں۔''

پرنس کا دل ٹھنڈا ہو گیا...... آخر اس نے پردادی ہی کے فراہم کردہ ہتھیار سے جنگ جیتنے کی کوشش کی تھی۔ مناسب ہتھیار کا بروقت استعمال بہت موثر ثابت ہوا...... لیڈی صوفیہ نے چند ثانیے کے سکوت کے بعد گہری سانس لی۔

''کون ہے وہ؟ آخر تمہیں کیسے یقین آیا کہ وہ تم سے عشق کرتی ہے اور یہ کہ تم اس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو؟'' وہ سوچ، سوچ کر سوال پر سوال کرنے لگیں۔

''وہ بہت کم عمر ہے...... اس کی آنکھوں میں کسی بچے جیسی بے ساختگی ہے، اس کی ہنسی میں آبشاروں کی

میلوڈی ہے...... اس کی مسکراہٹ میں اولین صبح کے اجالے ہیں...... اس کی ذات میں سیماب کی سی.... بےقراری ہے...... سچی بات ہے میں اگر اسے زنجیر سے باندھ کر نہ بٹھاؤں تو اسے پینٹ نہیں کرسکتا اس کا رف اسکیچ نہیں بنا سکتا۔'' پرنس کو خود نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کچھ بولتا چلا گیا...... الفاظ کہاں سے اتر رہے تھے...... وہ کس کو بیان کررہا تھا۔

لیڈی صوفیہ مبہوت بیٹھی اس کی شکل تک رہی تھیں۔

''اوہ گاڈ، کیا عمر ہوگی اس کی...... یہ ضرور بتاؤ، اس لیے کہ بیس سال کا لگنے اور بیس سال کا ہونے میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''ابھی ٹوینٹی کی کہاں...... اندر نائنٹین ہے ابھی۔'' پرنس اپنی طبیعت کے برخلاف اتنے فراٹے سے جھوٹ بول رہا تھا جس پر اسے کوفت بھی تھی اور حیرت بھی...... لیکن اسے ایک adopted اور بیچاری سی لڑکی سے پیچھا چھڑانا تھا...... پردادی کو اس طرف سے حتمی طور پر مایوس کرنا تھا۔ ایک ایسی بیچاری سی لڑکی بھی اس کا آئیڈیل نہیں ہوسکتی تھی۔

''اوہ گڈ......'' لیڈی صوفیہ کی اب آنکھیں چمکنے لگیں۔

''اگر وہ سوئٹ سکسٹین کی ہوتی تو میرے لیے زندگی کی بہت بڑی خوش خبری ہوتی...... اس عمر میں لڑکی ذرا modest (شرمیلی) ہوتی ہے آسانی سے خود پر کسی کو (حکومت) rule کرنے کی اجازت نہیں دیتی...... بہرحال میں اس سے ملنا چاہوں گی...... وہ بھی جلد سے جلد تو پھر کب ملا رہے ہو؟'' لیڈی صوفیہ انتہائی بوڑھی اور کمزور اعصاب کی عورت تھیں، پل میں بہت جذباتی ہوگئیں۔

اب پرنس کو نیا کام پڑ گیا...... بر محل جواب نہ سوجھا تو کھڑا ہوا پھر ٹہلنے لگا...... لیڈی صوفیہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

''میں اس کا بہت تفصیلی انٹرویو لوں گی...... آخر میری نئی نسل کے فیوچر کا سوال ہے۔ کوئی معمولی بات نہیں۔''
اب وہ سر جھکا کر خود کلامی کرنے لگیں...... اس دوران پرنس کو جواب مرتب کرنے کا موقع مل گیا تھا۔

''ویسے اگر وہ ویل آف ہے اور تم سے عشق کرتی ہے تو نوٹس لینا پڑے گا۔ کیونکہ غریب لڑکی تمہاری دولت کے عشق میں مبتلا ہو کر تمہیں پھنسانے کی کوشش کر سکتی ہے...... اس شہر میں بہت سی غریب لڑکیاں ہوں گی جو شارٹ کٹ سے ہائی جیبٹری میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس لیے کہ مڈل کلاس لڑکے اگر لائق فائق ہوں تو ان کے پاس برائٹ فیوچر ضرور ہوتا ہے...... پریزنٹ نہیں۔''

''میں ابھی آپ سے کوئی پرامس نہیں کر سکتا کہ آپ کو اس سے کتنی جلدی ملواؤں گا مگر ایک دن آپ اس سے ملیں گی ضرور......'' پرنس اتنی طویل بحث سے اکتا چکا تھا۔ مزید جھوٹ بولنے کا جذبہ بھی نہیں تھا۔ سو جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کر لوں گی لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میرا مطمئن ہونا بہت ضروری ہے...... اوپن ہارٹ سرجری ایک بار ہوتی ہے، میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ اس نے اتنی طویل زندگی دی ہے تھوڑی سی اور چاہیے تاکہ میں اپنی بہو کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار سکوں۔''

''شیور ویسے بھی آپ کو ناراض کر کے خوشی منانا میرے نزدیک تو کرائم ہے۔'' پرنس نے پردادی کو اٹھتے ہوئے دیکھا تو لمحۂ آزادی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آگے بڑھ کر اظہارِ محبت کرنا ضروری خیال کیا۔

"God bless you" دادی نے لرزتا ہوا ہاتھ پرنس کے سر پر رکھ دیا۔ ''اگر وہ سچ مچ تم سے عشق کرتی ہے تو تمہیں اسی سے شادی کرنی چاہیے...... ورنہ کسی اور کی بیوی بن کر اسے ساری زندگی دھوکا دیتی رہے گی...... اور تم اس کے پانچ چھ بچوں کے روحانی باپ بھی بن سکتے ہو۔ یہ بہت بڑا moral crime ہے اگر کوئی سمجھے۔'' انہوں نے جھریوں کی چار دیواری میں قید اپنی شرگیں نگاہیں پرنس کے چہرے پر جما کر قدرے لطیف انداز میں مسکرا کر کہا۔

پرنس دھیرے سے ہنس دیا۔

''مائی گریٹ مام......'' اس نے اپنا سر لیڈی صوفیہ کے سینے سے ٹکا کر بے ساختہ کہا تھا۔

☆☆☆

''تم کس کی اجازت سے نئی کار روڈ پر لے کر گئی تھیں؟'' تاجور کا جاپان کا ٹور سر پر آن کھڑا ہوا تھا...... جس کے لیے انہیں بہت سارا ہوم ورک کرنا تھا...... اب یہ ایک نئی ٹینشن سامنے آ گئی تھی۔ زارا مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔

''جسے تم بولڈنیس سمجھتی ہو، یہ اعلیٰ درجہ کی حماقتیں ہیں...... سب کچھ تمہارا ہی ہے...... میرا مطلب ہے تم دونوں بہنوں کا...... لیکن ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے۔'' وہ نہایت برہم تھیں۔

''سفینہ نے پوزیشن لی تھی تو میں نے اسے نئی کار دلانے کا پرامس کیا تھا...... تمہارے پاس تو پھر بھی اپنی کار ہے...... سفینہ تو گھر میں کھڑی پرانی سی کار سے بھی کام چلاتی رہی ہے، اسے اپنی اسٹڈی کے علاوہ کسی چیز سے دلچسپی

# ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

## ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

### نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔


ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

نہیں...... میرے کہنے پر اس نے بے شمار کاروں میں سے سلیکشن کیا تھا۔'' تاجور کا بس نہیں چل رہا تھا سامنے کھڑی زارا کے ساتھ کیا کریں یا اپنا سر دیوار پر دے ماریں۔

''سوری اماں...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔'' زارا کے حلق سے بہ مشکل آواز نکلی۔

''اتنا برا تو کوئی سوچنا بھی نہیں چاہتا۔'' تاجور شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہو رہی تھیں۔ ''ستم بالائے ستم...... اس چھوکرے کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر آ رہی ہو، ڈرائیور کو فون کرتیں تو وہ کوئی بھی گاڑی لے کر پہنچ جاتا۔'' یہ تو انہیں سیتا نے بتایا تھا کہ ساحل اپنی بائیک لے کر زارا کو لینے گیا ہے۔

''اماں میں آپ کو ٹرائی کر رہی تھی...... مگر سیتا نے بتایا آپ بہت اہم میٹنگ میں ہیں، فارنرز آئے ہوئے ہیں۔'' زارا نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن تم سیتا کو بتا سکتی تھیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے...... وہ اتنی critical situation میں مجھ سے ڈائرکٹ بات کر سکتی ہے یا مجھ سے تمہاری بات کرا سکتی تھی۔'' وہ جیسے کسی صورت زارا کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

''اماں...... ایف آئی آر کٹ گئی ہے...... انشاء اللہ کار جلدی مل جائے گی......'' زارا نے بڑی سادگی سے تاجور کو ٹھنڈا کرنے کے لیے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''وہ جن کی دس سال پہلے کاریں چھن گئی تھیں یا چوری ہو گئی تھیں...... انہیں پولیس آج بھی تسلیاں دے رہی ہے۔ تم ڈرائیور کے ساتھ گھر جاؤ...... مجھے ابھی یہاں بہت کام ہیں۔'' تاجور نے اسی طرح خراب موڈ میں اسے وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ انٹرکام پر سیتا کو حکم دیا کہ وہ ساحل کو ان کے پاس بھیجے۔ زارا چپ چاپ جانے کے لیے پلٹ گئی تھی۔ وہ کمرے سے باہر آئی تو سامنے سے ساحل آتا دکھائی دیا۔ زارا نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا خون پی جائے گی۔

پولیس اسٹیشن میں جس طرح وہ اس کا شوہر بن کر بڑی ایفی شنسی جھاڑ رہا تھا وہ کسی صورت معاف نہیں کر سکتی تھی۔ واپسی میں اس کی بائیک کی پھٹ پھٹ کے دوران چھٹ پڑنا مناسب نہیں لگا پھر سیتا کا بھی فون آ گیا تھا وہ ساحل کو جلد آفس پہنچنے کی تاکید کر رہی تھی کہ میم تاجور دونوں کا انتظار کر رہی ہیں۔

ساحل اب اس چار دیواری کے اندر تھا جو زارا کی سلطنت تھی اور اسے اس کی اوقات کی یاد دہانی کرا رہی تھی...... دوسرے باس نے طلب کیا تھا جب سخت گیر باس طلب کرتا ہے تو اللہ سے لو لگائی جاتی ہے۔ وہ طرح دے کر تیزی سے گزر گیا۔

پلٹ کر دیکھنا زارا کی شان کے خلاف تھا...... وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی مگر یوں جیسے آنکھیں پیچھے چپک گئی ہوں اور وہ ساحل کی گردن دبوچنے کے لیے زاویہ طے کر رہی ہو...... موقع کی تاک میں ہو۔

''اگر اماں کو اس کی حرکتیں بتاؤں تو ابھی اسے جاب سے فارغ کر دیں۔'' وہ بدلہ لینے کے جذبے سے ادھ موئی ہوئی جاتی تھی۔

☆☆☆

''تمہارا آئی کیو لیول بہت محدود ہے...... سوشل ایٹی کیٹس کا تمہیں نہیں پتا...... کتابیں چاٹ کر ڈگری لے لی...... جاب مل گئی تو آنکھوں پر پٹی باندھ کر کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے لگے...... تم یہاں سے کوئی بھی گاڑی

لے جاسکتے تھے...... ہمارے گھر کے کسی نوکر کے پاس یہ وکٹورین پیریڈ کی بائیک نہیں ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زارا کا سوشل اسٹیٹس کیا ہے؟ اس نے کبھی ایمرجنسی میں بھی آٹو استعمال نہیں کیا...... تم کار میں بیٹھو گے تو ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھو گے۔ بیک سیٹ پر مالکان کے ساتھ نہیں بیٹھو گے۔'' تاجور صبح فجر سے متحرک تھیں، آفس میں تین اہم میٹنگز بھگتائی تھیں۔ لنچ کرنے کا ٹائم نہیں ملا تھا۔ سوچا تھا کہ میٹنگ ختم ہونے کے بعد کچھ کھالیں گی مگر میٹنگ ختم ہوتے ...ہی سیتا نے یہ ساری کتھا سنادی۔

بائیس لاکھ کا نقصان، اتنی بڑی خبر خالی پیٹ اور تھکن سے چور حالت میں۔ انسانی فطرت کی بہت سی کمزوریاں ہیں...... ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے سے کمزور پر جی بھر کر دل کی بھڑاس نکال سکتا ہے، کسی تکلف سے کام نہیں لیتا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں ضمیر کی لعن طعن پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو۔ شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے انسان بڑے، بڑے مرحلے بھی آسانی سے طے کر جاتا ہے...... دست درازی کرسکتا ہے، گالیاں دے سکتا ہے...... خودکشی تک کرکے دکھا سکتا ہے۔

''سوری میم...... میں جان بوجھ کر بائیک لے کر گیا تھا...... ایسا نہیں ہے کہ میں جلدی میں نکل گیا تھا۔'' ساحل اپنی انا و خودداری کے سفاکانہ قتل کے بعد بہت تحمل سے گویا ہوا۔

''جان بوجھ کر......؟ مجھے سمجھ نہیں آئی۔'' تاجور نے بری طرح چونک کر دیکھا تھا۔

''میں کار ڈرائیو کرسکتا ہوں...... مگر میں کسی کی قیمتی کار چلانے کا رسک نہیں لے سکتا...... اتنی قیمتی کار کسی نے ہٹ کردی یا میری اپنی غلطی کی وجہ سے ہٹ ہوگئی تو سوری...... میری پوری سیلری پینلٹی میں لگ جائے گی۔'' ساحل نے اب بہت اعتماد سے جواب دے کر جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''تم ڈرائیور کو بھی لے جاسکتے تھے...... اسے مجھے چھوڑنے کے بعد اور کام ہی کیا ہوتا ہے؟'' تاجور نے اس کی معذرت کو غیر اہم و نامناسب قرار دے دیا۔

''آپ بھول رہی ہیں میم...... شفیق صبح سے فارم ہاؤس گیا ہوا تھا۔'' تاجور جیسی سادہ مزاج، صاف گو عورت ساحل جیسے ہوشیار، چرب زبان کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔

یہ تسلیم کرلینے کے بعد کہ واقعی شفیق فارم ہاؤس گیا ہوا تھا۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئیں۔

''اوکے...... بہرحال تم کسی بھی ایمرجنسی سچویشن میں باہر کھڑی گاڑیوں میں سے کوئی بھی گاڑی استعمال کرسکتے ہو۔ آج سے تمہیں اجازت دے رہی ہوں۔'' اتنا گرم ہونے کے بعد خفت مٹانے کی نیت سے اب انہیں کچھ تو اچھا سا کہنا تھا۔

''سوری میم...... I am postgraduate ڈرائیور نہیں ہوں۔ کسی بھی ایمرجنسی سچویشن میں، میں اپنی بائیک ہی استعمال کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے والٹ جیب سے نکالا اور ایک ایف آئی آر کی سلپ تاجور کے سامنے رکھ دی۔

''میم، ایف آئی آر کی کاپی ہے، اسے سنبھال کر رکھیے گا، آفس کے نمبرز اور آپ کا سیل نمبر پولیس ریکارڈ میں ہے......'' تاجور نے گلاسز آنکھوں پر چڑھا کر اس ایف آئی آر کا متن پڑھنا چاہا۔ مگر یوں لگا صادقین نے ڈاکٹر اقبال کا کوئی خوب صورت شعر فنکارانہ انداز میں کینوس پر نقش کیا ہوا۔ عجیب و غریب مگر صاف خوش خط اندازِ تحریر...... ہر تیسرا چوتھا حرف ظرف سے باہر کی طرف چھلکتا نظر آتا تھا۔

اس پر مستزاد ڈپٹی نذیر احمد کے مضامین والی اردو انہوں نے کار کا نمبر اور تاریخ پڑھنے پر اکتفا کیا اور سلپ

اپنے بیگ میں رکھ دی۔ بائیس لاکھ کے نقصان کو ہضم کرنے کے لیے کوشش شروع کر دی تھی۔ اس دوران ساحل سر جھکائے، مؤدب، خاموش کھڑا تھا۔ تاجور نے اس پر ایک سرسری نگاہ کی۔

"تمہاری ٹیبل پر بہت سی فائلز پہنچ گئی ہوں گی...... آج ہی سسٹم میں ڈال دو تو بہتر ہے۔ ورنہ کل کام بہت زیادہ ہوگا۔" کام کی بات شروع کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اب آپ جائیں اور اپنا کام کریں عزت نفس کی کرچیاں دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر اس نے باہر کی راہ لی۔

"شاید لڑکوں میں اکڑ ہوتی ہی ہے۔" تاجور اس کی پشت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

سیتا جانے کی تیاریوں میں لگ چکی تھی، وقفے وقفے سے کھٹاک پٹاک کی آوازیں ابھرتی تھیں۔ لاکرز میں فائلیں اور ضروری چیزیں رکھ کر لاکڈ کرتی جاتی تھی۔

ساحل تیز رفتار بلکہ درانہ اندر داخل ہوا، اپنی ٹیبل پر پہنچ کر زور سے ٹیبل کی سطح پر ہاتھ مارا۔ سیتا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا؟" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"یار ان لوگوں کو ایمپلائی اور slave (غلام) میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔" وہ اب کرسی دھکیل کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں مسٹر ساحل......؟" سیتا فکر مند ہو کر اپنا کام ہی بھول بیٹھی۔

"قوم جنات کی بات تو کرنے سے رہا...... انہی لوگوں کی بات کروں گا جن کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔" ساحل نے ہنس کر جواب دیا تھا۔

"ہے بھگوان......" سیتا مزید پریشان ہو گئی۔

"برے وقت میں ساتھ دینے والے کا احسان ماننا چاہیے کہ نہیں......" اب وہ سیتا سے سوال کر رہا تھا۔

"آف کورس......" سیتا نے بھی جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔

"لٹی پٹی لڑکی روڈ پر کھڑی تھی...... اسے ساتھ خیریت کے منزل پر پہنچایا ایف آئی آر کٹوائی...... ایک سانس میں تین ہزار جھوٹ بولے...... یہ کوئی آسان کام ہے۔" ساحل نے بھڑاس نکال کر پھر سوال کر دیا۔

"ویری ڈیفیکلٹ۔" سیتا نے کسی لگے سگے کے انداز میں ہمدردی کی، گھر میں مسئلے مسائل چھوڑ کر دفتر آنے والی عورت جو غائب دماغی کی وجہ سے دن بھر میں درجن بھر غلطیاں کرتی تھی اور سیکڑوں مرتبہ لتاڑی جاتی تھی۔

بار، بار اپنی عزتِ نفس کی چادر زنگ آلود سوئی سے رفو کرتی تھی۔ اس کو تو ظالم سرمایہ داروں کے خلاف ردِعمل ظاہر کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کی تو تمام تر ہمدردیاں ساحل کے ساتھ تھیں۔

"چھ جگہ اپلائی کیا ہوا ہے...... ایک جگہ سے بھی کال آ گئی تو شکل نہیں دکھاؤں گا ان لوگوں کو ہمارا خون پی، پی کر بزنس ٹائیکون بنتے ہیں...... صرف تیس دن کی دو وقت کی روٹی کے پیسے بھی پورے دے دیں تو کام کرنے والوں کا حق ادا کر دیں...... ہونہہ......" وہ جی کی بھڑاس نکال رہا تھا۔ "کیا سیلری ہوتی ہے بھلا...... دس دن پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ لاجک کیا دیتے ہیں جو مال خرچ کرتا ہے اس کی مرضی چلتی ہے۔ مال خرچ کرتے ہیں تو مال بڑھاتے بھی تو ہیں...... اور مال کیسے بڑھتا ہے...... ہم جیسے ضرورت مندوں کا خون پی، پی کر......" وہ بولتے،

بولتے ہانپنے لگا۔

''پلیز کام ڈاؤن۔'' سیتا کی آنکھوں میں مارے ہمدردی کے نمی اترنے لگی۔

''تمہیں پتا ہے سیتا...... دنیا میں خونی انقلابات آنے کی کیا وجوہات تھیں؟'' اس نے پھر سیتا کو کرائے امتحان میں بٹھا دیا۔

''میں نے لٹریچر پڑھا ہے، سوری ہسٹری نہیں پڑھی۔'' سیتا مارے شرمندگی کے ادھ موئی ہونے لگی۔ اپنی نااہلیت کا روح فرسا انکشاف جو ہوا تھا۔

''خون پینے، خون کا آخری قطرہ چوسنے کی وجہ سے۔ سرمایہ دارانہ سسٹم کی وجہ سے...... جس میں امیر، امیر تر... اور غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے۔''

''اے بھگوان......'' سیتا بس اتنا ہی بول پائی...... اسے ساحل پر بہت ترس آ رہا تھا۔

وہ تصور کر رہی تھی کہ میم کے بند کمرے میں ساحل کو شدید مینٹل ٹارچر سے گزرنا پڑا ہے۔

''پلیز ساحل...... ریلیکس کریں......'' وہ یہی کہہ سکتی تھی۔

''میرا خون کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔'' ساحل نے دراز کھینچ کر اپنی نوٹ بک نکالی...... جس میں وہ گاہے، گاہے دل کی بھڑاس نکالتا تھا۔ سیتا اب کھوج بھری نظروں سے ساحل کو دیکھنے لگی تھی۔

ساحل تیز، تیز لکیریں کھینچنے کے انداز میں قلم چلا رہا تھا۔

''resignation (استعفیٰ) لکھ رہے ہیں؟'' سیتا نے معصومیت سے سوال کیا۔ ساحل سنی ان سنی کر کے قلم چلاتا رہا۔ پھر سیتا کو شولڈر بیگ اٹھاتے دیکھ کر ایک دم بول پڑا۔

''جسٹ اے منٹ سیتا...... ایک ثواب کا کام کرتی جاؤ۔'' سیتا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پلکیں جھپکائیں۔

''واٹ......'' وہ قدم بڑھا کر اس کے قریب آ کھڑی ہوئی اور نوٹ بک کی طرف دیکھنے لگی۔

ساحل نے نوٹ بک اٹھا کر سینے سے لگا لی۔

''اوں...... ہوں...... ایسے نہیں...... میں سنا رہا ہوں۔ آپ سکون سے سنیں......''

''اوکے......'' سیتا اب کچھ، کچھ سمجھ رہی تھی کہ یقیناً وہ اشعار سنانے جا رہا ہے۔

''اے سلیمانؑ کے ہدہد
جا کسی ملکہ سبا کی خبر لا
پھر اس کا تخت اٹھوا کے لا
میرا اس سے نکاح پڑھوا
مجھے ذہنی تشدد سے نجات دلا
میرے خواب کو حقیقت بنا دے مولا
ظالم کو ٹھکانے لگا میرے مولا''

اشعار پڑھ کر اس نے نوٹ بک میز پر زور سے پٹخ دی...... سیتا نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

''مسٹر ساحل...... ذہنی تشدد کیا ہوتا ہے؟''

''مینٹل ٹارچر کا اردو ترجمہ ہے......'' وہ دانت پیس کر بڑبڑایا۔

''چلو اب روانہ ہو جاؤ اپنے رام کے پاس...... میری طبیعت شعر اگل کر قدرے بہتر ہوگئی ہے۔'' اس نے چٹکی بجا کر سیتا کو اذنِ رخصت دیا...... وہ بھی اشارے کی منتظر تھی...... فوراً کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔ ساحل نے کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

☆☆☆

سفینہ اور ماہین کی مشترکہ لاہوری دوست انوشہ چوہدری کی انگیج منٹ تھی۔ دونوں نے انویٹیشن دکھا کر پرمیشن بھی لے لی تھی مگر سفینہ کو عین وقت پر یاد آیا کہ اس کے پاس تو روزانہ کے استعمال ہونے والے عام سے ڈریسز ہیں...... انگیج منٹ کے حساب سے تو کوئی ڈریس ہی نہیں...... ابھی تک کسی تقریب میں شریک ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

''افوہ...... سیدھی سی بات کو ایشو بنا رہی ہو......'' ماہین کو اس کا مسئلہ پتا چلا تو یوں گویا ہوئی جیسے یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ''ابھی نکلیں گے تو راستے میں ایک بوتیک پڑتا ہے وہ رینٹ پر بھی ڈریسز دیتے ہیں...... بڑی، بڑی celebrities اُدھر آتی ہیں۔''

''اوہ......'' ماہین نے تو واقعی مسئلے کا حل چٹکی بجا کر نکال لیا تھا۔

''وہیں ٹرائی روم میں چینج کر لینا، اپنا ڈریس امانت کے طور پر وہیں سیل گرل کے پاس رکھوا دینا۔'' ماہین کو یوں بھی بہت زیادہ ہلکا پھلکا رہنے کی عادت تھی...... کھٹ سے سر پر رکھی گٹھری زمین پر دے مارتی تھی۔

سفینہ نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھ کر گویا شکریہ ادا کیا تھا۔ اور پھر بڑی پھرتی سے بیڈ سے اتر گئی تھی۔

''بس اب تو مجھے کچھ نہیں کرنا انہی کپڑوں میں نکلتی ہوں۔'' اس نے مرر میں خود کو دیکھتے ہوئے ماہین سے تکلف کے ضمن میں رائے لی۔

''ہاں بابا...... اب نکل پڑو...... بوتیک میں بھی ایک گھنٹا لگ جائے گا۔'' سفینہ جلدی، جلدی ضروری چیزیں اپنے شولڈر بیگ میں رکھنے لگی۔ ماہین بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ وہ مکمل تیار تھی۔ اس کے وارڈ روب میں ایک ڈھنگ کا ڈریس نکل آیا تھا اس لیے اسے بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑی تھی۔

سفینہ نے بیگ زپ اپ کیا کندھے پر لٹکایا اور قدم بڑھادیے مگر ایک دم رک گئی۔

ماہین اسے آگے بڑھتا دیکھ کر اس سے پہلے کمرے سے نکل چکی تھی۔ سفینہ آہستگی سے واپس مڑی...... اور بیگ اس انداز میں ٹیبل پر رکھا گویا کرسٹل سنبھال رہی ہو۔

پھر آہستہ، آہستہ چلتی بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

ماہین کو بہت آگے جا کر اندازہ ہوا کہ سفینہ نے ابھی تک اسے فالو نہیں کیا۔ بھناتی ہوئی روم میں داخل ہوئی۔ سفینہ کو اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر غصے پر حیرت کی شدت غالب آگئی۔

''ہیں، کیا ہوا......؟ تم پھر بیٹھ گئیں۔''

''میں نہیں جا رہی......'' دوٹوک فیصلہ آگیا۔

''آخر ہوا کیا......؟ کیا پرنس کی کال آگئی...... منع کر رہا ہے تمہیں؟'' ماہین تو جیسے غصے سے ناچ ناچ گئی۔

اتنے اہتمام سے کیا گیا میک اپ پسینے سے خراب ہو رہا تھا۔

''میں کسی کی اترن کیوں پہنوں......؟ وہاں کراچی میں کپڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔''

''اس ڈھیر کو پڑا رہنے دو......'' ماہین دانت پیس رہی تھی۔

''انڈے بچے نکلیں گے اس ڈھیر سے...... پھر ان کا بھی ایک ڈھیر بنا دینا......'' ماہین دھپ سے بیٹھ گئی۔

''تم جاؤ..... میری وجہ سے اپنا پروگرام کیوں خراب کر رہی ہو؟'' سفینہ پر ماہین کی خفگی کا مطلق اثر نہیں تھا۔

''یہاں قریب میں برانڈڈ ڈریس ملنا مشکل ہے اس لیے یہ مشورہ دیا تھا..... ٹائم جو نہیں ہے۔''

''ہاں تو ٹھیک ہے۔'' اس نے ماہین کی بات کاٹ دی۔

''کیا ٹھیک ہے؟'' ماہین ہونقوں کی طرح گھورنے لگی۔

''یہی کہ تم چلی جاؤ۔'' سفینہ اب آڑھی ترچھی بیڈ پر دراز ہوگئی۔

''میں تو نہیں جا رہی اکیلی۔'' ماہین نے پاؤں سے سینڈل اچھالے۔

''کم آن ماہین، کیوں اپنی شام خراب کر رہی ہو، اتنی اچھی تیار ہوئی ہو۔'' اس نے بچوں کی طرح چمکارا۔

''آسٹریلیا بھی تو اکیلی جاؤ گی آخر.....'' اس نے بڑی مضبوط دلیل دی۔

''اکیلی کیوں جاؤں گی؟ اپنے ہزبینڈ کے ساتھ جاؤں گی۔'' ترکی بہ ترکی جواب آیا۔

جواب سن کر سفینہ اب خاموش ہوگئی جیسے لاحاصل بحث کو یہیں ختم کرنا چاہتی ہو۔

''اترن..... بڑی عجیب بات کر رہی ہو..... آج کل تو سب پہن رہے ہیں، شوبز میں تو یہ روٹین کی بات ہے۔'' ماہین خراب موڈ میں اپنی ہلکی پھلکی جیولری اتارتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بس..... اپنی، اپنی نیچر ہے..... مجھے used چیزیں پسند نہیں.....''

''اٹس اوکے..... تمہیں کس شے کی کمی ہے؟'' ماہین اپنا خراب موڈ سنبھالنے کی سعی بھی ساتھ، ساتھ کر رہی تھی۔

''ویسے یار..... کچھ لڑکیاں شادی شدہ مردوں کو آئیڈیلائز کرتی ہیں، حالانکہ انہیں زیرو میٹرینگ مین پرپوز کرنا چاہتے ہیں۔'' سفینہ درمیان میں بول پڑی۔

''کوئی سائیکولوجیکل پرابلم ہوتی ہوگی..... مجھے تو دل بھی وہ چاہیے جو بالکل plain and blank paper کی طرح ہو..... صاف شفاف..... نیٹ اینڈ کلین نہ دُکھا ہوا..... نہ ستایا ہوا۔'' یہ کہہ کر سفینہ نے زور سے قہقہہ لگایا تھا۔ ماہین کی شکل پر جو بدمزگی و بیزاری تھی وہ عجیب سی گدگدیاں کر رہی تھی۔

''موڈ ٹھیک کرو..... میں تمہاری پسند کا جنک فوڈ آرڈر کر رہی ہوں..... جتنا رینٹ ڈریس کا دینا پڑتا..... اس سے آدھے میں ہم شاندار ڈنر کر سکتے ہیں۔''

''میں کھانے کی بھوکی نہیں ہوں..... مائنڈ یو.....'' ماہین وارڈروب کی طرف جاتے، جاتے پلٹ کر کھانے کو دوڑی۔

''میں تو اچھا سا فنکشن انجوائے کرنا چاہتی تھی..... مگر تم نے سارے پروگرام کا بیڑا غرق کر دیا.....'' ماہین کوفت بھرے لہجے میں بڑبڑائی۔

''ہاں تو..... اب بھی لیٹ نہیں ہوئیں..... تیار بھی ہو..... چلی جاؤ۔'' سفینہ اب ٹھیک سے لیٹ گئی تھی اور آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔

''تم اچھی طرح جانتی ہو میں تمہارے بغیر کوئی گیدرنگ انجوائے نہیں کر سکتی۔'' ماہین تیزی سے قریب آئی اور سفینہ کا بازو بزور بازو آنکھوں سے ہٹا دیا۔

''اپنے پیار کا اتنا احسان نہ جتاؤ..... آسٹریلیا پہنچنے کی دیر ہے، دو تین بچوں کی ماما بن گئیں تو یاد دلانے پر یاد آیا کروں گی۔'' سفینہ نے شریر مسکراہٹ کے ساتھ اسے گھورا۔

''جب کی تب دیکھی جائے گی...... ابھی تو تمہارے ساتھ ہی گزارہ کرنا ہے۔ اچھا چلو جلدی سے large pizza...... lazania رشین سیلڈ، اٹالین سیلڈ...... کوئلہ کڑاہی و روغنی نان آرڈر کرو...... دو گھنٹے میں ڈلیور ہوگا...... مجھے تھوڑی دیر بعد بھوک لگنا شروع ہو جائے گی۔'' ماہین وارڈروب میں سر گھسائے مینیو بتا رہی تھی۔

''یہ تم کتنے دن کا راشن منگوا رہی ہو؟'' سفینہ نے آنکھیں پھاڑ کر سوال کیا۔

''تمہیں معلوم ہے مجھے غصے میں بے تحاشا بھوک لگتی ہے...... یہ فائن تو تمہیں بھرنا پڑے گا۔'' ماہین نے قطعیت سے کہا تھا۔

''میری پاکٹ منی میں اتنی عیاشی کی گنجائش نہیں ہے...... ون ڈش بتاؤ۔'' سفینہ نے بھی فیصلہ سنا دیا۔

''بہن تو تمہاری پانچ ہزار کے نوٹ پر آٹو گراف لیتی ہے...... تم اپنی پیاری دوست پر ڈھائی ہزار خرچ نہیں کرسکتیں۔'' ماہین نے غیرت جگانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کی کوشش کی۔

''ہاں...... جب اماں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہوگی...... اور سنے گی بے حساب...... تو اسے رہ، رہ کر اپنا 5000 کا نوٹ یاد آئے گا...... اب تو اس کی ویلیو عید مبارک کے نوٹ والی ہے...... پتا چلے گا اسے۔'' سفینہ اب اوندھی ہو کر ماہین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنیوں کے بل پر آدھا جسم اٹھایا ہوا تھا۔ بالوں کا عارضی جوڑا کھل چکا تھا۔ بال بکھر کر دائیں، بائیں گرے ہوئے تھے۔ ذہانت سے چمکتی آنکھوں میں لطافت کے سنہری رنگ تھے۔ بھینچے ہوئے بھرے، بھرے ہونٹ، مسکراہٹ آنکھوں میں تھی۔ ماہین نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا...... پھر ایک ٹک دیکھنے لگی۔

''یہ تم کہہ رہی ہو؟ کس دل سے کہہ رہی ہو؟''

''وہ پانچ ہزار کا نوٹ شاید کچھ عرصے بعد زارا کے لیے واقعی عید مبارک کا نوٹ بن جائے۔'' سفینہ بولی۔

''مگر تمہارے لیے تو کوہ نور ہے۔'' ماہین اپنا نائٹ ڈریس بازو پر لٹکا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''بولتی رہو...... بولتی رہو...... یونہی تکے لگاتی، لگاتی آسٹریلیا چلی جانا۔'' سفینہ نے نظر چرا کر کہا اور سر تکیے میں گھسا دیا۔

''میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ میری جان...... تم سے کہہ رہی ہوں۔'' ماہین نے قریب آکر اس کے بال بکھیر دیے۔

مگر سفینہ نے سر نہ اٹھایا۔

''تم میرے سامنے دو مرتبہ پرنس سے ملی ہو اور پھر اس ملن کے بعد جو کچھ میں نے نوٹ کیا ہے وہ تمہارے فرشتوں نے بھی ضرور نوٹ کیا ہوگا۔ مگر جو میں سمجھ چکی ہوں وہ ابھی اس پر غور و فکر کر رہے ہوں گے۔'' اب ماہین دھپ سے اس کے قریب چپک کر بیٹھ گئی اور شریر انداز میں اسے دھکیلنے لگی۔

''جاؤ تم اپنا کام کرو...... میں آرڈر کر رہی ہوں۔ جتنی فضول باتیں تم نے ابھی کی ہیں اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ٹیمپرامنٹ ہے کمال کا۔'' سفینہ اسی طرح تکیے میں سر گھسائے گھسائے بول رہی تھی۔

''تمہارا ٹیمپرامنٹ کمال ہے۔ تمہارا اسلیکشن بھی کمال ہے۔ اس کے پاس سیل فون نہیں ہوتا...... پاپا سے لینڈ لائن نمبر لے کر دوں؟'' سفینہ سیدھی ہوگئی اور سیل ریسٹورنٹ کا نمبر سرچ کرنے لگی۔ یوں جیسے بہری ہو آواز ہی نہ آرہی ہو۔ حالانکہ دل نے پھڑک کر کہا تھا...... ویسے نہ سہی شنید سہی...... چلو بات کرادو کہ اس کی آنکھوں میں،

میں نے اپنا عکس دیکھا تھا۔

☆☆☆

پرنس شب خوابی کا ملبوس زیب تن کرنے کے ارادے سے ڈریسنگ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ دروازے پر جانی پہچانی دستک ہوئی...... اس نے وال کلاک پر نگاہ کی۔

رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

''گرینڈ مام ابھی جاگ رہی ہیں؟'' اسے قدرے تشویش ہوئی کیونکہ وہ ڈنر کے ایک گھنٹے بعد سو جاتی تھیں...... طبیعت کی خرابی کی صورت میں ان کے شیڈول پر اثر آتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔

لیڈی صوفیہ اپنے شب خوابی کے آسمانی رنگ کے ملبوس میں بالکل چوکس اور تازہ دم کھڑی تھیں۔

''تھینک گاڈ...... تم ابھی جاگ رہے ہو۔'' وہ بہت غور سے پرنس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''پلیز کم ان......'' پرنس کی آنکھوں میں بھی تجسس کے تاثرات تھے۔

''نہیں...... تم میرے ساتھ اسٹوڈیو چلو۔'' پرنس کے حساب سے بڑی انوکھی فرمائش تھی۔

''اسٹوڈیو......؟ اس وقت، وہاں آپ کچھ بھول آئی تھیں؟'' وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

''نو، نو پلیز...... جسٹ کم...... ہری اپ......'' وہ یہ کہہ کر پلٹ گئیں...... حتمی اور قطعی انداز کی وجہ سے پرنس کو ان کے پیچھے جانا پڑا۔

گھر کے لاؤنج سے نکل کر سرخ بجری کے کارپٹ پر چلتے ہوئے بڑے سے لان کے بائیں طرف پرنس کا اسٹوڈیو قائم تھا وہاں پہنچنا تھا...... لیڈی صوفیہ اپنی چھڑی ٹکاتی خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ مگر پرنس نے چند سیکنڈ میں انہیں جالیا...... اور ان کے پہلو میں چلنے لگا۔

وہ حیران تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہے جس کی وجہ سے گرینڈ مام تین سو گز کا راستہ طے کرنے کے لیے تیار ہو گئیں۔

اسٹوڈیو میں ان کی خاص ساگوان کی لکڑی کی اونچی پشت والی کرسی کے علاوہ ذاتی استعمال میں آنے والی کوئی شے نہیں تھی۔

''ابھی میں نے کوئی نئی اسکیچنگ یا پینٹنگ شروع نہیں کی گرینڈ مام...... آج کل میں مدر ٹریسا کے کہے ہوئے ایک خوب صورت موسٹ بیوٹی فل جملے پر غور کر رہا ہوں۔ ان کے اس حسین خیال کو رنگوں کی زبان میں پھیلانا چاہتا ہوں مدر کہتی ہیں۔

**I am a little pencil in the hand of a writing God, who is sending love letter to this world** (میں تو لکھنے والے خدا کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پنسل ہوں جو اس دنیا میں محبت نامے بھیج رہا ہے)

لیڈی صوفیہ نے کوئی ردعمل نہیں دیا...... ان کے انداز سے لگتا تھا وہ نیند میں چل رہی ہیں...... اور خود کو اکیلا فرض کر رہی ہیں۔ پرنس کے لیے یہ گہری خاموشی چونکا دینے والی تھی کسی طوفان بلاخیز کی تمہید تھی۔

وہ پردادی کی رفتار کا پابند ہو کر قدم اٹھا رہا تھا...... حالانکہ وہ تیز چلنا چاہتا تھا کہ کسی طور، جلد از جلد مقصود تو کھلے...... اسٹوڈیو کے منقش چوبی دروازے پر پہنچ کر پرنس نے آہستگی سے ہینڈل متحرک کیا اندر داخل ہوتے ہی ایک بٹن سے درجن بھر برقی قمقمے روشن کر دیے...... پھر مزید روشنی بڑھائی...... وسیع و عریض اسٹوڈیو روشن ہوا تو

اس نے پلٹ کر اپنی پردادی کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔ ان کی متجسس نظریں جانے کیا کھوج رہی تھیں۔

”یہاں تو تمہارا abstract art پھیلا ہوا ہے...... وہ تم سے عشق کرتی ہے...... کمال ہے تم نے اس کا کوئی اسکیچ بھی نہیں بنایا۔“

"Oh, good God" ایک حساب سے پرنس نے گویا سر ہی پیٹ لیا تھا۔

”گرینڈ مام...... میں بھلا اسے کیوں اسکیچ کرتا...... وہ مجھ سے عشق کرتی ہے۔ میری اپنی تو کوئی خاص فیلنگ ہی نہیں ہیں۔“

”لیکن تم اسے اپنا ماننا تسلیم کر تو کر چکے ہو...... شادی لائف کا بہت بڑا فیصلہ ہوتا ہے۔ تم نے اسے یاد رکھا۔ مجھ سے شیئر کیا، اس کے عشق کو محسوس کیا۔ تم اس کا نوٹس لے رہے ہو۔ یہ گڈ فیلنگ ہی تو ہیں۔ معاملات بہت critical ہو چکے ہیں۔“ انہوں نے رک کر گہری سانس لی۔ ”میں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔ صبح کا انتظار نہیں کر سکتی۔ ہر رات میرا سونا ایسا ہے جیسے میں موت کی نیند سونے جا رہی ہوں۔ تم ابھی ...... اسے رف اسکیچ کرو...... میں دیکھنا چاہتی ہوں...... چونکہ پاسیبل نہیں ہے، ورنہ میں تمہیں کہتی میں آج سونے سے پہلے اس سے ملنا چاہتی ہوں۔“ لیڈی صوفیہ خاصی جذباتی نظر آ رہی تھیں۔ خاصا وقت تنہائی میں گزارنے کی وجہ سے اچانک ان پر خواہش اور خوف نے غلبہ کر دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا جب سے پرنس نے ہوائی اڑائی تھی وہ تب سے صرف اسی ایک نکتے پر غور و فکر کرتی رہی تھیں۔

”کم آن گرینڈ مام...... پلیز آپ ریسٹ کریں...... آپ کا شیڈول ڈسٹرب ہو جاتا ہے تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے...... آپ کئی دن suffer کرتی ہیں۔“ پرنس انہیں بچوں کی طرح بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میرے پیارے بیٹے...... تم میرا مکمل خاندان ہو...... total asset (کل اثاثہ) میرا concern (تعلق) بنتا ہے وہ محض لڑکی نہیں ہے...... آنے والے دنوں میں اس خاندان کی ہسٹری بنائے گی...... وہ تم سے عشق کرتی ہے...... اوکے...... وہ غریب نہیں ہے...... correct لیکن اس کی شکل بھی بہت اچھی ہونی چاہیے۔ میں آج رات اس کا چہرہ آنکھوں میں بسا کر سونا چاہتی ہوں۔ تم تو پانچ منٹ میں کسی کا بھی رف اسکیچ بنا سکتے ہو۔ میں جانتی ہوں اچھی طرح سے۔“

پرنس آگے بڑھا...... اور پنسل انتخاب کرنے لگا...... کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پردادی اپنی خواہش پوری کیے بغیر بستر پر نہیں جائیں گی۔ آج یہ سب کچھ غیر معمولی تھا۔

ہونے والی بہو کے تصورات کا اتنا شدید غلبہ تھا کہ انہوں نے کھانے کے بعد مرحوم دادا سے متعلق کوئی بات نہیں کی تھی۔ پرنس نے پر تولے...... تیاری پکڑی تو لیڈی صوفیہ مطمئن ہو کر اپنی کرسی خاص پر فروکش ہو گئیں۔

پرنس نے اسکیچنگ شروع کی۔

پرنس کی پشت لیڈی صوفیہ کی طرف تھی۔ وہ چھوٹے سے بچے کی طرح آنکھیں بند کیے ٹیک لگائے آرام دہ حالت میں بیٹھی تھیں۔

پرنس نے کسی دھیان سے چونک کر پلٹ کر دادی کی طرف دیکھا وہ بہت پُرسکون حالت میں جیسے کچھ بہت اچھا دیکھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ پرنس بے آواز ایک طرف بڑھا اور سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔

ماحول میں بانسری کی دھن پر ایک بہت پرانا گیت اپنے اثرات ڈالنے لگا۔ گائیکہ کی آواز کے بجائے بانسری

کے ذریعے گیت کی دُھن تیار کی گئی تھی۔ سُر بکھرتے ہی لیڈی صوفیہ نے پل بھر کے لیے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں اور دوبارہ موند لی تھیں۔ لتا کے مشہور گیت کی دُھن نے فضا بہت سحر انگیز بنادی تھی۔

من ڈولے میرا تن ڈولے

میرے دل کا گیا قرار

کون بجائے بانسریا

بانسری کے سُروں کے زور پر پرنس نے موڈ بنانے کی کوشش کی تھی مگر دل کی بانسری سے سُر پھوٹ کر نہیں دے رہے تھے۔ وہ معذرت کر کے پیاری پردادی کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی دادی کو صحت مند دیکھنے اور خوش رکھنے کے لیے وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ وہ تو اتنا حلیم و صابر شاید اسی مشق کی وجہ سے نظر آتا تھا۔ اس لازوال وفطری محبت کے رشتے نے تو اس کو نکھارا، سنوارا تھا۔ وہ اپنی عمر سے چالیس سال بڑا تھا۔

ایک دانشور عورت کے قیمتی تجربات نے اسے دنیا کی نگاہ میں بہت شاندار اور عظیم بنادیا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد انسان کی روحانی اذیت...... دوسری جنگ عظیم کے بعد جنگ کا لفظ لغت سے نکال پھینکنے کی تڑپ اسے اسی قیمتی رفاقت سے میسر آئی تھی۔

وہ اپنی شعوری غلطی کی وجہ سے دادی کو اداس کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا

اس نے محتاط انداز میں پنسل کینوس پر چلانا شروع کردی...... پھر ایک کیفیت میں اتر کر انگلیوں میں دبی پنسل کو تیزی سے حرکت دینے لگا، دو سے ڈھائی منٹ کے اندر زارا کا رف اسکیچ اس کے سامنے تھا جسے دیکھ کر وہ خود ہی چونک پڑا...... پلٹ کر دادی کی طرف دیکھا وہ ہنوز آنکھیں بند کیے لب بستہ منتظر بیٹھی تھیں۔

پرنس نے آہستگی سے شیٹ کینوس سے اتاری اور ایک طرف رکھ کر دوسری شیٹ کینوس پر لگادی...... اور پھر گہری سوچ میں کھو گیا۔

ایک شوخ و چنچل الٹرا ماڈرن، خود اعتماد، کم عمر دوشیزہ کو بلا ارادہ ہی بہت توجہ سے دیکھا تھا...... جو کھڑے، کھڑے پانچ ہزار کی قربانی دے رہی تھی۔ بہت کم عمر نظر آتی ہے۔

گرینڈ مدر کے آئیڈیل سے۔ بہت ہی قریب......

سارا مسئلہ ہی یہی تھا۔

age factor بہت میٹر کر رہا تھا۔ آرٹ گیلری میں پُرجوش سی لڑکی از سرِ نو متحرک نظر آئی...... رف اسکیچ منٹوں میں بن گیا۔

''آپ اسکیچ دیکھ سکتی ہیں میم......'' اس نے پلٹ کر بے خودی لیڈی صوفیہ کو متوجہ کیا۔ اعصابی کمزوری کی وجہ سے وہ اشارے میں غنودگی میں چلی گئی تھیں۔ پرنس کی آواز فضا میں جیٹ طیارے کے شور کے مصداق محسوس ہوئی۔ پہلے تو پلکیں جھنک، جھٹک کر نیند کا تاثر خلط ملط کرنے کی کوشش کی پھر اپنا سفید نرم ہاتھ جس میں معمولی سی لرزش تھی پرنس کی طرف بڑھا دیا۔

پرنس نے شیٹ اتار کر اُن کے ہاتھ میں تھمادی۔

لیڈی صوفیہ نے شیٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسکیچ کی طرف پُرشوق نظروں سے دیکھا۔

زارا کی مسکراہٹ محسوس کر کے وہ خود بھی مسکرانے لگیں۔

(جاری ہے)

# آدابِ جاں سوزی

تسنیم منیر علوی



"بابا جلدی اندر آئیں بارش ہونے والی ہے، گھٹائیں گھر گھر کر آچکی ہیں۔" ٹپ، ٹپ بوندوں کا جلترنگ شروع ہوا۔ فضا میں سوندھی مٹی کی خوشبو اڑی۔ میری آواز پر بابا نے تیزی سے اپنی کرسی اور کتاب لے کر اندر کی طرف دوڑ لگائی، میں بھی مدد کے لیے ساتھ ہی لپکی...... اور اب بادل ٹوٹ کے برس پڑے۔ بابا نے ٹیرس کے شیڈ میں آکر ایک بلند و بانگ نعرہ لگایا۔

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



”ارے شبانہ کہاں ہو، آج تو تمہاری بیٹی نے موسمیات کو شکست سے دوچار کر دیا۔“ میں نے بابا کو اندر لاؤنج میں لا کر سہارے سے بٹھایا۔ کپڑوں پہ پڑی بوندوں کو جھاڑا۔

”بابا آپ اس بات پر حیران نہ ہوں۔“ اب میں قالین پر آلتی پالتی مار کر اُن کے گھٹنوں سے لگی بیٹھی تھی۔

”قصہ کچھ یوں ہے کہ جب ہم چھوٹے ہوا کرتے تھے تو ہماری نانی امی جب کبھی نیلے آسمان پہ بہت دور، دور اونچائی پر چیلیں اُڑتے دیکھتیں اور حبس بھی بہت ہوتا تو ہاتھ سے اشارہ کرتیں۔ دیکھو مشی آج بارش ہوگی تو ہم بھی آپ کی طرح حیرت کا اظہار کرتے مگر ایک گھنٹے کے اندر اندھیرا چھا جاتا، بادل برس پڑتے اور وہ جھل تھل مچتی اور سارے بچے نظیر اکبر آبادی کی کورس میں پڑھی نظم ”کیا کیا مچی ہے یاروں برسات کی بہاریں“ لہک، لہک کر گانے لگتے۔ اُف خدایا بابا ایک تو بارش کی گرج چمک پھر ہم سب کا شور کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ چھپا چھپ چھلانگیں مارتے چھوٹے بچے، کاغذ کی ناؤ بنا بنا کر پانی میں چھوڑ دیتے کوئی کہتا میری کشتی پہلے پار کر گئی میں جیت گیا۔ اسی چیخ و پکار میں بارش تو تھم جاتی مگر پرنالے شور مچاتے رہتے۔

بچپن کی امیری نہ جانے کہاں کھو گئی دوست
جب بارش کے پانی میں میرے بھی جہاز چلا کرتے تھے

تو بابا آج نانی امی کا گُر آزمایا اور وہ کامیاب ثابت ہوا۔“ ابھی میں سانس لینے کو رکی ہی تھی کہ بابا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا۔

”یہ سب تو ٹھیک ہے مگر برسات کی اصل بہار اور اس کے لوازمات کہاں ہیں، برسات تو اس کے بغیر ادھوری ہے۔“ پھر میری طرف شوخی سے دیکھا۔

”اوہ ہاں...... ٹھیک تو ہے بابا۔“ اور میں اندر سرپٹ بھاگی...... کہ امی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

”ذرا دیکھ کے کیا بولائی، بولائی پھر رہی ہو۔“ اب جو سامنے نظر پڑی تو امی ٹرالی میں پکوڑے، سموسے، چٹنی سجائے (نازک سی ٹی کوزی سے ڈھکی کیتلی جو نفاست سے کشیدہ کاری سے آراستہ تھی) خراماں، خراماں چلی آرہی تھیں دھانی چنری میں ان کا اتراتا سا رنگ حسنِ سوگوار کا سماں پیش کر رہا تھا۔

”آپ بابا کے پاس بیٹھیں، میں ٹرالی لے کر آتی ہوں۔“ میں نے اپنے نمبر بڑھانے کی ایک ادنی سی کوشش کی۔

”کوئی ضرورت نہیں اپنا حلیہ دیکھا ہے...... جا کے کپڑے بدلو، گیلے کپڑوں میں پھر رہی ہو، چھوٹی موئی تو ہو۔ ابھی چھینکیں مار رہی ہوگی۔“ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ اور پیشانی پر آئی گیلی لٹ کو جھٹکے سے پیچھے کیا۔ چند بوندیں اڑ کر میرے چہرے سے ٹکرائیں۔

”اونہہ جانے امی کیسے بابا کے دل کے بھید جان لیتی ہیں اور میرے بھی دل کا چور فوراً بھانپ لیا۔ اُف ایک تو یہ مائیں...... ابھی ہم سوچ رہے ہوتے ہیں اور وہ کر گزرتی ہیں۔“ اور میں اچھا کہتی ہوئی پلٹی...... اور وہ پچی ورتا اپنی بیماری کے باوجود مجازی خدا کی خدمت میں جا پہنچیں۔

مگر میں اپنا درد چھپا نہ پائی...... حال بتاؤں کس کے لیے...... ایک شخص جو مجھے چھوڑ گیا۔

وہ مارچ کا ایک عام سا دن تھا، زرد پتوں کا ڈھیر آمدِ بہار کا پتا دے رہا تھا۔ ٹہنیوں پر نئے شگوفے سر نکالے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ ایسے میں کاظم کی میری زندگی میں انٹری ہوتی ہے۔ امی کی کوئی پرانی دوست کینیڈا سے آئیں تو ہمارے گھر کاظم (اپنے بیٹے) کے ہمراہ آئیں...... اور مجھے فتح کر گئیں۔ انہوں نے تو کمال یہ کیا اسی وقت پیار سے مجھے سمیٹ لیا۔

”ارے فصیحہ یہ تو آج سے میری بیٹی بن گئی۔“ میں نے سامنے بیٹھے ایک خوش شکل و خوش جمال نوجوان کو دیکھا سو بر نفیس اور نک سک سے سجا میرے دل کے آنگن میں سما گیا۔ جلد ہی مجھے کاظم کے نام سے

وابستہ کر دیا گیا۔ وہ ایم ایس کرنے امریکا جا رہا تھا اس لیے اصرار ہوا کہ جلد از جلد نکاح کے بندھن میں باندھ دیا جائے تاکہ کاظم دو سال میں پیپرز تیار کر کے ساتھ دلہن لے جائے۔ بڑوں کی رضامندی سے یہ فرض بھی ادا ہوا۔ اب ہمارا تعلق اسکائپ اور موبائل تک محدود ہو کر رہ گیا۔ دوریاں یوں قربتوں میں بدل گئی تھیں مگر آپ سوچ سکتے ہیں نکاح کے فوراً بعد سمجھنے اور سمجھانے کے دور سے دور ٹائم تو گزر جاتا کبھی وہ کہتا کہ ”ایک سال دیکھو گزر گیا۔ دوسرا بھی گزر جائے گا اب تم کاؤنٹ ڈاؤن شروع کرو کیلنڈر پر نشان لگا کر ہم کا آغاز کرو۔“ ہم کیسے کہتے کہ کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس طرح رو دھو کر ہم نے سال گزارہ بقول کسی کے رونا بھی ایک طرزِ گفتگو ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ایک آنسو ساری کہانی کہہ جاتا ہے۔ مگر کاظم سے ہم اٹھلا کر کہتے ”ہم کیوں اپنا خوب صورت کیلنڈر برباد کریں“ اور کن انکھیوں سے دیکھتے کہ جنوری گزرنے پر سرخ مارکر سے کراس کا نشان ہم لگا چکے تھے۔ ”اچھا موبائل سے تصویر کھینچ کر کیلنڈر کی زیارت کراؤ......“ اور ہم بے اختیار آنکھوں میں آئے آنسو پونچھنے لگے۔

کس مسافت کے بعد پہنچا
تیرے رخسار پر تیرا آنسو

کاظم نے ایک دن میری سوگوار آواز پر یہ شعر پڑھا تو بے اختیار میرا ہاتھ اپنے گالوں پر جا پہنچا۔

اب دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ دونوں گھرانے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ ستمبر کا مہینہ بقول لوگوں کے ستمگر بن کر نازل ہوا۔ امی اور بابا باہر لان میں بیٹھے تھے گرمی شدید تھی پھر شاید گرمی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو دونوں اندر آ گئے۔ جب ہی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں راہداری سے گزری تو بابا پریشانی کے عالم میں ایک ہاتھ سے گرتی ہوئی امی کو سنبھال رہے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ریسیور تھامے کسی سے سوال و جواب کر رہے تھے۔

”اوہ...... اچھا...... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ...... اُف خدایا......“ اور زور سے ریسیور کریڈل پر دے مارا۔ میں دوڑ کر قریب پہنچی دونوں کی حالت دیکھ کر میرے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جب ذرا بابا کے حواس بحال ہوئے تو وہ میری زندگی کا المناک لمحہ تھا۔ جب میرے گناہ گار کانوں نے سنا کہ کاظم اب ہم میں نہیں رہے...... پھر تو فون کالز موبائل میسج کا تانتا بندھ گیا۔ بعد کو یہ معلوم ہوا کہ واش روم میں سلپ ہو کر گرنے سے دماغ میں چوٹ آئی، بے ہوش ہو گئے فوری امداد نہ ملنے کی وجہ سے آکسیجن ختم ہو گئی۔ شام کو ساتھی نے دروازہ توڑا، پولیس آئی مگر میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ امی اس سانحے کے بعد دل کو روگ لگا بیٹھیں۔ میں نے یہ حالات دیکھ کر اپنے کو سنبھالا اور امی، بابا کی خاطر دوبارہ زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش میں مصروف ہو گئی۔ مگر لگتا تھا کہ ہم لوگ اندر سے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں...... امی اب ہارٹ اٹیک کے بعد بہت کمزور ہو گئی تھیں مگر بابا میری خاطر خود کو سنبھال رہے تھے۔ اور آج جب برسات میں مجھے یوں اجاڑ صورت دیکھا تو امی کہے بغیر نہیں رہ سکیں۔ اور میں تو امی کو بابا سے اتنا ٹوٹ کر پیار کرتے دیکھ کر اس سوچ میں تھی کہ ہم نے بھی تو ایسا ہی سوچا تھا کہ کاظم اور میں محبت کا تاج محل ایسے ہی تعمیر کریں گے۔ میرے والدین ایک مثالی جوڑا تھے خاندان، دوست احباب اور تمام جاننے والے حلقوں میں ان دونوں کو ہنسوں کے جوڑے کا خطاب ملا ہوا تھا۔

مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال
(ہم کس خیال میں ہیں اور آسمان کیا سوچ رہا ہے)

آج صبح سے دل کی دھڑکنوں پر کنٹرول نہیں، میں نے اور امی نے تو بابا کی خاطر دوبارہ خود کو مصروف کر لیا۔ کئی جگہ جاب کے لیے انٹرویو دے چکی ہوں۔

اس نے آوارہ مزاجی کو نیا موڑ دیا
پا بہ زنجیر کیا اور مجھے چھوڑ دیا
اس نے آنچل سے نکالی میری گم گشتہ بیاض
اور چپکے سے محبت کا ورق موڑ دیا

آفس جوائن کر کے ٹائم کافی پاس ہو جاتا۔ شام
کو بابا اور امی کے پاس بیٹھ کر واپس اپنے کمرے میں جا
گھستی۔ فرح میری سہیلی آج کل اپنے فائنل ایگزام
میں مصروف ہے، اس کا میڈیکل کا آخری سال ہے تو
اس کی شکل کو ترس گئی ہوں۔ اس کے بعد اس کی شادی
ہے۔ جب بات کرو کہتی اب تم بھی اپنی زندگی کے
بارے میں سوچو، تمہاری امی بہت فکر مند ہیں جب سے
ان کے دل کا معاملہ ہوا ہے مجھ سے کہتی رہتی ہیں۔ مشی کو
سمجھاؤ کسی کی یاد کے سہارے زندگی نہیں گزاری
جاسکتی...... اور میں سوائے اس کو جھڑکنے کے کچھ نہیں
کرسکتی...... میں تو ہجر کے الاؤ میں دہک کر انگارہ بن گئی
ہوں۔ فرح تو اپنے ایک ہینڈسم کزن کا بہت پہلے بھی
ذکر کرتی رہتی تھی اور اب کاظم کے بعد تو باقاعدہ مہم
چلائی ہوئی ہے مگر میں مسلسل انکار کرتی آرہی ہوں۔
ٹھیک ہے کہ کسی کے جانے سے زندگی نہیں بدلتی مگر یہ بھی
غلط نہیں کہ جینے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ ابھی
قدرت کو میرے کچھ امتحان اور درکار تھے امی جو سانس
کی مریضہ تھیں اب دل کے دورے کے بعد بہت کمزور
ہوگئی تھیں پھر کاظم کا یوں اچانک چلے جانا اس روز پھر
انہیں سانس کا بہت زبردست اٹیک ہوا تھا۔ انہیلر بھی
یوز کرادیا مگر پھر بھی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی
تھی۔ میں نے قریب جا کر ان کا سرہانہ اونچا کیا۔ اف
چہرے کا رنگ نیلا پڑ رہا تھا۔ شاید آکسیجن کی ضرورت
ہے بابا آج اپنے بزنس کے سلسلے میں بزی تھے۔ میں
نے بابا کو موبائل پر کال کی بیل جاتی رہی اچانک دیکھا
تو قریب تکیے کے پاس ان کا فون آنکھیں جھپکا رہا تھا۔
اوہ مائی گاڈ...... فون کے پاس ایمرجنسی نمبر چیک کیے
شکر ہے ایدھی ایمبولینس کا نمبر مل گیا۔

ڈاکٹر نے جب مایوسی سے گردن ہلائی تو میری
جان ہی نکل گئی...... بقول ان کے اب بہت دیر ہو چکی
تھی۔ سلسلے توڑ گیا وہ بھی جاتے جاتے...... میری متاعِ
عزیز، میری ماں میرا ساتھ چھوڑ گئی۔

بابا تو امی کے بعد خشک خزاں رسیدہ پتے کی
طرح بکھر گئے تھے۔ کبھی گھنٹوں گہری سوچ میں غرق
رہتے...... کبھی امی کی وارڈ روب کھول کر کھڑے
ہو جاتے۔ مجھے لگتا کہ اب ان کو خود سے باتیں کرنا
شاید اچھا لگتا ہے۔ پہروں خود کلامی کرتے، دیواروں
کو حسرت سے گھورا کرتے۔ راتوں کو اٹھ کر امی کو
آوازیں دیتے "شبانہ...... شبانہ۔" پھر چیخ پڑتے میں
دوڑ کر آتی، ان کو پانی پلاتی سکون آور دوا دیتی...... تو
ذرا دیر کو سو جاتے۔ میں جو ستم بالائے ستم کے بعد زندگی
کو گھسیٹ رہی تھی مجبور ہوئی کہ بابا کو سنبھالنا ہے ورنہ تو
وہ غم سے حواس کھو بیٹھیں گے۔ میری مددگار فورس اب
فرح ہی تھی اس سے اصرار کیا۔

"ابھی تمہارا ہاؤس جاب شروع نہیں ہوا تم کچھ
دن میرے پاس آجاؤ میں نے آفس سے ایک ہفتے کی
چھٹی لے لی ہے۔" بابا کی حالت بہت خراب ہوگئی
میرے ہینڈسم اور دلکش بابا کمزور اور لاغر ہوتے جا رہے
تھے دو مہینے سے خوراک مختصر ہو کر برائے نام رہ گئی۔ وہ
بیچاری دوڑی چلی آئی...... اب ہم دونوں نے محاذ
سنبھال لیا۔ کبھی وہ بہانے، بہانے سے پھل کھلاتی اور
ایک دن تو خوشۂ انگور کو ایسے کمال سے ایک، ایک دانہ
گھما، گھما کر کھلایا، یہ دیکھیں انکل...... یہ دانا بہت میٹھا
ہے۔ اور پھر دو تین دانے اٹھا کر منہ میں ڈالتی کہ یہ اس
سے بھی زیادہ رسیلا ہے۔ اسی طرح سے وہ روز کسی نہ
کسی بہانے سے غذا کھلاتی رہی۔ پانچویں دن تک بابا
بہت بہتری کی طرف آگئے۔ فرح کی شوخی کیا بتاؤں کہ
ایک پہاڑی دوشیزہ کی طرح معصوم اور الھڑ ہے بس
صرف بغل میں ایک بکری کے بچے کی کسر باقی تھی۔
میڈیکل کالج میں سنا ہے کئی لڑکے مائل بہ کرم تھے......
مگر اظہارِ مدعا سے ڈرتے تھے...... یہ جب مرے،
مرے لے کر ان ناکام عاشقوں کے قصے سناتی تو ہنستے،
ہنستے بل پڑ جاتے۔ سنا ہے ایک عاشق نامراد پندرہ دن
مسلسل صبح کالج جانے سے پہلے گیٹ پر ایک پھولوں کا
گلدستہ رکھ جاتے تھے وہ تو خیر ہوتی فرح کی ہدایت
پر گارڈ نے ایک دن مکمل مرمت کردی جب جا کر سلسلہ

رکا فرح اپنے کزن سے منسوب تھی اور ہاؤس جاب کے بعد شادی تھی۔ میں اکثر مذاق کرتی......

''توپ و خنجر لیے پھرتی ہو خودکش بمبار حسینہ کے قریب آنے کی کس جیالے کی ہمت ہے......'' تو وہ کہتی۔

''یار پھونک، پھونک کر قدم رکھنا وہاں ہی سے سیکھا...... احتیاط لازم ہے۔ لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں۔'' میں تو اس کی شاعری سے عاجز ہوں۔ جانے کیسے شاعرانہ مزاج لڑکی میڈیکل جیسے شعبے میں جا گھسی۔ پھر یہ چپکے سے آنے والی بہار جانفزا اپنا جلوہ دکھا کر اپنے گھر سدھاری اور میں اپنے آفس کی طرف۔

بابا کے لیے پرانا خانساماں موجود تھا۔ صبح اٹھ کر ناشتا میں خود کرا کر ایک راؤنڈ لان کا لگواتی پھر پھل پاس رکھ کر کچھ اخبار اور میگزین قریب سجاتی اور آفس کے لیے نکل جاتی...... اب بابا کو بھی اپنے بزنس کی طرف مائل کرنا تھا جو یقیناً ایک مشکل کام تھا۔ مگر اس طرح تو بابا بیمار ہو جائیں گے...... مجھے گہری تشویش تھی۔ آج جب میں آفس سے واپس آئی تو شام ڈھل کر رات کی چادر اوڑھ رہی تھی۔ میں سیدھی بابا کی خوب گاہ میں پہنچی، اوہ ہو...... یہ ہی خواب گاہ.... جو آفٹر شیو لوشن اور قیمتی مسحور کن خوشبویات سے مہکا کرتی تھی۔ فرح جو گلدان سجا گئی تھی اس کے باسی پھولوں کی باس کمرے میں عجیب سا تاثر چھوڑ رہی تھی۔

''بابا...... بابا......'' میں نے آواز دی، بے دلی سے آنکھیں کھولیں۔ ''آپ آج ابھی تک اٹھے نہیں......'' بڑی متاسفانہ آہ بھری۔

''بس دل نہیں چاہا...... کیا کرتا اٹھ کر تم بھی تو نہیں تھیں...... کس کے لیے اٹھوں......'' میں نے جلدی سے پردے کھسکائے ...... ائیر فریشنز کا چھڑکاؤ کیا...... اور ان کو کمرے سے باہر لائی...... انہوں نے ماحول سے بالکل لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ بزنس چھوڑ کر صرف گھر کے ہو رہے تھے۔

''اب کیا کروں گا بی کر کس کے لیے کماؤں...... تم اپنا کماتی ہو...... مکان کا کرایہ آتا ہے۔ بینک میں تمہاری شادی کے خرچ کے علاوہ بھی اتنا ہے کہ زندگی بسر ہو ہی جائے گی...... باقی منیجر دیکھ تو رہے ہیں......'' بڑے پژمردہ لہجے میں وہ بولے۔ ''داد دیجیے کہ ہم جی رہے ہیں۔'' اور آنسو ان کے بلیچ چہرے سے لڑھکنے لگے۔

''سنا ہے حشر میں دیدار ہوگا
تماشا کیا سر بازار ہوگا''

''بابا...... آپ کو میرا خیال نہیں؟'' میں نے تاسف سے آہ بھری۔ ''آپ کی خاطر جاب چھوڑ دیتی ہوں۔''

''اوہو بھئی ایسا میں نے کب کہا...... تم کیوں میرے لیے قید رہو تمہاری بھی کوئی زندگی ہے۔''

رات بستر پر لیٹے، لیٹے جانے کتنے لمحے بیت گئے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ آنکھوں کی جھلملاتی قندیلیں بجھ چکی تھیں۔ گھڑیال نے تین بجے کا اعلان کیا...... دور کہیں کتے زور، زور سے بھونک رہے تھے۔ دل کا غم بڑھ کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔ پہلے میرا چاہنے والا تنہا چھوڑ گیا۔ پھر میری غم گسار ماں تنہا کر گئی...... میں تو خاک بسر ہو گئی۔ اب مجھے الٹا بابا کو زندگی کی طرف لانا ہے۔ اتنے ستم اٹھاؤ گے کہ غم ہی بھول جاؤ گے۔ کچھ ایسی ہی صورت حال ہے......

آج آفس سے واپسی پر گاڑی دغا دے گئی۔ بڑی مشکل سے راہ گیر نے دھکا لگا کر اسٹارٹ کی...... میری زندگی کی طرح گھر پہنچی تو نڈھال ہو چکی تھی۔ شام کی نا سمجھ ہوا کو کیا معلوم کہ کوزہ گر چاک پر اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ جب تک اس کا ہاتھ گردن پر نہ ہو...... کوئی بھی سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ اب چاک کا پہیا جدھر گھوم رہا ہے ہم ادھر گھوم رہے ہیں، لان میں کھلے رنگ برنگے پھولوں نے بھی رنج گزیدہ ہی رکھا...... شکر ہے بابا واک سے میرے فوراً بعد داخل ہوئے۔

آج بابا نے پرانی سی ڈی لگا دی۔

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا
جانے کیوں آج ترے نام پہ رونا آیا

امی کو یہ غزل بہت پسند تھی۔ زندگی میں چراغاں رکھنے والے جتنی تیزی سے زندگی میں داخل ہوتے ہیں اتنی ہی خاموشی سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں ونڈو گلاس کے ساتھ گال لگا کر ٹھنڈ کا احساس اندر اتارنا چاہ رہی تھی۔ پھر جانے کیوں بے بسی سے سامنے پڑے کشن کو دیوار پر دے مارا۔ برق رفتار غصہ رن وے پر جہاز کی رفتار کی طرح دوڑ رہا تھا کہ امی کی دیوار پر لگی تصویر کشن لگنے سے جھول پڑی...... پھر جیسے ہولے سے مسکرا اٹھی۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''کیا ایسے جیتے ہیں...... تم نے تو غم کو گلے سے لگا لیا۔ ابھی زندگی ختم نہیں ہوئی۔ تم اور تمہارے بابا میری محبت کی نشانی تمہارے پاس ہے دونوں...... یہ کیا کر رہے ہو اپنی زندگیوں کے ساتھ......'' میں پلٹ کر بابا کے پاس لپکی...... دیکھا راکنگ چیئر پر تصویر بتاں لیے...... ان کو تاک رہے ہیں۔ امی کی تمام پرانی تصویریں مونا لیزا جیسی ملکوتی مسکراہٹ بکھیرتی یادیں......

ہم شہرِ جاں میں آخری نغمہ سنا چکے
سمجھو کہ اب ہمارا تماشا تمام شد

زندگی کرنے کے لیے ہم دونوں کو ہی حوصلے کی ضرورت تھی بقول فرح۔ ''تم شادی کرو اور اوپر والے پورشن میں رہو...... کرایہ دار رخصت کرو، دیکھنا انکل کیسے ٹھیک ہوتے ہیں۔ فی الحال انہیں ان کے گولف کے پرانے دوستوں کے پاس لے جاؤ کچھ روٹین بن جائے تو پھر تمہاری شادی کا معاملہ اٹھاتے ہیں۔ اسے سرد خانے میں تو پڑا نہیں رہنے دے سکتے ناں......'' وہ بالکل بڑے بوڑھوں کی طرح بات کر رہی تھی۔ فرح نے بات تو پتے کی تھی۔ سنڈے شام میں بابا کو گولف کورٹ لے گئی۔ وہاں پر پرانے گولف کے ساتھیوں سے مل کر بابا میں خوشگوار تبدیلی محسوس کی، سب سے گرم جوشی سے ملے۔ عبداللہ بھائی ایک ادھیڑ عمر بزنس مین تھے۔ ان کے ساتھ ایک طلاق شدہ بڑی طرح دار بیٹی بھی ہمراہ تھی۔ کاکا بھائی ''شیشے والا'' بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے۔ یعنی بڑے، بڑے بزنس مینوں کا جمگھٹا موجود تھا۔ میرا بھی تعارف ہوا۔

''گیم ابھی شروع کرتے ہیں۔'' عبداللہ انکل اپنی توند کو گیلس میں پھنسائے آگے بڑھے۔ بابا کا ہاتھ پکڑا۔

''یار میں نے تو مہینوں سے اسٹک نہیں تھامی۔'' مگر وہ ان کو گھسیٹتے ہوئے ایک گرین سے دوسرے گرین لیے پھرے۔ ایک کیڈی ساتھ، ساتھ رگیگ بیگ اٹھائے پھر رہا تھا۔ بال ہول میں جاتے ہی کیڈی لپک کر ہیلپ کرتا...... میں جب تک ان میک اپ زدہ خواتین کے ساتھ بیٹھنے پر مجبور ہوئی...... عجیب بیہودہ لباس، لمبے، لمبے ناخن، گہرے، گہرے چیپ رنگوں سے لبریز بڑے، بڑے نگینوں والی انگوٹھیوں کو گھما، گھما کر اسٹائل دکھاتیں یہ ماڈرن حسینائیں جانے کیا جتا رہی تھیں...... اور کیوں......؟ وہ تو کہیے بابا نے جلدی واپسی کی ہامی بھرلی...... راستے بھر ان دولتمندوں کا تمسخر اڑاتے رہے۔ مگر میں نے یہ غنیمت جانا کہ صبح کی واک اور ہفتے کی شام گولف سے بابا کی صحت پر اچھا اثر پڑا...... گریس فل تو وہ تھے ہی اب میں نے ان کے پرانے سیلون لے جا کر بال کلر کرا دیے تو مزید نکھر گئے۔ امی کے سامنے تو مجال نہیں کبھی ایک چاندی سی چمک بھی بالوں میں نظر آئے فوراً وہ ڈائی کے لیے اصرار کرتیں...... اب وہ تک سک سے تیار ہو کر زندگی کے ساتھ چلنے پر تیار ہو چکے تھے...... اکثر برج کی پارٹیاں بھی اٹینڈ کر لیتے...... جب وہ گھر سے گولف کے لیے نکلتے، میں جلدی سے سر پر ہیٹ جما دیتی...... تو بالکل جینٹلمین لگتے...... آج کل جانے پھر بابا کو کیا ہو گیا تھا...... موڈ بدلا ہوا

تھا...... پانچ دن گھر میں رہتے تو بولائے، بولائے پھرتے...... آج یوں بھی موسم سرد تھا۔ پردے کھسکا کر باہر جھانکا۔

"اوہ! آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ بجلیاں، چمکنے اور لپکنے کو تڑپ رہی ہیں...... شاید اب وقت آ گیا ہے کہ فرح کی بات مان لی جائے۔" بابا عجیب و غریب تماشا کر رہے تھے میں تو ان کی خاطر زندگی داؤ پر لگا بیٹھی اب جاب بھی چھوڑ کر ان کے ساتھ، ساتھ تھی۔

"آج تم نے یہ کیوں پکایا...... میں تو کبھی یہ نہیں کھا سکتا۔" پھر پلیٹ زور سے کھسکائی۔ "تم ہی کھاؤ...... یہ ہاف فرائی انڈے تم نے کیسے بنائے ہیں زردی توڑ دی، نہیں کھا سکتا۔" پھر مجھے دیکھتے...... "کہیں کی تیاری ہو رہی ہے جب ہی جلدی میں سارا ناشتا خراب کر دیا......" بڑا ڈرامائی انداز آج انہوں نے اپنایا ہوا تھا...... پھر اپنے ریشمی گاؤن کی ڈوریاں کھولنے لگتے۔

"چلو میں بھی تمہارے ہمراہ ہی چلوں گا......" سپاٹ سا لہجہ...... میں شاکڈ رہ گئی۔

"بابا آج آپ کو کیا ہوا ہے...... روز ایسا ہی بریک فاسٹ کرتے ہیں...... اور سنیں میں کہیں بھی نہیں جا رہی، آپ کو کہیں جانا ہو تو جائیں مگر پلیز میرے ساتھ تو ایسا روکھا رویہ نہ اپنائیں۔" میں نے تو بات رسانیت سے کی...... مگر اس پر تو ان کو ہمالیائی غصہ آ چکا تھا۔

"ہاں تو تم یہ ہی چاہتی ہو کہ میں گھر چھوڑ دوں۔ تم کو آزادی سے گھومنے، دوستیاں کرنے اور موبائل پر گل چھرے اڑانے کا موقع مل جائے...... مگر ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے کچھ انتظام کرنا پڑے گا۔" پھر کرسی کو زور سے دھکا دیا اور پیر پٹختے ہوئے باہر نکل گئے۔ میں حیرت زدہ کھڑی آنکھیں جھپکا رہی تھی آنسوؤں کے گولے گلے میں پھنس رہے تھے۔ اچانک بہت سے خوف ذہن میں لوٹ آئے...... کہیں بابا اپنے گولف کے لالچی ندیدے کیڈی یا وہ کاکا تم کے عمر رسیدہ کے ساتھ میرا...... اُف خدایا یہ سوچ کر مجھے جھرجھری آ گئی...... میں نے آگے بڑھ کر پانی کی بوتل نکالی اور غٹاغٹ پانی حلق میں انڈیل دیا...... اب مجھے پھر فرح کی مدد درکار تھی۔

"فرح تم فوراً کارروائی کرو...... کل تک اپنے کزن کو لے کر پہنچو ورنہ کوئی بھی طوفان آ کر بہت بڑی تباہی سے مجھے دوچار کر سکتا ہے۔" بابا کے اس خود غرضانہ انداز نے مجھے غصہ تو بہت دلایا اور سوچا کہ مجھے بابا کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑے گا۔ میں تو to be, not to be میں الجھ کر رہ گئی، غصہ اور ترس کی ملی جلی کیفیت کا شکار ہو کر رہ گئی۔ جب وہ سرد موسم کی برسات میں گاڑی لے کر نکل گئے۔ تو تنہائی میں، میں نے زندگی کا ایک بہت بڑا فیصلہ کر لیا اور آرام سے ٹی وی کھول کر ایلفر ڈ ہچکاک کی شہرۂ آفاق فلم the birds دیکھنے لگی...... جانے فلم دیکھتے، دیکھتے اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے مجھ پر کسی نادیدہ قوت نے حملہ کر دیا...... میں ریموٹ پھینک کر بھاگی۔ سامنے سے آتے بابا سے ٹکراتے، ٹکراتے بچی...... پھر مجھے ایسا لگا کہ بابا کچھ مجھ سے کہہ رہے ہیں۔ میں نے اپنے حواس پر قابو پایا۔

"دومشی جلدی آؤ، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" بابا کی بات میں نے سنی ان سنی کر دی...... اور فون کی بیل کی طرف لپکی جو شاید کافی دیر سے بج رہی تھی۔ دوسری طرف فرح ہی تھی۔

"اب سب سیٹ کر دیا ہے، تم موبائل بھی نہیں چیک کر رہی ہو...... چلو تم کو موٹے توندوالے بیوپاری اور عمر رسیدہ کیڈی سے بچانے کا پورا انتظام مکمل ہے۔ کل گھر پر رہنا۔ ہلکی سی تیاری بھی کر لینا آخر وہ سالوں بعد تمہیں دیکھے گا۔ پھر آ کر معاملات سنبھالتی ہوں...... میرے ساتھ حماد اور ان کی ایک عدد آنٹی بھی ہوں گی۔ میں عاطف کے ساتھ موجود ہوں گی...... لیکن تم بابا کو گھر...... میں روکے

رکھنا...... اوکے...... اور ہاں چہرے پر ہوائیاں نہ اڑ رہی ہوں...... ذرا پارلر کا ایک چکر لگا لینا۔''

شام ڈھل رہی تھی میں پارلر میں رش ہونے کی وجہ سے تھوڑی لیٹ ہوگئی...... فرح نے تو چھ بجے کہا تھا۔ سب آدھا گھنٹے پہلے ہی آ گئے...... کیونکہ گھر سے باہر دو تین گاڑیاں کھڑی میرا منہ چڑا رہی تھیں۔ حماد اور فرح کتنے افراد کے ساتھ حملہ آور ہوگئے کیا آج ہی نکاح پڑھوانے کا ارادہ ہے میں حواس باختہ سی اندر داخل ہوئی۔

''اوہ نو......'' یہاں تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی...... سات آٹھ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سامنے ٹیبل پر فریش پھولوں کے ڈھیر ماحول کو خواب آگیں بنا رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کی نیلگوں فضا میں تازہ پھولوں کی باس بسی تھی۔ بابا بوسکی کے شلوار سوٹ میں شاندار لگ رہے تھے۔ کاکا انکل، لطیف چاچا اور بابا کے برابر کاکا کی طلاق یافتہ بہن شافی زیرِ لب شرگیں مسکراہٹ سجائے آراستہ و پیراستہ پھولوں کے گہنے سجائے بیٹھی تھیں۔ خود کو کسی پرستان کی شہزادی کی طرح سمجھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بابا اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آؤ، آؤ تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تم موبائل یہاں ہی چھوڑ کر جانے کہاں چلی گئیں، رات بھی جلدی سو گئیں۔'' اور مجھے کندھے سے پکڑ کر کاکا کے قریب والی نشست پر بٹھا دیا۔ میں اطراف کا ماحول دیکھ کر سہم گئی۔ مجھے دور، دور تک حماد یا فرح کی فیملی نظر نہیں آ رہی تھی...... پھر سامنے بیٹھے مولوی صاحب سے کہا۔

''ہاں...... قاضی صاحب شروع کریں..... بسم اللہ.....''

''اُف خدایا یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے...... اس وقت لحظہ موجود میں کوئی شخص بھی میرے لیے باپ کے برابر تو ضرور لگ رہے تھے مگر ان میں سے کوئی میرا شریکِ سفر نہیں ہوسکتا تھا۔'' میں نے سہم کر اپنی تمام قوتوں کو جمع کیا اور گھٹی، گھٹی سی آواز حلق سے یہ مشکل نکلی...... سوالیہ انداز میں دیکھا۔

''بابا...... یہ سب کیا ہے، مجھے تو آپ نے کچھ نہیں بتایا...... پھر ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔'' میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کا ارادہ کیا مگر...... بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''تم میرے لیے بہت فکر مند رہتی تھیں ناں...... تو آج تمہارے لیے ایک خوب صورت سرپرائز گفٹ ہے...... جی قاضی اسد اللہ صاحب..... بسم اللہ......'' میرے سارے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ پھر کانوں میں سیسہ ملی آواز گونجی......

''شگفتہ خاتون آپ کو ہاشم فاروقی بعوض پانچ لاکھ سکہ رائج الوقت نکاح...... قبول، قبول، قبول......'' اور میں شاید آگے کچھ سن نہ سکی۔ یقیناً ہوش میں نہ رہی تھی...... جب ہوش میں آئی تو فرح مجھے جھنجوڑ رہی تھی...... اور میں پھٹی، پھٹی آنکھوں سے...... سامنے بظاہر پریشان حال بابا اور ان کے قریب ان کی نئی نویلی دلہن کھڑی مجھے حیرت سے تک رہی تھیں۔ جانے بساطِ دل نے میرے ساتھ کیا چال چلی...... کہ فرح جیسی عقلِ کل رکھنے والی بھی نہ سمجھ سکی کہ آخر معاملہ کیا ہے؟

''بابا بس آپ امی کو صرف اتنا ہی چاہتے تھے۔ چراغ وفا جلا نہ سکے...... بابا، آپ کو تو ٹھیک طرح سے آدابِ جاں سوزی بھی نبھانا نہ آیا۔'' میں نے نڈھال ہو کر آنکھیں موند لیں۔ بابا کو میری نہیں، اپنی فکر نے پریشان رکھا...... اور ہم سب یہ سمجھتے رہے کہ وہ میرے لیے پریشان ہیں۔ شاید ہم ہی غافل ہوگئے تھے داستان کہتے، کہتے...... زندگی کی طرف تو انہیں میں ہی لائی، وہ تو یادوں کو دل سے لگا بیٹھے تھے...... یہ میں ہی تھی جو جاں سوزی میں جل رہی تھی ورنہ کوئی رشتہ بھی اپنی زندگی کے آگے ہیچ ہوتا ہے...... میری سوچوں کا دھارا بدل رہا تھا...... اور...... اور میں ڈوب، ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

"ملاقات آئی ہے بے تیری!" کرخت آواز میں کہا گیا جملہ...... وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ "سنا نہیں تو نے؟" آہنی دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی۔ "چل اٹھ!"

وہ دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا، سمجھا تھا کہ اس کی بیوی موتا ہو گی، اسے کیا منہ دکھاتا، وہیں اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ "بہرہ ہو گیا ہے کیا؟" قمیص کے کالر سے پکڑ کر اسے اٹھا کر گھسیٹ کر سیدھا کھڑا کیا گیا تھا، وہ

# میری ماں

شیریں حیدر



بے بسی سے پلٹا...... آہنی سلاخوں کے اس پار مونا نہیں بلکہ اس کی ماں تھی، اس نے حقارت سے اسے دیکھا اور اپنے غصے کے اظہار کے لیے منہ پھیر لیا۔

''کیا لینے آئی ہو یہاں...... چلی جاؤ اور چھوڑ دو مجھے یہاں مرنے کے لیے۔'' جواب میں ایک سسکی کی آواز آئی۔

سلاخوں کے پار وہ اپنے اکلوتے بیٹے عمر کو دیکھ رہی تھی، اس کمرے کا فرش گندگی سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں موجود لوگ غالباً بول و براز وہیں کرتے تھے...... بیٹے کی حالت دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، چند ہفتوں میں ہی وہ کتنا کمزور لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشدد کے نشانات نظر آرہے تھے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ کس طرح اس سپاہی نے اسے کالر سے پکڑ کر، حقارت سے گھسیٹ کر... فرش سے اٹھایا تھا، اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔

''کیسے ہو میرے لال؟'' اس نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مر گیا آپ کا لال!'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایسا بھی کوئی کرتا ہے اپنی اولاد کے ساتھ؟''

''ماں ہوں تمہاری بیٹا، میری جان!''

''ایسی ہوتی ہیں کیا مائیں؟'' اس کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی چمک ابھری تھی۔ ''آپ کو تو مجھ سے پیار ہی نہیں، ثابت کر دیا آپ نے۔''

''کاش ساری مائیں ایسی ہی ہو جائیں میرے بیٹے تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔''

''یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے کہ میں یہاں سڑ رہا ہوں، میری بیوی اور تین بچے کس تکلیف میں ہیں، آپ سوچ سکتی ہیں کہ انہیں کن مشکلات کا سامنا ہے؟ انہیں تو ایسے حالات کی عادت بھی نہ ہوگی، ایک رات وہ میرے بغیر نہیں گزار سکتے...... یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے، آپ نے ان کے بارے میں بھی نہیں سوچا، آپ کو مجھ سے پیار ہی نہیں ہے اماں! آپ مجھے اپنی دشمن لگتی ہیں، آپ میرے سامنے نہ آیا کریں، آپ کو دیکھ کر میرے دل کے زخم کھلنے لگے ہیں۔''

''چلو اماں جی، ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ہے......'' اس نے اتنے مہذب لہجے میں آکر اس سے کہا کہ عمر کو بھی اپنی سماعت پر شک ہوا، اس نے تو ان لوگوں کو کبھی نرمی سے بات کرتے ہوئے نہ سنا تھا۔

''میں تمہاری دشمن نہیں ہوں بیٹا!'' وہ گھگیائی۔ ''جو کچھ بھی کیا وہ تمہارے بھلے کے لیے تھا۔''

''آپ کو میری ہی قسم ہے اماں کہ مجھے اس کے بعد ملنے مت آئیے گا، اگر آپ دوبارہ یہاں آئیں تو میں خود کو کچھ کر لوں گا...... یہاں سے اگر زندہ نکل آیا تو پھر دیکھوں گا کہ آپ سے ملنا ہے یا نہیں۔'' اس نے غصے سے کہا، صالحہ کے سینے میں درد کے جوار بھاٹے اٹھنے لگے، اس کے لیے عمر کی طرف سے دی گئی وہ قسم بہت بڑی قسم تھی، کتنا مشکل تھا کہ وہ اسے ملے بغیر رہ لیتی...... واپسی کا سفر کرب کا سفر تھا، تانگے پر ہچکولے کھاتا اس کا پورا وجود لرز رہا تھا، وہ اسی تانگے میں بیٹھے، بیٹھے ماضی کے کئی سالوں کا سفر طے کر گئی تھی۔

☆☆☆

پچیس کا سن بھی کیا عمر ہوتی ہے بھلا اور وہ اس جواں عمری میں ایک پانچ سالہ بیٹے کے ساتھ بیوہ ہوئی تھی، سب نے مشورہ دیا کہ اسے دوسری شادی کر لینی چاہیے...... اس کی پہلی شادی خود سے تقریباً دگنی عمر کے مرد سے ہوئی تھی مگر وہ بہت نیک انسان تھے اور یہ تو نام کی بھی صالحہ...... اپنے باپ کے کیے گئے فیصلے کی لاج نبھانا تھی۔ عمر کے ابا کی پہلی بیوی نے انہیں شادی کے بعد کوئی سکھ نہ دیا تھا، نہ اولاد کا نہ سکون کا، اسی لیے وہ بھی شادی کے نام سے بدکتے تھے۔ صالحہ کے ابا کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا، تقریباً ہر روز شام کو وہ ان کی بیٹھک میں ابا کے پاس آتے، حالاتِ حاضرہ پر باتیں ہوتیں اور دونوں کا اچھا وقت کٹ جاتا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیوی کی وفات کے بعد ان کے بیٹوں کو اپنے بیوی بچوں سے فرصت نہیں ملتی تھی، جو وہ بھی کسی وقت

آنکھیں موند جاتے تو جانے ان کی بیٹی کہاں در بدر ہوتی، اسی لیے انہوں نے بیٹی کا باپ ہوتے ہوئے بھی علی احمد سے خود اس کے لیے بات کی اور علی احمد ہچکچا گئے، کہاں ان کی عمر کا ڈھلتا ہوا سورج اور کہاں ان کی انیس، بیس سالہ بیٹی۔ انہوں نے اسے کبھی دیکھا نہ تھا مگر اس کی بابت اپنے دوست کو پریشان ضرور دیکھا تھا...... ان کے اصرار پر علی احمد کو انکار کی تاب نہ ہوئی۔

صالحہ کم سن اور خوب صورت تھی، ان کی زندگی میں سکھ کا ساون بن کر برسی اور گھر کے کھانے، سکون اور خوشی کے علاوہ اولاد کی نعمت بھی انہیں صالحہ کے توسط سے ملی۔ سوچتے تھے کہ اچھا ہی ہوا جو پہلی بیوی سے اولاد نہ ہوئی اور ان پر ایسی ذمے داری نہ پڑی کہ جو نہ صرف انہیں ایک ناخوشگوار زندگی گزارنے پر مجبور کرتی بلکہ اس اولاد کے باعث انہیں دوسری شادی کے لیے کوئی اپنی بیٹی بھی نہ دیتا۔ صالحہ بھی اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ اسے ہر طرح کا آرام تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس پر کوئی پابندی اور روک ٹوک نہ تھی۔ علی احمد خود بھی نمازی اور پرہیز گار تھے اور انہوں نے صالحہ کو بھی ہیرے کی طرح تراش دیا تھا، برائی سے دور رہنے اور نیکی کا چراغ بننے کا گر سکھایا، وہ ایک قناعت پسند اور صابر عورت تھی۔

علی احمد کی اچانک وفات نے اسے آسمان کی بلندیوں سے زمین پر لا پٹخا، جسے گھر سے باہر کی فکر تک نہ ہوتی تھی اسے دنیا اندھیر لگنے لگی، کس طرح زندگی گزرے گی...... اسی سوچ کے باعث وہ چپ سی ہو گئی تھی۔ سب نے مشورہ دیا کہ دوسری شادی کر لے مگر اس کی سوچیں اور فکریں اور طرح کی تھیں۔ اسے کوئی پانچ سال کے بیٹے سمیت کیوں قبولتا! اپنے ابا جان کے اصرار پر اس نے ہامی بھر لی مگر اس دوران جو رشتے آئے وہ ایسے لوگوں کے تھے جن کی عمریں اس کے ابا جان کی عمر سے بھی زیادہ تھیں، رنڈوے، دوہاجو یا خفیہ شادی کرنے کے خواہش مند جن کا کہنا تھا کہ وہ اسے رخصت کروا کر بھی نہ لے جائیں گے بلکہ یہیں آ کر ملیں کیا کریں گے کیونکہ اس شادی کو انہیں اپنی پہلی بیوی سے چھپا کر رکھنا تھا۔ جن کے اپنے چھ، چھ بچے بھی تھے اور انہیں پالنے کے لیے ایک گھر والی چاہیے تھی وہ اس کا ایک بیٹا بھی ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھے، اس نمانی کی توکل پونجی ہی عمر علی تھا، وہ اس کے بنا زندگی کا کیا تصور کرتی؟

باپ کے گھر پر رہ کر اس نے گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے ہر وہ کام کیا جو محنت کے زمرے میں آتا ہے، اب مسئلہ صرف پیٹ بھرنے یا اس کی ضروریات کا نہ تھا، اسے اپنے بیٹے کو بڑا انسان بنانا تھا۔ سلائی، کڑھائی، کروشیہ، بنائی، جہیز، بری کے جوڑوں کی ٹکائی کا کام کیا، پکوڑے، سموسے، کباب، آلو ٹکیاں، بڑیاں، اچار، مربے اور چٹنیاں بنا کر بیچیں اور اپنے ہنر اور محنت سے کمائی کر کر کے کمیٹیاں ڈالیں تاکہ اس کا بیٹا کسی قابل بن سکے۔ ابا جان کی وفات نے اسے اور بھی کھلے آسمان تلے لا کھڑا کیا تھا مگر مشکل کے چند سال بھائیوں کی خالی منہ زبانی تسلیوں کے ساتھ گزار کر اب اس کا بیٹا اس کے قد کو پہنچ گیا تھا۔

ابا جان کے مکان پر ان کی وفات کے بعد اس کے بھائیوں کی نظر تھی، انہیں اس کو بیچ کر بانٹنا تھا، وہ زمانہ شناس تھی، ان کی نظروں کے اشارے سمجھ گئی اور علی احمد کے اس مکان کو خالی کروانے کا نوٹس دے دیا جہاں کرائے دار رہتے تھے اور وہ کرایہ اس کی اضافی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اب وہ ذریعۂ آمدنی چھوٹ جانا تھا اس لیے اس نے سوچ سمجھ کر بھائیوں سے ابا جان کے مکان کی فروخت سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا، اس میں کوئی غلط یا غیر شرعی بات نہ تھی مگر ایسا ہوا کہ اس سے اس کے بھائیوں اور ان کے اہلِ خانہ سے رہے سہے تعلقات بھی ختم ہو گئے۔

اسے اس سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا، اس نے اس یک مشت ملنے والی رقم سے ایک دو ضروری مشینیں خریدیں اور گھر پر سلائی کا کام کرنے لگی۔ اس کی مشین کا پہیا گھومتا رہا اور اس کے بیٹے کا سلسلۂ تعلیم اور گھر کا

نظام چلتا رہا، گزرتے ہوئے وقت نے اسے کمر درد اور نظر کی کمزوری کا عطیہ بھی دے دیا مگر اسے کب اس کی پروا تھی، اس کا عمر پڑھ لکھ جاتا تو اس کے سارے بوجھ اٹھا لیتا، نظر کے لیے چشمہ اور درد کے لیے گولیاں......

چل سو چل اس کا عمر چودہ جماعتیں پڑھ چکا تو اس نے کئی جگہ ملازمت کے لیے درخواستیں دیں، خود صالحہ نے بھی ہر وہ در کھٹکھٹایا جہاں تک اس کا ہاتھ پہنچتا تھا۔ جن گھروں کا وہ سلائی کا کام کرتی تھی وہاں اس نے سب سے کہہ کہلا کر بالآخر عمر کے لیے ایک کلرک کی ملازمت حاصل کر ہی لی۔ عمر کے بھی خواب اونچے سہی مگر دن رات ملازمت کے حصول کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھا کر اور جوتیاں چٹخا، چٹخا کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دفتر میں کلرک کی وہ ملازمت بھی اسے سفارش پر ملی تھی ورنہ کلرکوں کی سیٹوں کی بھی بولیاں لگتی تھیں۔

عمر کی ملازمت کی خوشی میں اس نے محلے میں مٹھائی بھی بانٹی۔ اس کا بیٹا کمائو ہو گیا تھا، اس کی عمر بھر کی پونجی، اس کی محنت کا نتیجہ اسے دیکھنے کو مل رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں اور طرح کے سپنے دیکھنے لگی تھیں جن اور اس کی کمیٹی کی رقم ایک اور مقصد کے لیے جمع ہونے لگی، اسے عمر کو بیاہنا تھا۔ اسے دولہا بنانا تھا۔ جہاں جاتی اسے لڑکیاں اور اور رنگ میں نظر آتیں اور وہ راتوں کو ان کے سپنے دیکھتی، اس کی شادی کر کے وہ اللہ کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی تھی کہ اس نے اپنے سارے فرائض احسن طریقے سے نبھائے۔ خود بھوکی بھی رہی تو اسے بھوکا نہیں سلایا، اسے اچھا پہنانے کو وہ سالوں تک اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتی رہی تھی۔ اب وقت آ گیا تھا کہ اس کا بیٹا اس کا خیال رکھے گا، تھوڑے عرصے میں گھر میں بہو آ جائے گی تو وہ آرام کرے گی۔

اس کے علاوہ اس کے دل میں جو خواہش مچلتی تھی، وہ اللہ کے گھر کی زیارت کی تھی، حج کی خواہش اسے تھی مگر عمر کی پڑھائی تک اس نے اس خواہش کو اپنے اندر دبا کر رکھا تھا، اب تو وہ سوچتی تھی کہ وہ دن دور نہیں جب وہ اس قابل ہو سکے گی کہ حج کرے۔ عمر کی قلیل تنخواہ میں بھی وہ مطمئن تھی، گھر کے ایک کمرے کو کرائے پر دے رکھا تھا تو اس سے آمدن ہو جاتی تھی جسے اس نے چند سال پہلے کمیٹی ڈالنے کے لیے کرائے پر چڑھا دیا تھا، اس میں کسی نے کریانے کی دکان کھول رکھی تھی جس سے انہیں بھی چھوٹا موٹا سودا لینے کی سہولت تھی۔

دو کمروں کا چھوٹا سا گھر تھا مگر صالحہ اس میں ہمہ وقت مصروف رہتی۔ چولہا چوکی، صفائی ستھرائی اور اس کے علاوہ وہ کام جو اب اس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا، عمر چاہتا تھا کہ اب اماں کام نہ کریں مگر ضرورت مند مجبور کر لیتے تو وہ مان جاتی اور پھر اس سے اضافی آمدن بھی تو ہوتی ہی تھی۔ اسے عمر کی شادی کے لیے رقم درکار تھی۔

اسے کسی شریف گھرانے کی قبول صورت، شریف، پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار لڑکی چاہیے تھی۔ اس کی تلاش کے گھوڑے ہر طرف دوڑائے جا رہے تھے۔ عمر بسا اوقات ہنستا اور کہتا۔ ”کہ وہ ایک نہیں بلکہ چار لڑکیاں ڈھونڈیں کیونکہ کسی ایک لڑکی میں تو یہ سب خوبیاں اکٹھی نہ ملیں گی۔ جو بھی لڑکی اس گھر میں لانی ہے اماں وہ آپ نے اپنی پسند سے لانی ہے کیونکہ میرا تو بہت کم وقت گھر پر گزرتا ہے، اصل میں تو آپ کو اس کے ساتھ گزارہ کرنا ہے اور اسے آپ کے ساتھ......“

وہ مسکرا کر رہ جاتی...... اپنی دور پار کی ایک رشتے دار کی پوتی پر اس کی نظر تھی، وہ اس کے بارے میں سوچ رہی تھی، وہ بچی ان تمام خوبیوں پر پوری اترتی تھی جو اس نے سوچ رکھی تھیں مگر اسی اثنا میں......

☆☆☆

”اماں جی، میرے دفتر کے ہیڈ کلرک صاحب اپنی بیوی کے ساتھ ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں!“ عمر نے ماں کے گلے میں بانہیں حمائل کیں۔

”وہ کیا ہوتا ہے بیٹا؟“ انہوں نے حیرت سے سوال کیا۔

”میں کلرک ہوں ناں اماں جی، تو وہ ہم سب کے......“

وہ رکا۔ ''یوں سمجھیں کہ ہم سب کے افسر ہیں۔''
''تو وہ ہمارے گھر کیوں آنا چاہتے ہیں بیٹا!'' صالحہ گڑبڑا گئی تھی۔ ''وہ بڑے افسر ہیں اور ہمارا گھر تو چھوٹا سا ہے.....'' اس پرلفظ افسر نے رعب ڈال دیا تھا۔
''مگر آپ کا دل تو بہت بڑا ہے ناں اماں جی!'' اس نے اپنا سر ماں کے کندھے پر ٹکایا۔
''جیسے تجھے ٹھیک لگتا ہے بیٹا......'' صالحہ نے کہا۔
''تو پھر انہیں اتوار کے دن آنے کا کہہ دوں؟'' عمر نے خوشی سے پوچھا۔
''جس طرح تمہیں مناسب لگے......'' صالحہ نے اس کا سر چوما۔ ''کیا خیال ہے کہ میں سموسے اور فروٹ چاٹ گھر پر بنالوں چائے کے ساتھ؟''
''ٹھیک ہے اماں جان، میں کیک رس اور پیسٹریاں بازار سے لے آؤں گا۔''
صالحہ پر تو عمر کے ہیڈ کلرک کی افسری کا رعب تھا مگر اسے لگا کہ عمر کسی اور انداز سے خوش تھا اور چہچہا رہا تھا۔ اتوار کو سویرے ہی وہ جا کر وہ سارا سامان لے آیا۔ صالحہ ابھی گھر کی صفائی سے فارغ ہی ہوئی تھی کہ عمر نے تنقیدی انداز میں جائزہ لیا اور ماں سے کہا کہ فلاں چیز کو فلاں جگہ پر رکھ دیں اور فلاں چادر میز پر ڈال دیں۔
وہ پھر بھی کچھ نہ سمجھی، چائے کا سامان تیار کیا، برتن ٹرے میں سجائے تو عمر نے اس سے بھی اچھی طرح تیار ہونے کو کہا۔
ہیڈ کلرک اپنی بیگم کے ساتھ آئے تھے۔ ان کا لباس، انداز اور چھب ہی نرالی تھی، گھر کی ہر چیز کو تنقیدی نظر سے دیکھتی ہوئی، ناک بھوں چڑھا کر بات کرتی ہوئی۔ چاہے اس نے منہ سے ایسا کچھ نہ کہا تھا مگر صالحہ سمجھ رہی تھی کہ انہیں وہاں آنا، بیٹھنا اور ان کے ہاں کی چائے پینا کس قدر ناگوار لگ رہا تھا۔ صالحہ پھر بھی بچھی جارہی تھی کہ آخر اس کے بیٹے کا بڑا افسر تھا۔
''آپ بھی کبھی آئیں ہمارے گھر!'' رخصت ہوتے سمے انہوں نے کہا تھا مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا فقرہ کتنا با دلِ ناخواستہ اور رسمی سا تھا۔

''میں تو کبھی ایسے مغرور لوگوں کے ہاں نہ جاؤں۔'' صالحہ نے دل ہی دل میں سوچا اور منہ سے کچھ بھی نہ کہا، ایک رسمی سی مسکراہٹ کے ساتھ ان کو رخصت کر کے واپس آ کر بیٹھے۔ ''توبہ کیسی نک چڑھی عورت ہے!'' عمر کے سامنے صالحہ نے کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا...... صالحہ نے حیرت سے اسے دیکھا، اس کا بیٹا ایسا خوش پہلے کب ہوا تھا بھلا؟

☆☆☆

''اماں ہم کب جائیں گے ان کے گھر؟''
''کس کے گھر بیٹا؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔
''ہمارے ہیڈ کلرک صاحب کے گھر!'' اس نے جواب دیا۔
''ان کے گھر کیوں جانا ہے ہمیں بیٹا، مجھے تو وہ عورت بڑی مغرور سی لگی تھی۔''
''اماں وہ اپنی بیٹی کا رشتہ مجھے دینا چاہتے ہیں۔'' عمر نے بلی تھیلے سے باہر نکالی تو وہ ہکر بکر اس کا منہ دیکھنے لگی، اس کے لیے تو وہ اچنبھے کی بات ہی تھی کہ کوئی بیٹی والا اپنے منہ سے رشتہ دینا چاہے، اس نے ان کی بیٹی نہیں دیکھی ہوئی تھی مگر اس کی ماں کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو گیا تھا۔
''وہ بہت بڑے اور پیسے والے لوگ ہیں بیٹا، ہمارا اور ان کا کیا جوڑ ہے...... اس کی ماں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں اندازہ کر سکتی ہوں بیٹا کہ اس کی بیٹی اس گھر میں خوش نہیں رہ سکے گی۔'' صالحہ نے کہا، سوچ رہی تھی کہ شاید اس بچی میں کوئی نقص ہوگا جو اُن کے گھر کو دیکھ کر بھی وہ ان کے ہاں اپنی بیٹی کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔
تو اماں جان ہمیں کون سا ساری عمر اسی گھر میں رہنا ہے......'' اس نے فوراً کہا۔ ''میں جوں جوں ترقی کرتا جاؤں گا ہمارے حالات بھی بدل جائیں گے اور ہم بھی اسی طرح ٹھاٹ سے زندگی بسر کریں گے۔''
''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو......'' اس نے ہولے سے کہا۔ ''چلو میں کسی دن جا کر دیکھ آؤں گی کہ ان کی بیٹی میرے شہزادے کے قابل ہے بھی کہ نہیں۔'' اس کی

خوشی کی خاطر اس نے دل پر پتھر رکھ کر کہا، جس قدر جلد ہوا وہ اسے وہ لڑکی بھی دکھائے گی جسے وہ پسند کیے بیٹھی تھی بلکہ کسی کے ذریعے پیغام بھی بھجوا چکی تھی کہ اُن کا عندیہ معلوم ہو یا یہ کہ وہ بچی کہیں منگنی شدہ نہ ہو۔

''اچھی ہے اماں ...... جیسی ساری لڑکیاں ہوتی ہیں، میں نے دیکھی ہے۔'' عمر کے کہنے پر صالحہ دنگ رہ گئی۔ ''آج شام کو ہی میں اور آپ چلتے ہیں اور بات طے کر آتے ہیں۔'' بات تو صالحہ کے اندازے سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی، اس کی شمولیت اور منظوری فقط ضابطے کی کارروائی تھی تاہم اسے اس کارروائی میں بھی خوشی سے حصہ لینا تھا تاکہ بیٹے کو ماں کی طرف سے کوئی تکلیف نہ ہو۔

شام کو رکشے میں سوار ان کے گھر کی طرف جاتے ہوئے علی احمد نے ہزار، ہزار کے پانچ کرارے نوٹ ہال کو پکڑائے کہ وہ مونا کو دے دیں تو وہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں، پانچ ہزار...... پورے پانچ ہزار! وہ سالوں سے محنت کر کے کماتی تھی تو بھی اس کی اتنی سکت نہ ہوتی کہ کسی بھی لڑکی کو یوں پانچ ہزار تھما دیتی، تاہم اس نے خاموشی اختیار کی، اب حالات اس کے بس میں نہ رہے تھے، اسے ہوا کا رخ دیکھ کر ہی چلنا تھا، بیٹے کی شادی کے حوالے سے اس کے خوابوں کے محل مسمار ہو گئے تھے مگر اسے یقین تھا کہ اس کے بیٹے کی پسند اچھی ہی ہوگی۔

☆☆☆

اس گھر کے دبیز قالینوں پر چلتے ہوئے بھی صالحہ کے پیروں میں کانٹے چبھ رہے تھے، اس کا گھر کسی بھی طرح ایسی لڑکی کے شایانِ شان نہ تھا جو اس گھر کی مکین تھی...... آبنوسی طویل میز پر سجے ہوئے لوازمات کے ساتھ چائے بھی صالحہ کے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی، وہ بری طرح ان کے رعب میں آ گئی تھی، خدا کرے کہ وہ خود ہی کسی بات سے انکار کر دیں، اپنے بیٹے کی خوشی تو اسے نظر آ رہی تھی کہ اتنے بڑے گھر کا داماد بننے چلا تھا۔

عام سے نین نقش، یقیناً ان کے بیٹے سے بڑی عمر اور گہرے رنگ کے چہرے کو میک اپ کی تہوں میں چھپائے ہوئے، مونا کے ہاتھ اور پاؤں اس کی عمر اور پکے رنگ کی چغلی کھا رہے تھے...... اس کی طرف غور سے کیا دیکھتی۔ سر جھکائے ہوئے اس کی گود میں پانچ ہزار کے نوٹ رکھتے ہوئے صالحہ کی آنکھوں سے کئی آنسو ٹپکنے کو بے چین ہوئے مگر اس نے ان پر بند باندھا اور نوٹ مونا کی گود میں رکھ کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، نادانستگی میں وہ اس کا موازنہ اس بچی سے کر بیٹھی جسے وہ پسند کیے بیٹھی تھی۔ اسے علم ہو گیا کہ سب کچھ پہلے سے طے تھا۔ ساری باتیں وہی تھیں جو انہوں نے پہلے سے سوچ رکھی تھیں اور اب کہی جا رہی تھیں۔

وہ خود کو کسی ڈرامے کا ایک کردار سمجھ رہی تھی جس کی لائنیں پہلے سے لکھی ہوئی تھی اور اسے وہی کرنا تھا جیسے ہدایت کار چاہتا ہے۔

واپسی پر مونا کی ماں نے مٹھائی کے دو بڑے ٹوکرے اور ماں بیٹے کے لیے قیمتی کپڑے ہمراہ کیے اور ان کے گھر کی گاڑی انہیں چھوڑنے آئی تو محلے بھر کو علم ہوا کہ صالحہ کے بیٹے کی کسی اونچی جگہ منگنی ہو گئی ہے۔

اسے لگا کہ وہ کوئی کٹھ پتلی بن گئی تھی جس کی ڈوریں کوئی اور ہلا رہا تھا، بالا بالا سب کچھ طے کیا جا چکا تھا۔ انہیں ہر مرحلے کے آغاز پر اگلے قدم کے بارے میں بتا دیا جاتا تھا۔ اسی پتلی تماشے کا حصہ بنے، بنے، شہر کے ایک بڑے شادی ہال میں ہونے والی تقریب میں صالحہ اور عمر اپنے چند گنے چنے رشتے داروں کے ہمراہ جا کر مونا کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے بلکہ اپنے بھی نہیں، اس گھر میں جو مونا کے باپ نے داماد کو سلامی میں دیا تھا اور وہ گھر مونا کے نام پر خریدا گیا تھا۔

اپنا پرانا گھر انہیں کرائے پر دینا پڑا، وہ تو اس گھر کو نہ چھوڑنا چاہتی تھی مگر بیٹے کی ضد کے آگے مجبور ہو گئی، پرانا گھر پھر کرائے پر دے دیا گیا اور اس کا مختصر سامان سمٹ کر اس گھر کے ایک اسٹور میں سما گیا تھا۔

صالحہ اپنے بیٹے کے گھر کے ایک کمرے میں کسی......

عضوِ معطل کی طرح رہنے لگی، گھر کا کرایہ صالحہ کے پاس آتا تھا جو وہ جمع کر لیتی تھی، ایک بے اختیار عورت کی خواہشات ہی کتنی ہوتی ہیں؟

☆☆☆

کئی رُتیں آئیں اور چلی گئیں۔ گھڑی کی سوئیوں کو آگے پیچھے بھاگتے دیکھتے ہوئے صالحہ نے عمر کے گھر کے آنگن میں بڑھتی ہوئی آسائشوں اور کھیلتے ہوئے چار بچوں کو دیکھا، جتنا وہ بچوں کو دیکھ کر نہال ہوتی اتنا ہی اسے دولت کی ریل پیل ہراساں کرتی تھی...... گھر میں ہر طرح کی آسائشیں تھیں، عمر اسے بتاتا کہ اس کی ترقی بہت تیزی سے ہو رہی تھی۔ اسے اپنے بیٹے پر یقین تھا، دل ہی دل میں اسے دعائیں دیتی، مونا کی قسمت پر نازاں ہوتی کہ اس کی قسمت سے اس کے بیٹے پر ہُن برس رہا تھا اور اس کی اتنی تیزی سے ترقی ہو رہی تھی۔

کبھی کبھار پرانے محلے جاتی تو جاننے والے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کے بیٹے کے پاس راتوں رات آ جانے والی دولت کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرتے، وہ ان کو جھٹلاتی کیونکہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی، اس نے تو اسے کبھی بے وضو دودھ بھی نہ پلایا تھا اور اسے ہمیشہ صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کی تھی، اسے غلط اور صحیح کی تمیز سکھائی تھی اور حرام سے بچنے کی تاکید...... وہ ایسا کیونکر کر سکتا تھا؟ کاش ایسا ہی ہوتا جیسا کہ وہ سمجھتی تھی۔ بیٹے کو بلا کر استفسار کیا تو وہ سوچ رہی تھی کہ بیٹا کہے گا۔

''لوگ جھوٹ کہتے ہیں، بہتان لگاتے ہیں!''

''ہر طرف یہی ہو رہا ہے اماں جان، سب لوگ ایسا کر رہے ہیں، میں کوئی اکیلا تو......'' اس نے بغیر جھجک کے کہا تھا۔ ''وقت، زمانہ اور ضرورتیں بہت تبدیل ہوگئی ہیں اماں جان!''

''غلط کو اس لیے درست نہیں مانا جا سکتا میرے لعل کہ سب لوگ ایسا کر رہے ہیں۔'' اس نے رسان سے کہا، اسے امید تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو اس کھائی میں

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایتُ اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،

جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

مزید گرنے سے بچالے گی۔'' کیا وہ دوسرے کنویں میں چھلانگ لگائیں تو تم بھی لگا دو گے؟''

''میں کوئی ایسا بے عقل نہیں ہوں کہ کوئی کنویں میں چھلانگ لگائے تو اس کی تقلید کروں......'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ کنویں میں چھلانگ لگانے سے جان جا سکتی ہے۔''

''یہ بھی تو کنواں ہی ہے بیٹا بلکہ دلدل ہے...... برائی کا راستہ کنویں اور دلدل سے بدتر ہے، اس میں سراسر نقصان ہی نقصان ہے، صرف جان ہی اہم نہیں ہوتی بیٹا، کردار بھی اہم ہوتا ہے، عزت بھی اہم ہوتی ہے، شرافت بھی اہم ہوتی ہے!''

''اب ایسے لیکچر نہ دیں اماں جان!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''کیا آپ کو نظر نہیں آتا کہ میرے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی میں نے کبھی عمر بھر خواہش کی ہو گی نہ سوچا ہو گا کہ مجھے مل سکتا ہے! کیا میرے حالات پہلے سے بہتر نہیں ہوئے۔ جیسے آج کل سب کے ہیں۔ جس کے پاس پیسہ ہے، بڑا گھر ہے، گاڑی ہے اور اس کے بچے بہترین اسکولوں میں پڑھتے ہیں، عزت اسی کی ہے اور لوگ اسی کو سلام کرتے ہیں۔''

''یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے بیٹا، جو کچھ تمہارے پاس نہیں تھا اس کی تمہیں کبھی خواہش بھی نہیں ہوتی تھی، تم نے ساری عمر قناعت کے ساتھ بسر کی ہے، خواہشیں بھی اتنی ہی تھیں جتنا ہمارا اختیار تھا۔ یوں کرنے لگو تو کوئی انت نہیں ہے، اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔'' اس نے اسے پیار سے سمجھایا۔

''کیا سنبھل جاؤں اماں جان؟'' اس نے ان کی طرف دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

''اب بھی حرام سے باز آجاؤ، اپنی اولاد کو حلال کھلاؤ تا کہ تمہیں پچھتانا نہ پڑے......''

''کیا میں اپنے بچوں کو اچھے اسکولوں سے اٹھا کر سرکاری اسکولوں میں ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھنے کے لیے بھیجنا شروع کردوں جیسے کہ میں نے پڑھا ہے؟''

''تو تم پڑھ ہی گئے ناں بیٹا!''

''کیا پڑھ گیا...... کیا کر رہا ہوں...... کلرکی؟ ہونہہ!'' اس نے بپھر کر کہا۔ ''مجھے تو لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے شرم آتی ہے جب وہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں کس اسکول یا کالج میں پڑھتا تھا، کس جگہ رہتا تھا...... سارا ماضی شرمندگی ہی شرمندگی ہے اماں جان!''

''تو یہ تو نصیب کی بات ہے بیٹا، پیدا کہاں ہوئے، کس کی اولاد ہو، اس پر کسی کا کیا اختیار، میں نے محنت کر کے تمہیں کھلایا اور پڑھایا لکھایا، تمہارے ابا جان بھی ایک نیک اور شریف انسان تھے، لوگ ان کی شرافت کی قسمیں کھاتے تھے، چھوٹا سا ذاتی کاروبار تھا، اس میں بھی فقط گھر کا گزارہ ہی چلتا تھا مگر میں نے اسی میں گزارہ کیا، کبھی زیادہ کی خواہش کی نہ انہیں غلط کاموں پر مجبور کیا...... جو تم اپنے جیسوں میں اٹھو بیٹھو تو تمہیں اپنے ماضی پر کوئی شرمندگی نہ ہو، جب تم نے دوستیاں ہی ایسے لوگوں سے لگا لی ہیں جو تمہیں غلط کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں تو وہ تو ایسا ہی کریں گے ناں بیٹا!''

''اب تو جو ہے اماں جان سو ہے!''

''دنیا کے عارضی فائدے کے لیے تم دائمی دنیا کے لیے سراسر نقصان کا سودا کر رہے ہو......'' پھر پیار سے اس کے سر کو سہلایا۔ ''جو تکالیف ایسے غلط کاموں کے نتیجے میں ہمیں آخرت میں جھیلنا ہیں اس کے مقابلے میں دنیا کی سختیاں تو کچھ بھی نہیں ہیں...... ہم تھوڑا کھا لیں گے، بھوکے رہ لیں گے، بچوں کو تم اپنی تنخواہ، گھر کے کرائے اور میری کمیٹیوں کی رقم سے جہاں چاہے پڑھاؤ...... انہیں حرام کے لقمے سے بچاؤ، مونا بھی یقیناً میری حامی ہو گی، تم اس سے بات کرو تو وہ بھی تم سے یہی کہے گی!''

''اس کے باپ نے اپنی بیٹی کو کسی غریب گھر میں سڑنے کے لیے نہیں بیاہا تھا اماں جان...... وہ ہمیشہ سے آسائشوں کی عادی ہے اور میرے ساتھ اسی لیے رہ رہی ہے کہ اسے وہ سب کچھ میسر ہے جو اپنے باپ کے گھر پر میسر تھا، اپنے بیوی بچوں کے لیے آسائشوں

کے حصول کا یہ راستہ مجھے دکھایا بھی اس کے ابا جان نے ہی ہے، انہوں نے ہی میری مدد کی ہے مجھے یہ سکھانے میں کہ میری کرسی کی کیا اہمیت ہے اور میرے دستخط کی کیا قیمت!''

''کس لیے کرتے ہو ایسا بیٹا؟'' وہ سسکی۔

''آپ کے لیے اماں...... مونا کے لیے...... بچوں کے لیے اور ظاہر ہے کہ اپنے لیے!'' اس نے ایک، ایک لفظ پر زور دے کر کہا تو اس کی ڈھٹائی پر وہ ساکت رہ گئی۔

''نہیں چاہیے مجھے یہ سب کچھ......'' نہ صرف اس نے کہا بلکہ اس نے ثابت بھی کر دکھایا اور واپس اپنے گھر میں لوٹ گئی۔ اسے سوچ، سوچ کر گھن آنے لگی کہ اس کے خون میں حرام کی آمیزش ہو گئی ہے اور وہ... لاعلمی میں ہی سہی مگر حرام کھاتی رہی ہے...... سوچتی کہ کہاں غلطی ہوئی جو اس کی محنت ضائع ہو گئی، اس کے بیٹے کو حلال اور حرام میں تمیز نہ رہی، کہاں ایسا برا وقت آیا کہ عزت کے معیار بدل گئے اور پیسہ ہی عزت کا معیار ٹھہرا۔

عمر کے پاس کہاں وقت تھا جو اس کے پاس باقاعدگی سے آتا، وہ تو وقت کے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھ کر ''ترقی'' کی راہ پر گامزن تھا، کبھی کبھار وقت ملتا تو ماں کے پاس کھڑے، کھڑے چلا آتا، بہت منت سماجت کی کہ وہ گھر چھوڑ کر نہ جاتی مگر وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ پہلی بار وہ ملنے کو آیا تو ساتھ میں پھل اور ماں کی دوائیں بھی لے کر آیا، اس نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا، اس کے دیے ہوئے کپڑے، جوتے تک وہ اس گھر سے ساتھ نہ لے کر آئی تھی، کیوں اب جان بوجھ کر اس کے حرام میں سے حصہ وصولتی۔

جب بھی اس کے پاس وقت ہوتا اور اسے ملنے کو آتا تو وہ اسے سمجھانے سے باز نہ آتی مگر وہ ان سب چیزوں سے بالا ہو چکا تھا مگر آخری بار اس کے پاس چند دن پہلے ہی تو آیا تھا۔

☆☆☆

اس روز اس کے ساتھ ڈرائیور تھا نہ گاڑی بلکہ وہ ٹیکسی پر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کالا بیگ تھا، وہ کچھ بجھا بجھا سا تھا، ماں کی نظر تو اولاد کے چہرے سے اس کے اندر تک بھانپ لیتی ہے......

''تم ٹھیک ہو ناں بیٹا؟'' اس نے سوال کیا۔

''ٹیکسی پر آئے ہو......''

''وہ مونا بچوں کو لے کر اپنے ابا کی طرف گئی ہے اماں!'' اسے بے فکری ہوئی اور وہ اٹھ کر چائے بنانے کو چل دی، چائے بنا کر لائی تو وہ اس کی چارپائی پر دراز سو رہا تھا، ہلکے سے کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

''بہت تھک گئے ہو کیا؟'' اس نے پیار سے پوچھا۔

''تھکا نہیں ہوں ...... بہت پریشان ہوں!'' چائے کا پہلا گھونٹ پیتے ہوئے اس نے کہا۔

''خیریت ہے ناں میرے لعل، میری جان!''

''مونا ناراض ہو کر چلی گئی ہے اماں جان!''

''ہو جاتا ہے بیٹا، میاں بیوی کے درمیان سو چھوٹی، چھوٹی باتیں ہو جاتی ہیں، چار دن میں مان کر واپس آ جائے گی، تم اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے دو اور خود بھی دو دن تنہا رہو گے تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ اس کی اہمیت تمہاری زندگی میں کیا ہے......'' انہوں نے اس سے قطعی نہ پوچھا کہ وہ کیوں ناراض ہو کر گئی تھی، میاں بیوی کے ذاتی معاملے میں انہیں دخل اندازی کی عادت نہ تھی۔

''نہیں اماں جان...... چھوٹی موٹی جھڑپوں پر وہ گھر چھوڑ کر نہیں جاتی مگر اب معاملہ گمبھیر ہے!'' اس نے چائے کا کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھا۔ ''وہ واپس نہیں آئے گی جب تک کہ میں اس کا مطالبہ نہیں مانوں گا۔''

''اب بھی اس کا کوئی مطالبہ ہے تم سے...... اب تک وہ یہ سمجھتی ہے کہ تم اس کے مطالبات نہیں مانتے؟'' دل کا دکھ ان کے لبوں پر آ گیا۔

''بات ایک چھوٹے سے جھگڑے کی ہے اماں جان جس میں، میں سمجھتا ہوں کہ اسے میرا ساتھ دینا چاہیے مگر وہ اپنے باپ کا ساتھ دے کر مجھ پر ناجائز دباؤ

ڈال رہی ہے۔'' وہ بتا رہا تھا مگر انہوں نے پھر بھی سوال نہ کیا، معاملہ اس کا اور اس کے سسر کا تھا، انہیں کیا معلوم کہ کیا معاملہ تھا اور کون درست تھا اور کون غلط وہ خاموش تھیں۔

''آپ ہی بتائیں اماں جان کہ داماد اور سسر کے مابین تنازع ہو تو بیوی کو کس کا ساتھ دینا چاہیے؟''

''مم...... میں کیا بتاؤں بیٹا، میں نے تو اپنی زندگی میں کبھی ایسی صورتِ حال اس سے پہلے سنی ہی نہیں!'' انہوں نے حیرت سے کہا۔ ''مگر تمہارے اور تمہارے سسر کے بیچ تو بڑی گاڑھی چھنتی ہے، تم دونوں میں کیوں جھگڑا ہوا؟'' اس نے سوال کیا۔

''پیسہ انسان کو اچھے، اچھے رشتوں کی پہچان بھلا دیتا ہے اماں جان، ان کی مجھ پر عنایتیں اور نوازشیں اپنی جگہ مگر جہاں ان کے اپنے مفاد کی بات آئی ہے وہاں انہوں نے آنکھیں پھیر لی ہیں!'' اس نے بتانا شروع کیا۔ ''یہ بیگ دیکھ رہی ہیں آپ؟'' اس نے بیگ کی طرف اشارہ کیا جس کے بارے میں وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ سامان سمیت اس کے پاس آ گیا ہے تاکہ وہ مونا کو اپنی ناراضی دکھا سکے۔ ''اس میں اس وقت کچھ رقم ہے، وہی ہم دونوں کے بیچ وجہِ تنازع بن گئی ہے۔'' اس نے اٹھ کر بیگ چارپائی پر رکھا اور اس کی زپ کھولی تو صالحہ کی سانس رک گئی۔

''یہ کس کی رقم ہے اور کتنی ہے؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اس بیگ میں تین کروڑ روپے ہیں اماں جان......'' صالحہ کو تو اتنی رقم کی وقعت کا بھی اندازہ نہ تھا۔

''اور کس کے ہیں؟ یہی تو سوال اور جھگڑے کی بنیاد ہے۔''

''یہ کیا رشوت کا پیسہ ہے؟'' وہ ہکلائی۔

''ارے میری بھولی اماں جان، ایک پارٹی کا بیس کروڑ کا سودا پھنسا ہوا ہے، میں نے تو بس ان کی فائل ڈھونڈ کر دی ہے ان کو تو انہوں نے مجھے انعام میں تین کروڑ دے دیے۔'' اس نے فخر سے بتایا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے...... اس میں کتنے لاکھ روپے ہوں گے بیٹا؟'' اس کے ہونٹ بھی اس رقم کو دیکھ کر خوف سے خشک ہو گئے تھے۔

''اس میں تین سو لاکھ ہیں اماں جان!'' اس نے ہنس کر بتایا۔

''ارے یہ تو بہت بڑی رقم ہے، اتنی رقم کوئی انعام میں دیتا ہے بھلا؟''

''یہ رقم تو مجھے اور آپ کو بڑی لگتی ہے اماں جان......'' اس نے ماں کی حیرت کا مذاق اڑایا۔ ''اصل میں اس فائل کو دبا کر میرے سسر اس پارٹی کے ساتھ پانچ کروڑ کا سودا کر رہے تھے، یعنی پانچ سو لاکھ اماں جان...... وہ اس دن چھٹی پر تھے اور میں ان کی سیٹ پر کام کر رہا تھا کہ یہ پارٹی آ گئی، مجھے تو علم نہ تھا کہ اندر خانے کیا چل رہا تھا، انہوں نے مجھ سے بات کی اور دو کروڑ کی پیش کش کی، میں نے تین کروڑ پر اصرار کیا تو وہ تھوڑی حیل و حجت کے بعد مان گئے اور میں نے فائل ان کے حوالے کر دی۔ اس کے بدلے میں انہوں نے حسبِ وعدہ یہ بیگ میری گاڑی میں اس وقت رکھوا دیا جب میں دفتر سے گھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔ میں نے اسے گاڑی کی ڈگی میں ہی رہنے دیا کہ اتنا بڑا بیگ کسی کی نظر سے چھپانا ممکن نہ تھا، میں نے مونا کو بھی اس کے بارے میں بتا دیا تھا اور اس کے بعد ہم نے ڈرائیور کو گاڑی کی چابی نہ دی بلکہ جب ہمیں کہیں جانا ہوتا تھا تو اسی وقت اس کے حوالے کرتے...... ایک دن موقع ملا اور مونا گھر پر نہ تھی تو میں نے اس بیگ کو گھر میں چھپا دیا، مونا کو ابھی میں بتا بھی نہیں سکا تھا کہ اس کے والد کو علم ہو گیا کہ ان کی غیر موجودگی میں کیا ہوا تھا اور جس فائل کو وہ پانچ کروڑ کے مطالبے پر دبا کر بیٹھے تھے وہ میں نے تین کروڑ میں دے دی اور انہیں بتایا بھی نہیں...... وہ ہمارے گھر آئے، بہت جھگڑے اور دھمکیاں دیں کہ یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے۔'' وہ سانس لینے کے لیے رکا۔

''مونا بھی انہی کی وکالت کر رہی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی کہ چاہے تین کروڑ ہی سہی مگر وہ رقم میں ان کو دے دوں...... مگر میں وہ رقم انہیں کیوں دیتا اماں

جان! آج میں دفتر میں تھا کہ مجھے ملازم نے فون کر کے بتایا کہ مونا گھر سے اپنا زیور وغیرہ لے کر بچوں سمیت چلی گئی ہے، اپنی دانست میں وہ گاڑی ساتھ لے کر گئی ہے کہ شاید اس میں وہ تین کروڑ رکھا ہوا ہے، میں فوراً دفتر سے اٹھا اور جس ٹیکسی پر دفتر سے گھر آیا تھا اسی میں یہ بیگ لے کر یہاں آ گیا ہوں...... اب مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے اماں جان!''

''میری مدد؟'' انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''مونا سمجھ رہی ہو گی کہ میں ابھی تک دفتر میں ہوں اور ممکن ہے کہ جب اسے ڈگی میں یہ بیگ نہیں ملے گا تو وہ واپس اپنے گھر کی تلاشی لینے ضرور آئے گی، آپ کا گھر وہ واحد جگہ ہے جہاں کے بارے میں اسے شک تک نہیں ہوگا، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ کے حوالے یہ امانت کروں تاکہ کچھ وقت گزر جائے، میں مونا کو بھی سمجھا لوں گا اور اپنے سسر سے بھی بات کرلوں گا...... حالات ٹھیک ہو جائیں گے تو میں یہ بیگ آ کر آپ سے لے لوں گا؟''

''اتنی بڑی رقم...... نہیں بیٹا، میرا گھر تو قطعی محفوظ نہیں ہے!''

''ایسی ہی جگہ سب سے محفوظ ہوتی ہے اماں جان جہاں لوگوں کو علم ہو کہ آپ جیسی مفلس عورت تنہا رہتی ہے، میں جانتا ہوں کہ اس رقم کے لیے اس وقت اس سے بڑھ کر محفوظ جگہ کوئی نہیں ہے۔''

''لیکن میں اس حرام مال کو اپنے گھر میں کیوں رکھوں، جانے کس وقت میرا دم نکل جائے اور لوگ سمجھیں کہ میں حرام کاموں میں تمہاری شراکت دار رہی ہوں۔'' اس نے حجت کی۔

''ایک بار اماں جان!'' اس نے ان کے سامنے ہاتھ باندھے۔ ''ایک بار میرے لیے......''

''تو کیا تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ تم اس برائی کی دلدل سے نکل آؤ گے، یہ رقم بھی اس کے مالکوں کو واپس کر دو گے اور آئندہ رشوت لینے سے توبہ کرلو گے؟'' خوشی سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

''اس دلدل سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے اماں جان!'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ ''نہ ہی مجھے عادت رہی ہے عیش و آرام کے بغیر زندگی گزارنے کی، چند دن کی بات ہے جب میں اپنے سسر سے بات کرلوں گا تو...... ویسے میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کوشش ضرور کروں گا!'' آخری بات اس نے محض ماں کو خوش رکھنے کے لیے کی تھی۔ ''اصل میں مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے سسر مجھے رشوت لینے کے الزام میں پکڑوا نہ دیں!''

''تو رشوت لینا کیا جرم سمجھا جاتا ہے؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔ ''مگر تم تو کہتے تھے کہ سب لیتے ہیں۔''

''جرم ہے اماں جان قانون کی کتابوں میں، حالانکہ آج کل تو ہر کوئی رشوت لے رہا ہے، قانون بنانے والے بھی اور قانون کے رکھوالے بھی، بس سزا اسے ہوتی ہے جو پکڑا جاتا ہے یا پھر دوسروں کا حصہ نہیں دیتا! سزائیں بھی بڑی سخت ہیں، کئی سال کی جیل ہو سکتی ہے، نوکری تو جاتی ہی ہے۔'' وہ اپنی بات کر کے بیگ اندر کمرے میں رکھ کر چلا گیا اور ان کی سوچ کو ایک نئی جہت دے گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے اپنی سفید چادر اوڑھی، گھر کو تالا لگایا اور پیدل ہی چل دی، جہاں اسے جانا تھا وہ گھر زیادہ دور بھی نہ تھا! وہ گھر ایک ریٹائرڈ جج کا تھا، وہ اپنے زمانے کے بڑے ایماندار جج مشہور تھے۔ صالحہ ان کی بیبیوں کے کپڑے سیتی تھی اس لیے جانتی تھی، ان کے چار بیٹے تھے جن میں سے ایک ڈاکٹر، ایک وکیل، ایک پولیس میں ڈی ایس پی تھا اور چھوٹا فوج میں کپتان تھا، انتہائی عزت دار گھرانا تھا...... ان کے ہاں پہنچ کر شربت کا گلاس پیا اور جج صاحب کی بیگم سے کہا کہ وہ جج صاحب سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے...... انہوں نے حیرت سے اسے دیکھا تو مگر انہیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ (اس کے بعد کی کہانی کی تفصیل میں جانا غیر ضروری ہے۔)

صالحہ کی بتائی ہوئی پوری کہانی کے سرے جوڑتا، رشوت کا مال، مجرم کے گھر کے حالات اور مجرم کی والدہ کی گواہی اس کے خلاف جاتی تھی، اس کی بیوی اور سسر بھی اس سے نالاں تھے اس لیے اندازہ کرنا دشوار نہ تھا، اس کے سسر کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا کیونکہ عمر نے ان کے خلاف بھی بہت سے ثبوت فراہم کیے تھے...... رشوت دینے والی پارٹی کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا، مہینوں کیس چلا اور عمر اور اس کے سسر کو قید اور جرمانے کی سزا ہوگئی، جرمانہ نہ ادا کرسکنے کی صورت میں مدت قید بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

''تم نے اپنے ہی بیٹے کے خلاف گواہی کیوں دی صالحہ؟'' جج صاحب نے اس سے پوچھا تھا۔ ''تم جانتی بھی ہو کہ اس جرم میں اسے کئی سال کی قید کی سزا ہوسکتی ہے؟''

''مجرم کوئی بھی ہو، مجرم ہی رہتا ہے...... رشتوں کی ڈور اگرچہ ہمیں اعانت جرم کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ خاموشی اور پردہ داری سب سے بڑی اعانتِ جرم ہے، میں نے اپنے بیٹے کو ہر طریقے سے اس آگ سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر وہ باز نہ آیا، اب بھی کہتا تھا کہ اس راہ کو چھوڑنا مشکل ہے، اس کے خلاف میرے پاس مکمل ثبوت موجود ہے، پہلے تو میں لوگوں کی زبانی سنتی تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ رشوت صرف اللہ کی نظر میں ہی نہیں بلکہ اس ملک کے قانون کے مطابق بھی قابلِ سزا جرم ہے۔''

''کس طرح رہوگی اس کے بغیر؟''

''میں تو اب بھی تنہا ہی رہتی ہوں...... بلکہ میں تنہا تو ہوں ہی نہیں، میرا اللہ ہمہ وقت میرے ساتھ ہے، اسی نے میری اس معاملے میں بھی راہنمائی کی۔''

''اس کے بیوی بچے اسے چھوڑ دیں گے جب انہیں وہ تمام تعیشات میسر نہ ہوں گے...... جب تک وہ باہر آئے گا، اگر تم زندہ بھی ہوئیں تو وہ تمہیں ملنے تک نہیں آئے گا، جس طرح تم بتارہی ہو کہ اس نے تمہیں کتنی حقارت سے کہا ہے کہ تم دوبارہ اسے اپنی شکل تک نہ دکھانا۔''

''بیوی بچے تو یوں بھی دنیاوی اور عارضی رشتے ہیں، میں تو اس کی ماں ہوں، اس جہاں میں نہ سہی، اگلے جہاں میں اس سے مل لوں گی۔'' اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

''تمہیں کس جذبے نے ایسا کرنے پر مجبور کیا؟'' سوال کیا گیا۔

''جج صاحب...... میں اس کی طرف دیکھتی تھی تو مجھے اس کے گرد آگ کی لپٹیں نظر آتی تھیں، میں خوف زدہ ہوجاتی تھی، سوچتی تھی کہ عمر بھر غلط کام نہ کیا اور ہمیشہ اس کے عوض جنت کی خواہش کی، جانے کہاں غلطی ہوئی جو اولاد بھٹک گئی، غلط راستے پر چل نکلی، اچھا ہے کہ مونا جیسی بیوی جو خاوند کی دنیا اور آخرت خراب کرے اس سے اسے چھٹکارا مل جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کا کوئی اور بہتر نعم البدل عطا کرے گا۔ میں اس کے باپ کو روزِ جزا کیا بتاتی، اللہ کو کیا منہ دکھاتی اور خود کیسے جنت میں جاتی جب میرا بیٹا آگ کی لپٹوں میں ہوتا!''

''تمہیں لگتا ہے کہ اب وہ غلط کام چھوڑ دے گا؟''

''اللہ تعالیٰ نے اسے موقع تو دیا ہے سنبھلنے، توبہ کرنے اور گزرے وقت کی معافی مانگنے کا، اب بھی اگر وہ نہیں سدھرے گا تو کم از کم میں تو سرخرو ہوں گی ناں کہ میں نے تو ماں کی ممتا کی بھی قربانی دے دی تھی۔''

''اللہ ہر ماں کو تم جیسی سوچ اور عمل عطا کرے!'' جج صاحب کی بیگم نے کہا۔

''آمین!'' جج صاحب کے گھر والوں کی آوازیں آئیں، وہ سب بیٹھے ان دونوں کے بیچ کی گفتگو سن رہے تھے...... صالحہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور چادر سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھو ناں صالحہ!'' جج صاحب کی بیگم نے اصرار کیا۔

''چلتی ہوں آپا جی، عمر کی جو پونجی بچ گئی ہے اسے پورا صرف کرنا ہے بیٹے کے لیے ہدایت کی دعا کرنے میں، شاید کوئی قبولیت کی گھڑی ہو جو میں باتوں میں گنوا بیٹھوں!'' سلام کر کے وہ اپنے گھر کو چل دی۔

# سیڑھی

## ہاجرہ ریحان

کس قدر تیزی اور نفاست سے میں تمہارے
گال پر تھپڑ مار چکی تھی کہ خود بھی حیران کھڑی رہ گئی
تھی......تم لمبے بھی تو بہت ہو......ایک زمانہ تھا جب
میں تم کو پہروں بے تکان سوچا کرتی تھی کہ ہم دونوں کی
اگر شادی ہوگئی تو کتنا مشکل ہوگا میرا تمہارے گلے میں
بانہیں ڈالنا......تم کچھ ایسے ہی لمبے ہو......پھر میں تھک
ہار کر سوچتی کہ تم کو کسی سیڑھی پر خود سے دو چار قدم نیچے
کھڑا کر دیا کروں گی......تب ہی ممکن ہوگا کہ تمہارے

گلے سے جھول سکوں...... اور یہاں تک سوچتے میں شرما جاتی...... مگر آج تمہارا اقدم بھی میرے ہاتھ کی تیزی سے نہ بچ سکا...... تھپڑ ایسا شدید تھا کہ تم دو قدم پیچھے ہٹ گئے...... لفظ منہ میں کہیں دب کر رہ گئے...... تمہاری بیوی جو زبان درازی کی حد تک تھوڑی ہی دیر پہلے تم سے لڑ رہی تھی...... میرے اور تمہارے درمیان آ گئی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی...... دو ٹکے کی عورت......؟'' اس نے نخوت سے مجھے دھتکارتے ہوئے پھنکارا...... اور پھر تمہارے تیزی سے پلٹ جانے پر خود بھی تمہارے ساتھ تیز، تیز قدم اٹھاتی ریسٹورنٹ سے باہر نکل گئی تھی۔

''یہ تو سراسر زیادتی ہے۔'' میں نے دل میں سوچا...... پہلے بھی تم مجھے اسی طرح پوری دنیا کے سامنے تنہا چھوڑ گئے تھے...... خود تو تیز، تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے تھے جبکہ میں بیچاری دو ٹکے کی عورت...... لوگوں کے سوالوں کے جوابات تک کی سکت نہ رکھتے ہوئے بھی ان کے ہی درمیان زندگی گزارتی رہی تھی...... اور آج پھر تم مجھے یوں اکیلا اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے، کھڑے، کھاتے، پیتے کئی لوگوں کی حیران نظروں میں اکیلا چھوڑ گئے...... بچپن میں کبھی ایک اسٹیج ڈراما دیکھا تھا...... ڈراما ہوا، کرداروں نے اپنا، اپنا کردار ادا کیا اور چلتے بنے...... جبکہ تماش بین ابھی آہستہ، آہستہ جا رہے تھے...... ایک تنہا اکیلے گھٹے ہوئے قد کے آدمی نے اسٹیج پر سجے سامان کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا...... وہ جس نپے تلے انداز میں سامان سمیٹ رہا تھا مجھے لگا کہ وہ بھی ایک کردار ہی تو ہے اور اپنے وقت پر اپنا پارٹ ادا کر رہا ہے۔ ڈرامے کا ڈراپ سین تو سمیٹے جانے پر ہوتا ہے اور میں...... میں بھی ڈرامے کے مکمل ہو جانے کے بعد...... ایک، ایک کردار کے واک آؤٹ کر جانے کے بعد...... آخر میں اسٹیج پر جا کر صرف سمیٹتی ہوں...... کبھی گالیاں، کبھی طعنے...... اور بہت سی رسوائیاں اور پھر...... اب سوچتی ہوں...... اور پھر...... کے بارے میں تو کانپ جاتی ہوں...... کیا دوبارہ میں وہی اکیلا پن، تنہائی، رسوائی برداشت کر سکوں گی؟ میں نے اپنی قید کے سات سال بہت جانفشانی اور خاموشی سے کاٹے ہیں کہ اگر اب بھی نہ بولتی تو شاید ساری عمر گونگی رہ جاتی...... جب ہم ایک دوسرے کے عشق میں نئے، نئے گرفتار ہوئے تھے کیا سہانے، مسلسل بول چال، ہنسنے کھیلنے کے دن تھے...... تم کو ہمیشہ امریکا جا کر بس رہنے کا شوق تھا۔ اور وہاں جا کر اچھا کمانے، اچھا کھانے، تعطیلات پاکستان میں منانے، خود کو منوانے...... سب کے سامنے سرخرو ہونے جیسے تمہارے ہر خواب پر میں مسکرا کر رہ جاتی...... کبھی کبھی دل ہوتا بھی کہ تم سے پوچھوں کہ ان سب میں، میں کہاں ہوں...... اچھا ہوتا کہ اسی وقت پوچھ لیتی کیونکہ بعد میں مجھ پر تمہارے لیے اپنے ہونے اور نہ ہونے کے ایک برابر کا سا جو احساس ہوا تھا وہ بڑا جان لیوا تھا۔ میرے منہ سے سسکی نکل گئی...... چلو یوں بھی ٹھیک ہے، یوں بھی سب اچھا تھا اگر تم مجھے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جاتے...... مگر کیسے خود کو سمجھاؤں کہ تم مجھے صرف نظر انداز کر کے تو آگے نہیں بڑھے...... تم نے مجھے باقاعدہ سیڑھی بنایا...... میری محبت، میری وفا، میری سادگی کا مذاق اڑایا، میں کہتی ہوں کہ کیا ضروری تھا کہ تمہاری عقابی نظر پورے خاندان کی لڑکیوں کو چھوڑ کر مجھ پر ہی پڑتی؟ کیا ضروری تھا کہ مجھے تم پر یقین بھی آ جاتا......؟ کیا ضروری ہی تھا کہ تم مجھے خواب دکھاتے۔ وہ خواب جو صرف تمہارے تھے، میں، میں تو بس ایک سیڑھی تھی...... اور یہ وہی سیڑھی ہے جو اوپر کی طرف جاتی ہے تو نیچے بھی یہی اترتی ہے۔ مگر معافی چاہتی ہوں، میں ایک سیڑھی تو ہوں، تمہاری ترقی میں ساتھی بن کر تمہیں اوپر تو پہنچایا ہے مگر تمہارے زوال میں تم کو نیچے واپس زمین تک پہنچانے کا سہرا میں اپنے سر ہرگز نہیں لوں گی۔

جب تم نے پہلی بار مجھ سے مدد طلب کی تھی اس وقت تک تو مجھے تم پر پورا، پورا اعتبار تھا...... اس وقت تک تو میں تم پر سب کچھ لٹانے سے دریغ نہیں کرتی

تھی...... سب کچھ لٹا کر ہی تو ہوش میں آئی...... تم نے مجھے بتایا کہ کس طرح تمہاری ایک ایجنٹ سے بات ہوئی ہے اور وہ تمہیں امریکا کا ویزا دلوانے پر راضی ہے...... بس کچھ اتنی رقم چاہیے تھی جو تمہاری بیوہ ماں سے حاصل ہونے کی تمہیں کوئی امید نہیں تھی...... تم روز، روز میرے پاس آنے لگے...... ہر دوپہر میرے گھر پر گزارنے لگے...... تمہاری بے چینی، تمہاری لگن، تمہارا نشہ ہم سب نے محسوس کرلیا تھا...... بابا جانی ملک سے باہر ہوکر بھی تم کو کئی بار سمجھا چکے تھے کہ اگرچہ تم ان کی سگی بڑی بہن کے بیٹے ہو مگر پہلے پڑھائی مکمل کرو اور اپنا راستہ خود بناؤ...... صرف امریکا میں کیا رکھا ہے لوگ یہاں بھی تو جیتے ہیں...... بیوہ ماں کو بڑھاپے میں چھوڑ جانا کہاں کی عقلمندی کہاں کی ترقی ہے۔ مگر تمہاری بے چینی کسی طور کم نہ ہوتی تھی...... میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی تھی...... عمر کے لحاظ سے تم میرے سب سے بڑے بھائی سے صرف دو سال چھوٹے تھے...... ہم دونوں کی عمروں میں ہی نہیں عقل و شعور میں بھی واضح فرق تھا...... اور مجھے یہ بات بہت بعد میں اپنی قیدِ تنہائی کے دوران سمجھ آئی تھی کہ اس میں بھی تمہاری چال تھی...... ایک میں ہی بے وقوف پھنس سکتی تھی...... میری بڑی بہنیں تو تم کو اچھی طرح سے سمجھ چکی تھیں مگر بابا جانی کی تم سے انسیت کے باعث تمہیں ہمارے گھر میں آنے جانے کی کھلی چھٹی ملی ہوئی تھی...... خاندان بھر میں ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھے جانے پر اب رشتے داروں نے بھی ہمیں ایسے ہی قبول کرلیا تھا۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ میں نے لندن رائل یونیورسٹی میں بیچلر آف کمپیوٹر سائنس کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تعلیمی ویزے کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا...... تم کئی دن تک ناراض رہے۔

''تو میں یہیں مرتا رہوں اور تم چلی جاؤ گی......'' غصے سے مجھے آنکھیں دکھاتے۔ ''بس منع کردو...... صاف کہہ دو اپنے بابا جانی سے کہ جہاں میں جاؤں گا وہیں تم جاؤ گی...... تم فکر ہی کیوں کرتی ہو...... ہم امریکا جائیں گے اور خوب کمائیں گے۔

میں مسکراتی رہی اور میرے یہ پوچھنے پر کہ آخر کار...... تم پڑھائی کی طرف توجہ کیوں نہیں دیتے اس طرح تم بھی کسی امریکا کی یونیورسٹی میں اپلائی کردو تو بابا جانی خوشی سے تم کو بھیجیں گے...... تم آگ بگولہ ہوجاتے، بل کھاتے جو واپس جاتے تو کئی دن تک نہیں آتے تھے۔

مجھے کھانسی کے جان لیوا قسم کے دورے پڑنے لگے تھے...... میں کھانس، کھانس کر ادھ مری ہوجاتی...... بستر پر گر کر خود سے بیگانی ہوجاتی......

سارے گھر والے اسے میرا ناٹک سمجھ کر مذاق اڑاتے، امی مجھے غور سے دیکھا کرتیں...... مگر پھر بھی خاموش رہتیں...... اور اس دن ویزا انٹرویو کے لیے مجھے دیا گیا وقت' میری کھانسی کی نذر ہو کر آہستہ آہستہ میری مٹھی سے پھسل رہا تھا...... میں بستر پر پڑی کئی بار خود کو منا چکی تھی کہ بس اب کی بار جو کھانسی آرہی ہے اس کے بعد اٹھ کھڑی ہوں گی...... میرے سرہانے ہی میرا انٹرویو کال لیٹر پڑا تھا اور ایک نوٹوں سے بھرا لفافہ...... امی تمہیں اس وقت اچانک دیکھ کر کھل اٹھیں...... گھر میں کوئی اور نہیں تھا جو گاڑی چلا کر مجھے ایمبیسی لے جاتا...... اور امی سمجھ رہی تھیں کہ میں اس قابل نہیں کہ خود گاڑی چلا کر چلی جاؤں...... امی نے جلدی، جلدی تم کو ہدایات دینی شروع کر دیں۔

''دیکھو بیٹا...... پہلے اس آفس جانا...... یہ ایڈریس لکھا ہے، یہاں سے اس کو اس کا جو میڈیکل ہوا ہے اس کی رپورٹ لینی ہے۔ پھر تم اسے لے کر یونیورسٹی کے لوکل آفس جانا جہاں یہ اپنی سال بھر کی فیس جمع کروا کر رسید لے گی...... یہ دونوں کاغذ حفاظت سے اس کے ساتھ ہی ایمبیسی میں جانے ضروری ہیں۔ بس پھر پلیز بیٹا تم اس کو انٹرویو دلوا کر واپس لے آنا...... اس کی آج طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے...... بس ذرا خیال رکھنا۔''

امی تم کو ہدایات دیتی رہیں اور ساتھ کے ساتھ مجھے کسی نہ کسی طرح گاڑی میں بٹھا گئی تھیں...... اب یاد کرتی ہوں وہ دائرے میں گھومتا ہوا سا دن...... غبارِ وقت...... بادل، وہ کیا تھا جو میرے حواس پر سوار تھا...... تمہاری وہ گھورتی ہوئی میرا جائزہ لیتی ہوئی آنکھیں، تم نے شاید راستے میں کئی بار مجھے پکارا بھی تھا...... صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ میں ہوش میں بھی ہوں یا نہیں...... مگر میڈیکل سرٹیفکیٹ لینے تک تو میں ہوش میں ہی تھی...... خود ہی تو گاڑی سے نکل کر لائن میں لگ کر اپنا میڈیکل سرٹیفکیٹ ایک مہر لگے لفافے میں قید لے کر ڈگمگاتی گاڑی تک آئی تھی...... اس کے بعد شاید مجھے پھر سے کھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا اور پھر تم اس بادل، غبار میں کہیں چھپ گئے...... میں نے تمہاری آواز کئی بار سنی جیسے تم مجھے آواز صرف یہ دیکھنے کے لیے دے رہے ہو کہ میں ڈراما تو نہیں کر رہی...... تمہارے آواز دینے پر ہوش میں تو نہیں آگئی۔

مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال میں تھی...... امی کی آنکھیں رو، رو کر سوج چکی تھیں...... میں علاج کے بعد گھر آئی تو معلوم ہوا کہ گاڑی ہماری گلی کے باہر چھوڑ کر تم کہیں بغیر بتائے چلے گئے تھے۔ میں گاڑی میں کئی گھنٹے اکیلی بے ہوش پڑی رہی اور پھر کسی محلے والے نے مجھے یا ہماری گاڑی کو پہچان کر گھر پر اطلاع دی تھی...... میرے میڈیکل سرٹیفکیٹ کے ساتھ، ساتھ والا پیسوں والا لفافہ بھی غائب تھا...... امی نے بابا جانی کو فون کر کے بتایا...... تمہاری گم شدگی پر بابا جانی نے امی کو خاموش رہنے کا کہا...... ان کا خیال تھا کہ تم ایسا کچھ کر ہی نہیں سکتے...... آخر کو ان کی بڑی بہن کے بیٹے ہو...... بابا جانی تم پر ایسا اعتماد کرتے تھے...... ہمارے گھر میں خاموشی چھا گئی۔ میں بھی اپنی بیماری میں ایسا گم تھی کہ مجھے کئی مہینوں تک کسی کے بارے میں بھی سوچنے کا موقع نہیں مل سکا تھا...... اور پھر ہمیں معلوم ہوا کہ تم امریکا روانہ ہو چکے ہو...... جو امی کو خدشہ تھا وہ صحیح ثابت ہونے پر بھی کوئی بھی خوش نہیں تھا...... پورے خاندان میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ امی کے پاس آنے والے رشتے داروں کا ایک ہی پسندیدہ موضوع بن گیا تھا...... میرا اور تمہارا...... تو اس کا اب کیا بنے گا...... تم ایسے گئے کہ پھر چار سال تک تمہارا کچھ پتا نہ چل سکا...... بڑی پھوپی نے بابا جانی کو بہت دلاسے دیے تھے کہ تم اتنے بے وفا نہیں ہو سکتے...... مجھ سے الگ ہو کر تمہارا کوئی وجود نہیں...... مگر یہ سب دلاسے ہی تھے...... چار سال بعد ہی ایک رشتے دار نے ہمیں اطلاع دی کہ تم وہاں شادی کر کے مزے میں ہو...... یوں تم تو اسٹیج خالی کر کے چلے گئے اور میں بیچاری اس تمام عرصے میں لوگوں کی چبھتی ہوئی طنزیہ نظر اور کھنکناتی زبان سے نکلے طعنے ہی سمیٹتی رہی ہوں...... کیا

یہ زیادتی نہیں۔

میری طبیعت کی ناسازی نے مجھے، گھر اور اس کے آرام سے باندھ دیا تھا...... میں خود اکیلے کہیں بھی جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... ٹی بی ایسی ہی کچھ لیچڑ بیماری ہے، ایک بار لگ جائے تو ہر دو ڈھائی سال بعد پلٹ کر نئی قوت سے حملہ آور ہوتی ہے...... میں نے ان سات سالوں میں اپنی بیماری کے ساتھ، ساتھ تمہاری بے وفائی کو بھی بہت بہادری اور خاموشی سے نمٹایا...... کیا ہے تمہارے پاس جواز، کوئی حیلہ؟ کوئی بہانہ؟ اب جو تم اچانک پاکستان واپس آگئے اور تمام رشتے داروں سے ایسے مل رہے تھے... جیسے سب نے تم کو اپنی محبت اور خوشی کے زیرِ سایہ ہی تو امریکا روانہ کیا تھا...... تم ایک بار پھر دھوکا دینے آئے ہو...... ہمارے خاندان نے جس طرح تمہاری بے رخی اور خود غرضی کو سہا ہے کیا اب ہم سے کسی بھی قسم کی اچھائی کی ذرا برابر بھی کہیں امید ہو سکتی ہے...... مگر تم نے پھر مجھے ہی سیڑھی بنایا...... پھر سے میرے راستے میرے خاندان میں گھسنے کی کوشش کی...... چلو یوں بھی ٹھیک تھا۔ میں نے تمہیں عرصہ ہوا معاف کر دیا...... امی اور بابا جانی ابھی تک تم کو بگڑا ہوا ''انوکھا لاڈلا'' ہی سمجھتے ہیں، تم میں صبر نہیں ہے، اسی لیے تم کو صبر آزما راستے سے بچانے کے لیے میں آج تم سے ملنے یہاں آئی تھی...... تمہاری بیوی کے قصے سن کر میں حیران تھی...... کس طرح اس نے تم کو قابو کیا، تمہارے بقول اس نے تم کو امریکا میں پاؤں جمانے میں مدد کی تھی اور اب تم اس کے اتنے مقروض ہو چکے ہو کہ چاہو بھی تو اس کو الگ نہیں کر سکتے...... تمہیں ہمارے رشتے کے یوں ٹوٹ جانے پر افسوس ہے...... تم خود کو اب تک معاف نہیں کر سکے ہو اور اب بابا جانی اور امی سے مل کر ان سے معافی مانگنا چاہتے ہو...... یہ ساری باتیں مجھے مسرور تو نہیں مگر ہاں محسور کر چکی تھیں...... میں سر ہلا، ہلا کر تم کو یقین دلانا چاہتی تھی کہ میں تمہارا کیس ضرور امی اور بابا جانی کے سامنے رکھوں گی کہ اچانک، تمہاری بیوی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی...... اس نے تم سے بے دریغ تیز، تیز آواز میں لڑنا شروع کر دیا...... اور تم دونوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ ایک بار پھر تم مجھے سیڑھی بنا رہے تھے۔ تم دونوں کو ایک مکان خریدنے کے لیے بہت سا سرمایہ درکار تھا اور ...... تمہاری بیوی نہیں جانتی تھی کہ میں ہی وہ سیڑھی ہوں جس پر چڑھ کر تم پیڑ سے لٹکے ہوئے روپے توڑ سکو گے...... وہ سمجھی تھی کہ میں تمہاری کوئی معمولی سی دوست ہوں جس کے ساتھ تم اپنا وقت خراب کر رہے ہو...... اس کے بقول اس وقت تو تم کو میرے گھر پر ہونا چاہیے تھا۔

مجھے شدید قسم کی متلی ہونے لگی جو میرے دورے کے شروع میں اکثر ہوتی تھی...... میں تم دونوں کی لڑائی سے گھبرا گئی اور عین اسی لمحے مجھے کھانسی کا شدید دورہ پڑنے لگا...... تم دونوں اب چپ، حیران مجھے تکلیف سے دہرا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے...... تمہاری بیوی نے تم سے ہمدردی سے پوچھا۔

''یہ تمہاری وہی سابقہ محبوبہ ہے کیا جس کو ٹی بی ہو گئی تھی جس کے باعث تم دکھ اور مجبوری میں اسے چھوڑ کر امریکا آگئے تھے کہ ٹی بی کے مریضوں کو امریکا کا ویزا نہیں ملتا اور تم اسے مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے...... تم نے اس کی میڈیکل رپورٹ بھی مجھے دکھائی تھی...... اور شاید ایک اسی دکھ نے ہم دونوں کو قریب کر دیا تھا...... کیا نام تھا...... اس کا؟''

اور کھانستے، کھانستے جیسے مجھے کسی غیبی طاقت نے پکڑ کر سیدھا کر دیا تھا...... میں جو تم سے قد میں بہت چھوٹی تھی اس ایک لمحے تم سے بھی قد میں بڑھ گئی جیسے کسی سیڑھی پر چڑھ گئی ہوں۔ اور پھر وہ زوردار تھپڑ...... میں بہت سے لوگوں کی حیران نظروں میں کھڑی کھڑی بے اختیار ہنسنے لگی...... جو سیڑھی آپ کو اوپر لے کر جاتی ہے وہی سیڑھی نیچے بھی...... اور کبھی، کبھی نیچے جاتے ہوئے واپسی کے سفر پر آپ کو ایک عدد زوردار قسم کا تھپڑ بھی مار سکتی ہے۔



منی ناول

دوسرا حصہ

# ہم کو محبت نے بدنام کیا

سیما رضا ردا

وانیہ اعزاز نے جھنجلا کر موبائل فون بیڈ پر اچھال دیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ روزی اس کا فون اٹینڈ نہیں کر رہی تھی اور اب اس نے موبائل ہی آف کر دیا تھا جس پر وانیہ اعزاز کو تشویش ہونے کے ساتھ غصہ بھی آرہا تھا۔ وہ رات بھر سوئی نہیں تھی اور نیند بھی شاید آنکھوں سے روٹھ بیٹھی تھی جو ہزار جتن کرنے کے باوجود آ کر نہیں دی تھی، ایسے میں روزی ہی تھی جو اس کی کیفیت جان کر اس کا ٹریٹمنٹ کیا کرتی مگر اس وقت روزی نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ اس پر رات بھر نیند نہ آنے کی وجہ سے بے چینی، تھکن اور کوفت طاری ہو چکی تھی۔ نیند کی ٹیبلیٹ بھی اس پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ وہ جھنجلا کر ڈریسنگ ٹیبل پر سے چیزیں زمین پر پھینکنے لگی۔ اعزاز شاہ نے کسمسا کر کروٹ بدلتے ہوئے ذرا سی آنکھ کھول کر وانیہ کو دیکھا



اس کے بعد پھر سو گئے۔ وانیہ کو ان کی یہ حرکت مزید غصہ دلا گئی تھی۔ اب وہ فرش پر پڑی چیزیں اٹھا کر انہیں کمرے میں اِدھر اُدھر پھینکنے لگی۔ جس سے اعزاز کی نیند میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ اعزاز شاہ کچھ دیر تو برداشت کرتے رہے پھر جھنجلا کر اٹھ بیٹھے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے۔ نہ خود سکون سے سوتی ہو نہ مجھے سونے دیتی ہو۔''

''میرا سکون تو تم برباد کر چکے ہو اور چاہتے ہو میں تمہیں سکون دوں......؟ تو یہ تمہاری بھول ہے اعزاز شاہ......'' وہ غصے سے چیخی تھی اور ایسا پہلی بار نہیں تھا، وہ شادی کی اولین رات سے لے کر اب تک ہر بات کا قصور وار اعزاز شاہ کو ہی ٹھہراتی آئی تھی اور اب بھی اس نے یہ ہی کیا تھا جبکہ سکون تو کسی اور نے چرا لیا تھا۔

''مجھے الزام دینے سے پہلے اپنے آپ کو دیکھو وانیہ بیگم۔'' اعزاز شاہ اسی کے انداز میں بولے۔ ''زندگی تو میری برباد ہو گئی ہے تم سے شادی کر کے دن کو چین ہے نہ رات کو سکون......''

''اور ہونا بھی نہیں چاہیے اعزاز شاہ...... کیونکہ مجھے تمہیں اذیت دے کر مزہ آتا ہے اور میری ذات کو تسکین اس وقت ملے گی جس وقت تم......'' وہ قصداً بات ادھوری چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

کمرے کا دروازہ بہت زوردار آواز کے ساتھ بند ہوا تھا۔ اعزاز شاہ کی نیند اڑنے کے ساتھ ذہن پر بھی بوجھ آ گیا تھا۔ اعزاز شاہ نے گھر کے کشیدہ حالات کے باوجود کالج و یونیورسٹی لائف کو بہت انجوائے کیا تھا۔ وہ محفل کی جان تھے اور زندگی جیسے ان پر فدا تھی۔ دوستوں کے ساتھ پکنک پر جانا، ہوٹلنگ کرنا یہ صرف ان کا شوق ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی تھی کیونکہ انہیں تنہائی سے خوف نہیں چڑ تھی۔ اس لیے اعزاز شاہ نے پڑھائی کے ساتھ، ساتھ دیگر ایکٹیوٹیز میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ انہوں نے اپنے دل کو بھی آزاد رکھا تھا لیکن کبھی کوئی لڑکی سیریس نہیں ہوئی تو کبھی کوئی ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔

اعزاز شاہ اب بھی زندگی کو جینا چاہتے تھے مگر انہیں دنیا میں ہر رشتہ کھوکھلا اور خود پسندی کا لگتا......اس لیے اعزاز شاہ نے دوستوں سے لے کر گھر کے ہر فرد سے خود کو الگ کر لیا تھا، انہیں تلاش تھی تو ایک مخلص دوست کی جو محض اُن کی الجھی ہوئی زندگی کو سلجھانے کی کوشش نہ کرے خود اعزاز شاہ جیسا ہرگز نہ ہو مگر ان کی ذات سے جڑا ہو۔ وہ اعزاز شاہ سے بات بے بات الجھے ضرور مگر پھر بھی ان کے ساتھ مخلص ہو۔

وہ واش روم سے فریش ہو کر نکلے تو موبائل فون بج رہا تھا۔ اعزاز شاہ نے بیڈ کارنر پر رکھا فون اٹھا کر اسکرین دیکھتے ہوئے یس کا بٹن دبا کر کان سے لگا لیا تو دوسری طرف سے کھنکتی ہوئی آواز کے ساتھ شکوہ کیا گیا۔

''بہت دیر کر دی فون اٹینڈ کرتے میں۔''

''ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آپ فون کر رہی ہیں، ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔'' اعزاز شاہ کا لہجہ کچھ دیر پہلے پیش آنے والے حالات سے بالکل مختلف تھا۔

''پھر آپ آ رہے ہیں ناں......اسی جگہ جو کل ہم نے طے کی تھی۔''

''جی بالکل......'' وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''میں آپ سے ملنے کی تیاری میں ہی لگا ہوا ہوں۔''

''ارے میں تو سمجھی تھی کہ میں ہی بے صبری ہوں مگر آپ تو......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر خوامخواہ ہی ہنسی تھی اور اعزاز شاہ اس کی ہنسی کے جلترنگ میں کھو گئے۔ وہ دل پھینک تو تھے ہی لیکن ساتھ ہی حسن پرست بھی بہت تھے۔ ان باتوں کے علاوہ اعزاز شاہ ہر لڑکی کو اپنے معیار کے ترازو میں تولتے، وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ دوستی کس حد تک آگے بڑھ سکتی ہے اور ابھی تک وہ ہر لڑکی سے پہلی اور آخری ملاقات کر کے ہی لوٹتے تھے لیکن نہ جانے کیوں اس لڑکی سے بات کر کے انہیں اپنے اندر کا سناٹا ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اعزاز شاہ کو لگ رہا تھا جیسے یہ لڑکی ہر لحاظ سے ان کے

معیار پر پوری اترے گی اس لیے کافی دیر اسے فون پر ہی گفتگو میں الجھائے رکھا تھا۔

وانیہ نے ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھولا ایک نظر اعزاز شاہ کو دیکھا پھر فرش پر بکھری چیزوں کی طرف دیکھ کر نخوت سے سر جھٹک کر واش روم میں بند ہو گئی۔

اعزاز شاہ نے اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ وہ تو گفتگو میں اس قدر مگن تھے کہ انہوں نے کمرے میں اس کا آنا محسوس ہی نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے ہی گفتگو کا اختتام کر کے اپنی جگہ سے اٹھے ویسے ہی وانیہ واش روم سے کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اعزاز شاہ نے سرسری سی نظر اسے دیکھا اور موبائل فون اور گاڑی کی چابی اٹھا کر کمرے سے نکلنے ہی لگے تھے کہ وانیہ کی آواز نے اُن کے بڑھتے ہوئے قدم روک لیے تھے۔

''کسی ملازم سے کہہ کر روم کی صفائی کروا دو۔''

''تم خود کیوں نہیں کر دیتیں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اعزاز شاہ کی زبان سے جملہ پھسل گیا تھا۔ وانیہ نے خونخوار نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس وقت اعزاز شاہ کا حشر بگاڑ دے۔ اسے ویسے ہی رات بھر نیند نہیں آئی تھی جس کی وجہ سے اسے ویسے ہی غصہ تھا اور اعزاز شاہ کے اس جملے نے مزید اس کے غصے کو ہوا دی تھی۔

''اعزاز شاہ تم......'' وانیہ نے اس قدر ہی کہا تھا کہ اچانک موبائل فون بجنے سے اس کی ساری توجہ اسی طرف مرکوز ہو گئی اور روزی کا نمبر موبائل فون کی اسکرین پر دیکھتے ہی اس کا سارا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اعزاز شاہ بہت خاموشی سے کمرے سے نکل گئے۔

☆☆☆

ریبال کے لیے تشمیرہ کی غیر موجودگی کافی پریشان کن بات تھی۔ کیونکہ تشمیرہ بلاوجہ یونیورسٹی سے غیر حاضر نہیں ہوتی تھی اس لیے سر قاصم کی کلاس لینے کے بعد ریبال نے باہر آ کر تشمیرہ کو کال ملائی تو دوسری طرف مسلسل بیل ہونے پر جب اس نے فون ریسیو نہیں کیا تو ریبال کی تشویش بڑھ گئی۔ وہ اضطرابی کیفیت میں کھڑا یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کہیں تشمیرہ کے ساتھ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آ گیا۔ ورنہ وہ کال ریسیو ضرور کرتی تھی۔ تشمیرہ سے رابطے کے لیے اس کے پاس صرف یہی موبائل نمبر موجود تھا ورنہ اس وقت تشمیرہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے نہ جانے کس، کس کو فون کر چکا ہوتا۔ اس وقت لائبریری جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے وہ اپنی بائیک کی طرف بڑھنے کے ساتھ مسلسل اس کا نمبر ٹرائی کر رہا تھا اور دوسری جانب مسلسل بیل ہو رہی تھی۔ ریبال نے بائیک کے پاس پہنچ کر موبائل پینٹ کی جیب میں رکھا کہ اچانک فون بجنے لگا اس نے اسکرین پر نام دیکھے بغیر کال ریسیو کی۔

''کہاں تھیں تشمیرہ کب سے......''

''ریبال......'' دوسری طرف سے پکارا گیا تو وہ چونکنے کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

''امی کہہ رہی ہیں رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا۔'' عروج نے کہا تو وہ اچھا کہہ کر رہ گیا۔

''خالہ کو بھی لے کر آیئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ریبال نے کہہ کر لائن کاٹ دی تھی۔ ریبال نے کتنی بار اسے منع کیا تھا کہ وہ اسے فون نہیں کیا کرے لیکن نہ جانے وہ کس مٹی سے بنی ہوئی تھی جو اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا اور اب تو جب سے منگنی ہوئی تھی وہ دن میں ایک بار ضرور فون کرتی تھی کبھی خالہ کی طبیعت معلوم کرنے کی غرض سے تو کبھی کسی غیر معمولی کام کے لیے فون کرتی تھی اور اب ریبال نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ جبکہ اس کے فون پر اندر ہی اندر جھنجلاتا ضرور تھا لیکن اس پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ وہ صرف اسے عاجز کرنے کے لیے ایسا کرتی ہے اور ریبال اس کی عادت جانتا تھا کہ وہ دوسروں کو تنگ کر کے مزہ لیا کرتی ہے خالہ زینب کے دونوں بچے ایسے ہی تھے۔ ضد، ہٹ دھرمی تو ان کی گھٹی میں شامل تھی نہ جانے کیوں

خالہ اور خالو نے انہیں اتنی ڈھیل دے رکھی تھی کہ عروج اور احمر کے دل میں جو آتا وہ وہی کرتے اور اپنے والدین کو تو وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔

اور اب تو عروج کی ریبال سے منگنی بھی ہو گئی تھی، اس رشتے کا ہی خیال کر کے وہ اپنے آپ کو سدھار لیتی مگر نہیں......! وہ تو مزید بگڑ کر خود کو ریبال کے سامنے پیش کر رہی تھی۔ ریبال کے سامنے بغیر دوپٹے آ کر کھڑے ہو جانا...... بات بے بات اس پر طنز کرنا وغیرہ وغیرہ...... ریبال بھی شاید اپنی امی جی کی وجہ سے چپ تھا ورنہ کب کا اس رشتے سے خود کو آزاد کر چکا ہوتا۔ اب بھی وہ خالہ زینب کے گھر کے ہر فرد پر جھنجلاتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا کہ اچانک امی جی پر نظر پڑی تو صحن میں بائیک کھڑی کرتا ہوا سیدھا وہ ان کے پاس کچن میں چلا آیا۔ امی جی اس وقت سالن بھون رہی تھیں۔

''السلام علیکم......'' ریبال نے سلام کیا تو امی جی چونکنے کے ساتھ سلام کا جواب دیتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

''تم اتنی جلدی کیسے آ گئے؟'' وہ اس سے پوچھ بیٹھیں۔

''جانے کے دن جیسے، جیسے قریب آ رہے ہیں، میں چاہتا ہوں زیادہ سے زیادہ وقت آپ کے ساتھ گزاروں۔'' وہ کہہ کر وہیں اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''کیا پکا رہی ہیں؟''

''جو تمہیں پسند ہے، مٹر قیمہ......''

''ہوں، مجھے تو بھوک لگنے لگی ہے۔'' ریبال نے کہا اور اس کا موبائل فون بجنے لگا تھا۔ اس نے پینٹ کی جیب سے فون نکال کر پہلے اسکرین پر نام دیکھا اس کے بعد کال ریسیو کر لی۔

''کہاں ہو تشمیرہ اور آج یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں؟'' ریبال نے اپنے لہجے کی بے قراری و پریشانی چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ امی جی نے ایک نظر میں اس کی کیفیت جان لی تھی۔

''میں نے کتنے فون کیے اور جواب نہ ملنے پر مجھے تشویش ہو رہی تھی۔ تم ٹھیک تو ہو ناں......''

''ہاں ریبال میں ٹھیک ہوں۔ اصل میں تائی جی کا بھتیجا آیا ہوا ہے اس لیے نہیں آ سکی۔ ویسے کوئی خاص بات تو نہیں۔''

''یہ خاص بات کم ہے کہ آج تشمیرہ بانو نہیں آئی۔ وہ لڑکی جو کبھی غیر حاضر نہیں رہی۔'' وہ کہہ کر ہنسا تھا۔ ریبال اس سے فون پر بات کرتا ہوا صحن میں لگے آم کے درخت کے نیچے جا بیٹھا تھا۔ امی جی کچن کی کھڑکی سے ریبال کے چہرے پر بکھرتے ہوئے رنگ دیکھ رہی تھیں۔

☆☆☆

تشمیرہ نے ریبال سے بات کرنے کے بعد موبائل فون بیڈ پر رکھا اور خود کمرے سے نکل کر باہر آئی تو غیر معمولی خاموشی پر وہ ٹھٹکی تھی گو کہ اس گھر میں کوئی بہت زیادہ افراد نہیں تھے لیکن پھر بھی تائی جی کی چہل پہل اور بڑبڑاہٹ پورے گھر میں سنائی دیتی تھی۔ اس وقت نہ جانے وہ کہاں تھیں۔ اس کے دل میں عجیب سے خوف نے دستک دینا شروع کر دی کیونکہ گھر میں جوان لڑکا بھی موجود تھا جس کے انداز و حرکات تشمیرہ کو ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ وہ خوف سے دھڑکتے دل کے ساتھ کچن میں آئی تھی اور فریج سے بوتل نکال کر واپس کمرے میں جانا چاہتی تھی کہ اچانک فاطر کچن کے دروازے پر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

''ایک کپ چائے ملے گی؟'' اس کا دل چاہا کہہ دے نہیں اور اسے دھکیل کر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں بند ہو جائے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اثبات میں سر ہلا کر جلدی سے ایک برتن میں چائے کا پانی رکھ کر چولہا جلا کر پانی کے کھولنے کا انتظار کرنے لگی۔

فاطر اس سے بات کرنے کے لیے موضوع تلاش کرنے لگا وہ اتنی جلدی اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ تشمیرہ بانو واحد لڑکی تھی جس سے بات کرنے کے لیے فاطر کمال کو مشکل پیش

آ رہی تھی۔

"گھر میں اتنی خاموشی چھائی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔"

"تائی جی شاید سو رہی ہیں اور ویسے بھی تین افراد ہیں گھر میں خاموشی کا راج تو ہو گا ہی......" تشمیرہ کپ میں دودھ اور چینی ڈالنے کے ساتھ بولی۔

"تمہیں گھبراہٹ نہیں ہوتی اس ماحول سے؟" فاطر کچھ دیر خاموش رہا پھر کہنے لگا۔

"گھبراہٹ کیسی، بچپن سے اس ماحول میں رہ رہی ہوں اب تو عادت ہو گئی ہے۔"

"مجھے تو بہت وحشت ہو رہی ہے۔" تشمیرہ نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے سے وحشت صاف ظاہر تھی۔ وہ شاید خاموشی کا عادی نہیں تھا۔ تشمیرہ چائے کپ میں ڈالنے لگی... پھر چمچ چلاتے ہوئے کپ فاطر کی طرف بڑھایا تو اس نے کپ اس کے ہاتھ سے لینے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام لیا اور شیطانی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"ابھی کہیں مت جانا۔"

"کیوں......؟" تشمیرہ بانو نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بہت سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ اس وقت کمزور پڑ کر اس کی ہوس کا نشانہ بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کی یہی ادا فاطر کمال کا دل چھو گئی تھی۔ اس لیے بجائے برا ماننے کے مسکرا کر بولا۔

"مجھے یہ تنہائی مار ڈالے گی۔"

"تنہائی سے بزدل مرتے ہیں۔" وہ اپنے جملے کی بازگشت میں فاطر کو دھکیل کر کچن سے نکل کر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس کی سانسیں ناہموار ہو رہی تھیں۔ وہ دروازہ بند کرتی اپنے بیڈ پر آ کر ڈھے گئی۔ اسے فاطر کمال سے خوف آنے کے ساتھ اس پر غصہ بھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس شخص سے کس طرح چھٹکارا حاصل کرے ابھی تو اس کی ہمت صرف ہاتھ پکڑنے کی ہوئی تھی اگر تشمیرہ بانو اس سے خائف ہو کر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلی آتی تو نہ جانے بعد میں کیا کچھ کر گزرتا لیکن اب بھی تشمیرہ کو اس سے ڈر تھا۔ اسی لیے وہ آگے آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔ وہ کوئی کمزور بزدل لڑکی نہیں تھی لیکن زندگی میں پہلی بار اسے اس طرح کی سچویشن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جہاں اسے اپنی ہی چار دیواری میں اپنی عزت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ اور ابھی وہ اس حوالے سے تایا جی سے بھی بات نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو اور فاطر کمال بھی ابھی حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ مگر تشمیرہ بانو کے ذہن میں بجتی خطرے کی گھنٹی آگے بہت کچھ ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

فاطر کمال کو تشمیرہ کا جملہ اور اس کا انداز پسند آئے تھے کیونکہ وہ اب تک جتنی بھی لڑکیوں سے ملا تھا وہ بہ آسانی اس کے دام میں پھنس گئی تھیں۔ مردانہ وجاہت کی کشش کے ساتھ، ساتھ پیسے کی کمی نہ تھی۔ لیکن تشمیرہ بانو ان دونوں سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی زندگی میں ایسی ہی لڑکی تو چاہتا تھا لیکن اس وقت اس کے سر پر شیطان سوار تھا اس لیے وہ کسی بھی طرح اس کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ گھر میں بالکل خاموشی ہونے کے ساتھ کسی اور وجود کا احساس بھی نہیں تھا۔ اور یہ موقع فاطر کمال کو بہتر ہی لگا کیونکہ اس وقت وہ تشمیرہ کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا، اس لیے وہ چائے کا کپ لیے تشمیرہ کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا، اس کے چہرے پر عجیب مکروہ مسکراہٹ تھی۔ اس کے کمرے کے پاس پہنچ کر فاطر نے دو تین بار دستک دی تھی اور اندر تشمیرہ کچھ انہونی جان کر خاموش بیٹھی رہی کیونکہ تایا، تائی کی دستک کا یہ انداز نہ تھا جبکہ اس کا دل خوف سے حلق میں آ کر اٹک گیا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود بھی چیخ کر تائی جی کو آواز نہیں دے پائی تھی اور دوسری طرف فاطر کمال اب دروازے کا ہینڈل گھما رہا تھا لیکن اندر سے دروازے کی کنڈی لگی ہونے کی وجہ

سے اسے مایوسی ہوئی تھی اور وہ کچھ دیر اپنی سی کوشش کرنے کے بعد واپس لوٹ گیا تھا...... لیکن مایوس نہیں ہوا تھا کیونکہ ابھی دوپہر کا ڈھلنا اور شام کا آنا باقی تھا کہ جب فاطر کمال اور کشمیرہ بانو کو اس گھر میں کچھ وقت اکیلے گزارنا تھا۔

☆☆☆

''میں تو حیران ہوں مس ریحانہ کہ مجھے کہیں بھی اس کی آواز سے اس کی عمر پر شک نہیں ہوا۔'' اعزاز شاہ آفس میں بیٹھے ریحانہ کے ساتھ آج والی ڈیٹ کے بارے میں بات کرتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ کل جس لڑکی سے اعزاز شاہ نے فون پر بات کی تھی آج اس کے ساتھ ملاقات کرنے کے بعد وہ ہمیشہ کی طرح آفس آنے کے بعد ریحانہ کو اپنے روم میں بلا کر اسے ساری رُوداد سنا رہے تھے اور ریحانہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت شوق سے سن رہی تھی۔

''سر تقریباً کیا عمر ہوگی اس کی؟''

''بس زندگی کے اختتام پر ہی ہوگی۔'' اعزاز شاہ کی برجستگی پر ریحانہ ہنستی چلی گئی۔

''پھر آپ نے کھانا کھایا یا ایسے ہی آ گئے؟'' وہ سنبھل کر پوچھنے لگی۔

''ہاں بھئی اخلاق کا اتنا برا بھی نہیں ہوں کہ کسی کو ڈیٹ پر بلاؤں اور پسند نہ آنے پر دیکھ کر واپس آجاؤں۔''

اعزاز شاہ کی ان خامیوں کو نکال کر دیکھا جاتا تو وہ ایک ہیرا انسان تھے۔ اور یہ خامیاں ان میں شادی کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ وہ بھی شاید اس لیے کہ وہ کچھ دن اور زندہ رہنا چاہتے تھے ورنہ پے در پے جو غم انہیں ملے تھے ان سے وہ مشکل ہی چند دن زندہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے نشے کا سہارا لیا اور دل بہلانے کے لیے چند ایک سے ٹیلی فون پر دوستی کر رکھی تھی۔ اس کے علاوہ آفس اسٹاف اور کام میں ان کی دلچسپی اس وقت تک ہوتی جب تک میگزین مارکیٹ میں نہیں آجاتا تھا یعنی شروع کے چند دن وہ بادشاہ کے طور پر گزارتے۔ آفس آنے کا کوئی ٹائم مخصوص نہیں تھا لیکن جانے کا وقت مقرر تھا جہاں چار بجتے وہ آفس سے نکل جاتے چاہے کتنی ہی خاص میٹنگ کیوں نہ ہو وہ معذرت کرکے آفس سے نکل کر یونہی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے اور جہاں سورج غروب ہوا وہاں سے خانے کا رخ کرتے۔

نئی زندگی کی ابتدا میں ہی انہیں باپ اور بیوی سے جو جملے سننے کو ملے تھے اس کی تپش وہ آج بھی اپنے کانوں کے ساتھ دماغ میں بھی محسوس کرتے تھے اور انہی کو بھولنے کے لیے اعزاز شاہ نے اس ممنوع شے کا سہارا لیا تھا۔

''میں نے سوچ لیا ہے مس ریحانہ۔''

''کیا سر......؟''

''یہی کہ اب کسی بھی لڑکی سے بات کرنے سے پہلے اس سے اس کی عمر ضرور پوچھوں گا۔''

''سر پھر بھی آپ کا ہی نقصان ہوگا۔'' ریحانہ نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

''وہ ایسے سر...... کہ خواتین اپنی عمر چھپانے میں ماسٹر ہیں۔'' ریحانہ کی بات پر وہ محظوظ ہو کر ہنسے۔

''یہ تو ہے مس ریحانہ......'' اس سے پہلے کہ اعزاز شاہ کچھ اور کہتے ٹیلی فون کی بیل نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی انہوں نے پہلے ریحانہ کو جانے کا اشارہ کیا پھر فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگالیا۔

''ہیلو......''

''تمہارا موبائل کیوں آف ہے؟'' وانیہ اعزاز نے چھوٹتے ہی پوچھا تو وہ ایک لمحے کو چونکے کیونکہ وہ اسے شاذ و نادر ہی فون کرتی تھی۔

''چارج نہیں ہوگا۔'' وہ سنبھلتے ہوئے بولے۔

''بہر حال میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں کچھ دنوں کے لیے لاہور جارہی ہوں۔'' انہوں نے بھی اپنے گھر میں اس بات کا شکوہ نہیں کیا تھا کہ ان کی شریک حیات ان کے مزاج کے بالکل برعکس

ہے جبکہ گھر کا ہر فرد آئے دن ان دونوں کے جھگڑوں کی آوازیں سنتا رہتا لیکن کبھی کسی نے معاملے کی نوعیت جاننے کی کوشش نہیں کی۔

اعزاز شاہ آنکھیں بند کیے وانیہ کے بارے میں سوچ جارہے تھا کہ اچانک اس نے لاہور جانے کا پروگرام کیوں بنایا۔ گو کہ اس کے تمام پروگرام یونہی اچانک ہی بنا کرتے تھے لیکن انہیں تشویش اس بات کی تھی کہ صبح آفس کے لیے نکلتے ہوئے وہ وانیہ کو غصے میں چھوڑ کر آئے تھے اور ابھی اس کا ردعمل بالکل مختلف تھا اس کی آواز سنتے ہی اعزاز شاہ یہ سمجھے کہ وہ اپنے غصے کی بھڑاس انہیں کچھ سنا کر نکالے گی مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا بلکہ اس کے برعکس وانیہ نے بہت نارمل انداز میں مختصر بات کی اور سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ اعزاز شاہ کو اچانک ہی یاد آیا تھا۔ آج شام ان کا پسندیدہ پروگرام آئے گا اسی لیے وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر آفس سے گھر جانے کے لیے نکل گئے۔

☆☆☆

روزی کی گاڑی لاہور جاتے ہوئے شہر سے باہر نکلتے ہی خراب ہو گئی تھی اور ایسے میں اسے وانیہ اعزاز یاد آئی تھی جس کی مدد سے وہ لاہور پہنچ سکتی تھی۔ اس پر وہ اندر ہی اندر تلملائی تو بہت لیکن مجبوراً اسے وانیہ کو ہی فون کرنا پڑا پہلے تو اس سے معافی مانگی کافی عذر پیش کیے اس کے بعد وانیہ کو اپنے ساتھ لاہور چلنے کی دعوت دینے کے ساتھ، ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا بھی بتا دیا اور اب وہ وانیہ اعزاز کی گاڑی میں بیٹھی لاہور کا سفر طے کر رہی تھی۔

''کتنے دن کا ٹور ہے لاہور کا......؟'' وانیہ نے یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھا۔

''موڈ پر ہے! ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں اور دو دن بھی۔'' روزی کندھے اچکا کر بے نیازی سے بولی۔

''لیکن میں نے تو اعزاز کو دو دن کا کہا ہے۔'' وانیہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

''تو کیا پتھر کی لکیر ہو گئی ہے یہ بات؟'' اس نے پلٹ کر کہا۔

''نہیں، میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔''

''مگر تمہارا انداز بتا رہا ہے۔''

''اچھا......'' وانیہ خواہ مخواہ ہی ہنسی تھی۔ اس کے اندر اعزاز شاہ سے کچھ دور رہنے کا غم نہیں کسی اور سے دور جانے کا احساس ضرور تھا۔ اگرچہ اسے دیکھا ٹریفک سگنل پر ہی تھا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی تھی لیکن ایک شہر میں رہتے ہوئے وہ اس تک ایک ہفتے کے اندر رسائی ضرور حاصل کر لیتی لیکن اب دو دن ضائع ہونے کا دکھ ہو رہا تھا اور ان دنوں میں وہ نہ جانے کیا کچھ کر چکی ہوتی۔ روزی اس کی خاموشی کو محسوس کرنے کے ساتھ اس کے چہرے پر ابھرتی سوچ کی لکیریں بھی پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' وانیہ نے پوچھا۔

''یہی کہ تم کتنی خوب صورت ہو۔'' روزی بات بناتے ہوئے بولی۔ ''مگر تمہاری خوب صورتی کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔''

''ابھی تو زندگی پڑی ہے کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔'' وانیہ ہنستے ہوئے بولی۔

''مگر ضرورت تو ابھی ہے اور ہو سکتا ہے لوگ صرف اعزاز شاہ کے نام کی وجہ سے کنارہ کر جاتے ہوں۔''

''کم آن روزی، اس کا نام لے کر مجھے بور مت کرو۔''

''جب اس کا نام اتنا ہی بور ہے تو اسے اپنی زندگی سے نکال کیوں نہیں دیتیں۔'' روزی کا انداز سرسری سا تھا لیکن وہ وانیہ اعزاز کو اکسانے کے ساتھ اسے بہکا بھی رہی تھی۔ وانیہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

''تمہیں کیا کمی ہے وانیہ، سب کچھ تو ہے تمہارے پاس پھر تمہیں اپنی پسند کا پورا اختیار ہے، کم سے کم دوسری بار انتخاب پر ایسی غلطی دوبارہ نہیں کرو گی۔''

وانیہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اعزاز شاہ تو اس کی زندگی کے باب پر لکھی گئی سب سے بڑی غلطی تھی جس

سے وہ چاہتے ہوئے بھی نظریں نہیں چرا سکتی تھی اور اب روزی نے اسے نیا راستہ دکھایا تھا تو اسے وہ ہی ٹھیک لگ رہا تھا مگر وہ فوراً اس پر عمل پیرا بھی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ اس سے علیحدگی کی بھی کوئی خاص وجہ ہونی چاہیے تھی۔

"روزی! میں بہت تھک گئی ہوں۔ اگر تم برا نہ مانو تو گاڑی تم ڈرائیو کرلو۔" وہ اب فیول اسٹیشن پر کھڑی تھیں۔ وانیہ نے کہا تو روزی اپنی طرف کا دروازہ کھول کر لپک کر نیچے اتر آئی۔ وانیہ نے سیٹ چینج کرتے ہی آنکھیں بند کرنے کے ساتھ سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا تھا۔

سرمئی شام اپنے پر پھیلا رہی تھی سورج کی چمکتی کرنیں بھی اب نارنجی مائل ہوگئی تھیں، پرندے بھی دن بھر دانہ چگنے کے بعد ایک دوسرے کو اپنی بولیوں میں الوداع کہتے ہوئے اپنے گھونسلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"تم نے کام کا کیا سوچا ہے؟" وانیہ نے اپنے اندر و باہر پھیلی دونوں خاموشیوں کو توڑنے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"کسی خاص موقع اور بندے کے انتظار میں ہوں۔" روزی کے مختصر جواب پر وہ اسے ناسمجھی کے عالم میں دیکھنے لگی تو وہ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "یہ کام ایسا ہے کہ ہم ہر ایک پر تو بھروسا نہیں کرسکتے، اس لیے کسی ایسے انسان کی تلاش میں ہوں جس کو ہم شیشے میں اتار سکیں اور ہمیں کوئی نقصان بھی نہ ہو۔"

"تو اس میں میرا کیا کردار ہوگا؟"

"وقت آنے پر سب بتادوں گی۔ تم ابھی انجوائے کرو لائف اور زیادہ اس وقت انجوائے کر پاؤ گی جب اعزاز شاہ کو اپنی زندگی سے نکال دو گی۔" روزی نے کہا تو وانیہ سر جھٹک کر بولی۔

"اس کے لیے کوئی وجہ بھی ہو۔"

"وجہ؟ ہوں......" روزی سوچتے ہوئے بولی۔

"کہہ دو کہ وہ باپ نہیں بن سکتا۔" روزی کی بات پر وانیہ بے ساختہ ہنسی تھی جبکہ روزی اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا ہنس کیوں رہی ہو؟"

"ہنس اس لیے رہی ہوں کہ ہماری تین بیٹیاں ہیں۔"

"واٹ، تم نے کبھی بتایا نہیں۔" روزی کو شاک لگا تھا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وانیہ نے اس سے اتنی بڑی بات اب تک چھپائے رکھی تھی اس نے اپنی فگر کو اس طرح مینٹین کیا ہوا تھا کہ کہیں سے بھی وہ تین بچوں کی ماں تو کیا شادی شدہ بھی نہیں لگتی تھی۔

"کبھی ایسا موقع ہی نہیں آیا جو میں تمہیں بتاتی۔"

روزی اس کو جس قدر بے وقوف سمجھ رہی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ ہوشیار تھی اور اس بات کا ثبوت وانیہ نے ابھی دے دیا تھا اس لیے روزی کا دماغ اس حساب سے چلنے لگا تھا۔

"اور کیا، کیا چھپایا ہے تم نے مجھ سے؟"

"اور کیا چھپاؤں گی۔" وانیہ کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی تھی۔ جبکہ روزی نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھانے کے ساتھ اسٹیئرنگ پر اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کردی تھی۔ روزی اپنے ذہن میں وانیہ اعزاز سے کی جانے والی تمام ملاقاتیں لاکر ہر زاویے سے اس کی باتوں کو سوچ رہی تھی کہ کہیں انجانے میں وہ کوئی غلطی تو نہیں کر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک اسے وانیہ پر مکمل بھروسا تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے جب وانیہ نے اسے اپنے بچوں کا بتایا تو وہ سچ مچ چکرا کر رہ گئی تھی۔ یعنی اتنی بڑی بات وہ اس سے چھپا گئی تھی اور روزی کا اب تک کا سارا تجربہ دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اس کے بعد روزی کو ہر قدم پر سوچنے کے ساتھ بڑی ہوشیاری سے ہر چال چلنی تھی۔ کیونکہ ابھی تک وہ وانیہ اعزاز کو ایک کٹھ پتلی سمجھ رہی تھی جو اس کے ہر اشارے پر اس کی مرضی سے چل رہی تھی۔ مگر اس بات کے بعد روزی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ بھی صرف اس کے ساتھ ایک مقام تک چل رہی ہے اس کے بعد وہ روزی کو اپنی زندگی سے اس طرح الگ کرسکتی تھی جیسے کوئی روزی نام کی لڑکی تھی ہی نہیں۔

☆☆☆

''خالہ نے آخر کیوں بلایا ہے؟'' ریبال نے جھنجلاہٹ کے ساتھ الماری سے شرٹ نکال کر بیڈ پر امی کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا تو انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''کھانے پر ہی تو بلایا ہے۔'' وہ بہت سادگی سے بولیں۔

''وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔''

''پھر......؟'' ریبال نے الماری بند کرتے ہوئے امی کو دیکھا جو اس کی شرٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب آکر بیٹھ گیا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''آپ کو حیرت نہیں ہوئی خالہ پر...... جن کے لیے ہم ہمیشہ سے برے تھے اب اچانک اچھے کیسے ہو گئے۔ صرف اس لیے کہ میں جرمنی جا رہا ہوں۔''

''نہیں بیٹا، وہ ایسی نہیں ہے۔'' امی فوراً بہن کی طرف داری کرتے ہوئے بولیں۔ ''وقت اور حالات نے اسے خود غرض بنا دیا ہے۔ پر میری بہن ہے، بہت اچھی طرح جانتی ہوں اسے۔''

''لیکن امی آپ یہ بھی کیوں بھول رہی ہیں کہ ان کا رویہ ہمارے ساتھ کبھی اچھا نہیں رہا پھر یہ سب اچانک؟''

''بیٹا، وقت کے ساتھ سب کچھ بدلتا رہتا ہے اور پھر اس کے علاوہ کوئی اور قریبی رشتے دار بھی نہیں ہے۔'' امی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی چھوٹے بچے سے بات کر رہی ہوں۔ امی، ریبال کو تو مطمئن کر رہی تھیں لیکن اندر سے وہ خود خائف تھیں کیونکہ اپنی بہن سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھیں۔ بدتمیز و بدلحاظ تو وہ شروع سے ہی تھی، رہی سہی کسر شادی کے بعد احساسِ کمتری کے شکار...... میاں نے لالچی بھی بنا دیا تھا اور یہ عادتیں میاں کے ساتھ بچوں میں بھی منتقل ہو گئی تھیں۔ مگر امی، ریبال کے سامنے تو اپنی بہن کی برائی نہیں کر سکتی تھیں، اندھا و ناسمجھ تو خیر وہ بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی امی ہر لمحہ بہن کی پردہ پوشی کرتی رہتیں۔

ریبال، امی کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے زیادہ بحث نہیں کیا کرتا تھا۔ اسے امی کی خوشی زیادہ عزیز تھی اس لیے وہ مصلحتاً خاموش ہو جایا کرتا اور خالہ اور ان کے بچوں کی باتوں کو بھی نظر انداز کر دیا کرتا لیکن اب معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ خالہ کا بڑھتا ہوا اصرار کہ وہ جرمنی جاتے ہی ان کے نکمے بیٹے کو وہاں بلا لے اور اس کے ایسا نہ کرنے پر نہ جانے خالہ، امی جی کے ساتھ کیا سلوک کرتیں، یہ اس کے لیے زیادہ پریشان کن بات تھی۔ وہ امی کی خوشی کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھا مگر یہاں وہ مجبور تھا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال سنوار رہا تھا کہ اچانک امی کمرے میں آئیں اور اسے دیکھنے لگیں۔ وہ عام سے حلیے میں بھی بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔

''چلیں......؟'' وہ برش رکھ کر امی سے پوچھنے لگا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر اس سے پہلے ہی کمرے سے نکل کر بائیک کے پاس آکھڑی ہوئی تھیں۔

ریبال بائیک کی چابی، موبائل فون اور اپنا والٹ بیڈ پر سے اٹھا کر تیزی سے بائیک کے پاس آیا تھا پھر بائیک اسٹارٹ کرتے ہی وہ امی کو لے کر خالہ زینب کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

انہیں زیادہ دیر نہیں لگی تھی زینب خالہ کے گھر پہنچنے میں یہاں خالہ زینب کے گھر کا تو منظر ہی کچھ اور تھا، ہر طرف قمقمے لگے ہوئے ہونے کے ساتھ محلے کی چند چھوٹی بچیاں ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کی پلیٹ لیے کھڑی تھیں۔

''ارے مبارک ہو بھئی......'' خالہ نے آگے بڑھ کر ریبال کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتے ہوئے کہا تو وہ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا جس پر خالہ بجائے جھینپنے کے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولیں۔

''ارے میاں، آپا نے تمہیں بتایا نہیں، آج تمہارا نکاح ہے۔'' ریبال نے نظروں کا زاویہ بدل کر امی کی طرف دیکھا جو اس کی طرح ہر چیز کو حیران کن نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''بھئی بڑھاپا ہے بھول گئی ہوں گی۔'' خالہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے بولے۔

''اور گھر کی بات ہے کوئی اتنا بڑا مسئلہ تو ہے نہیں، زینب......'' خالو، ریبال کو ایک کرسی پر بٹھا کر آواز دیتے ہوئے خود اندر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

ریبال کی نظریں ہر ایک چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جبکہ ذہن اچانک اس رونما ہونے والے حادثے کے بارے میں کچھ بھی سوچنے سے قاصر ہو چکا تھا۔ اس کی نظریں امی پر گئی تھیں جو اس کی طرح حیران کھڑی ہر ایک چیز کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ تیزی سے امی کی طرف آیا لیکن دوسرے ہی لمحے خالہ زینب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جانے کس طرف سے آئیں اور امی کو اپنے ساتھ لے کر اندر چلی گئیں، وہ بھی ان کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن خالو اور احمر نے بازو سے پکڑ کر اسے کرسی پر لا بٹھایا تھا۔

''جی مولوی صاحب نکاح شروع کریں۔'' خالو نے سر پر ٹوپی پہنتے ہوئے کہا تو مولوی صاحب رجسٹر کھولنے لگے۔

''لڑکی کا حق مہر کتنا ہے؟'' انہوں نے خالو سے پوچھا۔

''پانچ سو گز کا ایک گھر، 25 تولہ سونا اور پچیس لاکھ نقد......'' ریبال پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ہو رہا کیا رہا تھا۔ وہ تو یہاں دعوت کھانے آیا تھا اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ دعوت اسے قربان کرنے کے بعد ہوگی اور امی بھی اس سچویشن میں تنہا چھوڑ کر نہ جانے کس کمرے میں جا بند ہوئی تھیں یا انہیں بند کر دیا تھا۔ ریبال اب بالکل ہی ان کے رحم و کرم پر تھا اس کے پاس سوائے ہامی بھرنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ مظلومیت و...... بے بسی کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے مسلسل امی کی فکر کھائے جا رہی تھی گو کہ خالہ زینب امی کی سگی بہن تھیں لیکن پیسوں کی ہوس نے انہیں سوتیلوں سے بھی بدتر بنا دیا تھا۔ اس کی نظریں ہر ایک چہرے پر اپنی ماں کے چہرے کو تلاش کرتی ہوئی خالہ زینب پر آکر ٹھہری تھیں۔ خالہ زینب کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ سکون بھی تھا۔

امی کو اندر محلے کی خواتین نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور انہیں باتوں میں الجھا لیا تھا۔ پہلے ہی امی اس غیر متوقع صورت حال سے حیران تھیں مزید محلے کی خواتین سوالات کر کر کے انہیں پریشان کر رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک نکاح تک بات کیسے آگئی تھی انہوں نے تو اس کے متعلق کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

کمرے میں ایک طرف لڑکیاں بیٹھی عروج کو مہندی لگانے کے ساتھ شادی بیاہ کے گیت بھی گاتی جا رہی تھیں۔ محلے کی کچھ خواتین امی کو گھیرے بیٹھی سوالات پر سوالات کیے جا رہی تھیں۔

''کیا تمہارا بیٹا لڑکی کو بھی کو اپنے ساتھ جرمنی لے جائے گا؟'' ایک خاتون نے سوال کیا تو امی حیران پریشان نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو رہا ہے۔ وہ یہاں دعوت میں بلائی گئی تھیں اور یہ سب جیسے سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ہو رہا تھا۔

''ارے نہیں! عروج کو تو یہ اپنی خدمت کے لیے لے کر جا رہی ہیں۔'' ایک اور خاتون نے کہا تو امی فوراً اپنے حواس پر قابو پانے لگی اور ساری بات سمجھنے کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں کہ اچانک مولوی صاحب رجسٹر ہاتھ میں لیے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ احمر اور خالہ زینب بھی عروج کی رضامندی جاننے کے لیے اندر آگئے تھے۔ مولوی صاحب ایک صوفے پر اطمینان سے بیٹھنے کے ساتھ نکاح کے پیپرز کو ترتیب دیتے ہوئے عروج کے گواہوں کے بارے میں پوچھنے لگے۔

''زینب ہم اب چلیں گے۔'' امی نے ایک لمحے میں فیصلہ کرنے کے ساتھ خالہ زینب کی سب چالوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ خالہ زینب پہلے بوکھلائیں پھر تیزی سے امی کے قریب آکر بولیں۔

''نکاح تو ہو جانے دو......میں نے اشارتاً

تمہیں بتایا تو تھا۔“

”شادی بیاہ کوئی گڈے گڑیوں کا کھیل نہیں ہے۔“ امی نے سخت لہجے میں کہا تو خالہ زینب، امی کو دیکھنے لگیں۔ ان کی بچھائی شطرنج کی بساط امی نے ایک لمحے میں پلٹ دی تھی اور خالہ زینب فوراً ہار تسلیم نہیں کرسکتی تھیں اس لیے نئے سرے سے خود کو بچانے کی ترکیب سوچنے لگے۔

”اپنوں میں تو ایسے ہی سب ہوتا ہے۔“ وہ چہکے، چپکے امی کو رام کر رہی تھیں۔

☆☆☆

اعزاز شاہ نے ٹی وی آن کرنے کے بعد بیڈ کی سائڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر اس میں روم فریج سے برف کے کیوبز ڈالے اور پھر الماری سے بوتل نکال کر پیگ بنانے لگے۔ ان کا ذہن اس وقت اپنی بیوی وانیہ میں الجھا ہوا تھا۔ دن بھر وہ خود کو کسی نا کسی طرح مصروف رکھتے تا کہ انہیں وانیہ کی باتوں کے ساتھ اس کی حرکات یاد نہ آئیں کیونکہ وہ اعزاز شاہ کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بنتی تھی اس لیے وہ گھر بھی وانیہ اعزاز کے سونے کے بعد ہی آتے یا پھر کسی ہوٹل میں قیام پزیر ہو جاتے تھے لیکن اس وقت وہ ٹی وی پر اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھنے کے ساتھ، ساتھ اپنے مشروب سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اعزاز شاہ نے اپنی زندگی بہت پُر جوش انداز میں گزاری تھی انہوں نے آنے والے کل کے لیے کئی خواب سجانے کے ساتھ کئی امیدیں بھی باندھی تھیں۔ ان کا ارادہ الگ بزنس کرنے کے ساتھ اپنا آپ منوانا تھا گو کہ نام ان کا اب بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں تھا لیکن جو اعزاز شاہ کی سوچ و خواہش تھی اس منزل سے وہ بھٹک کر خود کو نشے کی بوتل میں قید تصور کرتے تھے، وہ چاہتے تو اب بھی اپنی زندگی کو آئیڈیل گزار سکتے تھے مگر وہ زندگی کو نہیں زندگی اب انہیں گزار رہی تھی ان کے پاس بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی سکون نہیں تھا۔

ان کے دل میں یہ خواہش بھی شادی کے اولین دنوں سے پوشیدہ تھی کہ جب وہ گھر میں داخل ہوں تو وانیہ ان سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھے، باہر جا کر کھانا کھانے کی فرمائش کرے یا شاپنگ پر جانے کی ضد کرے اور پھر روٹھ جائے اور اعزاز شاہ اپنی محبت سے اسے منائیں مگر یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں تھا بلکہ وانیہ اعزاز تو ان سے ٹھیک سے بات کرنا تو دور کی بات ان کا وجود ہی برداشت نہیں کرتی تھی۔

آدھا انسان تو اسی وقت مر جاتا ہے جب وہ کسی سے توقع کرے کہ کوئی اپنا اسے سمجھے، اس کے دکھ سکھ کو محسوس کرنے کے ساتھ اسے کچھ پل سکون و محبت کے دے اور جب یہ خواہشات اس انسان جس سے توقعات باندھی گئی ہوں اپنے پیروں کے نیچے روند کر آگے بڑھ جائے تو ان روندے ہوئے احساسات کے ساتھ خود انسان بھی مٹی میں رُل جاتا ہے جیسے اعزاز شاہ جو کہنے کو تو زندہ تھے مگر زندگی سے کسی معصوم بچے کی طرح روٹھے ہوئے۔ اور چاہتے تھے کہ زندگی انہیں منائے مگر یہ بھول گئے تھے کہ زندگی صرف موت کو مناتی ہے اور اپنا آپ موت کی آغوش میں دے دیتی ہے۔ احساسات سے اسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ رات اپنے اختتامی مراحل طے کرنے کے ساتھ اعزاز شاہ کو نیند کی وادیوں میں پہنچا رہی تھی۔

”وانیہ اعزاز......!“ وہ نیند کی وادیوں میں اترنے سے پہلے چیخے تھے۔ ”تم بہت بری ہو اور تم سے زیادہ برا میرا باپ ہے، جس نے تمہیں میرے گلے باندھ دیا اور تم وانیہ اعزاز......“ انہوں نے غصے سے شراب کی بوتل ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے پر مارنے کی کوشش کی لیکن نشے کی وجہ سے بوتل ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گری تھی اور ایک چھوٹا سا کانچ کا ٹکڑا زمین کو چھو کر ان کے پیر پر لگا تھا جس کی وجہ سے خون بہت آہستہ، آہستہ زمین پر ٹپکنے لگا۔ ”ورنہ تم میرے گلے میں پھنسی وہ ہڈی ہو جسے میں نہ اگل سکتا ہوں اور نہ نگل سکتا ہوں۔“ اعزاز شاہ مزید بھی کچھ بولنا چاہتے تھے مگر نیند ان پر غالب آگئی تھی اور وہ بستر پر آڑے ترچھے پڑ گئے۔

اعزاز شاہ نے آنکھ ایسے گھر میں کھولی جہاں سب کچھ تو تھا آسائشوں کی صورت مگر والدین کی توجہ نہیں تھی۔ شروع میں انہوں نے اس بات کو بہت محسوس کیا کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی خوشی نوکر سیلی بریٹ کرتے پھر تھوڑا میچور ہوئے تو خود باہر دوستوں کے ساتھ مل کر خوشی کو انجوائے کرتے لیکن جب اچانک ان کی شادی ہوئی تو اس رات کمرے میں جانے سے پہلے انہیں انجانی سی خوشی نے آگھیرا تھا۔ انہیں یوں لگ رہا تھا۔ جیسے اب وہ اس دنیا میں تنہا نہیں ہیں کوئی اور بھی ہے جو صرف ان کے لیے بنا ہے اور اب وہ اس کے ساتھ مل کر اپنی زندگی کی تمام خوشیاں ادھورے خواب مکمل کریں گے۔ وہ خود کو آسمان پر اڑتا ہوا محسوس کرنے کے ساتھ اپنے آپ کو کسی ریاست کا شہنشاہ سمجھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے والد محترم زوار شاہ کے کہے جلے کٹے الفاظ بھی بھول گئے تھے۔ ان کے دل میں شریک حیات سے ملنے کی تمنا اور نہ جانے کتنے ارمان کروٹ لے رہے تھے، ان کے ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ اور ہاتھ میں رونمائی کا تحفہ تھا۔ وہ وانیہ کے جذبات سے بالکل ہی بے خبر تھے یا شاید دل میں کہیں یہ بات بھی تھی کہ وانیہ روایتی دلہنوں کی طرح سمٹی ہوئی بے صبری سے انتظار کر رہی ہوگی مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی سارے خواب ملیامیٹ ہوگئے۔

وہ دروازے میں حیرت زدہ کھڑے وانیہ کو دیکھنے لگے۔ وانیہ سوٹ چینج کرنے کے بعد الماری میں زیورات رکھنے کے ساتھ جھنجلا رہی تھی، اس نے ایک نظر بھی اعزاز شاہ کو دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ اعزاز شاہ کو یوں لگا جیسے زندگی نے بہت بڑا اور بھیانک مذاق ان کے ساتھ کیا ہو، کئی سوال ذہن میں اٹھ رہے تھے مگر جواب نہیں مل رہا تھا انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان سے پاتال میں جا گرے ہوں۔ وہ وانیہ اعزاز کو یہ یاد دلانے کہ ”میں اعزاز شاہ تمہارا شوہر ہوں۔“ آگے بڑھے اور وانیہ شاید ان کا ارادہ بھانپ گئی تھی اس لیے اعزاز شاہ کو ان کی نظر میں دو کوڑی کا کر کے خواب آور گولیاں کھا کر جا سوئی تھی اور وہ خود تمام شب تنہائی و ذلت کی آگ میں جلتے رہے تھے اور اب تک جل رہے تھے۔

☆☆☆

صبح ابھی پوری طرح سے پھیلی نہیں تھی لیکن پرندوں نے اپنے گھونسلوں سے دانے کی تلاش میں نکلنا شروع کر دیا تھا اور اب آسمان پر بھی ہلکی، ہلکی سپیدی پھیلنے کے ساتھ بادِ نسیم بھی چلنے لگی تھی جو روزی کو اب تھپک رہی تھی، ایک پورا دن ڈرائیو کرنے کے بعد وہ اب پوری طرح تھک چکی تھی جبکہ پچھلی سیٹ پر وانیہ اعزاز گہری نیند کے مزے لے رہی تھی۔ رحیم یار خان شروع ہو چکا تھا صوبہ پنجاب کا چھوٹا سا شہر ہونے کی وجہ سے یہاں ہوٹل بھی چھوٹے تھے۔ اگر روزی کی آنکھیں تھکن و نیند کی وجہ سے بند نہیں ہو رہی ہوتیں تو وہ ان چھوٹے ہوٹلز میں سے کسی ایک میں بھی ٹھہرنا پسند نہیں کرتی لیکن اس وقت مجبوری تھی۔ اس لیے اس نے قدرے غنیمت ہوٹل کے سامنے گاڑی روک دی اور ایک نظر وانیہ اعزاز کو دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی پھر تیزی سے گاڑی سے اتر کر ہوٹل میں داخل ہوگئی اور ہوٹل کے منیجر سے تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد جب واپس آئی تو دیکھا وانیہ گاڑی سے باہر کھڑی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔

”صبح بخیر......“

”تم کہاں چلی گئی تھیں؟“ وانیہ نے روزی کی آواز پر چونکنے کے ساتھ پوچھا۔

”اپنے آرام کا انتظام کرنے، بہت تھک گئی ہوں۔“ وہ کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولی۔

”تو مجھے جگا دیتیں۔“

”تم بھی تو یہیں کرتی جو میں نے کیا......“ روزی گاڑی میں سے اپنا بیگ نکالتے ہوئے بولی۔ وانیہ کو اس کا انداز کچھ عجیب سا لگا شاید روزی واقعی بہت تھک گئی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی۔ وانیہ جاننے سے قاصر تھی۔

''تم نہیں چلو گی؟'' روزی نے اس کے قریب رک کر پوچھا تو وانیہ نفی میں سر ہلا گئی۔

''نہیں، میں کچھ دیر تازہ ماحول میں رہنا چاہتی ہوں۔'' اس کی بات پر روزی مسکراتے ہوئے ہوٹل کے اندر چلی گئی اور وہ کچھ دیر یونہی کھڑی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ابھی کچھ سوچ ہی رہی تھی کہ اپنی کنپٹی پر کسی چیز کی سختی کا احساس ہوا اس کی طرف کا شیشہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہی تھی اس نے ذرا سی گردن موڑ کر شیشے کی طرف دیکھنا چاہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی طرف کا دروازہ کھول کر ایک بھاری بھرکم شخص نے اسے دوسری سیٹ کی طرف دھکیلا تھا جس کی وجہ سے اس کا پیر مڑ گیا تھا اور تکلیف سے اس کی چیخ نکل گئی جبکہ تیزی سے پیچھے بیٹھے دوسرے شخص نے فوراً ہی اس کے منہ پر کپڑا رکھا تھا جس کی وجہ سے پہلے تو وانیہ نے اس شخص کے ہاتھ پر کئی بھی مارے پھر آہستہ، آہستہ وہ بے ہوش ہوتی چلی گئی۔

رات بھر گاڑی ڈرائیو کرنے کی وجہ سے روزی بہت تھک چکی تھی شاید اور زیادہ تھکن کی وجہ سے اس وقت اسے فوری نیند نہیں آرہی تھی اس لیے اس نے پہلے چائے کا آرڈر دیا اور خود فریش ہونے چلی گئی۔ فریش ہو کر روم میں آئی تو چائے کے ساتھ بسکٹ بھی حاضر تھے۔ وہ چائے کا کپ لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تھکن کی وجہ سے اس کا ذہن کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا اس لیے اس کا سارا دھیان چائے پر ہی تھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے کپ ایک طرف رکھا اور سونے کے لیے لیٹی ہی تھی کہ موبائل فون بجنے لگا۔

''ہیلو......کون......؟'' اس نے انجانا نمبر دیکھ کر کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''تعارف کروانے کا وقت نہیں......اتنا سن لو کہ تمہاری دوست ہمارے قبضے میں ہے۔'' اس نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا تھا اور روزی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ حیرت و پریشانی کے عالم میں موبائل فون کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ نیند تو اب آنکھوں سے کافی دور ہو چکی تھی مگر جسم میں تھکاوٹ کے باعث درد ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ دیر کی نیند اسے فریش کر دے گی مگر یہ نئی صورتِ حال اس کے لیے بالکل انوکھی اور ناقابلِ یقین تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

روزی کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتی تو کبھی ایک جگہ بیٹھ کر اپنا دفاع کرنے کے بارے میں سوچنے لگتی اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وانیہ اعزاز کہاں اور کس حال میں ہے اور اسے اغوا کرنے والے بدلے میں کیا چاہتے ہیں۔ وہ صرف اپنا سوچ رہی تھی۔ روزی اپنے مفاد کے لیے ہی ہر کام کرتی تھی اور یہاں وقتی طور پر وہ اپنے تمام مفاد بھول کر راہِ فرار تلاش کر رہی تھی۔ گو کہ اس نے ابھی اپنا موبائل فون آف نہیں کیا تھا۔ کیونکہ ابھی لاہور سے بھی بہت ضروری کال آنی تھی لیکن اس وقت وہ ہر بات پسِ پشت ڈالے یہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہی تھی کہ اچانک موبائل فون دوبارہ بجنے لگا تھا۔

روزی نے پہلے موبائل اسکرین پر نمبر چیک کیا پھر کچھ سنبھل کر فون ریسیو کر لیا۔

''ہیلو......'' دوسری طرف جو کوئی بھی تھا پر اس نے یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ کسی مشکل سے دوچار ہے بلکہ بڑی خوشگواری کے ساتھ بات کر کے اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر سے اُلجھن کو سلجھانے کی ترکیب کرنے لگی تھی۔ مگر ہر ترکیب کے آگے ایک سوالیہ نشان اسے کچھ سوچنے سے روک دیتا کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے وانیہ کو اغوا کیا۔

روزی چاہتی تو پولیس کا سہارا لے کر اسے چھڑا سکتی تھی مگر اس وقت وہ ایسا کرنے سے گریز کر رہی تھی کیونکہ اس کی نظر میں یہ سب ایک سوچی سمجھی پلاننگ کے تحت ہو رہا تھا اور جو کوئی بھی اس کے پیچھے تھا روزی کی سوچ اس تک رسائی حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔

نیند سے بچنے کے لیے اس نے انٹر کام پر کافی کا

آرڈر دیا اور خود کمرے سے نکل کر بالکونی میں آ کھڑی ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اس کے ذہن کو تازگی بخشنے کی کوشش کی تھی اگر اس وقت واثیہ اس کے حواس پر سوار نہ ہوتی تو یہ سب اس کے لیے بہت خوب صورت و دلفریب ہوتا لیکن اس وقت سب کچھ پس منظر میں کہیں کھو گیا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس الجھن سے نہیں نکال پا رہی تھی۔

☆☆☆

کسی بھیانک خواب کی کیفیت سے جیسے اچانک تشمیرہ کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ کچھ دیر تو پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر لاحول پڑھ کر اٹھ بیٹھی اور دونوں ہاتھوں سے بال سمیٹ کر جوڑا بناتی سلیپر پہن کر واش روم چلی گئی۔

رات معمول کے مطابق روزہ مرہ کی ڈائری لکھتے ہوئے نہ جانے کب اسے نیند آ گئی اسے پتا ہی نہیں چلا اور وہ اپنے اطراف پھیلی چیزیں سمیٹ نہیں پائی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھ وقت سے کافی پہلے کھل گئی تھی۔ اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بھرپور نیند لے کر اٹھی ہو۔ اس لیے وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد سیدھی کچن میں چلی آئی تاکہ ناشتا بنانے میں تائی جی کی مدد کر سکے اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ تائی جی ناشتا بنانے کے لیے پہلے سے کچن میں موجود تھیں اور ان کا موڈ بھی خوشگوار تھا اس لیے تشمیرہ کو روکنے ٹوکنے کے بجائے وہ اسے کام بتاتی جا رہی تھیں۔ اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا کہ تائی جی کا موڈ اتنا اچھا و خوشگوار ہو۔ اسے اس وقت تائی جی اپنی سگی ماں لگتیں اور اس کا دل چاہتا کہ تائی جی ہمیشہ اس کے ساتھ ایسے ہی رہیں مگر یہ کہاں ممکن تھا۔

''السلام علیکم......'' تشمیرہ نے ناشتے کی ٹرے سجاتے ہوئے ایک نظر کچن کے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ فاطر بلو جینز اور سفید چیک دار شرٹ پہنے نہ جانے کہاں جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے چائے کی پیالی میں چمچ چلانے لگی۔

''تم صبح، صبح کہاں جا رہے ہو؟'' تائی جی نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ پوچھا۔

''گاڑی کے کام سے آیا ہوں تو آج یہ کام کر لوں...... پھر کل واپس چلا جاؤں گا۔'' اس نے کہہ کر تشمیرہ کی طرف دیکھا شاید اس پر جتانا مقصد تھا۔

''اتنی جلدی، ابھی کل ہی تو آئے ہو...... کچھ دن تو رکو......'' تائی جی نمک دانی ٹرے میں رکھتے ہوئے بولیں تو تشمیرہ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں جاؤں؟

''ہاں چلو...... باقی باتیں ناشتے کی ٹیبل پر کرتے ہیں۔'' تائی کہہ کر ان دونوں کے ساتھ چلتی ہوئی ڈائننگ روم تک آ گئی تھیں۔

''تم ابھی تک یونیورسٹی جانے کے لیے تیار نہیں ہوئیں۔'' تایا جی نے اخبار پر سے نظریں ہٹا کر تشمیرہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں تو تیار ہوں۔ بس اپنی فائل اٹھانی ہے لیکن اس سے پہلے آپ کی اجازت چاہیے۔'' وہ ان کے کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے بولی۔

''کیسی اجازت......؟'' تایا جی کے بجائے تائی جی نے پوچھا تو وہ ایک لمحے کو نروس ہوئی مگر پھر سنبھل گئی۔

''میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔''

''ہرگز نہیں......'' اب کی بار بھی تائی جی کی طرف سے دوٹوک جواب آیا تو وہ تایا جی کو دیکھنے لگی جو بہت خاموشی سے ناشتا کرنے میں مصروف تھے یہ پہلا موقع تھا جب تایا جی نے جواب نہیں دیا تھا ورنہ وہ ہمیشہ تائی جی کو خاموش کروا دیا کرتے تھے اور تائی جی بھی تایا جی کے سامنے اس انداز سے بات نہیں کرتی تھیں پھر آج کیا ہو گیا تھا، وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''پلیز تائی جی...... میں پریکٹس کے لیے جاب کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ منت سے بولی۔ تایا جی بظاہر ناشتا کرنے میں مصروف تھے لیکن وہ بیوی اور بھتیجی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ وہ یہ بھی

جانتے تھے کہ ان کی بیگم تمیرہ کو ڈگری کرنے سے کیوں منع کر رہی ہیں۔ اس لیے انہوں نے بیچ میں مداخلت کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

''ایک بار منع کر دیا تمیرہ نہیں تو نہیں۔''

''مگر تائی جی......''

''بس......'' انہوں نے دوٹوک انداز میں ہی بات ختم کر دی تو وہ جز بز سی ہو کر ناشتا کرنے لگی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ پہلے ہی مرحلے پر تائی جی اپنا فیصلہ سنا کر بات ختم کر دیں گی اور تایا جی جو ہمیشہ اس کا ساتھ دیا کرتے تھے اس مقام پر خاموشی اختیار کر لیں گے۔ اس نے آس و امید سے تایا جی کی طرف دیکھا جو چائے کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ وہ جلدی، جلدی اپنا ناشتا ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کے ساتھ فاطر کی نظریں بھی اٹھی تھیں اور اسے اپنے حصار میں لے گئیں۔

''کیا ہوا...... ناشتا تو ٹھیک سے کر لو۔''

''نہیں، بس......'' تایا جی کی بات کا جواب دیتے ہوئے وہ بولی۔ ''یونیورسٹی کے لیے لیٹ ہو جاؤں گی۔'' وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''اس کو ساری بات آپ ہی راستے میں سمجھا دیجیے گا۔ میری تو یہ سنتی ہی نہیں ہے۔'' وہ میاں سے مخاطب ہوئیں۔ ''دیکھا ناں آپ نے کس طرح ضد کر رہی تھی، اب اس کو کیا پتا کہ کس وجہ سے منع کیا ہے، اگر بتا دوں کہ شام میں لڑکے والے اسے دیکھنے آ رہے ہیں تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔'' تائی جی کی بات پر فاطر نے چونک کر باری، باری دونوں کو دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح اس آنے والے رشتے کو روکے کیونکہ ابھی تک وہ اپنی شیطانی سوچ کو حقیقت کا رنگ نہیں دے سکا تھا۔

''میں سمجھا دوں گا۔'' تمیرہ کے آنے پر تایا جی صرف اتنا ہی کہہ سکے اور اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے گاڑی میں آ بیٹھے پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے اسے ریورس کرتے گھر سے نکال کر گلی میں لے آئے تب تک دونوں ہی اپنی جگہ خاموش بیٹھے ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے ذہن میں الفاظ کو ترتیب دینے میں لگے ہوئے تھے۔

''بیٹا...... میں جانتا ہوں کہ تائی جی کی بات نے تمہیں ہرٹ کیا ہے لیکن اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور پھر میں بھی تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔'' تایا جی نے تمہید باندھ کر اسے مزید مایوس کر دیا وہ سر جھکا کر رہ گئی۔

''میں یہ بات اس لیے کر رہا ہوں بیٹی کہ تمہیں ایک نہ ایک دن اپنے گھر جانا ہے۔'' اس نے ایک دم سے سر اونچا کر کے تایا جی کو دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں کل ہم جس دعوت میں گئے تھے وہاں جیلانی صاحب کی فیملی کو تم پسند آ گئی ہو۔ وہ آج اسی سلسلے میں ہمارے گھر آ رہے ہیں۔''

''مگر تایا جی میری تعلیم......''

''اس کی فکر مت کرو، میں جانتا ہوں کہ یہ تمہارا جنون ہے اسی لیے ان سے کچھ وقت مانگ لیں گے۔''

''مگر تایا جی مجھے سوچنے کا کچھ وقت تو دیا جائے۔'' یونیورسٹی کے گیٹ پر گاڑی رکی تو وہ اترنے سے پہلے تایا جی سے کہنے لگی۔

''پوری زندگی کا معاملہ ہے ویسے تو آپ کی مرضی میں ہی میری رضامندی ہے لیکن میں کچھ وقت چاہتی ہوں۔''

تایا جی ''ہوں'' کہہ کر رہ گئے تھے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے تایا جی جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔ میں نے آپ کا مان نہیں توڑا اور نہ ہی کبھی توڑ سکتی ہوں۔''

''مجھے تم سے یہی امید ہے۔'' تایا جی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو وہ انہیں خدا حافظ کہتی ہوئی گاڑی سے اتر کر یونیورسٹی گیٹ میں داخل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

تشمیرہ بانو، فاطر کے لیے شطرنج کی بازی بن گئی تھی جسے وہ ہر حال میں جیتنا چاہتا تھا اس سے پہلے بھی کئی لڑکیاں اس کی زندگی میں آ کر گئی تھیں مگر نہ جانے اس میں ایسی کیا بات اسے نظر آئی تھی جس کے لیے وہ کسی بھی حد تک جا سکتا تھا اس وقت جو آگ فاطر کے سینے میں دہک رہی تھی اسے وہ بجھانے کی ترکیب سوچ رہا تھا لیکن اب تشمیرہ کے آنے والے رشتے سے بھی وہ پریشان ہو گیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کرے۔

وہ مسلسل سگریٹ پھونکنے کے ساتھ کمرے میں ٹہل رہا تھا اور ساتھ ہی اس رشتے کو روکنے کی پلاننگ کر رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ تمام باتیں اور وجوہات اپنے شاطر دماغ میں لیے تائی جی کے سامنے کھڑا تھا۔

"میں ساری زندگی تو بغیر کسی وجہ کے اسے اپنے گھر بٹھا کر نہیں رکھ سکتی ناں......" تائی جی فاطر کی بات سن کر بولیں تو وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔

"لیکن اچھی بھلی نوکرانی آپ کے ہاتھ سے جا رہی ہے۔ سوچیں اس کے جانے کے بعد آپ بالکل اکیلی ہو جائیں گی اور سارے کام آپ کو خود کرنے پڑیں گے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

"کون سے بہت سارے کام ہوتے ہیں، ہم دو افراد تو ہیں، کتنے کام ہوں گے۔" تائی جی نہ جانے کیا سوچے ہوئے تھیں جو اس وقت فاطر کی تمام ترکیبیں الٹ رہی تھیں۔ وہ بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ تائی جی کا بازو تھام کر ان کو اپنے ساتھ بٹھاتا انہیں قائل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔

"پھپھو ذرا سوچیں ...... آپ نے کتنا اس کے لیے کیا ہے، پڑھایا لکھایا، اچھا کھلایا، پہنایا تو اب آپ اس کا بدلہ لیں۔ کیوں اس کو اتنی آسانی سے پرایا کر رہی ہیں۔"

"آج نہیں تو کل...... اسے اپنے گھر کا تو ہونا ہی ہے پھر آج ہی کیوں نہیں...... اور ویسے بھی وہ مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتی۔" تائی جی کا انداز ایسا تھا جیسے اب وہ اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"میں تشمیرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ ہر ایک لفظ پر زور دے کر بولا تو تائی جی اسے یوں دیکھنے لگیں جیسے اس کی ذہنی حالت پر انہیں شبہ ہو اس لیے فوراً کچھ نہیں بولیں۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں پھپھو! میں تشمیرہ سے......"

"بس کرو لڑکے......" تائی جی نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ "شادی بیاہ گڑیوں، گڈوں کا کھیل نہیں، جب دل چاہا منہ اٹھا کر شادی کر لی۔"

"مجھے معلوم ہے، اس لیے میں نے آپ سے پہلے بات کی ورنہ میں پھوپا صاحب سے بھی بات کر سکتا تھا۔"

"شکر کرو کہ نہیں کی...... ورنہ تمہارے ساتھ مجھے بھی گھر سے باہر نکال دیا جاتا۔" تائی جی کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھیں کہ فاطر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ان کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔

"پھپھو میں سچ کہہ رہا ہوں، میں تشمیرہ سے بہت محبت کرتا ہوں اور اب سے نہیں بہت پہلے سے، بس آپ کو بتا اب رہا ہوں کہ اگر تشمیرہ سے میری شادی نہیں ہوئی تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔" وہ تائی جی کو زلزلوں میں دھکیل کر خود وہاں سے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کہ ایک طرف جیلانی صاحب کے گھر والے آج تشمیرہ کے لیے رشتہ لے کر آ رہے تھے دوسری طرف فاطر نے انہیں عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا۔

بھتیجے کی خودسری سے وہ بخوبی واقف تھیں وہ کس حد تک جا سکتا تھا یہ سوچ کر ہی انہیں خوف آ رہا تھا۔

"اچھا پھپھو! میں جا رہا ہوں، مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی۔" کچھ دیر بعد وہ انگلی پر گاڑی کی چین گھماتا ہوا آیا تو تائی جی نے اسے باہر جاتے ہوئے

دیکھا......اس کے بعد اِک گہری سانس ہونٹوں سے خارج کرتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر کچن میں چلی آئیں۔ فاطر کی بات نے ان کا دماغ بالکل ہی ماؤف کر دیا تھا۔

☆☆☆

''پتا نہیں ریبال! مجھے کیوں اس شخص سے بہت ڈر لگتا ہے۔ جب وہ میری طرف دیکھتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ابھی وہ مجھے کھا جائے گا۔'' تشمیرہ نے ریبال کے ساتھ چلتے ہوئے جھرجھری لیتے ہوئے کہا تو وہ اسے دیکھنے لگا۔ خوف کی چادر میں لپٹی سہمی ہوئی وہ کسی معصوم سی بچی کی طرح لگ رہی تھی نہ جانے کیوں آج پہلی بار ریبال کے دل کی دھڑکن اس کے لیے عجیب سی ہوئی تھی وہ فوراً نظریں چرا گیا۔

''اس طرح ڈرو گی تو وہ واقعی تمہیں کھا جائے گا۔''

''پھر میں کیا کروں......؟'' وہ بیچارگی سے پوچھنے لگی۔

''ہمت و بہادری سے اس کا مقابلہ کرو......'' ریبال نے ایک گھنے درخت کے نیچے رک کر کہا۔ ''اس کو اس کے مقصد میں کمزور کرو لیکن خوفزدہ ہو کر خود کمزور مت بنو۔''

''میں کمزور نہیں ہوں مگر......''

''اگر کمزور نہیں ہو تو پھر اگر مگر کیا...... دیکھو تشمیرہ ہر انسان کے اندر ایک خوف چھپا ہے اور اس خوف کو دبا کر وہ حاکم بنتا ہے۔'' ریبال درخت سے ٹیک لگا کر اسے سمجھانے لگا۔

ریبال کی باتوں سے تشمیرہ کو حوصلہ ملا تھا اس کے اندر جو خوف کے بادل چھائے تھے وہ اب چھٹ چکے تھے وہ اب دور تک روشنی پھیلی ہوئی تھی جس میں اسے اپنا راستہ صاف نظر آ رہا تھا اور پھر کچھ دیر میں ہی وہ خود کو پُرسکون محسوس کر رہی تھی اور اب ریبال کے ساتھ کافی شاپ میں بیٹھی اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے ساتھ اس کے جرمنی جانے کے حوالے سے بھی پوچھ رہی تھیں۔

''تم امی کی فکر مت کرنا......ان کے پاس میں روز چلی جایا کروں گی۔'' ریبال کے ہاتھ پر وہ اپنا ہاتھ رکھ کر اسے یقین دلاتی ہوئی بولی تھی۔

ریبال کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی۔

''تم بہت اچھی دوست ہو۔ میرے کہنے سے پہلے ہی تم نے میرے اندر کا حال جان لیا۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ مسکرا کر یونہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس کے اندر اداسی آ کر ٹھہر گئی تھی ایک مخلص دوست جو بہت دور جا رہا تھا گو کہ دو سال کوئی طویل عرصہ نہیں تھا لیکن جہاں روز کی ملاقات تھی وہ اب کافی عرصے بعد ہونی تھی اور اس عرصے میں کیا کچھ بدلنا تھا اس سے وہ خود بھی ناواقف تھے۔

''تم وہاں جا کر مجھے فون تو کرو گے ناں......؟''

قدرے توقف کے بعد تشمیرہ نے دل میں آئے سوال کو زبان دی تو وہ چونک کر اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگا۔

''بھلا کیوں......؟''

''صرف اس لیے کہ کہیں ہم دونوں ڈگمگا نہ جائیں۔ جہاں ہم اتنا ساتھ رہے ہیں وہاں ہم سے یہ دوری برداشت نہ ہو۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔ روز بات ہوگی تو دور ہونے کا احساس بھی کم ہوگا اور پھر کب وقت گزرا ہمیں......'' تشمیرہ نہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ ایک دم ہی ہونٹ بھینچ کر نظریں جھکا کر میز کی سطح انگلی سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی۔ وہ تشمیرہ کو دیکھنے لگا اس کا دل چاہا کہ وقت یہیں ٹھہر جائے اور وہ اسے یونہی دیکھتا رہے لیکن پھر اپنے اس خیال کو جھٹک کر وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''چلو دیر ہو رہی ہے۔'' وہ کچھ نہیں بولی بہت خاموشی سے اٹھ کر اس کے ساتھ چلتی ہوئی پوائنٹ تک آئی تھی۔ پوائنٹ میں سوار ہونے سے پہلے اس نے ایک نظر ریبال کو دیکھا تھا نہ جانے کیا تھا اس کی نظروں

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



میں ریبال کو اپنے دل کی دھڑکن کچھ عجیب سی لے
الاپتی محسوس ہوئی۔ جبکہ دوسری طرف تشمیرہ کی کیفیت
بھی اس سے کچھ الگ نہیں تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے
وہ اپنا بہت کچھ ریبال کے پاس چھوڑ آئی ہو مگر کیا یہ وہ
جاننے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

محبت ایسے ہی ہوتی ہے، بے نام سی
کیفیت...... بے آہٹ دل کے دروازے پر دستک
دے کر تمام راستوں پر چلتی اپنا نام لکھ کر خود کو منواتی
ہوئی زندگی میں شامل ہو جاتی ہے اور ایسے جیسے اس کے
بغیر دنیا میں کچھ بھی نہ ہو یا اس سے پہلے انسان زندہ ہی
نہ ہو...... وہ انسان کی شخصیت کے ساتھ اس کے آس
پاس کی بھی ہر چیز بدل دیتی ہے۔

ریبال حسن پر جرمنی جانے سے کچھ دن پہلے ہی
یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ تشمیرہ بانو سے دل کی گہرائیوں سے
محبت کرتا ہے اور اب سے نہیں شاید تب سے یہ محبت
اس کے اندر پنپ رہی تھی جب سے اسے وہ پہلی دفعہ
جانا تھا یعنی یونیورسٹی کے پہلے سال سے مگر یہ انکشاف
اس پر اب ہوا تھا مگر وقت کی ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اسے
بتا نہیں سکتا تھا۔

جس انسان سے ہم بہت ساری دوسری باتیں
کر جاتے ہیں اسی سے ہم یہیں آ کر مات کھا جاتے ہیں
کہ ایک لفظ محبت کہتے ہوئے شرم، لحاظ اور نہ جانے کیا
کچھ درمیان میں آ کر ٹھہر جاتا ہے اور یہی ریبال کے
ساتھ بھی ہوا تھا۔

وہ اس وقت اپنا بیگ پیک کرنے کے ساتھ
مسلسل جھنجلا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں اپنی ہی کیفیت نہیں
آ رہی تھی۔ یعنی جرمنی جانا بھی چاہ رہا تھا اور
نہیں بھی......

''امی کہاں ہیں؟'' وہ کمرے سے نکل کر
برآمدے میں آ کھڑا ہوا، امی نے کچن کی کھڑکی سے
اسے دیکھا اور اس کے لیے چائے کپ میں ڈال کر اس
کے پاس چلی آئیں۔

''لو چائے پیو...... آ گئی میں...... دو گھڑی صبر
نہیں کر سکتے۔''

''اچھا...... چلیں اندر چل کر میرے پاس
بیٹھیں...... ویسے بھی دو دن بعد میں چلا جاؤں
گا۔'' امی ایک دم سے افسردہ ہو گئیں۔

''میں روز فون کروں گا اور میری غیر موجودگی
میں تشمیرہ بھی آتی رہے گی اور پھر وقت گزرتے پتا
تھوڑی چلے گا کب دو سال گزر جائیں گے۔'' وہ ان کا
ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

''اور پھر تشمیرہ کے لیے تیرا رشتہ لے کر جاؤں
گی۔'' وہ ایک دم سے ٹھٹک کر امی کو دیکھنے لگا اور اسے
اندازہ نہیں تھا کہ امی اتنی جلدی اس کے دل کی بات
سمجھ جائیں گی۔

''تشمیرہ اور میں صرف دوست ہیں۔'' وہ ان کی
بات پر نظریں چرا کر بولا۔

''اسی دوستی کو ہی تو مضبوط رشتے میں باندھنے کا
سوچ رہی ہوں۔ دیکھو تو میں بھی کتنی پاگل ہوں۔ اس
کے روز، روز میسج اور فون کال سے کبھی اندازہ نہیں
ہوا۔'' امی نے ہلکے پھلکے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے امی...... پسند صرف
میں اسے کرتا ہوں یا وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے اس
بات کا میں نے اندازہ لگایا ہے اور نہ ہی پوچھا ہے۔''

''تو پوچھ لو، دیر کیوں کر رہے ہو؟''

''پوچھ لوں گا...... جب واپس آؤں گا۔'' وہ کہہ
کر مسکرا کر انہیں دیکھنے لگا۔ ''اب جلدی سے میری
تیاری مکمل کروا دیں۔''

''اچھا چلو۔'' امی کہہ کر ریبال کے ساتھ کمرے
میں چلی آئی تھیں جبکہ دوسرے ہی لمحے اس کا موبائل
فون بجنے لگا تھا۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور
اسکرین پر فون نمبر دیکھ کر کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی لیکن
موبائل دوبارہ بجنے لگا تھا۔ اور وہ واقعی اس کال پر
بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔

(باقی آئندہ)




# ہنسنا منع ہے

امِ مریم طیفور

"او...... بیڑا غرق! ابل گیا، پکڑ، پکڑ اسے پکڑ بھی۔" اماں نے بڑی کوشش کی تھی کہ دودھ کو پکڑ سکیں پر وہ دغا دے گیا تھا۔ جتنی تیزی سے وہ کچن میں داخل ہوئی تھیں سانس الگ چڑھ گئی تھی۔ کچھ لمحے تاسف سے ضائع شدہ دودھ کو دیکھا پھر "رخِ پُر غضب" چولہے کے بالکل پاس دھرے پیڑھے پہ بیٹھی کشور کی طرف کیا۔

"پھو...... اوپھو۔" اماں کو جب بھی کشور بی پر

غصہ آتا تو اسے ماضی کے یادگار نام سے ہی بلاتی تھیں۔

''اَنّی...... (اندھی) ہوگئی ہے کیا......؟ دیدوں میں سلائیاں پھیر کر بیٹھی ہے، جو ابلتا دودھ تجھے نظر نہ آیا؟ ڈڈو جیسے پھٹے ہوئے ڈیلے ہیں پر مجال ہے کوئی کام ڈھنگ سے بھی کر لے...... لے کے سارا دودھ برباد کر دیا۔ چولہے کا ناس مارا سو الگ......'' اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کشور کا سر ہی چولہے میں دے ماریں، تاؤ کم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔

''اماں...... یہ پھو کس کو کہا ہے؟'' شاید دودھ اوپر گر جاتا تو کشور اتنا نہ بلبلاتی۔ جتنا اماں کے پھو کہنے پر تڑپی تھی۔ ''ہزار بار کہا ہے میرا صحیح نام بلایا کرو...... پر نہ جی، دنیا چاند پر پہنچ گئی پر ہم ابھی تک پھو، پوپے اور پیچھے سے باہر نہیں آئے۔ بدلو اماں، بدلو خود کو...... اب آپ وہ پرانی اماں نہیں رہی ہو۔ پنڈ سے شہر آچکی ہو، اب دودھ ابلنے پر پنڈ والی اماں کی طرح واویلا نہ کیا کرو...... بلکہ......''

''تاں...... رولا نہ ڈالوں تو کیا کروں......؟ بتا...... بتا ذرا......'' اماں نے کشور کی بات کاٹ کر خطرناک تیوروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے اماں...... بس صافی لے کر چولہا صاف کر لو، اللہ، اللہ خیر صلا۔'' کشور نے نادر مشورے سے نوازتے ہوئے پھر سے سابقہ مشغلے کی طرف توجہ دی۔ وہ پچھلے دس منٹ سے ہاتھ، بازوؤں اور پیروں پر لیموں رگڑنے میں مصروف تھی۔ اماں غصے سے بڑبڑاتی چولہا صاف کرنے لگیں۔ انہیں خفا، خفا سا دیکھ کر کشور پیڑھے سے اٹھی۔ دونوں پاؤں چپلوں کے اوپر جمائے اور گھسو گھسو کرتی چولہے کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''لاؤ اماں! خفا کیوں ہوتی ہو؟ لاؤ میں صاف کر دیتی ہوں۔'' اس نے لیموں سے سنے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے جنہیں اماں نے زور سے پرے جھٹک دیا۔

''پرے مر......!'' ''کم ناس مارے'' ہاتھ لے کر آگئی۔ رہا سہا دودھ بھی غارت ہو جائے گا جو ہلکی سی چھینٹ بھی پڑ گئی تو...... نکل اِدھر سے نہیں تو تجھے لیموں کی طرح نچوڑ دوں گی۔''

''ہاں اماں! آپ واقعی نچوڑ سکتی ہیں، گاؤں کی جم پل (پلی بڑھی) ہیں۔ مجھ جیسی ''شہری دوشیزہ'' کی ''دیسی پہلوان'' کے آگے کیا اوقات......''

''دفع ہو جا پھو...... نہیں تو بیچ میں سر کھول دوں گی تیرا......'' اماں نے غصے سے دودھ میں لتھڑی صافی سنک میں دھونے کے لیے پٹخی۔

''اماں، اماں یہ دیکھو ذرا...... اے اماں...... ٹونٹی بند کرو پہلے میرے بال دیکھو ذرا۔ مجھے لگتا ہے اس دفعہ پرویز سے جو دہی آپ نے منگوایا ہے وہ دو نمبر ہے۔ منحوسوں نے شاید صمد بونڈ ڈالنی شروع کر دی ہے اس میں...... یہ دیکھو تو......'' کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر کشور کی آواز ابھری تھی اور تنگ آکر اماں نے ٹونٹی بند کی پھر مڑ کر کشور کو دیکھا تو یک دم جو ہنسنا شروع ہوئیں تو لال سرخ ہو گئیں۔ بڑی مشکل سے پیڑھے پہ بیٹھیں...... اماں کا مثانہ کمزور تھا اور ایسے ہی کسی نازک موقع پر اکثر ہنس ہنس کر ان کے کپڑے خراب ہو جاتے تھے۔ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر کشور کی آواز ابھری تھی اور اس وقت بھی کشور جس شکل میں ان کے سامنے تھی اس نے ان کی حالت عجیب سی کر دی تھی۔ پہلے تو کچن میں دودھ ابلنے کی افراتفری اور غصے نے انہیں کشور کو دیکھنے کی فرصت کب دی تھی اور اب جو فرصت سے دیکھا تو قہقہے تھم نہیں رہے تھے اور کشور شدید پریشانی کے عالم میں اپنے بالوں کے اکڑاؤ پر غور کر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی اماں پہ بھی غصہ آرہا تھا جو بجائے اس کی مشکل آسان کرنے کے اس پر ہنسے جا رہی تھیں۔ پتا نہیں گڑبڑ کہاں پہ ہوئی تھی۔ کسی ڈائجسٹ میں سے حسن نکھارنے کے نسخے لیے تھے، جن کو آزمانے کا موقع آج کشور نے ڈھونڈ نکالا تھا۔ آسان سے تو نسخے تھے۔ بالوں پہ دہی میں تھوڑا سا سرسوں کا تیل مکس کر کے لگایا تھا اور چہرے پر خالص شہد کا ماسک...... پھر مسئلہ کیا تھا؟ بال یوں اکڑے

جارہے تھے جیسے کرنٹ لگا ہو۔ چھوٹی، چھوٹی پہاڑیاں کشور نے خود ابھی بنا چھوڑی تھیں۔ جب انگلیوں کی پوروں سے بالوں کو کھینچ کھینچ کر ان کے اکڑاؤ کی وجہ معلوم کر رہی تھی۔ جبکہ چہرے پر بھی عجیب پیلی سی چپچپاہٹ چپکی ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ کشور اپنے بھیانک منہ سے رونے کی بھیانک آواز نکالتی اماں نے بہ مشکل ہنسی روک کر قریب پڑی ڈوئی اٹھا کر اس کی پنڈلی پر دے ماری۔ کشور نے تڑپ کر پنڈلی تھام لی تھی۔ اماں کی ڈوئی نے وقتی طور پر ہی سہی کشور کا دھیان اس کے بالوں سے ہٹا دیا تھا۔

”بہ مر جا بیٹے...... جا کر ذرا بوتھی دیکھ شیشے میں۔ عقل کی اَنّی تو نے نسخے پٹھے (الٹے) کر دیے ہیں۔ عقل تو تیری ویسے ہی چولہے میں ڈالنے جوگی ہے۔ جو الا بلا پڑھتی ہے، تھوتھنی پہ مل لیتی ہے ناں...... ذرا بتا مجھے ملا کیا ہے تو نے اپنے جھاٹے میں اور بوتھے پر۔“ اماں رج، رج ہنسنے کے بعد کافی حد تک نارمل ہو چکی تھیں اور نارمل حالت میں اماں ”غضبناک“ ہی رہتی تھیں۔

”اماں...... ! دہی میں سرسوں ملا کر لگایا ہے بالوں میں۔ لکھا تھا خشکی دور ہوگی اور بال ریشم کے لچھوں جیسے ہو جائیں گے اور منہ پر گلابی پن لانے کے لیے شہد لگایا تھا۔ پر مجھے لگتا ہے میرے بال ریشم کے لچھوں جیسے نہیں، چولہے کی بتیوں جیسے وٹے گئے ہیں۔“

”باؤلے! ریشم کے بال تو آپ ناریل کی چھال سے بنے لگتے ہیں، تجھے کیوں اتنے پسند آ گئے؟“ اماں کے لہجے میں حیرت در آئی تھی۔ ریشم دو گھر چھوڑ کر ہی رہتی تھی جو اپنے انتہائی گھنگرالے اور روکھے بالوں کی وجہ سے جانی جاتی تھی۔

”ناں اماں، مجھے کیا ڈینگی ہو گیا ہے جو میں ریشم کے ”للیے کی جت“ (چھترے بکرے کی کھال) جیسے بال پسند کروں گی۔ میں نے اصل ریشم، دھاگے جیسی نرمی اور ملائمت کی بات کی ہے اماں......“ کشور کو ریشم پڑوسن کے حوالے نے پتنگے لگا دیے تھے۔

”بچ...... چل فیر پتر باہر کمرے پہ چل۔“ اماں نے کشور کو طنزاً پچکارا...... ”چل کے سر دھلوا لے مجھ سے کیونکہ ابھی تیری دادی کمرے سے باہر آ گئی اور تیری یہ جو ملنگوں جیسی موٹی، موٹی لٹیں بنی ہوئی ہیں ناں، دیکھ لیں ناں تو میرا پتر اس نے انہیں تیلی دکھا دینی ہے۔ تجھے پتا ہے تیری دادی کو تیلیاں لگانے کا کتنا شوق ہے اور کچھ تو لگ بھی بتیوں والا چولہا ہی رہی ہے۔“ اماں پھر ہنس، ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگیں تو کشور پاؤں پٹختے ہوئے خود ہی سر، منہ دھونے چل دی۔ کیونکہ دادی کی نظر میں واقعی وہ نہیں آنا چاہتی تھی۔ انہوں نے شہد اور دہی جیسی قیمتی چیزوں کے زیاں پر رات سونے تک ”میرے پتر کی کمائی، میرے پتر کی کمائی“ کرتے رہنا تھا۔

☆☆☆

بڑی مزے کی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کشور صحن میں چارپائی پر دراز تکیے کی طرف سر لٹکائے لیٹی دادی کے سر پر بھر بھر کے مہندی تھوپ رہی تھی۔ ایک یہ شوق ایسا تھا جو شدید سردی میں بھی دادی کا جاتا نہیں تھا۔ چاہے گردن اکڑ اکڑ جاتی پر بال ضرور رنگتی تھیں۔

اور کشور مہندی لگانے سے سخت چڑتی تھی لہٰذا تقریباً نیند سے اونگھتی دادی کو مہندی سے ”تھپڑتے“ کا شوق پورا کر رہی تھی۔ قریب ہی اماں شلجم کاٹ رہی تھیں مگر کشور کو روک ٹوک نہیں کر رہی تھیں کیونکہ ساس کی حالت دیکھ کر خود کو بھی مزہ آ رہا تھا۔ بس ہنسی روک رکھی تھی، مبادا ساس جاگ جائیں، ویسے بھی اماں کے دو ہی تو شوق تھے۔ بے تحاشا غصہ کرنا اور بے تحاشا ہنسنا۔

چھپ کی آواز کے ساتھ کشور مہندی ہاتھ میں بھر کر دادی کے سر پر مل دیتی تھی۔ مزیدار دھوپ کی گرمائش دادی کو نیند کے گہرے جھونکے میں لے گئی تھی اور یہ بہترین موقع تھا کہ جی بھر کر دادی کا مہندی لگوانے کا ارمان پورا کر دیتی تا کہ آئندہ دادی کم از کم کشور کو مہندی لگانے کا فریضہ نہ سونپتیں۔

سر پر مہندی کا رقبہ بڑھا کر بھنوؤں تک پھیلا دیا۔

کان تو پہلے ہی "مہندی کی ٹوپی" میں گم ہو چکے تھے۔

اماں نے شلجم کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے ساس کا جائزہ لیا جن کو ایک نظر دیکھنے میں یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے موٹی اونی ٹوپی کو اچھی طرح سر پر اوڑھے دھوپ انجوائے کر رہی ہیں۔ بس ٹوپی ذرا کھینچ کر ماتھا اور کان ڈھکنے کا اہتمام بھی کر لیا تھا۔ اتنی سی بات تھی...... اماں کے ہونٹ ہنسنے کے اسٹائل میں پھیلتے دیکھ کر کشور نے گھورا تھا۔ کیونکہ اگر خدانخواستہ مہندی خشک ہونے سے پہلے دادی اٹھ جاتیں تو جوتے تو پڑتے ہی (جن کی کشور کو پروا نہیں تھی) مگر رنگ چڑھنے سے پہلے ہی دادی سر دھو لیتیں۔ تو اتنا رسک لینے کا فائدہ بھلا کیا ہوتا؟ کوئی اور وقت ہوتا تو اماں، کشور کی گھوری پہ یقیناً اس کی آنکھیں نکال دیتیں۔ پر اس وقت ہنسی کنٹرول کرنا ضروری تھا کیونکہ بڑا شغل ہاتھ آنے والا تھا۔ بڑی مشکل سے کشور کو کٹے ہوئے شلجم کی ٹوکری اشارے سے کچن میں لے جانے کو کہا اور خود کھڑی ہوتی گھٹنے سے گھٹنا جوڑتی باتھ روم روانہ ہوئیں۔

☆☆☆

دوپہر کا ایک بجنے والا تھا۔ ساڑھے گیارہ کا ٹائم تھا۔ جس وقت کشور مہندی تھوپ کر ہٹی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹا ہو چکا تھا۔ دادی کے مہندی لگے۔ لال، لال رنگ تو یقیناً پکڑ ہی لیا ہوگا ماتھے اور کانوں کی جلد نے، کشور نے کچن کے جالی والے دروازے سے دادی کو دیکھ کر سوچا۔ ساتھ سلاد کے لیے باریک، باریک پیاز کترتے اس نے دادی میں نیند سے جاگنے کے آثار محسوس کر لیے تھے۔ اسے پتا تھا دادی ابھی کچھ دیر مزید لیٹیں گی، سر کی مہندی خشک کرنے کے لیے۔ پھر قریب ہی صحن کے نکڑ پہ بنے کمرے پر جا کر سر دھو لیں گی۔ کشور کی نظر نے بے چینی سے اماں کو ڈھونڈا جو اسے برآمدے میں تخت پوش پر بیٹھی اپنا اور دادی کا سوٹ کاٹتی نظر آئیں۔ اماں نے کپڑے بدل لیے تھے، یقیناً اماں کا مثانہ پھر دغا دے گیا تھا۔ کشور نے سکون کی سانس لی کیونکہ ایک دفعہ اماں کپڑے بدل لیتیں تو مزید نہیں ہنستی تھیں۔ شاید دادی ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ تمہاری ماں ہنستی ہی کپڑے بدلنے کے لیے ہے۔ ہاہاہا...... اسے کچن میں کھڑے ہنسی آ گئی۔ ابھی وہ مزید ضرور ہنستی اگر کوئی زور، زور سے گیٹ نہ دھڑ دھڑاتا۔

کشور نے گھڑی کی سمت دیکھا، ٹائم تو ابا کے آنے کا تھا مگر گیٹ کھلوانے کا انداز ابا کا نہ تھا۔ اس نے تجسس سے گیٹ کی سمت دیکھا جسے اماں کھولنے جا چکی تھیں جبکہ دادی بھی ٹانگوں سے کمبل ہٹا کر اٹھ کر بیٹھ چکی تھیں۔

"کیا ہوا جی...... ! خیر تو ہے پوپے کے ابا......؟" دروازے پہ واقعی ابا ہی تھے اور ان کے پیچھے کشور سے سال چھوٹا شاہد عرف پوپا تھا۔ دونوں ہی بے حد غصے میں تھے۔ اماں نے جلدی سے موڑھا کھینچ کر ابا کو دیا جبکہ پوپا، دادی کے پاس تک گیا۔ کشور نے جلدی سے پانی کا گلاس بھرا اور جالی والا دروازہ کھولتی باہر نکل آئی اور ابا کو گلاس پکڑاتے ساتھ ہی پوچھ ڈالا۔

"کیا ہوا ہے آپ کو "بابا جان؟" اتنے غصے میں کیوں ہیں آپ؟ لیجیے پانی پئیں۔" جبکہ ابا نے غصے میں ہاتھ مار کر گلاس کو پرے جھٹک دیا۔ جس کی وجہ سے قریب بیٹھے پوپے کو اچھی ٹھنڈ میں تراوٹ پہنچ گئی۔

"یہ جو تو نے مجھے ابا جان سے "بابا جان" بنانے کا سیاپا ڈالا ہے ناں یہ سب اسی کا قہر ہے مجھے۔" ابا نے کشور کو لال، لال آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھی نہیں بابا جان، ہوا کیا ہے؟"

"ابا کہہ ابا...... سمجھی!" ابا جھٹکا کھا کر بولے تھے جبکہ جھٹکے سے کشور بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"کیوں غصہ کر رہے ہیں، ہوا کیا ہے آخر؟ بتائیں بھی تو سہی......؟" اب کے اماں نے پوچھا تھا۔

"جب سے پنڈ سے شہر میں آئے ہیں، اس کڑی نے سیاپا ڈالا ہوا ہے، شہری بنو، شہری بنو۔" ابا نے کشور کی نقل بھی اتار چھوڑی۔ "شروع میں تو میں بھی خوش ہوا تھا "بابا جان" بن کر پر ناں جی...... میرے مرے پیو کی توبہ۔ میں ابا ہی بھلا۔" ابا نے سچ مچ کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"اچھا بھلا میرا حلیہ تھا، گرمیوں میں لُنگی کُرتا اور سردیوں میں شلوار قمیص۔ اسے پتا نہیں کیا تکلیف ہوئی جو میرے لیے "سفری سوٹ" (سفاری سوٹ) پکڑ لائی۔ اور آج صبح زبردستی مجھے پہنایا تھا اس نے......

"بابا جان، پہن لیں ناں...... بالکل محمد علی لگیں گے آپ۔" ایک بار پھر کشور کی نقل اتاری گئی جس پر وہ محض جز بز ہو کر رہ گئی تھی جبکہ پوپے اور اماں کو ہنسی آ گئی تھی۔

"لے دس...... مجھے بھی بھلا باؤلے کتے نے کاٹا تھا جو میں اس کی باتوں میں آ گیا۔ کریانے کی ہٹی ہے میری، اب تو خود سوچ پوپے کی ماں...... اپنی ہٹی پہ میں یہ "سفری سوٹ" پہنے بیٹھا کیسا لگ رہا ہوں گا؟ میری ساری دکھ (شو) کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا اس نے۔ جو بھی ہٹی پہ سودا تلوانے آیا مجھے سر سے پاؤں تک یوں گھور کر گیا جیسے میں اپنے ولیمے کے اسٹیج پر بیٹھا ہوں۔" اماں نے ابا کی آخری بات پہ ناگواری سے پہلو بدلا اور دل میں دو باتیں بھی لگا دیں۔ (بڈھے ہو گئے پر ولیمہ کرانے کا چاہ نہیں گیا، ساٹھے پاٹھے نہ ہوں تو......)

"چلو یہاں تک تو ٹھیک تھا۔" اب کے ابا نے اماں سے نظریں چرائی تھیں۔ "ولیمے والا مذاق تو یار دوست کرتے ہی ہیں پر جب سامنے گلی میں جو امام صاحب رہتے ہیں ناں...... انہوں نے مجھ سے دو کلو چینی تلوا کر میرے کپڑوں کو گھورا تو میں تو مانوں تریلو تریلی (پسینے پسینے) ہو گیا۔ اور پھر جاتے، جاتے مجھے چونڈی (چٹکی) بھی وڈ گئے۔ کہنے لگے۔ "کرم دین اچھا بھلا بندہ ہے تو، نماز بھی میرے پیچھے پڑتا ہے۔ پھر تیری مت کولی (الٹی) کیوں ہو گئی جو دشمنوں کا لباس ٹانگ کر آ گیا ہے۔ صحبتیں تو تیری بھلی ہیں ناں آج کل...... لے دس اب اس عمرے میں نے پیڑے مندے یار تو نہیں بنانے ناں...... بڑی مٹی پلید ہوئی آج تو میری...... تو ایسا کر......" ابا نے اماں کو مخاطب کیا جو کشور کو کینہ توز نظروں سے گھور رہی تھیں جبکہ کشور کا سارا دھیان دادی کی "ٹوپی" کی طرف تھا اور دادی کا سارا دھیان ابا کی باتوں کی طرف تھا۔

"تو ایسا کر مجھے تو کل سے سیدھا، سیدھا شلوار قمیص دے اور یہ جو "سفری سوٹ" ہے ناں یہ تو اپنے نکے کو بھجوا دے۔ وہ طبیعتاً ویسے بھی چھچھورا ہے۔ بڑے شوق سے پہن لے گا یہ سوٹ۔"

"ناں وہ کیوں چھچھورا ہونے لگا۔" اماں کو بھائی کے لیے ایسے القابات انتہائی ناگوار گزرتے تھے، حالانکہ نگینے کی طرح فٹ بیٹھتے تھے۔

"تمہارے وڈے بھرا۔ یعنی اپنے جیٹھ کو نہ بھیج دوں، وہ تو ایک دفعہ پہن بیٹھا تو نہاتے وقت بھی نہ اتارے گا۔ یاد ہے ناں...... پچھلے مہینے جو آپ نے ٹھیلے سے کالی عینک لے کر بھیجی تھی پوپے کے ہاتھ اللہ معافی...... توبہ...... ! حد ہوتی ہے چولیں مارنے کی بھی...... دو دن بعد جب پوپا واپس آیا تھا تو اس نے بتایا تھا مجھے کہ...... اماں، تایا تو رات کو سونے کے وقت بھی عینک نہیں اتارتا۔ صحن میں منجی (چارپائی) ڈال کر، کھوپے (عینک) چڑھا کر سوتا ہے کہ سویرے، سویرے دھوپ تنگ نہیں کرتی، دو دن تو یوں ہی سویا تیسرے دن صبح آنکھ کھلی تو سارے صحن میں رولا ڈالتا پھر رہا تھا۔

"او...... میری آنکھوں میں موتیا اتر آیا...... او...... میرے ربا مجھے معاف کریں، میری آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔" وہ تو پوپے نے ہی اپنی تائی کے کان میں جا کر کہا۔ "تائے کی عینک اترواؤ، اس کے شیشوں پہ کوّے نے وٹھ (بیٹ) کر دی ہے جسے وہ موتیا سمجھ رہا ہے...... میرے بھرا کو چھچھورا کہتے ہیں، اونہہ......" اماں نے جی بھر کر غصہ نکالا تھا۔ ابا کے لتے لینے کے چکر میں تایا کو رگڑ ڈالا تھا اور یہ بات بھلا دادی کو کیسے ہضم ہوتی، تبھی بہو کو للکارا۔

"اے فضیلت...... منہ سنبھال، نہیں تو منہ میں وٹے (پتھر) ڈال دوں گی...... بجھی۔ بڑی آئی میری پتروں کو پُنڈنے (چھاننے) والی۔ اپنی کڑی کو لگام ڈال، شہری بننے کے چکر میں سبھی کے دماغوں کے ڈھکن مونڈے (الٹے) مار رہی ہے۔ لے دس۔ اچھا بھلا بیبا میرا پتر جس کو سویرے افلا (بگلا) بنا کر بھیج چھوڑا ہٹی پر۔"

دادی نے بروقت ابا کو کمک پہنچائی تھی۔ جوابا ابا نے ایسی نظروں سے اماں کو دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں اب بول۔"
"وے پوپے۔" اب کے دادی نے پوپے (شاہد) کو جھنجوڑا۔
"تجھے کیا تکلیف ہے...... منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟ تیرے نانکوں میں کوئی مرگ ہوگئی ہے...... ہاہاہا......" دادی کو اماں کا میکا مارنے کا بڑا شوق تھا۔
"کچھ نہیں دادی، اپنی تو عزت ہی تار، تار ہوگئی آج۔ کچھ باقی نہیں رہا۔ کسی کو منہ نہیں دکھا سکوں گا اب۔ زندگی سے دل اچاٹ ہوگیا میرا تو۔"
"ناں...... مجھے بتا تو ابے کے ساتھ ہٹی پہ گیا تھا یا سینما دیکھنے؟ شکل تیری "کاں" (کوا) جیسی اور ڈائیلاگ بول رہا ہے تو دلیپ کمار کے۔" دادی نے پوپے کی شکل پہ چوٹ کرکے اس کی گردن پہ پیر دھرا تھا۔
"دادی، ہزار بار کہا ہے مجھے کاں نہ کہا کریں، میرے یار بیلی مجھے وحید مراد جیسا "نمکین" کہتے ہیں۔" پوپے نے فخر سے گردن اکڑائی۔
"آہو...... کالے نمک جیسا نمکین......" اب کے کشور نے لقمہ دیا تھا۔ نتیجتاً دادی، پوپا، ابا اور اماں چاروں کی قہربار نظریں اکٹھی اس پر پڑی تھیں۔
"اسی کی وجہ سے دادی۔" پوپا ایک دم کشور پر انگلی تان کر ابا کی طرف پیٹھ کیے کھڑا ہوا تھا۔ جسے کسی وجہ سے ابا نے پینٹ سے کھینچ کر بٹھایا تھا۔
"اس نے دادی، اس نے مجھے یہ نئی پینٹ لاکر دی تھی کہ آج کل لاہور میں فیشن ہے۔ کولھوں سے نیچے گری ہوئی پینٹ کا...... پر دادی...... قمیص اس نے مجھے پیچے کی پہننے کو دے دی تھی۔ جو مجھے چھوٹی تھی اور آج جب میں ہٹی سے کسی کام کو باہر نکلا تو سب مجھے دیکھ، دیکھ کر ہنسنے لگے۔ پہلے تو مجھے پتا نہیں چلا پر جب محلے کے بچے اکٹھے ہوکر میرے پیچھے لگے تو میں کھٹک گیا۔ اب مجھے کیا خبر تھی کہ میرے "پچھواڑے" کیا چل رہا ہے؟ وہ تو جب ریاض درزی نے ہانک لگائی ناں...... اُف مت پوچھیں دادی...... مت پوچھیں۔ اس کشور کی وجہ سے آج میرے پچھواڑے کیسا اندھیر مچا ہے۔ وہاں کون تھا، جو مجھے پر ہنسا نہیں...... اور یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ یہ مجھے ایسی پینٹ لاکر دیتی، نہ میری چٹی چادر کو داغ لگتا۔" پوپے کے جذباتی اسٹائل میں جاری کیے گئے بیان نے کشور کی زبان پر پھر کھجلی کرڈالی تھی۔
"میرا کوئی قصور نہیں ہے شاہد......" کشور پوپے کو اصل نام سے ہی بلاتی تھی۔ "یہ تم اماں سے کہو، جو تم دونوں بھائیوں کو پندرہ، پندرہ روپے والے لال اور پیلے "جانگیے" لاکر دیتی ہیں...... میں تو خود بڑا منع کرتی ہوں مگر میری......" دادی کی دہاڑ نے کشور کا منہ بند کردیا۔ جس کے نزدیک قصور اب بھی "گرتی پینٹ" کا نہیں تھا۔
"تو بک بک بند کر، تو نے ہی سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ تو خود کتنی شہری ہے۔ شکل سے ہی اپلے تھاپنے والی بھنگن لگتی ہے۔ شرم نہ آئی تجھے بھائی کو آدھا کجا (ڈھکا) اور آدھا ننگا بازار بھیجتے ہوئے اور پیو کو بگلا بنا کر......" ابا جو غصہ نکال لینے کے بعد بڑی حیرت سے دادی کی شکل کافی دیر سے دیکھ رہے تھے، خود کو بچوں کے سامنے ایک بار پھر بگلا بنائے جانے پہ تڑپ اٹھے۔
"کیا اماں تو بھی...... اب بس بھی کر...... مجھے بگلا کہے جارہی ہے، ذرا یہ بتا...... اپنے ساتھ تو نے کیسا ظلم کیا ہے؟ کیا سارے محلے نے آکر تجھے مہندی تھوپی ہے جو سر پہ جگہ نہیں رہی تو منہ بھی لپیٹ میں لے لیا۔" ابا نے کامیابی سے دادی کا دھیان بگلے سے ہٹا کر اُن کی خود کی طرف موڑا تھا۔
"کیا ہانک رہا ہے پتر......؟ دماغ کو بستی (بے عزتی) تو نہیں چڑھ گئی تیرے......؟ مجھے کیوں پورے محلے نے مہندی لگائی تھی بھلا...... یہ تو میں نے چھو سے ہی لگوائی ہے۔" کشور کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے، جتنی مرضی کوشش کرتی تھی چھو کا دم چھلا ہٹانے کی مگر ناکام رہتی...... پر اس وقت متوقع "چھترول" سے بچنے کے لیے کھسکنے میں ہی عافیت تھی۔
"او...... پوپے جا ذرا پتر...... شیشہ تو لے کر آ ذرا۔ تیری دادی کو اس کے درشن کراؤں۔" ابا نے

سکون سے کرسی سے کمر ٹکاتے پوپے سے کہا۔ اماں بھی چپ چاپ کھانا لگانے کی خاطر کچن میں کھسک لی تھیں، پوپا شیشہ لے کر آیا اور لہرا کر دادی کے سامنے کیا۔

''ٹن، ٹناں ں ں......لیں دادی نظارہ کریں۔''

پوپا بتیسی نکالتا بولا۔

''کم بجت...... اپنی شکل کیوں دکھا رہا ہے، بھوتنے۔ میری طرف شیشہ کر۔'' دادی اپنی صورت پہچان نہیں پائی تھیں۔

''دادی غور سے دیکھیں، یہ آپ کا ہی رخِ روشن ہے۔'' پوپا برا مانتے ہوئے بولا۔

''او...... تیرا بیڑا غرق کشور...... ہائے میں مر گئی...... چھوتیر استیاناس نکمی...... ہڈ حرام نہ ہو تو...... وڈی آئی تو شہرن...... دیسی ککڑی (مرغی) ہو کر ولایتی بانگیں دینے والی، باہر نکل ذرا......'' دادی پورے صحن میں چکرائی، ہاتھ سے مہندی رگڑ، رگڑ کر اتارے جا رہی تھیں۔ ساتھ، ساتھ کشور کو کوسنے بھی جاری تھے۔

ان کی حالت سے محظوظ ہوتے ابا کب کے انہی کی چارپائی پہ لیٹے دھوپ کا مزہ لینے لگے تھے۔ پوپا کپڑے بدلنے کمرے میں جا چکا تھا۔ جبکہ کشور اسٹور میں لحافوں کے پیچھے دبکی بیٹھی تھی۔

اب اسے دادی کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا وہیں بیٹھے، بیٹھے انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

جمعہ، جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے، اس سارے ٹبر کو ''شوقیہ'' اندرونِ شہر شفٹ ہوئے۔ حالانکہ پنڈ میں بڑا ٹیکا تھا۔ اور ابا پہ کشور کا بڑا ''ٹیکا'' تھا۔ روز کان میں شہر میں رہنے کے فوائد پھونکتی تھی۔ ابا بھی آخر انسان تھے۔ انہیں لگا وہ شہر جا کر واقعی زیادہ باعزت ہو جائیں گے۔ لہٰذا زمینیں بیچ کر ایک دس مرلے کا مکان لیا۔ جانور سارے بڑے بھائی کے حوالے کیے تاکہ ان کی دیکھ ریکھ ہو سکے اور یہ پورا چھ افراد کا کنبہ شہر شفٹ ہو گیا۔ سچی بات تھی شروع میں تو دادی بھی بڑی خوشی، خوشی ساتھ روانہ ہوئی تھیں اور بڑی مسرت سے بے بے...... سے دادی بننا قبول کیا تھا۔ اسی طرح باقی سب افراد نے بھی بخوشی ابا سے ''بابا جان''، پوپے سے شاہد اور پیجے سے پرویز تک کا سفر کیا، پھوکی جون تو پنڈ میں ہی بدل گئی تھی۔ صرف ایک اماں تھی جو ابھی تک اماں تھیں کیونکہ اماں نے کچھ بھی بننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ شروع، شروع میں جب کسی بچے نے لاڈ میں آ کر ماما کی ہانک لگائی بھی تو اماں دوڑی چلی آئیں۔

''آئے ہائے، میں صدقے، میرا ویر آیا ہے؟ کدھر ہے تم لوگوں کا...... ماما۔'' بس اس کے بعد کشور نے اماں پر محنت کرنا بند کر دیا پر اب دادی کو گاہے بگاہے پنڈ کا ہڑکا لگ جاتا تھا۔ کبھی انہیں اپنی مجیں (بھینس) چھترے بکرے، بکریاں اور مرغیاں یاد آنے لگتیں اور کبھی پنڈ والے گھر کا وہ لمبا چوڑا سا ویہڑا (صحن)۔ دادی کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں سب ہی پاس قریب کے پنڈوں میں بستے تھے۔ اماں نے بتیرا کہا کہ اگر آپ کا دل نہیں لگتا تو پنڈ، کسی بھی پتر کے پاس چلی جائیں۔ پر دادی نے بھی اماں کی خواہش پوری کر کے نہ دی۔ انہیں بھی نہ، نہ کرتے شہری سہولتوں کا چسکا لگ گیا تھا۔ جس میں سرفہرست ''کیبل کی سہولت'' تھی۔ فجر پڑھ کر دادی جو ٹی وی کے آگے ٹکتیں پھر ظہر کی اذانوں پہ ہی اٹھتی تھیں۔

پنڈ سے آ کر ابا نے ایک چلتا ہوا جنرل اسٹور خرید لیا تھا، جسے ابا نے مزید اچھی حالت میں کر لیا تھا۔ زندگی ایک مخصوص روٹین پہ سیٹ ہوئی تو کشور نے سب کو ''شہری پولش'' کرنے کا اہتمام کیا۔ لچھوں سے لے کر اٹھنے بیٹھنے تک سب کے انداز و اطوار سنوارنے میں جت گئی۔ اور ابھی تک سب ہی بلاچوں و چرا اس کی باتوں پہ عمل بھی کر رہے تھے جو آج والا واقعہ رونما نہ ہو جاتا۔ اب ابا، اماں، دادی اور پوپا تو شہری بننے کی فہرست سے خارج ہو گئے تھے۔ بچے تھے تو کشور اور سب سے چھوٹا پرویز عرف پیجا...... جو دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور مکمل کشور کا حمایتی و مددگار...... اب دیکھنا یہ تھا کہ اس رسہ کشی میں جیت کس کی ہوتی ہے اور

کون کس کے رنگ ڈھنگ اپناتا تھا۔

☆☆☆

"اے فضیلت...... یہ اپنی کشور اب بیاہ کے لائق ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے تائے کو بلوا کر بات کروں اب...... آ کر لے جائے اپنی امانت......" دادی نے تار پر کپڑے پھیلاتی کشور کو دیکھ کر کہا۔

وہ حسب معمول صحن کے بالکل بیچ چار پائی ڈالے مالٹے چوس رہی تھیں۔ دادی ہمیشہ مالٹوں کو بیچ سے کاٹ کر کالا نمک ڈال کر چوسا کرتی تھیں۔ پھانکیں بنا کر نہیں کھاتی تھیں۔ اسی چار پائی کے ایک طرف اماں بیٹھی پالک کے پتے چھانٹ رہی تھیں۔ دادی کی بات پر انہوں نے نظر اٹھا کر کشور کو دیکھا جبکہ دوسری طرف کشور نے بھی منہ پھیر کر دادی پر ایک نظر ڈالی مگر جلدی سے رخ واپس موڑ لیا تھا۔ جب سے دادی کے منہ کو مہندی کا رنگ چڑھا تھا کشور، دادی کو دیکھنے سے گریز ہی کرتی تھی۔ کیونکہ انہیں دیکھ کر ہنسی روکنا محال ہوتا تھا اور وہ بڑی مشکل سے پہلے ہی دادی کے عتاب سے بچ پائی تھی۔ اس وقت بھی اس نے بہ مشکل اپنی ہنسی دبائی تھی۔ پیلی چمکتی دھوپ میں بیٹھی دادی، دادی کا چمکتا "مالٹے" رنگ کا منہ اور منہ سے لگا آدھا کٹا مالٹا ہنسی نہ آتی تو اور کیا ہوتا...... حیرت تھی کہ اماں بغیر ہنسے کس طرح بیٹھی تھیں۔

"ہاں بے بے...... میرا بھی یہی خیال ہے کہ پاکرم داد کو بلوا کر کشور اور آصف کے بیاہ کی بات کر دینی چاہیے۔" اماں کی سوچتی نظریں پھر بیٹی پر آٹھہریں۔

"میں تو کہتی ہوں کہ چڑھے چاند کی تاریخ دے دیں گے، کون سا غیروں میں جا رہی ہے جو ستر سیاپے کرنے ہیں، اپنوں میں جا رہی ہے، چار جوڑے دے کر ٹھیل دینا (جان چھڑانا)۔" دادی کو کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

"نہ بے بے وہ کیوں......؟ ٹھیلنا ایویں ہی ہے، میرے کون سے درجن بال ہیں، تین تو بچے ہیں اور اکو اِک کڑی...... اس کو بھی مغر ولا دوں۔" اماں کو دادی کا جان چھڑانا فقط نہیں بھایا تھا۔

"ناں، تو کس نے کہا تھا کہ تین ہی جم (پیدا) کے ہاتھ جھاڑ بیٹھ...... ہوتی تو میرے وقت کی تو تجھے پتا چلتا۔ تین بچے ہونا کتنی نموشی (بے عزتی) کی بات ہے۔" دادی کو اماں کی تھوڑی اولاد کا بڑا قلق تھا۔ ان کے نزدیک کم از کم بچوں کی تعداد چھ مناسب تھی۔ ہاں جو اس سے تجاوز کر جائے تو وہ "زندہ باد......"

"ناں تو بے بے! میرے ہاتھ اختیار میں ہے کیا؟ شکر ہے اللہ کا، بے اولاد تو نہیں ہوں ناں......"

"تو اور کیا دادی......" کشور چھپاک کی آواز کے ساتھ تولیا پانی سے بھرے ٹب میں پھینک کر میدان میں کودی...... انداز تقریر والا تھا۔

"بہت ہو چکا ظلم و جبر دادی! اب وہ دور لد گئے۔ جب جمعے کے جمعے ایک "نیا کاکا" تکیے کے نیچے سے نکلا کرتا تھا۔ عورت کو مشین سمجھا جاتا تھا...... توبہ...... دے بچے پہ بچہ دے بچے پہ بچہ...... یہ بھی بھلا کوئی زندگی تھی۔ میں تو کہتی ہوں......" ابھی کشور کو کچھ اور بھی کہنا تھا مگر بائیں کندھے سے اماں کا جوتا، چھوتا ہوا بڑی تیزی سے گزرا تھا۔ یہ دیکھ کے دادی کو بھی جوش چڑھا اور بولیں۔

"دے فضیلت! دے جوتے پہ جوتا...... دے جوتے پہ جوتا......" دادی کا بس چلتا تو جس طرح کشور نے ان کا منہ مہندی سے لال کیا تھا۔ ویسے ہی وہ بھی کشور کا کر دیتیں۔ (مگر چپیڑوں سے)

"لے دس...... بے ہدایتی نہ ہو تو...... کیسے منہ پھاڑ کر بچے پہ بچہ پیدا کروانے جا رہی ہے۔ بے شرم نہ ہو تو...... ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ کسی کے گھر جمعے کے جمعے کاکا... ہوتا ہو۔ اور تکیے بھی بھلا کاکے دیتے ہیں؟ پٹھی مت والی نہ ہو تو......" دادی نے اس کی تقریر کا وہی بنا دیا تھا جبکہ کشور کینہ توز نظروں سے دونوں کو دیکھتی کندھا سہلا رہی تھی۔

"اماں سن لیں آپ دونوں، اول تو میری مرضی پنڈ میں شادی کروانے کی ہے ہی نہیں۔ پھر بھی اگر

میرے مقدر ماڑے نکلے اور ایسا ہو گیا تو تایا کو بتا دینا کہ انہیں اپنے پورے ٹبر سمیت شہر آنا ہوگا۔ میرا نہیں گزارہ اب پنڈ شنڈ میں۔'' وہ سخت لہجے میں دادی اور ماں سے مخاطب ہوئی۔

''ناں تیرے بوتھے پہ ستارے ٹنگے ہیں جو تیری ساری فرمائشیں پوری ہوں، چپکی بیٹھی رہ اب۔ اور یوں گلا پھاڑ، پھاڑ کے بولنا بند کر دے۔ نہیں تو تیری آواز بھی...... فلاں جیسی ''کھروی'' (کھردری) ہو جائے گی۔'' انہوں نے ایک مشہور سیاسی خاتون کا نام لیا۔

''اونہہ...... صورت باجیاں، آواز بھائیاں۔'' دادی نے چونکہ کشور سے متاثر ہونا بالکل چھوڑ دیا تھا...... سو خوب لتے لیے۔

''آپ لوگ بھی دیکھ لینا پھر......'' کشور نے غصے میں ٹوٹنی بند کی اور کپڑے یونہی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اگر میں ابا کو شہر لا سکتی ہوں تو سسرال بھی لا سکتی ہوں...... ہاں......'' تن فن کرتی کشور خاتون کپڑوں سے جان چھڑاتی اندر گم ہو گئی تھی۔

''ہو...... ہائے بے بے...... یہ کیا کہہ گئی ہے؟ جے بیچ میں اس نے نہ کر دی تو......؟ یا کل کو سسرال میں بھی پواڑا ڈال دیا، شہر آنے کا...... پھر کیا ہوگا؟ لوگ تو ہمارے سروں میں کھے (خاک) ڈالیں گے۔'' اماں کے لہجے میں فکر مندی جھلک رہی تھی۔

''او تو فکر نہ کر فضیلت، یہ صرف گرج کر گئی ہے، برسے گی نہیں، ہماری تربیت میں کھوٹ نہیں، بچی کڑیاں آپ بستی ہیں، منڈے نہیں بساتیں، دیکھ لیں...... اس کا حال بھی وہی ہوگا......''میں آئی...... بُوگوائی۔''

دادی مزے سے سر دھنتی ہوئی بچ بچ کی آواز کے ساتھ مالٹا چوستے ہوئے بولیں۔

''کیا مطلب بے بے، میں آئی...... بُوگوائی کا؟'' اماں کے سر سے اکثر دادی کے محاورے بغیر قیام کیے گزر جاتے تھے۔

''دیکھ، جب یہ پنڈ میں تھی، تو خوش تھی، اسی ماحول میں رچی بسی ہوئی تھی۔ شہر آئی تو یہاں کے رنگ ڈھنگ اپنا لیے۔ یہ سمجھتی ہے اس نے ہمیں بدلا ہے جبکہ یہ خود ہی ارد گرد کا ماحول اپناتی ہے اور سمجھتی ہے کہ باقی سب کو اپنی مرضی کا ڈھال لیا ہے، بس یہی ساری بات ہے، یہ جدھر جائے گی ویسے ہی ڈھل جائے گی اور ویسے بھی پنڈ میں اب کون سی سہولت ہے جو نہیں ماسوائے گیس کے۔ باقی بجلی شجلی سب ہے، تو فکر مت کر......'' دادی نے اماں کو ان کی بیٹی کی نفسیات سمجھانے کی اپنی سی سعی کی تھی۔ اماں کچھ سمجھی اور نا سمجھی کی کیفیت میں دادی کو ایک اور مالٹا چیرتے دیکھنے لگیں۔ پھر کچھ دیر دادی کے مالٹے گننے کے بعد۔ جو کہ سات تو ضرور بنے تھے اپنی جگہ سے اٹھیں اور کشور کے چھوڑے کپڑے دھونے چل دیں۔

☆☆☆

شادی ہوئی اور بڑے ٹھسے سے ہوئی۔ تایا اور تائی کج وج کے کشور کو بیاہنے آئے تھے۔ تایا کالے کھوپے (عینک) لگانا نہیں بھولے۔ شہری بہو بیاہ لے جانے کی خاطر تائی ساڑی پہن کر آئی تھیں۔ جو ساڑی کم اور دھوتی زیادہ لگ رہی تھی۔ پتا نہیں کس سے بندھوا بیٹھی تھیں کہ ساری فال دائیں ٹانگ کی طرف کھسکی ہوئی تھی اور بائیں طرف سے ساڑی ٹخنے سے اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ تائی نے ساڑی پہلے کب باندھی تھی۔ جو چلنے پھرنے کی پریکٹس ہوتی۔ دو قدم چل کر یوں جھٹکا کھاتیں جیسے کسی نے دھکا دیا ہو۔ دادی کو تو رہ، رہ کر تاؤ آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سب کی نظر بچا کر دادی نے تائی کو ساڑی کے پلو سے کھینچ کر اپنے ساتھ کرسی پر بٹھا دیا اور ڈپٹ کر بولیں۔

''ہیں...... زہرہ! تجھے یہ ''الماس بوبی'' بن کر آنے کو کس نے کہا تھا......؟ اس سے تو اچھا تھا تو خصم کا لاچا پہن آتی، کم از کم ٹور تو تیری سہی رہتی۔ ابھی تو ایسا لگ رہا ہے جیسے تجھے ''قبض'' نے بے چین کر رکھا

ہے۔" یہ کہہ کر دادی خود ہی ہنسنے لگیں۔ جبکہ تائی نے پتر کے ویاہ کے موقع پر ساس کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا۔

سب کچھ بخیر و خوبی ہو گیا۔ کشور خاتون رخصت ہو کر اسی پنڈ پہنچیں، جہاں کی خاک تھیں۔ کچھ زیادہ پرانی بات بھی نہیں تھی مگر کشور کو یوں ہی لگتا تھا کہ وہ تو پیدائشی شہری ہے، پتا نہیں پنڈ میں کیسے رہے گی؟

"نہیں بھی نہیں...... ہولے، ہولے وہ ان سب کو بھی شہر لے آئے گی۔" یہ پروگرام محض اس نے دل میں ترتیب دے رکھا تھا۔

پنڈ پہنچ کر وہ تمام رسمیں ہوئیں جن کا کبھی ماضی میں کشور بھی حصہ رہی تھی۔ ہر بیاہ میں اور رسم میں وہ آگے، آگے ہوتی تھی۔ مگر اس وقت کوفت اور تھکن اعصاب پر پوری طرح سوار تھے۔ کچھ رسمیں ادا کرنے والی عورتوں کے کپڑوں اور سروں سے عجیب سی باس اس کے دماغ کے پیچ کھولے دے رہی تھی۔

آخر تائی کو اس کے حال پر رحم آیا اور اسے کمرے میں پہنچایا... کمرے میں پہنچ کر، اپنے آرام دہ "جہیزی مسہری" پر بیٹھ کر اس نے سکون سے پاؤں پسار لیے تھے۔ اسے نیند کے شدید جھونکے آ رہے تھے کہ جب دروازے پر کھٹکا ہوا۔ وہ فوراً سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ آنے والا آصف تھا۔ کشور نے شہری کڑی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے گردن اکڑا کر اسے دیکھا۔ مگر اس کا دھیان ہی کب تھا کشور پر...... اس کی موٹی، موٹی آنکھوں میں نیند کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

آصف دھپ سے کشور کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ کشور کو پہلی بار زندگی میں تھوڑی شرم آئی۔ آصف نے بڑی چاہ سے اس کا ہاتھ تھاما، کشور نے سر جھکا لیا۔ اسے انتظار تھا کہ آصف اسے اب رونمائی کے طور پر انگوٹھی یا کوئی کنگن، شگن پہنائے گا۔ آصف نے بڑے پیار سے کشور کو پکارا۔

"کشور......"

"جی......" کشور نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"میں آکھیا سو جہنو...... ہون سو جاؤ، سویرے ولیمہ وی کھانا اے......" (میں نے کہا سو جہنو...... اب سو جاؤ صبح ولیمہ بھی کھانا ہے)

اور کشور کا دل چاہا کہ ایک زوردار مکا آصف کے پھولے پیٹ پر مارے جو یقیناً بارات کے کھانے کی وجہ سے ابھر آیا تھا۔ جس وقت رخصتی سے پہلے بارات کا کھانا کھلا تھا۔ تب اس کی سہیلیوں نے اسے بتایا تھا کہ "کشور تیرا دولہا تو لگتا ہے ایک ہفتے کا بھوکا ہے، سب سے پہلے وہی میز کی طرف لپکا ہے اور پر سے شوربے والا سالن چاولوں پر ڈال رہا تھا تو پوری آستین کو سالن میں ڈوبا دے دیا۔"

مگر چونکہ کشور کے دماغ میں اس کی خود کی منطقیں گردش کرتی تھیں لہٰذا فکر کو سوار نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ تو اپنے تئیں پنڈ جا ہی سب کو بدلنے کے لیے رہی تھی۔ آصف کا بارات کی خوراک سے بھرا پیٹ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ نہ صرف کھانے بلکہ بے تحاشا کھانے کا شوقین ہے اور بیوی سے دو میٹھی باتیں کرنے کے بجائے اسے صبح کا انتظار تھا۔ جب وہ ولیمہ ٹھونس سکے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ کسی زوردار بھیانک آواز نے اس کے حواس گم کر دیے۔

"اووووو......"

"اللہ معافی! ڈکار ہے یا ڈرون اٹیک کیا ہے اس بندے نے؟" کشور حیرت میں گم تھی۔ آصف کے بھرے ہوئے پیٹ نے زوردار انگڑائی لی تھی جو بستر پر دراز شیروانی سمیت عنقریب نیند میں غوطہ کھانے والا تھا۔ کشور نے غور سے اس کی شیروانی کے پھڑکتے بٹن کو دیکھا جو عین پیٹ کے اوپر دم گھٹنے کے باعث ہک میں سے نکلنے کو بے تاب تھا۔ کشور کا جی چاہا اس بٹن کو خود ہی کھول کر آصف کے پیٹ کو آرام سے "پھولنے" کا موقع دے۔

"استغفراللہ...... بلڈوزر نہ ہو تو......" شدید کوفت سے اس نے آصف کو اپنے لہنگے سے پرے لڑھکایا تھا اور اس لڑھکانے کے نتیجے میں آصف بیڈ سے نیچے کارپٹ پر لڑھک گیا تھا۔ پر اس راک اینڈ رول

میں بھی کھانے کی خماری کی شدت برقرار رہی تھی۔ کشور نے اسے یونہی چھوڑا اور خود باتھ روم کا رخ کیا۔

☆☆☆

"کشور پتر...... اٹھ جا پتر...... نماز پڑھ لے فجر کی۔ نہیں تو ویلا لنگ جائے گا۔ اور چڑیاں سارا دن بنیڑے پہ بیٹھی تجھے لعنتیں بھیجیں گی۔" تائی کی اپنی ہی منطق تھی۔ روز صبح اسی طرح فجر کے وقت سب کو اٹھاتی تھیں اور جو نہیں اٹھتا تھا تو اس کے حصے کی چڑیوں کو سارا دن بنیڑے پر لعنتوں کے لیے بٹھائے رکھتی تھیں۔

بڑی مشکل سے کشور نے آنکھیں کھولی تھیں۔

آصف تو تہجد کے وقت ہی زمینوں پہ نکل جاتا تھا اور یہ اس کی صفت تھی۔ رات کو کتنی ہی دیر سے کیوں نہ سوتا صبح بانگوں سے بھی پہلے اٹھ کھڑا ہوتا۔ دو ہفتے ہو گئے تھے کشور کی شادی کو اور ابھی تک تائی ہی آصف کو ناشتا کرا کر بھیجتی تھیں۔ ویسے بھی آصف کے لیے بھاری بھرکم ناشتا بنانا کشور کے بس کی بات نہیں تھی۔

کبھی ساگ اور مکئی کی روٹی، کبھی پراٹھے اور لسی...... وہ بھی زیادہ مقدار میں...... خود کشور کو دو ہفتوں سے بھی کچھ کھانے کو ل رہا تھا۔ مگر اسے احساس تک نہیں تھا کہ ناشتے میں چائے رس یا توس کھانے والی کو سسرال کتنا وزنی ناشتا کرا رہا تھا۔

اصلی گھی اور مکھن کا مزہ منہ کو دوبارہ لگ گیا تھا۔

کشور نماز سے فارغ ہو کر چپل اڑستی، شال لپیٹتی باہر صحن میں چلی آئی۔ تائی نے لکڑیوں کے بالن کو آگ دکھا دی تھی۔ اب اس پر پورے ٹبر کے دھڑا دھڑ پراٹھے پکنے تھے۔ پنڈ میں ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ ماسوائے گیس کے...... مگر تایا کے گھر گیس سلنڈر موجود تھا۔ یہ الگ بات کہ تائی اس کا استعمال نہیں کرتی تھیں۔ انہیں سلنڈر سے خوف آتا تھا۔ کبھی کبھار کشور کی جیٹھانی اسے ضرور استعمال کر لیتی تھی۔ کشور کی جیٹھانی ناہید بھی عجب آئٹم تھی۔ سات سال شادی کو ہو چکے تھے اور چھ بچے تھے۔ سال کے سال آبادی میں اضافہ کرتی تھی مگر اب بھی مزید کا کے کھلانے کا چاہ ختم نہیں ہوا تھا۔

ایک بار پھر ہونے والے نومولود کے لنگوٹ تیار تھے۔ ساتواں بچہ تھا پر الٹیاں کر کر کے بے حال ہوئی رہتی۔ جو بھی تھا کھاتی ڈٹ کر تھی۔ کشور کو حیرت ہوتی تھی کہ وہ دو پراٹھے ڈکار جاتی تھی اور پانچ منٹ بعد ہی کھُرے پر بیٹھی الٹ رہی ہوتی۔ بھلا...... اتنا ٹھوستی کیوں ہے......؟ یہ محض کشور سوچ کر رہ جاتی تھی۔

اس وقت بھی گھی کی خوشبو سے بچنے کے لیے ناک پہ شال کا کونہ دھرے اور سب سے چھوٹے پانچ ماہ کے بچے کو گود میں لیے تائی کے بالکل پاس بیٹھی پراٹھا اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔

کشور نے گھڑیاں گننی شروع کر دیں۔ اِدھر ناہید نے دو پراٹھے ختم کرنے تھے اور اُدھر کھُرے کی طرف دوڑنا تھا۔

''ندیدی...... بھلا کھا ہی اتنا جتنا پچا سکے۔ کم بجت، دو پیڑوں کا آٹا کھُرے میں روڑ (بہا) آتی ہے۔'' کشور کو محض جی ہی جی میں تاؤ کھانا آتا تھا۔ پر ظاہر ہے، جیٹھانی کو کھانے سے تو نہیں روک سکتی تھی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد تائی صفائیاں کرانے میں جت جاتیں۔ صفائی کے لیے پنڈ کی ایک میراثن آتی تھی جو تائی کے ساتھ ہانڈی روٹی کرنے میں بھی ہاتھ بٹاتی تھی، چونکہ کشور نے اپنے ہاتھوں کی مہندی ابھی اترنے نہیں دی تھی لہٰذا تائی اسے چولھے کے آگے بیٹھنے نہیں دے سکتی تھیں۔

تائی نے دو گائیں اور تین بھینسیں گھر کے پچھواڑے باندھ رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی جانور تھے۔ پر وہ ڈیرے پر بندھے رہتے تھے۔ تائی اور ناہید خود گھر کے جانوروں کی دیکھ بھال کرتیں اور گوبر اکٹھا کر کے اپلے تھاپتی۔ سامنے صحن کی ایک پوری دیوار اپلوں کی مدد سے بنائے گئے تجریدی آرٹ کا نمونہ تھی۔ جس وقت اپلے تھپتے تھے اگر بچے اسکولوں کو نہ گئے ہوتے تو تمام بچے گوبر پہ ٹوٹ پڑتے تھے اور پھر دیوار کے ساتھ، ساتھ وہ خود بھی اس قدر ہرے، ہرے ہو جاتے کہ ناہید کو ایک نظر میں پہچاننا مشکل ہو جاتا کہ کون سا ''ہرا بچہ'' کون ہے؟

☆☆☆

''مبارک ہو بے بے......'' اماں دائیں چپل، بائیں میں اور بائیں، دائیں میں پھنسائے بھکتے قدموں سے دادی کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

''مبارک ہو بے بے...... بڑی بڑی......'' اب کے دادی نے اماں کو گھور کر دیکھا جو ایک بار پھر اتنا جملہ کہہ کر خاموش ہو گئی تھیں۔

''ناں...... اٹھانوے بار ہور بول...... سو کی تسبیح تو پوری کرنا...... مبارک ہو بے بے، مبارک ہو بے بے بے۔'' دادی نے اماں کے ہی انداز میں نقل اتاری پھر یک دم اچھل کر بولیں۔

''کہیں تیرے پیکے میں کوئی چٹا بال (گورا بچہ) تو نہیں جم بیٹھا...... بھی تو خوشی سے پاگل ہو گئی ہے۔ تیرے پچھلوں کے کالے چکیلے رنگ جو ہوئے ہاہاہا......'' دادی نے بات پوری کر کے ٹھٹا لگایا تھا۔

''خیر بے بے...... ایسی بھی بات نہیں...... میرے پیکے میں اگر کوئی اتنا گورا نہیں تو کاسٹک سوڈا آپ کے ٹبر نے بھی نہیں ملا ہوا...... ہیں تو وہ بھی ڈب کھڑ بے......''

''اتار لیا نہ بدلہ...... تو رہ سکتی ہے بھلا...... یہ جو تیرے بچے اتنے گورے ہیں ناں تو وہ اپنے دادکوں پر ہی پڑے ہیں، ماسوائے پوپے کے، ایک وہی تیرے پچھلوں پر گیا ہے تجھی......؟'' دادی نے ناراض ہو کر پہلو بدلا تھا اور کھری سنا دی تھیں۔

''ہاں، ہاں تبھی تو جب میری جنج (بارات) آئی تھی تو میری سہیلیوں نے مجھ سے کہا تھا کہ فضیلت تیری تو ساری جنج ہی دھوانکی ہوئی ہے۔ میری تو اماں کو فکر پڑ گئی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ بٹی کس یرقان کے مارے خاندان کو پکڑا دی۔'' اماں اپنے میکے کی عزت کی خاطر مبالغہ آرائی کی آخری حدوں کو چھو لیتی تھیں۔

''چپ کر جا، چپ کر جا...... پھولن دیوی کی ہم شکل۔'' دادی کا جلال عود کر آیا تھا۔ ''بھلا میں جانتی

نہیں...... تیری ماں کو سب سرے دانی کہتے تھے۔ بڑی آئی ''چھاننی '' ہو کر ''چھج'' کو مہنے (طعنے) مارنے والی۔'' اب کے جواباً اماں نے کچھ نہ کہا بلکہ منہ پھلا کر رخ موڑلیا۔ چند لمحوں بعد دادی کی ہی آواز پھر ابھری۔

''چل اب منہ سیدھا کر...... غصے میں ویسے بھی تیرا منہ فلاں جتنا وڈا ہو جاتا ہے۔ کہ متھے سے دیکھنا شروع کرو تو بل (ہونٹ) تک آتے، آتے پون گھنٹا مارا جاتا ہے۔'' دادی نے کسی کا نام لے کر اماں کو ہنسانا چاہا تھا اور اماں ہنس بھی دی تھیں۔ انہیں ہنستا دیکھ کر دادی نے فٹافٹ ٹوکا۔

''بس، بس...... تھوڑا ہنسیں! میں نے تخت پوش کی چادر سویرے ہی پوپے کو کہہ کر بدلوائی تھی۔'' اماں، دادی کے ہی تخت پوش پر براجمان تھیں لہٰذا دادی کی تنبیہ لازمی تھی۔

''چل اب بتا بھی دے...... کون سی خوشی کی خبر سنانے آرہی تھی مجھے؟''

''ہاں...... وہ......'' اماں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''باتوں میں لگ کر ذہن سے ہی نکل گیا کہ کہنے کیا آئی تھی۔ وہ اپنی کشور کے گھر منڈا ہوا ہے، کل رات کو۔''

''کیا......؟'' دادی تو اچھل ہی پڑی تھیں۔

''اور تو اب بتارہی ہے، اب بھی رہنے دیتی۔ خیر سے سال کا تو ہولینے دیتی۔''

''میں تو بتانے ہی آئی تھی بے بے...... پر آپ نے ہی میرے پیکے کے لتے لینے شروع کر دیے تھے۔''

''حق ہاہ......'' دادی نے ٹھنڈا ہوکا بھرا تھا۔

''دیکھ فضیلت، وقت کتنی تیزی سے نکل جاتا ہے اور پھر جب کی کشور بیاہ کر گئی ہے، بس ایک واری ہی چکر لگ سکا ہے اپنا۔''

یہ بات واقعی سچ تھی کہ پے در پے کچھ ایسی مصروفیات آڑے آئی تھیں کہ نہ اماں پنڈ جاسکیں اور نہ دادی......

دادی صحن میں گریں تو پنڈلی کی ہڈی فریکچر ہوگئی۔ ابا کو گردوں میں کچھ مسئلہ ہوا تو ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا کہہ دیا۔ پوپا، ہٹی میں مصروف اور چھوٹا بیجا کتابوں میں...... اور اماں ان سب کی دیکھ بھال میں مصروف...... کشور سے محض فون پر رابطہ تھا۔ پھر دائی نے کشور کو خوشی کی خبر دی تو ساتھ ہی سفر سے بھی منع کر دیا۔ کچھ تائی کی وہمی طبیعت نے بھی شہر کا منہ نہ کرنے دیا۔

اور اب جبکہ اللہ نے خوشی دکھائی تھی تو دونوں ساس، بہو کو بری طرح کشور کی یاد ستانے لگی۔ اب تو ابا بھی دوبارہ ہٹی پہ جانے لگے تھے۔ اگر دادی اور اماں بیجے کو ساتھ لے کر چلی بھی جاتیں تو پوپا ابا کی دیکھ بھال کرسکتا تھا۔ ویسے بھی دو دن کی تو بات تھی۔ اماں اور دادی کو تو مانو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ کشور اور اس کے بچے کے لیے کیا، کیا سوغاتیں لے کر جائیں۔ دادی کی خوشی تو دیکھنے والی تھی۔ آخر کو ان کی تیسری نسل کا بچہ تھا۔ اور بوڑھے، کمزور، جسموں میں اگر کوئی چیز حرارت کا موجب بنتی ہے تو وہ اپنی نسل کو بڑھتے پھولتے دیکھنا ہے۔

☆☆☆

تایا کے لمبے چوڑے صحن میں خوب رونق لگی تھی۔ دادی کے پہنچتے ہی ان کے سارے بیٹے اور بیٹیاں تایا کے گھر جمع ہو گئے تھے۔

شدید سردی کے باعث دادی نے کشور اور اس کے بیٹے کو باہر صحن میں لانے سے منع کر دیا تھا کہ سب سے مل ملا کر وہ اور اماں کشور کے کمرے میں ہی چلی جائیں گی۔ گرما گرم دودھ پتی پی کر اور بیسن کا حلوا جی بھر کے کھا کر دادی اور اماں کچھ دیر کمر ٹکانے کے لیے اور کشور سے ملنے کے لیے اس کے کمرے کی طرف چل دیں۔ عورتوں نے باورچی خانے کا رخ کیا اور مردوں نے ڈیرے کا...بیجا بھی دادی اور ماں کے پیچھے ہولیا۔ کمرے کے دروازے کے باہر سے ہی تینوں نے کشور کی آوازیں سنیں جو اپنے بیٹے کے ساتھ لاڈیاں کرنے میں مصروف تھی۔

## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللّٰہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللّٰہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیمُ الحق |
| رفعت سراج | اُمِ مریم | نایاب جیلانی | ایماےراحت |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

''او...... میرا ٹلو...... میرا پیارا ٹلو...... یہ تو سب سے سوہنا ٹلو ہے۔'' تینوں نے بے یقینی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ کشور اور نام بگاڑے...... وہ بھی اپنے بیٹے کا...... وہ تینوں ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ کشور کی نظر پڑی تو بے ساختہ چیختی ہوئی اماں اور دادی کے گلے جا لگی۔ کتنے مہینوں بعد تو ملے تھے سب......

''اماں، دادی میں بہت اداس ہوگئی تھی۔ قسم سے بڑا یاد کرتی تھی، پر پنڈ کے جھمیلے جان ہی نہیں چھوڑتے اور پھر میرے شہر آنے پر بھی روک لگ گئی تھی۔'' کشور بیڈ سے کپڑے سمیٹتی دادی اور اماں کے بیٹھنے کی جگہ بنانے لگی۔ دادی نے تو لیٹنے کی، کی اور لحاف سینے تک اوڑھ لیا اور اماں نے بھی ٹانگیں لحاف میں گھسالیں۔ سیٹ ہو کر دادی کو پوتے کا خیال آیا۔

''ہیں، کشور ذرا منڈے کو تو دے مجھے، رب دی سوں میں تو فیر اک واری جوان ہوگئی ہوں۔'' کشور نے بیٹے کو دادی کی گود میں ڈالا۔

''فیر اک واری کا کیا مطلب دادی؟ آخری دفعہ آپ کب جوان ہوئی تھیں۔'' یہ پیجا تھا جس نے اصل میں کشور کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

''ہائے میں صدقے، میرا ویر...... تو، تو ہور لمبا ہوگیا ہے، کیسا ہے تو پیجے......؟'' کشور، بھائی پر واری صدقے جانے لگی۔ جبکہ پیجے کی آنکھیں پھٹ کر کانوں کو جا لگیں۔

''آپا، تجھے سردی تو نہیں لگ گئی یا پھر تیری... یادداشت ماری گئی ہے کیا؟ پرویز نام ہے آپا میرا، پرویز......'' پیجے نے یاد دلایا تھا۔

''پرویز ہو یا پیجا میرا ویر...... نام سے کیا ہوتا ہے، اصل چیز کام ہے کام، کسی کام سے لگ جائے گا تو نام خود ہی ہو جائے گا۔'' اماں کو تو ہول پڑ رہا تھا کشور کی فلسفیانہ گفتگو سے جبکہ دادی پڑپوتے کو ہاتھوں میں لیے اس سے باتیں کرتی کن انکھیوں سے کشور کو بھی دیکھ رہی تھیں۔

''اور اماں، گھر میں سب کیسے ہیں؟ پوپے اور ابا کو بھی لے آتیں۔ پچی تم لوگ تو بیاہ کر مجھے بھول ہی گئے۔'' کشور اماں سے مخاطب تھی جبکہ اماں کا منہ ابھی تک حیرت سے ادھ کھلا تھا۔ اسی منہ سے ان کی آواز برآمد ہوئی۔

''آئیں گے، سب آئیں گے میری بچی...... پر تو یہ بتا کہ تیرا دماغ تیرے کھوکھے (سر) میں ہی ہے یا کہیں پھینک پھونک بیٹھی ہے۔''

''کیا اماں! میں کیا پوچھتی ہوں اور آپ کی بتاتی ہو...... نواسے کی شکل تو دیکھو۔'' اب کے کشور نے دھیان بیٹے کی طرف کرایا جسے اماں نے دادی سے لے کر تھام لیا۔

''آپا نام کیا رکھا ہے میرے بھانجے کا؟ یقیناً بڑا اچھوتا ہی سوچا ہوگا۔'' پیجے کو پتا تھا کہ کشور کو نئے اور خوب صورت ناموں کا کتنا شوق تھا۔

''خورشید...... خورشید رکھا ہے کیسا......؟'' کشور نے فخریہ بھویں اچکاتے ہوئے بم پھوڑا۔

دادی، اماں اور پیجا پھر سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

''آپا تھوڑا ''ہولا'' رکھنا تھا۔ لگتا ہے پورے پنڈ کے ناموں کا وزن اس اکیلے بیچارے پر لادیا ہے۔''

''او جا اوئے! چنگا بھلا تو ہے...... کیوں اماں؟'' اور اماں نے مروتاً سر اثبات میں ہلادیا تھا جبکہ دادی کا اطمینان قابل دید تھا۔

''اچھا، تو یہ ٹلو کہاں ہے؟'' پیجے کو کسی طور چین نہیں پڑ رہا تھا۔

''یہی ہے! اور کون ہوگا...... اس کا ماما......؟ ہاہا......'' کشور اپنی بات پر دل کھول کے ہنس دی۔

''اللہ نہ کرے آپا...... میں پرویز ہی ٹھیک ہوں، بس ٹلو نام کچھ ہضم نہیں ہوا۔ اس لیے پوچھ لیا، تمہیں تو نام بگاڑنا برا لگتا تھا ناں آپا......؟''

''لگتا تھا...... پر وہ کیا ہے ناں، یہاں پنڈ میں سب کے نام بگڑے ہوئے ہیں، سو اس کا بھی نام سوچا جا رہا تھا کہ خورشید کو کیا کہہ کر بلایا جائے...... اس کی

پھپیاں ''شیدی'' کہہ رہی تھیں...... تایا ''کھرچی'' بول رہا تھا اور چاچا ''شیدا ٹلی''، بلا رہا تھا۔ مجھے ایک بھی پسند نہیں آیا تو میں نے اپنی مرضی سے ''ٹلو'' رکھ لیا۔ سبھی کو بھا گیا۔ کیوں دادی آپ کو کیسا لگا...... آپ بھی تو کچھ کہیں ناں......؟''

''پتر نگینے کی طرح فٹ بیٹھا ہے وڈا ہو کر سارے ٹبر کی ''ٹلیاں'' بجائے گا ہاہاہا......'' دادی نے ہنستے ہوئے سر دھنا تھا جبکہ اماں کو ان کا اطمینان ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ ان کی برداشت ختم ہوگئی۔

''کشور لگتا ہے، دن، رات بھینسوں میں رہ تیرے دماغ کا گوبر بن گیا ہے۔ کہاں تو پنڈ اور اِدھر کے لوگ تیرے وارے میں نہیں آرہے تھے اور اب تو خود ہی ڈنگروں کی طرح ہوتی جارہی ہے۔'' ابھی اماں نے اور بھی لتاڑنا تھا کہ دادی کا تنبیہی ہنکارا سنائی دیا۔

''ہوں...... ہوں......'' پھر کشور سے مخاطب ہوئیں۔

''کشور پتر جا ذرا ایک، ایک کپ دودھ پتی کا اور بنالا...... پنڈ کا پالا (ٹھنڈا) تو گوڈوں میں گھس رہا ہے۔'' کشور کو باہر بھیج کر دادی نے اماں کا مغز ٹھنڈا کیا۔

''اے فضیلت...... قد تیرا مر کر چار فٹ ہوگا پر عقل تیری ہورے کیوں گٹوں میں ہے، حالانکہ سنتے آئے ہیں لمبے کی عقل گٹوں میں ہوتی ہے...... یہ تو بٹی سے کس طرح کی باتیں کر رہی ہے...... یاد ہے اِک واری میں نے تجھے کیا سمجھایا تھا؟'' دادی کا انداز استفہامیہ تھا جبکہ اماں کے چہرے پر ہنوز اکتاہٹ تھی۔

''یاد کر وہ دن جب ویہڑے میں منجی (چارپائی) پر بیٹھ کر گرم، گرم دھوپ سینکتے ہوئے ہم مالٹے چوپ (چوس) رہے تھے۔'' دادی کی نظریں خلاؤں میں بھٹک رہی تھیں۔

''ہم نہیں...... آپ بے بے اکیلی آپ اور پورے سات مالٹے چوپے تھے آپ نے......'' اماں نے بروقت دادی کو یاددہانی کروائی تھی۔

''کم بخت پتا تھا مجھے تو یقیناً میرے مالٹے گن رہی ہوگی۔ تبھی تو اس دن میرا پیٹ ڈھیلا ہوگیا تھا اور ساری رات میری غسل خانے میں گزری تھی۔''

''او...... دادی! اب آپ لڑنا نہ شروع کردیں۔ آگے بھی تو بتائیں کیا ہوا تھا۔'' بیچے نے پنجا لڑانے سے پہلے ہی دونوں کو روک دیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ابھی میرے منہ پر چڑھا مہندی کا رنگ پھیکا نہیں پڑا تھا۔'' دادی نے مہندی کا ذکر اس انداز میں کیا جیسے کسی نئی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی کا تذکرہ......

''اس ویلے میں نے تجھ سے کہا تھا فضیلت کہ اپنی کشور کی تربیت میں کھوٹ نہیں۔ اس کا حال وہی ہوگا۔ ''میں آئی بوگوائی'' وہ جہاں جائے گی ویسی ہی ڈھل جائے گی۔ حالانکہ اسے یہی محسوس ہوگا جیسے دوسرے اس کی مرضی کے مطابق خود کو تبدیل کررہے ہیں۔ جبکہ اصل بدلاؤ اس کی اپنی ذات میں آئے گا۔'' دادی نے بڑے فخر سے پوتی کی نفسیات دُہرائی تھی اور اماں نے ساری بات سمجھ کر سر دھنا تھا۔

''شوں، شوں، شوں......''

''بے بے! بیچے! آپ لوگوں کو خوشبو آرہی ہے کوئی......؟ شوں...... شوں......'' اماں ناک سے کسی نادیدہ چیز کو سونگھتی ہوئی پوچھنے لگیں۔

''ہاں آرہی ہے ''مٹر قیمے'' کی۔'' دادی بولیں۔ انہیں مٹر قیمہ بہت پسند تھا۔ ''میرا خیال ہے کچن میں تیری جیٹھانی شاید یہی بنارہی ہے۔''

''نہیں بے بے ''مٹر قیمہ'' نہیں مجھے تو مولیوں کی خوشبو آرہی ہے۔ میرا خیال ہے اپنی کشور نے سویرے ناشتے میں مولیوں والے پراٹھے کھائے ہوں گے اسی پلنگ پر۔'' اماں نے لحاف سونگھتے ہوئے قیاس آرائی کی تھی کیونکہ خوشبو یا بدبو جو بھی تھا لحاف میں ہی تھا۔

''تو مجھے خوش نہ ہونے دینا فضیلت...... اپنی پسند کی چیز کی ہی خوشبو گھسی ہے تیری ناک میں۔'' تبھی کشور ٹرے میں دودھ پتی کے مگ رکھے اندر داخل ہوئی۔

''لے کشور سے پوچھ۔'' دادی نے کشور کو درمیان میں گھسیٹا۔ ''آج کس چیز کا ناشتا کیا ہے تو نے

کشور؟ مٹر قیمہ کھایا تھا یا مولی کا پراٹھا؟"

"افوہ دادی...... میں نے تو سویرے دلیہ کھایا تھا۔ بھلا نکے سے بچے کے ساتھ میں اتنی بھاری خوراک کیسے لے سکتی ہوں۔"

"ہاں! گل تو تیری ٹھیک ہے...... پھر کچن میں کچھ پک رہا ہوگا؟" دادی کو بھی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"پرے بے، ہمک اس لحاف میں سے اٹھ رہی ہے......" اماں بھی سابقہ بیان پر قائم تھیں۔

"اوہو...... ! اماں آپ لوگ بھی کمال کرتے ہو۔" کشور نے ٹرے تپائی پر رکھی اور پھر گویا ہوئی۔

"دادی! مٹر قیمہ تو تائی نے واقعی پکایا ہے، خاص آپ کے لیے۔" کشور نے دادی کو اطلاع بہم پہنچائی۔

"آئی شاواش اے......" دادی نے لہرا کر ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اماں کی جان جلائی تھی۔

"پر ناں جی...... مجھے تو اب بھی کچھ مولیوں کی وہاڑ (بدبو) آرہی ہے۔" اماں نے حتمی انداز میں ہاتھ اٹھا کر بات ختم کی۔

اماں کی بات پر دادی نے بھی کچھ کھٹک کر لحاف میں منہ گھسا کر کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ پھر لاشعوری طور پر لحاف ذرا سا پرے سرکا دیا جسے سینے تک اوڑھ رکھا تھا۔

"نہیں اماں...... اصل میں رات آصف سرگی (سحری) ویلے آکر لحاف لے گئے تھے۔ وہ ناں پچھلے صحن میں جو بھوری مج (بھینس) ہے ناں آصف کو لگا وہ ٹھنڈ کے مارے کالی سے نیلی ہو رہی ہے۔ وہ ٹھہرے دردمند اور ہمدرد سدا کے۔" کشور کے لہجے میں آصف کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"فٹافٹ لحاف لیا اور اس نمانی کے اوپر ڈال آئے۔ مجھے تائی کے کمرے سے دوسرا لا دیا پر آپ کو تو پتا ہے ناں اماں، مجھے اپنے تکیے اور لحاف کے بغیر نیند کہاں آتی ہے، صبح روشنی پھوٹتے ہی میں نے واپس منگوا لیا اور تائی والا بھیج دیا۔" کشور کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی یہ۔

"او تیرا بیڑا غرق ہو کشور......" دادی نے ایک جھٹکے سے لحاف پرے پھینکا...... "دس مرتے کہی، ناس مارا آصف تو لگتا ہے بھینس کی بُو پرو کر لے آیا ہے اس میں اور تو نے وہی "کسیلا لحاف" ہمیں اوڑھا دیا۔" دادی کا غصہ عروج پر تھا اور بھیجے کی ہنسی......

"پرے بے...... مولیوں کی ہمک کدھر سے آرہی ہے؟" اماں مولیوں پر ہی اٹکی تھیں۔

"اوہو...... اماں! چھوڑ بھی دو مولیوں کو۔ کھالی ہوں گی بھوری نے مولیاں، پاس ہی تو ڈھیر لگا رہتا ہے سبزیوں کا۔ جو میرا دیور ہمارے کھیتوں سے لاتا ہے۔" کشور کے لہجے میں کھیتوں کا فخر بول رہا تھا۔

"اور دادی...... وہ تو سحری کی بات تھی۔ اب تو بُو اڑ شو بھی گئی ہوگی۔" کشور نے دادی کو تسلی دی۔

"مر جا جیئے...... ابھی تک اندھیر نگری مچی ہے اندر...... ذرا منہ ادھر لا۔ اندر گھساؤں تیرا پھر تجھے اپنی بھوری کی کرتوت پتا چلے۔" دادی کو کشور کی بے نیازی زہر لگ رہی تھی۔

"آئے ہائے دادی، میں بھی تو اسی لحاف میں سوئی ہوں، مجھے تو کوئی نہیں آئی بُو......" (میں آئی بُو گوائی)

"ویسے بھی بھوری والا پاسا (سائڈ) یہ تھوڑی تھا۔ وہ تو اماں والا تھا۔ بھی تو مولیوں کی ہمک چڑھ رہی ہے انہیں۔" اور اماں کو مانو کسی نے تیلی دکھا دی تھی۔ شرلی کی طرح اوپر کو اچھلیں اور ایک جھٹکے سے لحاف اتار کر پرے پھینکا جو سیدھا دادی کے اوپر آکر انہیں لپیٹ میں لے گیا۔ دادی بیچاری جو پہلے ہی خود کو لحاف سے آزاد کرا چکی تھیں اور اپنی ناک کو شال سے اچھی طرح ڈھکے بیٹھی تھیں۔ اس اچانک سر پڑنے والی افتاد پر بری طرح لحاف میں مچلنے لگیں۔ وہ بیچاری شال میں اچھی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ اس میں سے ہاتھ نکالتیں تو لحاف ہٹا پائیں ناں...... اور بس ایک بار وہ لحاف سے نکل آتیں تو یقیناً باقیوں کی خیر نہیں تھی۔ جو ہنس، ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔

# دلِ ناداں

ماہ وش طالب





”کیا سوچا ہے تم نے، چلو گے آج شام مسز احتشام کی پارٹی میں، میرے ساتھ؟“ مسز بخاری ایک بار پھر پرانا موضوع لے کر بیٹھ گئی تھیں۔

”آخر آپ کو جلدی کس بات کی ہے...... کہیں نہیں بھاگا جارہا میں۔“ معظم بیزاری سے بولا اور پھر ساری توجہ ٹی وی پر لگے فٹ بال میچ کی طرف مبذول کرلی۔

”مجھے پتا ہے تم کہیں بھاگے نہیں جارہے اور میں

تمہیں بھاگنے بھی نہیں دوں گی لیکن تمہارے دماغ میں جو کھچڑی پک رہی ہے میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی سمجھے!'' اب کی بار معظم ٹھٹکا تھا۔

''کیا مطلب، کیا پک رہا ہے میرے دماغ میں؟'' اس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں نشا کو تمہارے لیے سلیکٹ کرلوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے، اتنے عرصے سے تم جو انکار کیے جا رہے ہو سب سمجھتی ہوں، آج کی پارٹی میں مسٹر ہاشمی کی بڑی بیٹی بھی موجود ہوگی اسی سے انٹروڈیوس کرادوں گی میں تمہیں۔''

''آپ کو نہ جانے کیوں نشا پسند نہیں ہے، کیا برائی ہے اس میں، کزن ہے وہ میری، بچپن سے آپ دیکھ رہی ہیں۔'' اسے اپنی اس پھوپھوزاد سے ممی کی بیزاری کی وجہ کبھی سمجھ نہیں آئی۔

''کزن ہے تو کیا سر پر بٹھالوں، بٹھانا کیا بلکہ بیٹھ چکی ہے وہ، اسے پال پوس کے بڑا کیا یہی احسان کافی ہے، اب اس یتیم کی میں تمہارے ساتھ شادی بھی کروادوں تو اس اچھائی کی توقع مت رکھنا مجھ سے۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولی تھیں۔

''آپ سے کس نے کہا کہ میں نشا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ جو اب تک آڑھا ترچھا صوفے پر بیٹھا تھا ایک دم سیدھا ہو بیٹھا، اب ٹھٹکنے کی باری ان کی تھی اور دروازے کے پار کھڑی نشا کا دل لرز کر رہ گیا۔

''واٹ ڈو یو مین، کس نے کہا تم نے ہی تو بتایا تھا مجھے کہ تم اسے پسند کرتے ہو، اس کی تعریف میں زمین، آسمان ایک کر رکھا تھا تم نے آسٹریلیا جانے سے پہلے۔''

''واؤ ممی، آپ کو اتنی پرانی بات یاد ہے...... امیزنگ لیکن پسند کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... پسند تو مجھے اس کی ڈیزی بھی بہت ہے تو کیا میں اب اس سے شادی کرلوں؟'' اس نے نشا کی بلی کا نام لیا تھا، تضحیک اڑاتے ہوئے وہ ان کے اندازوں کی تردید کررہا تھا۔

نشا نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں کو باہر آنے سے روکا اور واپس اپنے کمرے کی جانب چلی گئی...... صحیح تو کہہ رہا تھا معظم، کسی کو پسند کرنے کا مطلب یہ تو نہیں، ہوسکتا ناں کہ وہ شادی بھی اسی سے کرے گا۔ اگر اس نے دو سال پہلے آسٹریلیا جانے سے قبل نشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا تھا۔

''نشا مجھے لگ رہا ہے، میں وہاں جاکر تمہیں بہت مس کرنے والا ہوں۔'' اور نشا نے خواہ مخواہ ہی کچھ خواب اپنی آنکھوں میں سجالیے تھے، وہ تمام دن ان دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔

وہ اس گھر میں اپنے ماموں کے ساتھ تین سال کی عمر میں آئی تھی بہت جلد اس کی معظم کے ساتھ دوستی ہوگئی تھی۔ ممانی یعنی معظم کی ممی جسے نشا بھی ممی ہی کہنے لگی تھی نے کبھی اس کے ساتھ سوتیلوں والا برتاؤ نہیں رکھا تھا مگر کبھی بیٹی والا درجہ بھی نہیں دیا...... کہ بہرحال تھی تو وہ ان کی مڈل کلاس نند کی بیٹی...... جس کا بڑی کسمپرسی میں انتقال ہوگیا تھا کہ وہ علاج بھی نہیں کروا پائی تھی۔ کچھ سال پہلے ماموں کے انتقال کے بعد ممی کی پیشانی کے بلوں میں نشا کو دیکھ کر بے وجہ ہی اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ہاں تو غلطی نشا کی ہی تھی...... معظم نے کب اس سے اظہارِ محبت کیا تھا، جو یوں اب وہ کسی کو الزام دیتی......

☆☆☆

پرل کانٹی نینٹل میں سماں بندھا تھا...... ممی کی نظریں اپنے بیٹے اور ہونے والی بہو سے نہیں ہٹ رہی تھیں آج تو وہ نشا کو بھی اپنے ساتھ لیے نت نئے لوگوں سے متعارف کرارہی تھیں۔ نشا کے لیے تو کم از کم وہ چہرے نئے ہی تھے...... معظم نے اپنی ماں کی پسند پر چپ چاپ ہاں کرلی تھی...... بظاہر لاتعلق نظر آتی نشا کی نگاہیں بار بار معظم اور اریبہ کی جانب اٹھتیں تو اپنی کم مائیگی کا احساس حاوی ہونے لگتا...... اسٹیج پر بیٹھے

مسکراہٹیں بکھیرتے دونوں ایک ساتھ پرفیکٹ کپل لگ رہے تھے۔ وہ اب ایک کونے میں بیٹھی اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی کہ اچانک وہ نشا کو اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

''تم بہت خوب صورت لگ رہی ہو نشا، معظم ..سرتاپا اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے نشا میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔'' نشا کو لگا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔

''تمہیں بتاؤں میں نشا...کہ یہ صرف ایک ڈراما ہے...... ہاں صرف ممی کے اصرار پر میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔'' وہ حیرت زدہ اس کی بات سن رہی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں نشا!'' معظم کے لہجے کی سچائی......؟ وہ اب بھی بے یقین تھی۔

''بس تمہیں ہر حال میں میرا ساتھ دینا ہے...... اس سب سے۔'' معظم نے اریبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ریلیشن شپ پر کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔'' وہ اب عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بول رہا تھا اور نشا کو پہلی بار معظم کی آنکھوں سے نفرت محسوس ہوئی تھی......وہ کچھ کہے بغیر وہاں سے ہٹ گئی۔ معظم، اریبہ کی بانہوں میں بانہیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر اسے نئی زندگی کے خواب دکھا رہا تھا......ہال سے باہر نکلتے ہوئے نشا نے آخری نظر ان دونوں پر ڈالی کچھ دیر پہلے یہ شخص کہتا تھا کہ یہ فنکشن صرف دکھاوا ہے۔ وہ رات اس نے مشکل سے کاٹی تھی۔



''ممی میں نے آپ کو حذیفہ کے بارے میں بتایا تھا ناں آج فائنلی میں حذیفہ سے بات کر کے آپ کو انفارم کر دوں گی کہ اس کے پیرنٹس کب تک آسکیں گے۔'' یہ پہلی بار تھا کہ وہ ان کے روبرو اتنے پُراعتماد لہجے میں اپنے کسی کلاس فیلو کے لیے بات کر رہی تھی۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے، کچھ عرصے پہلے تک تو تمہارا کوئی ارادہ نہیں تھا شادی وادی کا۔'' انہوں نے اپنی ناگواری چھپانے کی کوشش کی۔

''وہ کچھ عرصے پہلے کی بات تھی ممی! ارادے اور نیتیں بدلتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ویسے بھی آپ کو خوش ہونا چاہیے ایک ساتھ دو، دو فکروں سے آزاد ہو جائیں گی۔'' بہت مشکل سے اس نے اپنے لہجے کو نم ہونے سے روکا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ ناشتا کرتے معظم نے چونک کر اسے جاتے دیکھا تھا۔ اور پھر ممی کی جانب......انہوں نے کندھے اچکا دیے۔ انہیں تو واقعی خوش ہونا چاہیے تھا سو وہ خوش تھیں......

''ایکسکیوز می۔'' کہہ کر وہ اپنی چیئر سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔

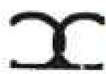
''نشا یہ سب کیا ہے؟ کیا کہہ رہی تھیں تم ممی سے؟''

''کیوں، کیا کچھ غلط کہا ہے میں نے جو آپ کو اعتراض ہے۔'' بہت ساری ہمت جمع کر کے اس نے معظم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے، میں نے تمہیں اس دن سب سمجھایا تھا، ہٹ کروایا۔''

''آپ کو کس نے کہا کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔'' معظم کے لیے یہ دھچکا شدید تھا۔ ''کیا میں تمہیں بالکل بھی پسند نہیں ہوں؟'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

''پسند......ہاں پسندیدگی اپنی جگہ، وہ تو میں اس ڈوگی کو بھی بہت کرتی ہوں جو آسٹریلیا سے آپ اپنے ساتھ لائے تھے......اس کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا۔'' معظم لاجواب کھڑا تھا۔ نشا گیٹ سے باہر نکل گئی تھی......اپنی بے نام محبت کو خواہشوں سمیت اس نے گزشتہ رات ہی دفنا دیا تھا......اب تو بس فاتحہ پڑھنی تھی اور دو آنسو بہانا باقی تھے وہ بھی شاید خشک آنسو......



ناولٹ



# سنہری دھوپ میں برستی بارش

فاطمہ چوہدری



آج شاہ ہاؤس اپنی پوری شان سے کھڑا روشنیوں اور رنگ برنگی قمقموں سے جگمگ، جگمگ کر رہا تھا۔ آج بڑے شاہ جی سید وجاہت علی شاہ کے بڑے پوتے سید زمان علی شاہ کی رسمِ مہندی تھی۔ شاہ ہاؤس میں شام ڈھلے ہی سے مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی اور یہ رونق رات گئے تک جاری رہی تھی۔ مہندی کی رسم بڑی دھوم، دھام سے منائی گئی تھی اور اب شاہ ہاؤس کے مکین اور تمام مہمان خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ ماسوائے اس



کے جس کی آج پوری دنیا ہی تہس نہس تھی۔ رسم کے دوران جب اس نے اس شخص کو دیکھا جو اس کا کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ تھا تو اس کے اندر عجب بے کلی پھیل گئی تھی۔ وہ شخص وہ تھا جس نے اس سے اس کی عزت، غرور اور اس کی ذات کا مان چھین لیا تھا جس کی وجہ سے وہ آج تہی دامن تھی۔ ماضی قریب کی تمام تلخ یادیں آج نئے سرے سے یاد آکر اسے کچوکے لگا رہی تھیں۔ شاہ ہاؤس میں آنے کے فیصلے نے اسے پھر سے ماضی میں لا پٹخا تھا۔

یونیورسٹی کے پہلے روز ہی وہ کلاس میں لیٹ پہنچی تھی۔ اسے اپنی کلاس ڈھونڈنے میں کافی دیر ہوگئی تھی۔ کلاس میں داخل ہوتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ آج طالب علموں کی کافی کم تعداد حاضر ہے۔ وہ پچھلی نشستوں میں سے ایک پر جا بیٹھی۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گم تھی جب اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک لڑکی آکر براجمان ہوئی۔ وہ خود تو کافی کم گو اور لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی اس لیے دوسری لڑکی نے ہی بات چیت میں پہل کی۔

"ہیلو! آئی ایم زارا شہباز۔"

"اور میں رابیل شاہ۔" اس نے بھی اپنا نام بتاتے ہوئے زارا کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔

"لگتا ہے کہ آج کلاس نہیں ہوگی، فرسٹ ڈے عموماً کلاس نہیں ہوتی۔ چلو آؤ باہر چلتے ہیں اور ویسے بھی کلاس کا آدھا ٹائم تو گزر ہی چکا ہے۔" زارا کے کہنے پر رابیل نے ایک نظر کلاس کو دیکھا جس میں اب ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا سو رابیل کو زارا کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ وہ دونوں باہر گراؤنڈ میں بینچ پر بیٹھ گئی تھیں۔

"تمہیں فزکس میں ماسٹرز کا خیال کیسے آیا؟"

"یہ میری ڈیئر ماما کا شوق تھا کہ میں فزکس کی فیلڈ جوائن کروں۔" زارا کے پوچھنے پر رابیل نے جواب دیا۔

"اور مجھے بچپن سے ہی پیور سائنسز کو پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میرا یہ شوق آج مجھے یہاں پنجاب یونیورسٹی کھینچ لایا۔" زارا نے اپنا بتایا۔

شاید یہ کسی کی نظروں کی تپش تھی جو رابیل کو پیچھے دیکھنا پڑا اور پیچھے نظر جاتے ہی ایک گروپ پر پہنچی جس کے بیچ کھڑا ایک بھرپور مردانہ وجاہت کا حامل لڑکا اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ رابیل کی نظروں کے تعاقب میں جب زارا نے بھی دیکھا تو وہ جھٹ سے بولی۔

"ارے یہ تو یونیورسٹی کا سب سے بیسٹ گروپ ہے۔ اس کے تمام لڑکے، لڑکیاں یونیورسٹی کے ٹاپ اسٹوڈنٹس ہیں اور تو اور یہ لوگ تو کسی اور سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ خاصے اونچے دماغ کے ہیں یہ سب۔" زارا نے ایک ہی سانس میں سب کچھ رابیل کو بتا دیا۔

"اور وہ جو سب سے ہینڈسم لڑکا ہے ناں جو بیچوں بیچ کھڑا ہے، وہ اس گروپ کا ہیڈ ہے۔ سید حمران علی شاہ جو اپنی پرسنالٹی اور قابلیت کے بل بوتے پر بہت اکڑتا ہے۔" رابیل کافی حیران تھی کہ زارا کو یہ سب کیسے پتا ہے جبکہ آج تو اس کا بھی پہلا ہی دن تھا۔

"تم اتنا سب کچھ کیسے جانتی ہو؟"

"لو...... ایکچوئلی میری ایک کزن بھی اِدھر ہی پڑھتی ہے بلکہ ان سب کی کلاس فیلو ہی ہے تو اس نے ہی مجھے بتایا تھا۔ اور ایڈمیشن کے دوران کئی دفعہ آنا ہوا تو ان کے بارے میں مجھے کافی معلومات ہیں۔" اور پھر جتنی دیر زارا اور وہ وہاں بیٹھی رہیں، رابیل کو اس کی نظروں کی تپش محسوس ہوتی رہی۔ کلاس تو ہوئی نہیں تھی سو دونوں نے واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

گاڑی کے ہارن پر چوکیدار نے گیٹ وا کیا جس پر سید حمران علی شاہ گاڑی اندر لے آیا۔ پورچ میں گاڑی روکتے ہی اس کی نظر لان میں بیٹھی اماں جان اور اپنی ماما جان پر پڑی، ساتھ ہی اس کے ماموں کی بیٹی عرشیہ بھی بیٹھی تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ لان کی طرف بڑھا۔

"السلام علیکم......"

"وعلیکم السلام، جیتا رہ میرا شیر پتر۔" اماں جان

کے لہجے میں اس کے لیے محبت جھلک رہی تھی۔

''اتنے دن لگا دیے آنے میں، جانتے بھی ہو کہ ماں تمہارے بغیر کتنی ادھوری ہے۔'' ماما جان نے اسے گلے لگاتے ہی شکوہ کیا۔

''کیا ماما جان! اب ایک سال ہی تو رہ گیا ہے پھر یہاں آپ کے قدموں میں ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے ڈیرا ڈال لوں گا۔''

''باتیں کرنا تو کوئی تم سے سیکھے۔'' شافیہ بیگم نے اس کے فلسفیانہ انداز پر چوٹ کرتے ہوئے کہا۔

''اور عرشیہ جی آپ کیسی ہیں؟ اور ہماری حویلی میں کب قدم رکھا؟''

''ارے، ہم تو کب سے آئے ہوئے ہیں، آپ کو اپنے کاموں سے فرصت ملے تو اِدھر اُدھر کی خبر ہو۔'' عرشیہ کی اس سے گہری دوستی تھی جواب اس کے یونیورسٹی جانے سے ماند پڑ گئی تھی۔

''ہا......ہا......! یہ ڈائیلاگ آپ اپنے ''ان'' کے لیے سنبھال رکھیے......بس اگلے ماہ آنے ہی والے ہیں۔'' حمدان نے اسے اپنی عادت کے مطابق چھیڑا۔ جس سے شرمیلی عرشیہ کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

''چل ہٹ پرے......بے شرم، کیوں تنگ کرتا ہے بیچاری کو......'' اماں جان نے اسے جھاڑا۔

''ہاں جی! بیچاری تو بہت ہیں یہ محترمہ......تبھی تو ہمارے بھیا کو لے اڑنے کے ارادے رکھتی ہیں۔'' حمدان نے یہ سرگوشی عرشیہ کے کان میں کی ورنہ اماں جان سے کوئی بعید نہ تھی کہ اسے جوتی کھینچ مارتیں۔

عرشیہ سے اس کی بچپن کی دوستی تھی۔ کھیل کود، دکھ، تکلیف سب میں وہ اس کی ساتھی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ حمدان کے بڑے بھائی سید امان علی شاہ کو عرشیہ اچھی لگنے لگی اور لگتی کیوں نہ......وہ تھی ہی اتنی سادہ دل اور چھوئی موئی سی کہ کسی کا بھی دل اس پر آ سکتا تھا لیکن حمدان نے ہمیشہ اسے چھوٹی بہن ہی سمجھا تھا۔ امان کی پسندیدگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عرشیہ کو امان کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی تھی جبکہ شادی عرشیہ کی ہاؤس جاب اور امان کے ایم بی اے کے بعد ہونا طے پائی تھی۔ اس رشتے سے حمدان آتے جاتے عرشیہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا۔

☆☆☆

ساہیوال کے بس اسٹاپ پر اترتے ہی رابیل نے ایک لمبی سانس لی اور فضا میں اپنے شہر کی خوشبو کو محسوس کیا۔

اسے اپنے شہر سے بہت پیار تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ کبھی اپنے شہر سے دور نہ جاتی لیکن ''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے'' پر عمل کرتے ہوئے اپنی پڑھائی کی خاطر اپنے شہر کو خیر باد کہنا پڑا۔ بی ایس سی تک ساہیوال میں تعلیم حاصل کر کے اب اسے ایم ایس سی کے لیے مجبوراً لاہور جانا پڑا۔ کیونکہ ساہیوال میں کوئی بڑا ادارہ ایم ایس سی نہیں کروا رہا تھا اور جو کروا رہا تھا وہاں فزکس کا مضمون نہیں تھا۔

رابیل نے بہت خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے شفیق سے پاپا جانی اسے اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے تھے اور بقول ان کے رابیل ان کی بیٹا ہے۔ یہی حال بہت سوبر اور پیاری سی ماما جانی کا تھا۔

رابیل کے پاپا جانی سید منہاج علی شاہ مقامی کالج میں میتھس ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ تھے اور وہ اس شہر کی جانی پہچانی شخصیت تھے۔ انہوں نے لندن سے میتھس میں پی ایچ ڈی کر رکھی تھی۔ جبکہ رابیل کی ماما جانی نے ان ہی کے سبجیکٹ میں ایم فل کر رکھا تھا لیکن وہ ہاؤس وائف کا کام سرانجام دے رہی تھیں۔ دونوں ماما، پاپا کی یہی اکلوتی اولاد تھی اور دونوں کے پیار نے اس کی ذات میں کوئی خرابی یا بگاڑ کے بجائے اس کی ذات میں مضبوطی اور نکھار پیدا کیا تھا۔ وہ اکلوتی ہونے کے باوجود اپنے والدین کی بہت فرمانبردار اولاد تھی۔ اس کی بڑی وجہ ان کے گھر کا ماحول تھا۔ پاپا جانی کا وقت، وقت پر دیا ہوا اخلاقیات پر لیکچر اور ماما جانی کی گھریلو تربیت نے اس کی شخصیت کو پُراعتماد اور مکمل بنا دیا تھا۔

رابیل ساہیوال آئی تو سامان رکھ کر فوراً اپنی

بیسٹ فرینڈ آمنہ کی طرف دوڑ لگادی جو اُن کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دونوں نے بی ایس سی تک اکٹھے پڑھا تھا اب آمنہ کی شادی اس کے کزن کے ساتھ طے ہوگئی تھی۔ اس لیے یونیورسٹی میں دونوں کا ساتھ نہ ہوسکا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آمنہ نظر آگئی تھی۔ جو لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کررہی تھی۔

''کیسی ہو رابیل؟ تمہارے بغیر دیکھو کن، کن چیزوں میں خود کو الجھا لیا ہے میں نے۔'' گلے ملتے ہی آمنہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

''بس، بس رہنے دو...... اتنا ہی افسوس ہو رہا ہے تو پھر مجھ اکیلی کو جانے ہی کیوں دیا؟ لیکن تمہیں تو شادی کا شوق سوار تھا ناں...... اب سڑتی رہو......''

رابیل کو ابھی تک آمنہ کے لاہور نہ جانے پر غصہ تھا سو آتے ہی اسے سناڈالیں۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو، اب اتنے دن بعد آئی ہو چلو سکون سے باتیں کریں...... اتنا کچھ ہے تمہیں بتانے کے لیے اور کچھ، کچھ تم سے سننے کے لیے۔'' آمنہ نے رابیل کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی سہیلی کی اس ادا پر مسکرادی۔

''ہاں تو اب سناؤ لاہور کا کوئی ڈریم مین ملا؟'' آمنہ نے رابیل کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں وہاں پڑھنے گئی ہوں...... ڈریم مین ڈھونڈنے نہیں۔''

''اچھا تو جناب ڈریم مین کے لیے آنکھیں کھول کر رکھنا پڑتی ہیں۔ وہ خود تمہارے پاس چل کر نہیں آئے گا۔'' آمنہ نے حسب عادت رابیل کو چھیڑا۔

''اچھا چھوڑو اپنے منگیتر کی سناؤ کب آرہا ہے تمہیں لینے۔'' دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ اس طرح آمنہ سے ایک خوشگوار ملاقات کر کے وہ اپنے گھر آگئی کیونکہ ابھی اسے اپنے پاپا جانی کو اپنے ہاتھ کی کافی بھی پلانی تھی۔

☆☆☆

اب تو وہ سب یونیورسٹی سے مانوس ہوچکے تھے۔ چار ماہ کیسے گزرے پتا بھی نہیں چلا۔ آج رابیل اور زارا کا فرسٹ سمسٹر کا لاسٹ پیپر تھا۔ دونوں آج بہت خوش تھیں کیونکہ دونوں کے پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ رابیل اپنی کلاس کی سب سے ہونہار اسٹوڈنٹ تھی۔ پورا ڈیپارٹمنٹ یہ بات جانتا تھا۔ ایک تو وہ... بی ایس سی میں بھی گولڈ میڈلسٹ اور اس یونیورسٹی آنے پر تو اس کے جوہر کھل کر سامنے آرہے تھے۔ وہ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر نمایاں مقام حاصل کرچکی تھی۔

وہ دونوں پیپر دے کر ہال سے باہر نکلیں تو موسم بہت حسین ہو رہا تھا۔ آسمان پر کالی بدلیاں اٹکھیلیاں کررہی تھیں۔ ایک تو پیپرز ختم ہونے کی خوشی اوپر سے موسم حسین، دونوں نے کینٹین جانے کا فیصلہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کینٹین میں داخل ہوتیں وہی بیسٹ اور یونیورسٹی کا مشہور گروپ اُن کی طرف بڑھا اور ان میں سے حمدان علی شاہ نے انہیں سلام کیا۔

سید حمدان علی شاہ اپنی وجاہت کے علاوہ ذہانت میں بھی بے مثال تھا۔ رابیل کی طرح وہ بھی بہت ذہین اسٹوڈنٹ تھا اور یونیورسٹی کے اکثر اساتذہ اسے اچھے سے جانتے تھے یہی وجہ تھی کہ اینول فنکشن میں اسے ہوسٹنگ کے لیے کہا جاتا لیکن اس سال اساتذہ نے رابیل شاہ کا نام بھی دیا۔ ایز اے کو ہوسٹ...... اسی کی بابت حمدان علی شاہ آج اس کے پاس چلا آیا تھا۔ حمدان علی شاہ کے سلام کا جواب صرف زارا نے دیا جبکہ رابیل نے ایک ناگوار نگاہ اس پر ڈال کر اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا۔

''ایکسکیوزمی مس رابیل شاہ! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' حمدان نے رابیل کا رویہ نظر انداز کر کے اسے مخاطب کیا۔ جبکہ حمدان تو کسی ایرے غیرے کو بلانا پسند نہیں کرتا تھا مگر رابیل کو دوسری مرتبہ مخاطب کرنے پر حمدان کو ناگوار نہیں گزرا جبکہ گروپ کے باقی ممبرز حیران کھڑے تھے۔

''لیکن مجھے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔'' رابیل

کے ری ایکشن پر وہاں موجود بھی لوگ حیران کھڑے تھے۔ رابیل جیسی ویل مینرڈ لڑکی سے کوئی بھی اس طرح کی بدتمیزی کی امید نہیں رکھتا تھا۔ جبکہ رابیل کو تو حمدان پہلے دن سے ہی عجیب لگا تھا کچھ زارا کی باتوں سے بھی رابیل کو حمدان کا غرور ایک آنکھ نہ بھایا۔

حمدان علی شاہ نے ضبط سے مٹھیاں بھینچ لیں لیکن کہا کچھ نہیں...... نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت وہ رابیل کو کچھ کہے بغیر چھوڑے جا رہا تھا۔ حمدان نے اپنے گروپ کو اشارہ کیا اور وہاں سے چلے گئے۔ حمدان کے فرینڈز اس کے ردِعمل پر حیران تھے تو دوسری جانب زارا، رابیل کے بی ہیوئیر پر حیران تھی۔

''تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ وہ یونیورسٹی کا سب سے ذہین اور ویل مینرڈ لڑکا ہے اور تم نے بغیر کسی سولڈ ریزن کے اسے سنا ڈالیں۔ ایسا کیا کہہ دیا تھا اس نے۔ ایک ضروری بات ہی تو کہنا تھی اسے تم سے۔'' ان کے جانے کے بعد زارا نے رابیل سے استفسار کیا اور اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی جبکہ رابیل اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال بھی چکی تھی۔

''تمہیں کچھ اور کہنا ہے یا اب چلیں؟''

زارا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ رابیل جیسی اچھی سلجھی ہوئی لڑکی تو وہ اب کہیں سے نہیں لگ رہی تھی۔

''مجھے تم سے ایسے رویے کی امید نہیں تھی۔ اس نے صرف بات کرنا تھی، تمہیں کھا نہیں جانا تھا۔'' زارا نے ایک بار پھر رابیل کو قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی۔

''یار زارا، تمہیں پرابلم کیا ہے؟ ہاں...... میں جب اس شخص کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کرنا چاہ رہی تو پھر تم کیوں اسے بار، بار درمیان میں لا رہی ہو۔ انتہائی فضول لوگوں کو کب سے ڈسکس کرنا شروع کر دیا ہے تم نے؟ چلو اب دیر ہو رہی ہے، ابھی سامان بھی اٹھانا ہے پھر بس ہی نہ نکل جائے۔'' ابھی رابیل نے دو قدم اٹھائے ہی تھے کہ زارا نے اس کی کلائی تھام لی۔

''ہم کہیں نہیں جا رہے، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے حمدان میں ایسی کون سی فضولیات دیکھ لیں جن کی بنا پر تم اسے فضول کہہ رہی ہو؟''

''ایک تو مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کیوں اس کی طرف دار بنی ہوئی ہو، خیر میں تمہیں یہ پہلی اور آخری مرتبہ بتا رہی ہوں کہ مجھے اس شخص کی آنکھوں سے فرعونیت ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے، مجھے وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ غرور پتا نہیں کس بات کا ہے اس میں بڑا آیا وڈیرا کہیں کا۔'' رابیل نے بھی ایک ہی سانس میں حمدان علی شاہ کے گُن گنوا دیے۔

''کیوں، اس نے تم پر ایسی کون سی نظر بازی کر لی ہے؟'' زارا اب بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی اور ہوتی بھی کیسے؟ رابیل کے تمام الزامات مفروضات کی طرح خود ساختہ ہی تھے۔ جو کم از کم زارا کی سمجھ سے باہر تھے۔ اب زارا کو کون سمجھاتا کہ زندگی میں کچھ لوگوں سے بس اللہ واسطے کا بیر ہو جاتا ہے اور رابیل کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ رابیل کو اول روز سے ہی حمدان سے عجیب سی چڑ ہو گئی تھی۔

''میں تمہیں اب کچھ نہیں سمجھا سکتی اور پلیز اب اس بندے کو گولی مارو اور چلو ورنہ بس نکل جائے گی۔''

زارا، رابیل کو یہ بات دوبارہ سمجھانے کا ارادہ ترک کر کے اس کے ساتھ چل پڑی مبادا وہ مزید استفسار پر اسے ہی جھاڑ پلا دے۔

☆☆☆

ساہیوال آ کر بھی رابیل کا موڈ آف ہی رہا تھا۔ اس فضول شخص کی وجہ سے آج زارا سے بھی تلخ کلامی ہو گئی تھی۔ یہ سوچ، سوچ کر رابیل کو اور بھی غصہ آ رہا تھا۔ وہ کب سے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی کڑھ رہی تھی کہ کچن سے ماما جانی اس کے لیے جوس لے کر نکلیں۔

''ارے رابیل جانو، میں کب سے نوٹ کر رہی ہوں کہ تم کچھ الجھی، الجھی سی ہو، کیا پرابلم ہے میرا بچہ؟ آپ کو پتا ہے ماما جانی تو آپ کی فرینڈ ہیں، چلو جلدی سے بتاؤ کیا بات ہے؟'' کچن ونڈو سے وہ رابیل کو نوٹ کر رہی تھیں۔ سامنے ٹی وی لگا ہونے کے باوجود

وہ غائب دماغی سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اس کی بچپن سے عادت تھی کہ اگر کوئی بات بری لگتی تو وہ بات دنوں اس کے حواس پر سوار رہتی۔

''تو ماما جانی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، ایوری تھنگ از او کے......''

''اوہ ماما کی جان......'' ماما جانی نے اسے پیار سے گلے سے لگالیا۔

وہ ان کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناتے تمام پیار سمیٹتی تھی۔ اسے دیکھ کر شازیہ بیگم کو اپنی ممانی جان یاد آجاتی تھیں یعنی رابیل کی دادو...... وہ ہو بہو اپنی دادو پر پڑی تھی۔ ایک، ایک نقش رب نے بڑی خوب صورتی سے بنایا تھا۔ ویسی ہی بڑی، بڑی غزالی آنکھیں، سرو قد، کمر تک لمبے سلکی چمکتے بال اور ستواں ناک اور ساتھ، ساتھ سنہری رنگت اس کی شخصیت کو مزید جاذب نظر بناتی تھی۔

رابیل نے ماما جانی کو اسے لگاتار دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کی آنکھوں پر رکھا۔

''کیا ماما جانی! آپ کبھی، کبھی مجھے ایسے کیوں دیکھنے لگتی ہیں، جیسے کچھ کھوج رہی ہوں...... میرے چہرے میں کسی اور کا چہرہ ڈھونڈ رہی ہوں؟'' وہ رابیل کے اس قدر پرفیکٹ اندازے پر چونکی ضرور تھیں لیکن لمحوں میں ہی سنبھل گئی تھیں۔

''آں ہاں......! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میری بیٹی ہے ہی اتنی پیاری کہ اس کے ایک، ایک نقش کو دل میں اتارنے کو دل کرتا ہے۔'' ماما جانی نے پیار سے اس کی پیشانی چوم لی۔

''آں ماما جانی! آپ نے اور پاپا جانی نے مجھے کبھی اپنے رشتوں کے بارے میں نہیں بتایا۔ آپ دونوں ہمیشہ بات ٹال دیتے ہیں یہ کہہ کر کہ ابھی تو تم چھوٹی ہو لیکن اب تو میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہوگئی ہوں۔ پلیز اب تو بتادیں۔'' رابیل کو ہمیشہ سے ہی رشتوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ اس کی فرینڈز کے کزنز آتے تھے۔ کھیلتے، گھومتے پھرتے تھے۔ پھر ان کے نانا نانی، دادا، دادی ان کو عیدی دینے آتے تو وہ اسکول میں خوشی، خوشی اپنی چیزیں دکھا رہے ہوتے اور رابیل کی آنکھیں پانیوں سے بھر جاتی تھیں۔ وہ اسکول سے واپسی پر پاپا جانی سے استفسار کرتی تھی اور پھر گھر آکر ماما جانی سے بھی سوال کرنا نہیں بھولتی تھی...... لیکن جواب وہی ہوتا تھا۔

''بیٹا ابھی آپ چھوٹی ہو جب بڑی ہوگی تو سب سے ملوائیں گے آپ کو۔'' جیسے، جیسے رابیل شاہ بڑی ہوتی گئی اسے سمجھ آتی گئی کہ کوئی ایسا حادثہ یا کوئی ایسی بات ماضی میں ضرور ہوچکی ہے جس کی وجہ سے یہ رشتے اس سے دور ہوگئے ہیں لیکن ایک تسلی بھی تھی کہ بڑے ہوکر یہ رشتے مل جائیں گے اور پھر وہ اپنے دادا، دادی اور نانا، نانی سے بہت سی عیدی لیا کرے گی اور اپنی فرینڈز کو دکھایا کرے گی لیکن اب جب وہ بالغ ہوگئی تھی تب بھی ماما جانی اور پاپا جانی اسے بتانے سے انکاری تھے۔ آج ماما جانی کا انکار سن کر اسے دلی دکھ ہوا تھا لیکن اس نے سوچا کہ اگر یہ رشتے اچھے ہوتے تو ضرور میرے پاس بھی ہوتے شاید انہوں نے ماما جانی اور پاپا جانی کے ساتھ کچھ برا ہی کیا ہوگا جو آج دونوں ان رشتوں کے بارے میں سننا بھی پسند نہیں کرتے۔

ماما جانی اسے سوچوں میں گم چھوڑ کر کچن میں ہانڈی دیکھنے کے لیے جاچکی تھیں۔ اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تو وہ بھی اپنے کمرے کی طرف آرام کی غرض سے چل دی۔

☆☆☆

''یار حمدان غصہ تھوک دے۔ وہ ایک لڑکی ہے، اس سے بدلہ لے کر تو کیا کرے گا اور پھر سب کو تمہاری عادات کا علم ہے، اس کے کہہ دینے سے تم برے تو نہیں بن سکتے ناں......'' معیز پچھلے دو گھنٹوں سے اسے سمجھانے میں اپنا سر کھپا رہا تھا لیکن حمدان بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ اس کے سر پر رابیل شاہ سے بدلہ لینے کی دھن سوار ہوگئی تھی اور اب اس کا اپنے ہدف سے پیچھے ہٹنا ناممکن ہی لگتا تھا۔ اول تو وہ کسی کو بلاوجہ چھیڑتا نہیں تھا

اب جبکہ شروعات رابیل کی طرف سے ہوئی تھیں اور وہ بھی بلا کسی وجہ کے تو حمدان کا غصہ سوا نیزے پر تھا۔

کچھ اس کی رگوں میں خاندانی خون دوڑ رہا تھا جو اپنا بدلہ لیے بنا ٹلتے نہیں تھے۔ بدلہ لینے پر آتے تو جان لیے بنا نہیں ٹلتے تھے لیکن اس وقت حمدان جان لینے سے پرے کچھ مختلف سوچ رہا تھا۔ رابیل نے بغیر کسی وجہ کے اس کی عزت اور وقار کو کرچی کرنے کی کوشش کی تھی۔ حمدان کو تو اساتذہ بھی بہت عزت دیتے تھے۔ ایک تو وہ تھا ہی ذہین اور فرمانبردار اور دوسرے وہ کسی کے لیے اذیت کا باعث نہیں بنتا تھا۔ وہ جس نہج پر اب سوچ رہا تھا اس پر تو کسی کا دھیان جا ہی نہیں سکتا تھا۔

''تم اس انسلٹ کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے جو بیچ چوراہے پر مجھے محسوس ہوئی ہے۔'' حمدان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہونے آ رہا تھا۔

''یار تو سمجھنے کی کوشش تو کر...... یار کون پاگل لڑکیوں سے بدلہ لیتا ہے اور پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ اس کی عزت بھی بیچ چوراہے پر بکھیرنا...... دیکھ وہ لڑکی ہے، اسے بہت فرق پڑے گا تو، تو لڑکا ہے تجھے نہ کوئی پوچھنے والا ہے نہ تجھ پر کوئی انگلی اٹھانے والا ہے۔''

حمدان نے معیز کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو معیز کے پسینے چھوٹ گئے کیونکہ وہ خود بہنوں والا تھا اور وہ سمجھ سکتا تھا کہ رابیل کے ساتھ جو کچھ حمدان کرنے جا رہا ہے اس سے رابیل کی زندگی محدود اور مفلوج ہو کر رہ جائے گی۔

''تو اپنا لیکچر بند کر اور بتا کہ تو میرا ساتھ دے رہا ہے یا نہیں۔'' حمدان کو معیز کا سمجھانا سخت زہر لگ رہا تھا کیونکہ وہ کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔

معیز کے تو پسینے چھوٹے ہوئے تھے کیونکہ اس نے کبھی ایسا کام نہیں کیا تھا۔ کیا تو حمدان نے بھی ایسا کچھ نہیں تھا معیز، حمدان کو بچپن سے جانتا تھا، دونوں اکٹھے بورڈنگ میں پڑھتے تھے اور کلاس فیلوز ہونے کے ساتھ ایک دوسرے کے بہترین دوست تھے۔ کالج میں بھی دونوں نے ایک سے سبجیکٹس رکھے تھے پھر یونیورسٹی آ کر ان کی دوستی عزیر سے ہوئی وہ بھی انہی کی طرح پڑھاکو اور نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا اسٹوڈنٹ تھا۔ جب وہ تینوں ایم ایس سی میں آئے تو آذر اور عمیر سے ان کی دوستی ہوئی۔

سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ اس طرح سے ان پانچ لڑکوں کا ایک گروپ بن گیا تھا جو یونیورسٹی میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ سب اپنے گروپ میں تو بہت شرارتیں کرتے تھے لیکن دوسروں کو بہت کم ہی شامل کرتے تھے۔ اس لیے سب ان کو تھوڑا مغرور سمجھتے تھے حالانکہ ضرورت پڑنے پر یہ لوگ سب کی مدد بھی کھلے دل سے کرتے تھے۔ ان میں کبھی کسی نے کوئی غلط عادت نہیں دیکھی تھی۔

تبھی تو حمدان کی بات سن کر معیز کو دکھ ہوا تھا کیونکہ ان سب نے تو کبھی کچھ ایسا غلط سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بات صرف حمدان اور معیز کے درمیان تھی۔ حمدان ہمیشہ اپنی ذاتی بات معیز سے شیئر کرتا تھا کیونکہ وہ دونوں بچپن کے دوست تھے۔

''تو غلط کر رہا ہے ایک بار پھر سوچ لے یار، ایسے جذبات میں آ کر بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔'' معیز نے ایک بار پھر حمدان کو سمجھانے کی کوشش کی جو رائگاں ہی گئی۔

''تو میرا ساتھ دے رہا ہے کہ نہیں؟ بس مجھے اتنا بتا دے۔'' حمدان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رابیل جیسی ضدی چڑیا کے پر کاٹ ڈالے اور اسے بے بس کر دے۔

''او کے یار! کول ڈاؤن...... میں نے تجھے کبھی انکار کیا ہے۔'' معیز نے آخر کار ہتھیار ڈال ہی دیے۔ اگر وہ نہ بھی مانتا تو بھی حمدان نے کون سا اپنی سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنانا تھا۔

''یہ ہوئی ناں بات! مجھے یقین تھا کہ تو انکار کر ہی نہیں سکتا۔''

''چل یار تجھے کچھ کھلاؤں پھر مجھے اپنے مشن پر کام بھی شروع کرنا ہے۔'' حمدان تو اس وقت کا سوچ

کر خوش ہو رہا تھا جب رابیل شاہ بے بس ہو کر اس کے سامنے گڑگڑا رہی ہو گی۔ جبکہ معیز بڑی پُرسوچ نگاہوں سے حمدان کو دیکھ رہا تھا۔ اس دوست کو جس نے کبھی چیونٹی کا بھی دل نہیں دکھایا ہو گا اور اب بدلے کی آگ اسے کس حد تک لے آئی تھی۔

ٹھہرے پانی میں پتھر نہیں پھینکنے چاہئیں ورنہ چھینٹے تو آپ پر پڑیں گے ناں اور کبھی، کبھی خاموش جھیل میں کنکر پھینکنے سے آپ پر پڑنے والے چھینٹے آپ کے کپڑوں کے ساتھ، ساتھ وجود کو بھی داغ دار کر جاتے ہیں اور ایسے داغ سیاہ داغوں کی طرح ان مٹ ہوتے ہیں جو آپ کے وجود پر اس طرح سے ثبت ہو جاتے ہیں کہ دوست احباب بھی آپ کو پہچاننے سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ حمدان علی شاہ اور رابیل شاہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اول تو حمدان کسی کو تکلیف نہیں دیتا تھا لیکن اب تو رابیل شاہ نے خود اسے پکارا تھا...... بلکہ للکارا...... آ بیل مجھے مار کی طرح...... اور یہ پکار نا رابیل شاہ کو بہت مہنگا پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

ساہیوال سے واپسی پر بھی سارا راستہ رابیل اپنے رشتے داروں کے بارے میں ہی سوچتی رہی تھی...... بس اسٹاپ سے یونیورسٹی ہاسٹل جاتے ہوئے بھی وہ اپنی سوچوں میں اس قدر گم تھی کہ اسے اپنے قریب رکتی پراڈو کا بھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ ہوش میں تو وہ تب آئی جب دو آدمیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر پراڈو میں کھینچ ڈالا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی ہی تھی کہ ایک آدمی نے اس کے چہرے پر رومال رکھ دیا جس سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

”اُف...... آ آ آ...... ماما جانی؟ پاپا جانی...... آ آ......“ ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی اس نے اپنے جان سے پیارے ماما اور پاپا کو پکارنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اسے اپنے پورے جسم میں بہت درد محسوس ہو رہا تھا لیکن آنکھیں کھلنے کی دیر تھی اس نے جب خود کو غیر مانوس ماحول میں پایا تو سب کچھ اسے آہستہ، آہستہ یاد آنے لگا تھا کہ کس طرح وہ یہاں پہنچی تھی۔

”یعنی کہ میں اغوا ہو چکی ہوں...... اُف...... لیکن یہ سب کون کرے گا؟ میں نے تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہا...... ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھا ہے۔“ رابیل شاہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اغوا ہو چکی ہے۔

”اور میرے ماما جانی اور پاپا جانی...... وہ...... وہ کیسے یہ خبر سن پائیں گے...... لڑکی کے لیے تو یہ داغ بن جاتا ہے کہ وہ اغوا ہوئی ہے پھر میرے ماما اور پاپا جانی کیسے برداشت کریں گے؟ اے میرے اللہ یہ کیا ہے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔“ سوچوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو رابیل کو رونے اور چیخنے چلّانے پر مجبور کر رہا تھا۔ سب سوچ، سوچ کر رابیل کو لگ رہا تھا کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

ایک دم ہی اسے کچھ خیال آیا جس کے تحت اس نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت وہ بہت ہی نفیس اور خوب صورت بیڈ پر موجود تھی۔ حد سے زیادہ خوب صورت اور اسٹائلش پردے اور ان سے ہم رنگ قالین اور کمرے میں موجود ڈیکوریشن پیس بہت اعلیٰ ذوق کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔ رابیل نے بھاگ کر کھڑکی دیکھنے کی کوشش لیکن یہ کیا کھڑکی پر تو بہت مضبوط جنگلا لگا ہوا تھا۔ باہر بہت اندھیرا تھا اور شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”میں دوپہر دو بجے بس سے اتری تھی اور اب رات کا پہر ہے...... یعنی مجھے آدھا دن گزر گیا یہاں آئے ہوئے...... اُف میرے خدایا۔“ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”سب میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟“ رابیل کو اس سوچ کے ساتھ، ساتھ ڈر بھی لگ رہا تھا کیونکہ باہر بارش شروع ہو چکی تھی اور اسے رات کی بارش سے بہت خوف آتا تھا۔ بادل کی گرج اور چمک سے اس کا دل دہل جاتا تھا۔ جب بھی رات کو ایسی بارشیں اور گرج چمک ہوتی تو ماما جانی اس کے کمرے میں آ کر اسے اپنی نرم، نرم آغوش میں چھپا لیتی تھیں لیکن اب وہ تنہا تھی۔ رابیل کو یہ سوچ کر اور بھی

شدت سے رونا آرہا تھا اب اس کی حالت بہت خراب ہورہی تھی۔ کمرے میں پانی نام کی کوئی شے نہیں تھی اور وہ صبح سے بھوکی پیاسی تھی۔ اس پر پھر سے غنودگی طاری ہورہی تھی۔ شاید اس رومال والے نشے کا اثر تھا کہ وہ دوبارہ نیم بے ہوش ہوچکی تھی۔ اسے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو اس نے اپنی آنکھیں بھرپور کوشش سے پوری کھولیں۔ کھڑکی سے آتی روشنی اسے صبح کا سلام پیش کررہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی دروازے پر پڑنے والی رابیل کی نظر پلٹنا بھول گئی تھی۔ دروازے پر تو سید حمدان علی شاہ اپنی تمام تر وجاہت سمیت کھڑا تھا اور رابیل کی ہونق بنی شکل دیکھ کر مسکرا رہا تھا لیکن رابیل کو تو اس کی ہنسی مکروہ لگ رہی تھی۔

”تت...... تم! تم ...... کیسے یہ سب...... کیوں...... ؟ تم نے ایسا کیوں کیا؟“ روتے، روتے رابیل کو وہ سب ایک دم یاد آگیا تھا۔ ہاں وہ یونیورسٹی کا دن...... اُف تو اس نے اس دن کا بدلہ لینے کے لیے یہ گھٹیا حرکت کی۔

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے...... ؟ ہاں؟ اگر تم اس دن کی بات کو لے کر یہ سب کررہے ہو تو دیکھو میں تم سے معافی مانگ لیتی ہوں...... مجھے جانے دو پلیز...... تم نہیں جانتے لڑکی کی عزت کیا ہوتی ہے...... پلیز۔“ اور کوئی موقع ہوتا تو رابیل، حمدان کو دو چار تھپڑ رسید کرتی لیکن اب تو وہ اس کی قید میں تھی اور اسے اس قید سے جلد از جلد چھٹکارا پانا تھا۔

”پہلی بات تو یہ کہ اب تم یہاں سے جب تک میں نہ چاہوں کہیں بھی نہیں جاسکتیں اور ہاں اگر تم نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا...... دوسری بات عزت...... ہا...... ہا تو مس رابیل شاہ عزت کا تو آپ کو خود نہیں پتا کہ کیا ہوتی ہے اور ویسے بھی اب تو تمہیں سب لوگ میری عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ سو...... اپنی عزت کی تو تم فکر مت کرو...... وہ میری امانت......“ حمدان نے بڑے تحکمانہ انداز سے رابیل کو سب کچھ باور کروانے کی کوشش کی۔

”اس سب بکواس کا کیا مطلب ہے تمہارا؟“ اس کی باتوں سے مطلب اخذ کرکے رابیل کے تو چھکے چھوٹ گئے تھے۔

”وہی جو مطلب تمہیں سمجھ آیا ہے۔ اچھا پہلے یہ کھانا کھالو پھر تمہیں اپنے سب مطلب سمجھا دیتا ہوں۔“ حمدان نے کھانے سے بھری ٹرے اس کے سامنے رکھ دی جسے رابیل نے بڑے زور سے زمین پر دے مارا تھا۔

”تڑاخ......“ حمدان کا ہاتھ بے ساختہ ہی اٹھا تھا اور رابیل کا چہرہ سرخ کرگیا تھا...... ہاتھ اتنا بھاری پڑا تھا کہ رابیل کا سر سائڈ ٹیبل کے کارنر سے لگا تھا اور وہ درد سے بلبلا اٹھی تھی جبکہ اس کا چہرہ لحموں میں خون سے تر ہوگیا تھا۔

حمدان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے تھاما تھا اور رابیل، حمدان کی بانہوں میں ہی جھول گئی تھی۔

☆☆☆

رابیل کی آنکھ کھلی تو اس نے کراہ کر پانی کی ضرورت محسوس کی۔ جس پر قریب کرسی پر بیٹھے حمدان نے سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلا اور رابیل کے آگے کیا۔ اس نے گلاس پکڑنے کی کوشش کی لیکن سر کا درد اتنا شدید تھا کہ وہ اٹھنے سے قاصر تھی جس پر حمدان نے اسے کمر سے پکڑ کر سہارا دیا اور پانی کے چند گھونٹ اسے پلائے۔

اگر رابیل اس حال میں نہ ہوتی تو کبھی وہ یہ سب برداشت نہیں کرتی لیکن ایک تو سر میں شدید درد اوپر سے اس ظالم کی قید...... رابیل کو اپنی بے بسی پر جی بھر کے رونا آیا۔

حمدان دیکھ رہا تھا کہ گزشتہ دو دن سے رابیل کی حالت کیسی دگرگوں ہوگئی تھی۔ گلابی، گلابی گال اب بخار میں ہونے کے باوجود پیلے، پیلے سے ہوگئے تھے۔ حمدان کے دل کو کچھ ہوا تھا لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔

”رابیل شاہ...... ! رونا بند کرو اور یہ کھانا کھا

لو......" جب سے رابیل یہاں آئی تھی تب سے اس نے صرف ایک گلاس پانی ہی پیا تھا۔ یعنی اس نے مسلسل دو دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

"نہیں، میں یہ نہیں کھا سکتی...... پلیز تمہیں رب کا واسطہ...... مجھے جانے دو۔"

"دیکھو اگر تم یہ کھانا نہیں کھاؤ گی تو میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔"

"او کے، تم وعدہ کرو کہ میرے کھانا کھا لینے کے بعد تم مجھے چھوڑ دو گے؟"

"وعدہ نہیں کرتا ہاں کوشش ضرور کروں گا۔" ابھی تو حمدان نے اپنا پلان پورا کرنا تھا وہ کیسے جانے دے سکتا تھا رابیل کو......

"تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟" رابیل نے روتے ہوئے حمدان سے استفسار کیا تھا۔

"پہلے تم کھانا ختم کرو...... پھر تمہیں سب کچھ بتا دوں گا وعدہ......" حمدان نے بھی سوچا کہ چلو جلد ہی کام پورا ہو جائے گا اور پھر اسی بہانے یہ لڑکی کچھ کھا ہی لے گی۔

رابیل یہ سن کر کھانا کھانے لگی لیکن اس سے نوالے حلق سے نیچے اتارے نہیں جا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے گلے میں کانٹے اُگ آئے ہوں لیکن پھر بھی اس نے تھوڑا بہت کھانا زہر مار کر ہی لیا تھا کچھ تو وہ بھوکی بھی تھی اور کچھ اسے کچھ وجوہات جاننے کی بھی جلدی تھی۔

"پلیز اب بتا دو، یہ سب کیوں کر رہے ہو؟" رابیل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے اپنی غلطی پتا چلے جس کی سزا میں اسے یہاں لایا گیا تھا۔

"ہاں تو اب تم میری بات تحمل سے سننا...... تمہیں اپنی عزت کا بہت خیال ہے ناں تو اب تم میری عزت بن جاؤ...... تمہاری عزت کی ذمے داری بھی میرے ذمے آ جائے گی...... اور ہاں جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے ورنہ تم جانتی ہو کہ یہ کام کیسے پتا میں تمہیں یہاں سے جانے ہی نہیں دوں گا۔" حمدان کا ڈھکا چھپا مطالبہ سن کر رابیل تو بے ہوش ہوتے، ہوتے بچی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حمدان ایسا کچھ کرے گا کیونکہ اگر رابیل کو حمدان سے کوئی چڑ بھی تو وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے اپنے دماغ کا فتور ہے اور اتنا تو وہ علم رکھتی تھی کہ حمدان یونیورسٹی کا اچھا اسٹوڈنٹ تھا۔

حمدان کے مطالبے نے اسے بہت سے پہلوؤں پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتی تو حمدان اسے جانے نہیں دیتا اور پھر ایسی صورت میں اس کے ماما، پاپا کیسے جی پاتے جن کی اکلوتی پونجی ہی وہ تھی۔ ان سب پہلوؤں کو دیکھتے سوچتے ہوئے اس نے حمدان کو ہاں کر دی تھی اور اس کے علاوہ کوئی آپشن بھی تو نہیں تھا۔

لیکن حمدان کو رابیل کی ہاں کھٹکی تھی...... وہ کیسے اتنی جلدی مان گئی یہ حمدان کی سمجھ سے باہر تھا۔ خیر اس نے یہ سب سوچیں فوراً سے جھٹک ڈالیں کیونکہ اس کا مقصد تو رابیل کو بے بس کرنا تھا اور اپنے پنجرے میں قید کرنا تھا۔ جس طرح رابیل نے اسے بے عزت کیا تھا اسی طرح اب وہ بھی رابیل کو تا عمر بے بس ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس پر خوشیوں کے دروازے بند کر دینا چاہتا تھا۔ یہ سب حمدان شاہ کے مزاج کے بالکل برعکس تھا لیکن بدلے کی آگ کب کسی کو کچھ سوچنے کے قابل چھوڑتی ہے۔

اگلے چند گھنٹوں میں رابیل کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ رابیل منہاج شاہ سے رابیل حمدان علی شاہ بن گئی تھی۔ سائن کرتے ہوئے اسے اپنی بے بسی اور اکیلے پن پر بہت رونا آیا۔ ایسا کیا تھا جو رابیل یہ سب کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ یہ خود رابیل بھی نہیں جان پائی تھی۔

"پلیز اب تو مجھے جانے دو......" حمدان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر رابیل نے پھر سے اس کی منت کی۔

جوں، جوں حمدان بیڈ کے قریب آ رہا تھا ویسے ویسے رابیل کا دل دھڑک رہا تھا۔

''دیکھو میں نے تمہارا کہا مان لیا ہے لیکن اس سے آگے کچھ نہیں مان سکتی' پلیز مجھ سے دور رہو......''

''ہا...... مسز رابیل حمدان شاہ کو کتنی خوش فہمی ہے اپنے بارے میں...... تم میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے کہ تمہارے قریب آیا جائے بلکہ مجھے تو تمہارا وجود ہی برداشت نہیں تو تمہیں چھونا تو دور کی بات ہے۔''

حمدان بول نہیں رہا تھا بلکہ پھنکار رہا تھا۔

''تو پھر تمہیں مجھے اس بندھن میں باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''صرف اور صرف تمہیں اپنی نظروں کے سامنے بے بس دیکھنے کے لیے اور شاید دنیا کے سامنے... بے عزت کرنے کے لیے...... تمہیں بہت اچھا لگتا ہے ناں کہ لوگ تمہیں نیک و پارسا جانیں تو دیکھ لو اب لوگ کیا کہیں گے۔'' وہ مکروہ ہنسی ہنسا تھا۔ رابیل کا اندر تک جل اٹھا تھا۔

''اب کرو مجھ سے بدتمیزی...... منہ توڑ دوں گا میں تمہارا......'' حمدان نے رابیل کا چہرہ اپنے ہاتھ سے اتنی زور سے دبایا کہ رابیل کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

''چلو آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں اور ہاں...... یہ بات ذہن نشین کرلو کہ آئندہ کسی بھی لڑکے سے بدتمیزی مت کرنا ورنہ نتیجہ تم دیکھ ہی چکی ہو۔'' رابیل کو تو کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا اسے اب حمدان کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا کیونکہ زندگی تو وہ اس کی برباد کر ہی چکا تھا۔ اسے زارا کی، یونیورسٹی کی، لوگوں کی کوئی فکر نہیں تھی...... اسے بس اپنے ماما، پاپا کی فکر ستا رہی تھی کہ وہ کس حال میں ہوں گے...... وہ اس سے کیسا سلوک کریں گے۔ لیکن اسے ایک یقین بھی تھا کہ ماما، پاپا اس کی بات سنیں گے...... انہیں رابیل پر یقین ہوگا کیونکہ زندگی میں کبھی کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں کیا تھا اور پھر وہ کردار کے لحاظ سے کوئی گری ہوئی لڑکی نہیں تھی۔ اسے اپنے پاپا، ماما پر پورا یقین تھا کہ وہ اسے سنبھال لیں گے۔

☆☆☆

''تمہیں کہاں ڈراپ کروں؟'' کار اسٹارٹ کرتے ہی حمدان نے رابیل سے پوچھا جو کسی گڑیا کی طرح خاموش بغیر پلکیں جھپکائے بیٹھی تھی۔

''او ہیلو...... میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں......''

حمدان نے رابیل کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ لہرایا تو وہ دنیا میں واپس لوٹی تھی۔

''کہیں بھی اتار دو...... اب زندگی میں کوئی بھی راستہ مجھے سرخرو نہیں کر پائے گا۔''

''اور میں ایسا چاہتا بھی نہیں ہوں۔'' حمدان نے بڑی بے رحمی سے یہ الفاظ ادا کیے تھے۔ حمدان نے یونیورسٹی سے تھوڑا پہلے ہی کار روک دی تھی مگر رابیل کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔

''چلو اترو بھی اب......'' حمدان نے رابیل کو بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا تھا۔

رابیل بنا اس کی طرف دیکھے کار سے نیچے اتر گئی تھی۔

''اور یہ اپنا بیگ بھی لیتی جاؤ۔'' حمدان نے اسے اس کا بیگ دینے کے لیے پیچھے سے ہانک لگائی۔ رابیل نے پلٹتے ہی بیگ گاڑی کی سیٹ سے اٹھا لیا تھا۔

رابیل کے پلٹنے پر حمدان کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تھی اور پلٹنا بھول گئی تھی، کچھ تو تھا جو رابیل کے چہرے کو حمدان کے لیے خاص بنا گیا تھا۔ بس ایک لمحہ تھا وہ...... حمدان کے دل میں کچھ، کچھ ہوا تھا رابیل کے پیلے، پیلے نقوش کو دیکھ کر...... سرخ ہوتی ناک کو دیکھ کر...... ادھ اوڑھے دوپٹے میں رابیل کے بکھرے بالوں کو دیکھ کر...... کیا حال ہو گیا تھا رابیل کا صرف اس کی وجہ سے...... حمدان ابھی ملال کی وادی میں قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ خودساختہ انا نے راستہ روک لیا۔

''نہیں...... یہ سب تو ہونا ہی تھا...... ہر چیز کا بدلہ تو لازم ہے۔'' حمدان نے تمام خیالات کو جھٹکتے ہوئے گاڑی آگے بڑھالی۔

☆☆☆

ہاسٹل وارڈن نے رابیل کو آڑے ہاتھوں لیا تھا اور یونیورسٹی سے نکال دیے جانے کے سنگین نتائج سے

# ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

## ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

### نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

بھی آگاہ کر دیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی تو پھر......؟ اب رابیل کے پاس گھر جانے کے علاوہ کوئی چارا نہیں تھا۔ زارا سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن وارڈن نے اس سے بھی نہیں ملنے دیا۔ یہ کہہ کر کہ ''تم باقی گرلز کو بھی خراب کرو گی، نہ جانے کہاں رہیں، گھر والے بھی پتا کرتے رہے۔'' وہ اپنے ماما، پاپا کے خیال سے کانپ گئی تو کیا ان کو بھی پتا چل چکا تھا کہ وہ ہاسٹل میں نہیں تھی۔

لاہور سے ساہیوال تک کا سفر آج سے پہلے کبھی اتنا طویل نہیں لگا تھا لیکن اب تو یہ سفر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ رابیل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر اپنے گھر پہنچ جائے اور اس بات کا یقین کر لے کہ اس کے ماما، پاپا کو اپنی بیٹی پر بھروسا ہے اور وہ اسے لوگوں کی طرح بے عزت نہیں کریں گے مگر......!

چار دن غائب رہنے کے بعد وہ آج اپنے گھر کی دہلیز پر کھڑی تھی مگر اسے کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔ گیٹ کھلا تھا...... چوکیدار موجود نہیں تھا۔ لان میں سفید چادر بچھی تھی جس پر جا بجا کھجور کی گٹھلیاں پڑی تھیں اور بہت سے مرد حضرات گٹھلیوں پر کچھ پڑھنے میں مصروف تھے۔

اس کے قدم یہ سب دیکھ کر ڈگمگا گئے تھے لیکن وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے اندر لاؤنج تک آئی۔ وہاں خواتین بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں پھر اچانک سامنے سے آتی ہوئی آمنہ دکھائی دی۔

''رابیل کہاں تھیں تم......؟'' آمنہ نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ سب کیا ہے؟ ماما جانی اور پاپا جانی کہاں ہیں؟'' رابیل کو بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اپنے پاپا جانی اور ماما جانی کو نہیں دیکھا تھا۔ آمنہ نے اسے کندھوں سے تھاما۔

''رابیل حوصلے سے سنو انکل، آنٹی کا تو تین روز پہلے ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا، ہم نے تمہیں کانٹیکٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن تمہارا سیل فون آف تھا اور یونیورسٹی میں تم نہیں تھیں پھر تمہارا انتظار کیا گیا لیکن انکل، آنٹی کی ڈیڈ باڈیز اس قابل نہیں تھیں کہ انہیں زیادہ دیر رکھا جاتا۔ سو ہمیں انہیں ان کی آخری آرام گاہ پہنچانا پڑا...... بہت افسوس ہوا...... لیکن تم......'' آمنہ، رابیل کی طرف نظریں کیے بغیر ہی اسے روح فرسا خبر سنا رہی تھی لیکن جیسے ہی آمنہ کی نظر رابیل کے پھیکے چہرے پر پڑی تو زبان تالو سے لگ گئی اور اگلے ہی لمحے رابیل پورے قد سے زمین پر آ گری تھی۔

☆☆☆

ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے جسم سے روح کھینچ لی ہو۔ زندگی بہت پھیکی لگنے لگی تھی۔ زندگی کے سب رنگ عجیب لگنے لگے تھے۔ رابیل...... رنگوں سے پیار کرنے والی لڑکی...... رنگوں سے بھاگنے لگی تھی۔ رابیل کو جب کچھ سمجھ آنے لگا، تب تک سب لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ صرف آمنہ اور اس کے امی، ابو رہ گئے تھے۔ آگے زندگی اکیلے کیسے کٹنی تھی...... یہ سوچ رابیل کو بستر سے اٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ جان سے پیارے والدین کی وفات پر کون، کون آیا تھا...... تدفین کیسے کی گئی۔

سوائے چند جاننے والوں کے اور کوئی رشتے دار نہیں آیا تھا۔ کوئی بھی پروفیسر صاحب کے خاندان کو نہیں جانتا تھا۔ صرف پروفیسر صاحب کے کولیگز، اسٹوڈنٹس اور چند ایک آس پڑوس کے لوگ ہی تدفین میں شامل ہوئے تھے۔ یہ سب آمنہ ہی کی بدولت رابیل کو پتا چلا تھا۔

آمنہ نے رابیل سے بہت پوچھا کہ وہ کہاں تھی یا اگر کوئی پریشانی کی بات ہے تو بھی بتا دے وہ اور اس کے والدین اس کا پرابلم حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن رابیل کے منہ پر پڑے قفل نہیں ٹوٹے...... پھر آمنہ نے بھی استفسار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر اینڈ مسز منہاج علی شاہ کو دنیا سے گئے بیس دن سے اوپر ہو گئے تھے۔ رابیل کو تو دنیا کی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹی رہتی۔ آمنہ ہی تھی جو اس کا کسی بچے کی طرح خیال رکھ رہی تھی۔ وہ دن رات

اس کے ساتھ تھی۔ گھر میں ایک گارڈ، اس کی آیا اماں جو کچن سنبھالتی تھیں اور گھر کی صفائی کی ذمے داری بھی انہی کی تھی اور ان کے شوہر شرفو بابا جو باہر سے ضرورت کا سامان لا دیتے تھے یا لان کو دیکھتے تھے۔ یہ فیملی شروع سے ہی سرونٹ کوارٹر میں رہائش پزیر تھی اور گھر کے افراد ہی کی طرح تھے۔ رابیل کو ماما جانی سے زیادہ شریفاں اماں نے پالا تھا۔ اب بھی شریفاں اماں، رابیل کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھیں۔

"رابیل...... میری دھی! ایسا کب تک چلے گا؟ کمرے سے تم باہر نہیں نکلتیں، کپڑے تم نے سفید اور کالے پہننے شروع کر دیے ہیں، میری دھی! زندگی اسی کا نام ہے، ایک نہ ایک دن ہم سب کو اس رب سوہنے کے پاس جانا ہے...... کوئی پہلے تو کوئی بعد میں جائے گا۔ میری دھی سنبھال خود کو...... ابھی تو تیرا پورا جیون پڑا ہے۔" اماں شریفاں نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی رابیل کو سینے میں بھینچ کر پیار سے سمجھانے کی کوشش کی تو اس کی سسکیاں نکل گئیں۔ آج اس کے آنسو کھل کر برسے تھے۔ آخری بار، وہ حمدان کے آگے گڑگڑائی تھی اور دوبارہ اب رو رہی تھی۔

"نہ میری دھی......! روتے نہیں...... جانے والوں کی روح کو دکھ ہوگا۔ ان کی روحیں بے قرار ہوں گی۔"

"اماں کیوں چلے گئے ماما جانی اور پاپا جانی...... انہیں پتا بھی تھا کہ ان کی رابیل کا ان کے علاوہ اس دنیا میں کوئی بھی نہیں......" رابیل نے اماں شریفاں کا جھریوں بھرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے پوچھا۔

اماں کیا جواب دیتی...... وہ جانتی تھی کہ رابیل اکیلی نہیں ہے، رشتے دار موجود ہیں لیکن ان کا کسی کو علم نہیں کہ وہ سب کہاں ہیں۔ رابیل کی ماما جانی اکثر ان سے اپنے رشتے داروں کی باتیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن کبھی انہیں ان کے شہر کا نہیں بتایا۔

اماں شریفاں بہت نیک خاتون تھیں تو شرفو بابا بھی عاجزی و انکساری میں کچھ کم نہیں تھے...... دونوں کو رابیل کی بہت فکر تھی...... جوان بچی تھی...... منہاج صاحب نے بہت کچھ چھوڑا تھا رابیل کے لیے...... لیکن ایک لڑکی کی زندگی صرف پیسے پر تو نہیں بسر ہوتی، اسے ایک مضبوط سائبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اس دنیا کے بھیڑیے اسے چیر پھاڑ کر رکھ دیں۔

لیٹے، لیٹے رابیل کو اچانک حمدان کا خیال آیا تھا۔ "ہاں وہی ہے اس سب کا ذمے دار...... میری بربادی کا اور ماما جانی، پاپا جانی کی موت کا ذمے دار، نہ وہ میرے ساتھ ایسا کرتا، نہ ماما جانی اور پاپا جانی کو میرے اغوا کی خبر ملتی اور نہ ان کا ایکسیڈنٹ ہوتا۔" سوچ تو رابیل ٹھیک رہی تھی لیکن مسٹر اینڈ مسز منہاج کا تو رب کی طرف سے لکھا ہی یوں ہوا تھا اور لکھے ہوئے کو کون ٹال سکتا ہے اور پھر موت کا تو ایک بہانا بننا ہوتا ہے۔ موت تو برحق ہے، یہ سوچتے ہوئے رابیل کو حمدان سے بہت نفرت محسوس ہوئی تھی اور خود سے اس سے بھی زیادہ نفرت اس کاغذی تعلق کی بنا پر جو حمدان اس سے زبردستی قائم کر چکا تھا۔ اس لمحے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔

کیا جانتی تھی وہ حمدان علی شاہ کے بارے میں؟ کچھ بھی تو نہیں سوائے اس کے کہ وہ یونیورسٹی کا ہونہار اور اساتذہ کا ہر دل عزیز اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ کہاں کا رہنے والا تھا، اس کا خاندان کیسا تھا؟ اس کا کانٹیکٹ نمبر؟ کچھ بھی تو نہیں تھا اس کے پاس...... یعنی وہ تہی داماں رہ گئی تھی۔ زندگی کی بازی، خوشیوں اور امیدوں کی بازی ہار گئی تھی وہ......!

"سید حمدان علی شاہ......! تم سے زیادہ نفرت میں اس دنیا میں کسی سے نہیں کرتی...... سنا تم نے...... کسی سے نہیں...... کسی سے بھی نہیں۔" رابیل ہذیانی انداز میں چیخی تھی کہ اس کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئی تھیں۔

☆☆☆

"چاچی......! میری باربی ڈول کہاں ہے؟" دانی نے ہانپتے ہوئے اپنی چاچی سے چھوٹی بہن کا پوچھا جو خود کسی کام میں مصروف تھیں...... وہ خود بھی

شاید کھیل کر آرہا تھا۔

بڑی مشکل سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلنے پارک تک گیا تھا ورنہ تو اسے صرف باربی ڈول ہی اپنا سب کچھ لگتی تھی۔ اور بچوں کے ساتھ وہ زیادہ فری نہیں ہوتا تھا۔ اسے زندگی کے رنگ ڈول کے ہونے سے ہی نظر آتے تھے۔

''دادو کے روم میں دیکھو دانی......'' چاچی نے اس کے چہرے پر اپنی گڑیا کے لیے فکر دیکھی اور وہ مسکرادیں۔

دانی اپنی باربی ڈول سے تین سال بڑا تھا...... ڈول اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ پھولے، پھولے گلابی گال اور سفید کھلتا ہوا رنگ، سنہرے بال...... ایسے ہی تو وہ اسے ڈول نہیں کہتا تھا۔ دانی کو ہر وقت ڈول کی ہی فکر ستاتی رہتی۔ اسکول جاتے وقت سب سے پہلے وہ اس کے گال پر چٹاچٹ پیار کرتا تھا۔ واپس آتے ہی اسے ڈھونڈتا...... اس کے لیے راستے سے خریدی کینڈیز اسے خود کھلاتا۔

جب ماما جان سونے کا کہتیں تو وہ ڈول کو ساتھ لیے اپنے بیڈ روم میں چلا جاتا اور اسے اس کے کاٹ میں خود سلاتا تھا۔ بڑے پیار سے اس کے بال سنوارتا اور باقاعدہ ماں کی زبان سے سنی لوری سناتا۔ گالوں پر بوسے دے کر سلاتا...... گھر والے اس کی ان حرکتوں پر ہنستے تھے اور اس قدر پیار پر ذرا پریشان بھی ہو جاتے تھے۔

''یہ لڑکا تو رانو کے پیچھے باؤلا ہو گیا ہے، میں تو کہتی ہوں ان دونوں کو ایک ہی کردیں گے...... ورنہ یہ لڑکا تو اس کا ساتھ چھوٹنے پر ایک، ایک کو مار ڈالے گا۔'' اماں جان ہنس کر کہتیں تو ان کی دونوں بہویں بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس دیتیں۔

''اماں جان مجھے تو کوئی اعتراض نہیں...... مجھے تو گڑیا اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر پیاری ہے۔'' شافیہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں...... دراصل تین بیٹوں کے بعد ڈاکٹر نے انہیں مزید بچوں کے لیے روک دیا تھا ان کی حالت کے پیش نظر ورنہ انہیں بیٹی کا بہت شوق تھا۔

بیٹیاں ہی تو ماں کے دکھ، سکھ کی ساتھی ہوتی ہیں۔

جبکہ گڑیا کی ماما بھی یہ بات سن کر خوش تھیں...... انہیں بھی بھابی کے تینوں بیٹے اور خاص طور پر دانی بہت پسند تھا اور وہ تھا بھی ان کی لاڈلی کا دیوانہ......

☆☆☆

سید حسنین علی شاہ کی ایک ہی اولاد تھی۔ سید وجاہت علی شاہ...... وجاہت علی شاہ کی پیدائش پر چند پیچیدگیاں ہونے کے باعث سید حسنین کی شریک حیات اس جہان سے کوچ کر گئی تھیں۔ پھر انہوں نے بہنوں کے بے حد اصرار پر اور کچھ وجاہت شاہ کا سوچ کر دوسری شادی کرلی۔ دوسری بیگم بہت ہی نیک دل خاتون تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے پتا نہیں کس مصلحت کے تحت انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ انہوں نے وجاہت شاہ کو ہی اپنی سگی اولاد سے بڑھ کر ممتا کا پیار دیا پھر انہوں نے وجاہت شاہ کے لیے اپنی بھانجی ذکیہ کو منتخب کیا جس پر وجاہت شاہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ذکیہ بیگم بھی اپنی خالہ کا پرتو تھیں...... نہایت صابر و شاکر اور عاجز تھیں۔ وجاہت شاہ کی زندگی کی گاڑی ذکیہ بیگم کے ہمراہ نہایت سُبک روی سے چل رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ سید حسنین شاہ اور ان کی بیگم وجاہت شاہ کو داغِ مفارقت دے گئے۔

سید وجاہت علی شاہ کو اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا۔ سید منان علی شاہ اور سید منہاج علی شاہ...... دونوں میں مثالی پیار تھا۔ منان شاہ نے بی اے کر کے ہی تعلیم کو خیرباد کہہ دیا اور باپ کی زمینوں اور فیکٹریوں کو سنبھالنے لگے۔

اماں جان یعنی بیگم وجاہت علی شاہ نے منان شاہ کی شادی ان کی پسند سے اپنی بھتیجی سے کردی جو نہایت ہی خوش اخلاق تھی۔ انہوں نے آتے ہی تمام کام اپنے ذمے لے لیے تھے اور اپنی پھپھی کو بستر پر بٹھا دیا تھا۔ ان کی اپنے دیور منہاج سے بہت بنتی تھی۔ منہاج شاہ ان دنوں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ ان کا ارادہ پی ایچ ڈی کرنے کا تھا جبکہ وجاہت شاہ چاہتے تھے کہ

وہ بھی منان شاہ کی طرح کاروبار سنبھالیں۔ وقت آگے گزرا تو شافیہ بیگم نے اماں جان کے کہنے پر منہاج سے اس کی پسند دریافت کی جس پر انہوں نے اپنی دور پرے کی رشتے کی پھپو کی بیٹی کا نام لے دیا۔ جس پر گھر والوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا اور وہ اس کو منہاج کے لیے بیاہ لائے۔ مسز منہاج بھی بہت اچھی تھیں۔ دونوں بہوؤں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ منہاج شاہ نے شادی کے بعد اپنا ایم فل مکمل کیا اور اب وہ پی ایچ ڈی کا سوچ رہے تھے۔ انہیں تعلیم سے بہت لگاؤ تھا اور وہ ایک اعلیٰ استاد بننا چاہتے تھے...... کاروبار سنبھال کر اپنی ڈگریوں کو زنگ آلود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس آنگن میں ننھی قلقاریاں گونجنے لگی تھیں۔

سید منان علی شاہ کے ہاں یکے بعد دیگرے تین بیٹے ہوئے...... زمان علی شاہ، امان علی شاہ اور سب سے چھوٹا، لاڈلہ شاہ...... یعنی سب کا دانی......

لیکن منہاج شاہ کو قدرت نے صرف ایک بیٹی سے نوازا تھا جو سب سے بڑھ کر دانی کی گڑیا تھی۔

منہاج شاہ نے اپنے بابا سے پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت طلب کی تو وہ بھڑک اٹھے۔

”تمہیں آگے پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں...... اتنا بڑا کاروبار ہے اور تمہیں پڑھ کر نوکری کرنے کا شوق ہے؟ تم تو شاہوں کی اولاد لگتے ہی نہیں۔“

”لیکن بابا پلیز یہ لاسٹ ڈگری ہے، بس تین سال لگیں گے اور پھر میں آپ کے پاس ہمیشہ، ہمیشہ کے لیے آجاؤں گا۔“ منہاج شاہ اپنے بابا کو تسلی دے رہے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وجاہت شاہ کے دماغ کی سوئی جہاں اٹک جائے وہاں سے آگے نہیں ہلتی۔

”تم اپنی بچی کو سنبھالو...... ماں ہے تمہاری جو تم سے پیار کرتی ہے۔ بھائی، بھابی ہیں تمہارے...... تمہیں کسی کا خیال نہیں......“

”بابا تو میں تین سال بعد آکر بھی سب کے درمیان ہی بیٹھوں گا ناں......“

”ٹھیک ہے اگر تم نہیں مانتے تو چلے جاؤ لیکن اپنی بیوی اور بچی کو یہاں ہی چھوڑ دو اور دوبارہ یہاں قدم مت رکھنا۔“ بابا کا حکم سن کر تو ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی لیکن شاید سید وجاہت شاہ یہ بات بھول گئے تھے کہ ان کی یہ اولاد بھی ان ہی کی طرح ضدی ہے جبکہ دروازے کی اوٹ سے باتیں سنتی بیگم منہاج اپنے ماموں کا یہ حکم سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ وہ اپنے شوہر کو جانتی تھیں...... وہ پی ایچ ڈی کیے بغیر نہیں ٹلیں گے اور وہ خود اپنے محبوب شوہر کے بغیر کیسے رہیں گی؟ ایک طرف اتنے پیارے رشتے تو دوسری طرف محبوب شوہر...... خیر...... ہونا تو وہی تھا جو منہاج شاہ کہتے۔

منہاج شاہ نے جب اپنے بابا جان کو کسی صورت مانتے نہ دیکھا تو پھر ایک فیصلہ کر کے وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھے کہ انہیں اپنے کاندھے پر ایک نرم ہاتھ محسوس ہوا...... دیکھا تو شریک حیات تھیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں، اللہ سب بہتر کرے گا۔“

”لیکن میں بابا جان کو جانتا ہوں...... وہ اب کبھی نہیں مانیں گے۔ تم مجھ سے وعدہ کرو...... جو میں کہوں گا اس میں میرا ساتھ دوگی؟“ نہ جانے کیا سوچ کر انہوں نے اپنی بیگم سے ایسا کہا لیکن وہ تو تھیں ہی ان کی دیوانی...... سو جھٹ سے انہیں ہاں کہہ دی۔

”تھینک یو سوچ...... مجھے تم سے یہی امید تھی...... چلو اب جلدی سے اپنی اور ڈول کی پیکنگ کرلو...... ہمیں اگلے دو گھنٹوں میں یہ سب کچھ چھوڑ کر جانا ہے۔“ منہاج شاہ کا حکم تھا یا روح فرسا خبر...... وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھیں ایسا...... ستم یہ کہ وہ ان سے وعدہ کر چکی تھیں۔

آنکھوں میں آنسو لیے وہ اس امید پر پیکنگ کرنے لگیں کہ اماں جان یا بڑی بھابی روک لیں گی لیکن وقت رخصت روانگی ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اماں جان اور

بھابی کے روتے ہوئے چہرے بھی منہاج شاہ کو روک نہیں پائے اور پھر اماں جان اور بھابی کو انہیں روکنے کی اجازت بھی نہیں تھی کیونکہ سید وجاہت علی شاہ نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا ورنہ بصورتِ دیگر وہ بھی ان کے ساتھ ہی اس گھر سے جا سکتی تھیں۔

منہاج شاہ، اماں جان اور بھابی سے مل کر گھر کی دہلیز پار کرنے ہی والے تھے کہ وجاہت شاہ کی گرج دار آواز نے ان کے قدم روک دیے۔

''اب اس گھر سے تمہارا کوئی تعلق نہیں...... گھر کی دہلیز پار کر جاؤ گے تو کبھی یہاں کا رخ مت کرنا۔''

''اور سنو لڑکی...... تمہیں اپنے ماں، باپ کے گھر دیکھا تو وہاں سے بھی نکلوا دوں گا۔ تم دونوں کا اب شاہ خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔''

منہاج شاہ کو تو بابا جان کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اپنا جنون پانے کے لیے یہ سب برداشت تو کرنا پڑے گا اور اگر اس کٹھن سفر میں اپنی جان سے عزیز بیوی کا ساتھ رہا تو سفر سہل ہو جائے گا لیکن وہ تو شاک میں آگئی تھیں...... یعنی اب ماں باپ سے بھی نہیں مل سکتیں...... جو ایک موہوم سی امید باقی تھی وہ بھی ختم...... لیکن اپنے شوہر اور بچی کے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔

اور پھر منہاج شاہ اپنی بیوی اور بچی سمیت اس عالیشان حویلی سے چلے گئے تھے کبھی نہ لوٹنے کے لیے۔

اسکول سے گھر آتے ہی بچوں نے چاچا، چاچی اور دانی نے تو صرف ڈول کا پوچھا...... پھر جو خبر انہیں دی گئی وہ بچوں کے ننھے ذہنوں میں سمٹ کر رہ گئی۔ زمان اور امان تو نارمل زندگی گزار رہے تھے لیکن دانی نے اپنے جان سے پیارے چاچو اور ڈول کا دکھ سینے سے لگا لیا تھا۔ پورا ایک مہینہ بخار میں پھنکتا رہا...... رات کو ڈول کے بغیر روتے، روتے سوتا تھا۔

وقت گزرنے کا علم ہی نہیں ہو سکا...... بچے جوان ہو گئے......!

زمان نے ایم بی اے کر کے اپنے والد منان شاہ کے ساتھ کاروبار سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔ امان ایم بی اے کر چکا تھا اور ہائیر اسٹڈیز کے لیے ملک سے باہر گیا تھا۔ جبکہ دانی بزنس فیلڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلا گیا تھا۔ اسے بھی اپنے چاچو کی طرح پڑھنے کا بہت شوق تھا۔

سید منہاج شاہ کے گھر سے چلے جانے کے چار سال بعد وجاہت شاہ کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ منہاج شاہ سے رابطہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ وہ تعلقات کی راہوں کی سب راہیں مسدود کر گئے تھے۔

زندگیاں سنبھل گئی تھیں لیکن سب کے دلوں میں کہیں نہ کہیں ایک ہوک اٹھتی تھی...... اماں جان کو اپنا لاڈلا منہاج، خوابوں میں آکر ستاتا تو بھابی کو اپنا لائق اور نٹ کھٹ دیور بہت یاد آتا تھا۔ زمان اور امان کو بہن کی کمی محسوس ہوتی تھی تو دانی کو اپنی باربی ڈول بہت یاد آتی تھی...... دادو اکثر ذکر چھیڑ دیتیں کہ ڈول کو تو اپنے دانی کی دلہن بنانا تھا لیکن اب نہ جانے ڈول کہاں کھو گئی تھی...... منان شاہ نے بھی باپ کے بعد بھائی کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کو نہ ملنا تھا اور نہ ملے۔

ہاں دانی کو انتظار تھا اپنی ڈول کا...... گلابی گالوں والی گڑیا کا......

''دیکھیے گا دادو...... میری باربی ڈول ضرور آئے گی ایک دن...... اسے ہماری چاہت واپس لائے گی۔ ہاں میری چاہت اسے لائے گی...... چاہت کی شدت......'' وہ اکثر دادو کی گود میں سر رکھے پیار سے ڈول کو یاد کرتا تھا لیکن آخری جملہ اپنے دل میں ہی کہتا تھا۔ اس کی سوچوں کے گرداب میں اس کی ڈول تھی اور اب جوان ہو کر بھی سوچوں کا محور وہی ڈول تھی۔

ہاں اسے شدید محبت تھی اپنی باربی ڈول سے......اور یہ محبت وہ سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

**دوسرا اور آخری حصہ اگلے ماہ**

# ماں کی لاڈلی

کائنات غزل





”میں پاگل نہیں ہوں، نہیں ہوں میں پاگل......
نکالو مجھے یہاں سے، مار ڈالوں گی میں سب کو......“
چاروں طرف سے بند کمرے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی جس کی لمبائی اور چوڑائی ایک بالشت سے کچھ ہی زیادہ ہوگی۔

شدید پڑتی سردی میں بھی وہ جسم پہ دو کپڑے پہنے پسینے میں تربتر ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں رو، رو کر سرخ پڑ چکی تھیں...... مسلسل بھوکے رہنے اور نیند نہ آنے کی وجہ

سے اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے تھے۔ تین دن ہو گئے تھے اسے یہاں قید، اسے لگتا وہ اسی طرح بند رہی تو واقعی پاگل ہو جائے گی۔ اس کھڑکی سے اسے کھانا پانی ملتا...... لیکن وہ سب ہاتھ مار کر گرا دیتی...... پہلی بار جب ایک عورت دروازہ کھول کر اسے کھانا دینے آئی تو وہ اس کے پیروں میں گر گئی۔

"خدا کے لیے مجھے نکالو یہاں سے...... میں پاگل نہیں ہوں۔"

"تم یہ کھانا کھالو، میں ڈاکٹر سے بات کرتی ہوں، وہ تمہیں یہاں سے نکالیں گے۔" اس نے اسے اٹھایا اور بہت پیار سے بولی۔

"ڈاکٹر، ڈاکٹر سے کیوں! تم بھی مجھے پاگل سمجھتی ہو" چٹاخ، اس نے اس عورت کے منہ پر طمانچہ مارا اور اچھی خاصی موٹی عورت کو جھنجوڑ ڈالا۔ وہ الٹے قدموں بھاگی۔ بس اس کے بعد اسے اسی کھڑکی سے کھانا دیا جاتا...... اور وہ گرا دیتی۔ کبھی چیختی۔

"اماں، اماں دیکھو اپنی لاڈلی کا حشر، مار ڈالا تمہاری بہوؤں نے...... خدا غارت کرے تمہاری بہوؤں کو۔" چیختے، چیختے نڈھال ہو کر فرش پر گر جاتی اور پھر وہیں سو جاتی۔

☆☆☆

حجلۂ عروسی میں بیٹھی مینا کو یہاں بیٹھے کتنا وقت بیتا اسے اندازہ نہیں تھا۔ فائرنگ اور پٹاخوں کے درمیان اسے گاڑی سے اتارا گیا۔ کئی تھکا دینے والی رسموں کے بعد اسے کمرے میں لے جایا گیا۔ گلاب اور موتیے کی لڑیوں سے سجا یہ کمرا اس کی سوچ سے زیادہ حسین تھا۔ وہ چاروں طرف کا جائزہ لینے میں مصروف تھی جب اسے پہلی بار چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی لڑ رہا ہو، اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا...... کچھ دیر بعد خاموشی ہو گئی۔ چند منٹوں بعد آہٹ پر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دل بے ترتیب انداز میں دھڑکنے لگا۔ سلام کی آواز پر اس نے نظریں اٹھائیں تو اس کے مجازی خدا کے ساتھ اس کی اکلوتی نند عرشیہ بنا دوپٹے کے جسم سے چپکی اور

کھرے گلے کی شرٹ پہنے بھائی سے لگی کھڑی تھی۔ اس طرح اسے دیکھ کر مینا کو شرم آ گئی اور دادی کی بات یاد آ گئی جو کہتی تھیں کہ "باپ، بھائی سے بھی پردہ ہوتا ہے جوان لڑکیوں کو حیا، شرم ہونی چاہیے۔ اور بھائیوں سے فاصلہ رکھ کر بات کرو۔" جو نصیحتیں کبھی سمجھ نہ آئیں لیکن ہمیشہ عمل میں رہیں آج ایک نیا رشتہ جڑتے ہی اس کی سمجھ آنے لگیں۔ وہ دونوں اب بیڈ پر بیٹھے ہنسی مذاق میں مگن تھے۔

نند عرشیہ اپنی مطلوبہ رقم لے کر ہی ٹلی اس کے بعد اس کے مجازی خدا کو مینا کا خیال آیا۔ اور پھر سات سال تک یہی ہوتا رہا پہلے بہن پھر بیوی...... صبح ہوئی، ناشتے سے فارغ ہو کر دونوں ماں، بیٹی نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ مینا کے میکے والے آئے بیٹھے تھے اسے لینے۔ ان کے انتظار میں تقریباً دو گھنٹے بیٹھے رہے۔ وہ واپس آئیں تو آتے ہی عرشیہ نے گلے میں سونے کا ویسا ہی لاکٹ پہنا جیسا رات میں اس کے شوہر امان نے اسے منہ دکھائی میں دیا تھا۔ مینا کے دل میں عرشیہ کے خلاف پہلی گرہ لگی۔ اور شادی کے تین سالوں میں اسی طرح گرہیں لگتی چلی گئیں۔ سونے پر سہاگا اس کی جیٹھانیوں نے کم و بیش اسی طرح کے قصے سنا، سنا کر اس کے دل میں بدگمانی کی ان گرہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیا تھا۔ مینا کے شوہر امان کا گھر میں ساتواں نمبر تھا۔ عرشیہ چوتھے نمبر پہ تھی اس سے بڑے تین اور چھوٹے تین بھائی تھے۔ سب کی لاڈلی، نازوں میں پلی اور ضد میں پکی......

☆☆☆

ہیل کی ٹک، ٹک پر وہ اس بالشت بھر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

"ارے، میں نے اگر غلط نہیں پہچانا تو تم کلثوم باجی کی بیٹی عرشیہ ہی ہو ناں؟" انتہائی اپنائیت بھرے لہجے میں انہوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ جو گم صم کھڑی تھی چونک کر نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اسے وہ کہیں سے بھی پہچان میں نہیں آئیں۔ لیکن اس نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

"کیسی ہو گڑیا...... اور یہاں کس نے بھیجا

تمہیں......؟ مجھے نہیں پہچانا تم نے، جب تم اتنی سی تھیں میں تمہارے گھر آتی تھی اکثر کلثوم باجی کے پاس بیٹھ کر گپیں لگاتی یاد آیا کچھ......؟" وہ اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولیں۔ اسے یاد تو کچھ بھی نہیں آیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے چہرے کا تناؤ اب کم ہو گیا تھا۔

"نہیں، مجھے نہیں یاد آرہا......" عرشیہ کنپٹی کو دو انگلیوں کی مدد سے دباتے ہوئے بولی۔

"تم یہاں سے نکلو، آؤ باہر لان میں چل کر بات کرتے ہیں۔" وہ نرمی سے گویا ہوئیں۔

"نہ، نہ، نہ نہیں یہ کمرا بند ہے، تالا لگا ہوا ہے باہر سے۔ میں باہر نہیں آسکتی۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"کیوں...... تالا کیوں لگا ہوا ہے۔" وہ اچنبھے سے بولیں۔

"یہ لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"تمہیں یہاں تک لایا کون ہے؟"

"بھائی اور مینا بھابی۔"

"اماں......؟ وہ تو تم سے بہت محبت کرتا تھا...... بن کہے ہر بات پوری کرتا تھا...... پھر وہ کیوں لے آیا تمہیں یہاں......؟" وہ اسے جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"اپنی بیوی کے کہنے پر......" اس نے "اپنی بیوی" ایسے منہ بنا کر کہا کہ جیسے منہ میں کڑوا بادام آ گیا ہو۔

"اور باقی بھائی ریحان، فرحان وغیرہ......؟"

"وہ بھی سب اپنی، اپنی بیویوں کے غلام ہیں۔" اس کی آنکھوں سے نفرت جھانکنے لگی۔

ڈاکٹر دانیہ کی نظر سامنے سے آتی نرس پر پڑی تو انہوں نے جلدی سے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

"اوکے، میں بعد میں تم سے ملتی ہوں تم پریشان نہ ہو کلثوم باجی کی وجہ سے تم بھی مجھے بہت عزیز ہو۔ میں انشاء اللہ تم سے کل ملتی ہوں پھر تفصیل سے بات ہو گی۔" وہ اس کا ہاتھ تھپک کر آگے بڑھیں پھر کچھ خیال آنے پر پیچھے پلٹ آئیں۔

"یہاں تم کھانا وغیرہ صحیح سے کھاؤ ورنہ یہ لوگ واقعی تمہیں کچھ الٹا سیدھا سمجھیں گے، سمجھ گئیں ناں......" اس نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ تیزی سے آگے بڑھ گئیں۔ مبادا نرس قریب آ کر ان کا نام پکار لے اور ان کی بنائی اسٹوری کمزور پڑ جائے۔ ڈاکٹر دانیہ نفسیات کی نامی گرامی ڈاکٹر تھیں وہ مریض کی کیس ہسٹری بہت اچھے انداز میں اسٹڈی کرتی تھیں اور مریض کو ایسے ہینڈل کرتیں کہ وہ اپنے دل کی ہر بات اُن سے کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ وہ اس اسپتال کے صرف دس کیس اسٹڈی کرتی تھیں۔ عرشیہ خوش نصیب تھی جس کا کیس ڈاکٹر دانیہ کے ہاتھ میں آیا تھا۔ وہ مریض کے ماں، باپ، بہن، بھائی، عزیز و اقارب کے نام باقاعدہ اچھی طرح یاد کر کے پھر مریض سے ملتی تھیں کہ مریض کو مکمل اپنائیت ملے۔

☆☆☆

موسم بہت دلفریب ہو رہا تھا۔ شام کے اس پہر ٹھنڈی، ٹھنڈی ہوائیں چلتی بھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ آسمان پر بادل اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ نم گھاس پہ دو نفوس بیٹھے تھے۔ یہ اسپتال میں پچھلے حصے پر بنا لان تھا۔

"میری اماں نے میری کوئی خواہش کبھی رد نہیں کی...... ابا کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ زبان سے بات نکلنے سے پہلے میرے بھائی بات پوری کرنے دوڑ جاتے۔ کبھی کوئی خواہش ایسی نہیں تھی جو رد ہوئی ہو۔ پھر میرے دو بڑے بھائیوں کی شادی ہو گئی۔ ان کی بیویاں انہیں لے کر الگ ہو گئیں۔ یہ صدمہ میرے لیے بہت بڑا تھا کہ میرے دونوں بھائی اب صرف سلام دعا کی حد تک مجھ سے بات کرتے اور اس سے زیادہ کرتے بھی کیا...... وہ آتے ہی رات کو کچھ دیر کے لیے تھے۔ میں گھٹ، گھٹ کر روتی، اسی دوران میرا رشتہ خاور شاہ کے لیے آ گیا۔ وہ بڑی بھابی کے دور کے کوئی رشتے دار تھے۔ فرمان بھائی نے ہاں کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تو میری اماں کو ہاں کرتے ہی بنی۔ خاور بظاہر بہت ملنسار تھا۔ لیکن اسے عورت میں کوئی دلچسپی نہ تھی یا شاید اس کی انا عورت پر خود کو کمزور ظاہر نہ ہونے دیتی۔ خیر جو بھی تھا میں

جو اتنی محبتوں کے سائے میں پلی تھی، مجھ سے اس کی
بے رخی نہ سہی گئی اور میں اماں کے گھر واپس آ گئی۔
میری اماں نے بجائے مجھے سمجھانے کے مجھے سینے سے لگایا
اور میرے بھائیوں کی عدالت میں میرا کیس بڑھا چڑھا کر
رکھا۔ میرے بھائیوں نے خلا کا مقدمہ کر دیا وہ تو شاید
انتظار میں ہی بیٹھا تھا۔ فوراً ہی مجھے طلاق کا پروانہ پکڑا گیا۔

میری شادی کے ساتھ، ساتھ مجھ سے بڑے بھائی
فوزان کی بھی شادی ہوئی تھی۔ فوزان بھائی جب بھی مجھے
پیار کرتے مجھے دلاسا دیتے تو ان کی بیوی مجھے ایسی کاٹ
دار نظروں سے گھورتی کہ میں کٹ کر رہ جاتی۔ لیکن بظاہر
ڈھیٹ بن کر بھائی سے مزید لاڈ کرواتی۔ میرے تینوں
چھوٹے بھائی اب بھی میرا ویسا ہی خیال رکھتے جیسے پہلے
رکھتے تھے۔ میں کبھی اکیلی بیٹھی کسی سوچ میں گم ہوتی تو فوراً
مجھے باتوں میں لگا لیتے۔ میری ماں، آہ میری اماں...... میرا
بے حد خیال کرتیں۔ پھر فوزان بھائی کی بیوی نے ایک
رشتہ کرانے والی سے میرا رشتہ ایک اور جگہ کروا دیا اور
دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادیاں اپنی کزنز سے کروا
دیں۔ یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ میں کچھ سوچ نہ پائی اور
فراز کے گھر شادی ہو کر آ گئی جو ایک بدقماش، عمر رسیدہ
شخص تھا۔ نشے میں ہوتا تو مار پیٹ کرتا ورنہ دن میں نارمل
حالت میں رہتا۔ اس کی انہی حرکتوں سے میرا بچہ بھی
ضائع ہو گیا۔ ایک دن پیسوں کے مطالبے پر میرے انکار
کرنے پر اس نے مار پیٹ کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ گھر کی
دہلیز پر میں بے یار و مددگار پڑی درد سے تڑپ رہی تھی کہ
پڑوس سے کسی نے ایمبولینس کو بلایا میرے گھر والوں کو
اطلاع دی وہ فوراً پہنچے...... میں جب ہوش میں آئی تو اپنا
قیمتی سرمایہ کھو چکی تھی۔ اور میں جو یہ سمجھ رہی تھی کہ میرے
بھائی فراز کی جان کے درپے ہو جائیں گے ایسا کچھ بھی
نہ ہوا۔ صرف امان ہی تھا جو میرا ہاتھ تھام کر روتا رہتا،
میرے حال پر کڑھتا رہتا۔ پانچ بھائیوں نے میرا حال
تک پوچھنا گوارا نہیں کیا...... سب ہی نے مجھے قصور وار
جانا۔ مجھے دورے پڑنے لگے، میں ہسٹریائی ہونے لگتی۔
چیزیں اٹھا، اٹھا کر پھینکتی، نعمان کی بیوی بھی امید سے
تھی۔ وہ میرے سامنے جان بوجھ کر نعمان سے نخرے
کرتی...... میں منہ پھیر کر کمرے میں بند ہو جاتی۔ گھر کے
ماحول سے تنگ آ کر میری اماں نے دونوں چھوٹے
بھائیوں کو بھی الگ کر دیا اب گھر میں صرف میرے دو محبت
کرنے والے رشتے بچے تھے میری اماں اور چھوٹا بھائی
امان۔ میں آہستہ، آہستہ زندگی کی طرف آنے لگی۔ اب
میں جان، جان کر امان سے فرمائش کرتی۔ شاید اپنی انا کو
تسکین پہنچانے کے لیے، امان میرا بہت خیال رکھتا۔
کبھی، کبھی مجھے اندر سے دکھ بھی ہوتا۔ لیکن میں اپنا حق سمجھ
کر وصول کرتی۔ امان کے لیے لڑکی میں نے خود تجویز کی
تھی۔ میری دوست کی بہن مینا بہت معصوم سی گڑیا لگتی تھی۔
وہاں امان کا نکاح کر دیا۔ نکاح کے بعد میں امان کو ہر
وقت جانچتی نگاہ سے دیکھتی کہ اس میں کچھ تبدیلی تو نہیں
آ رہی لیکن مجھے ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔ تو میں نے اماں کو
رخصتی کا سگنل دے دیا کہ گھر میں تنہائی مجھے کاٹتی تھی۔ اماں
زیادہ تر مصلے پر بیٹھی رہتیں، ملازمہ کام نمٹا کر چلی جاتی
اور میں ہولتی رہتی...... لیکن امان کی رخصتی ہوتے ہی مجھے
ایسا لگا جیسے میرا یہ بھائی بھی مجھ سے چھن جائے گا۔ جب
اماں نے امان کو دلہن کو منہ دکھائی دینے کے لیے لاکٹ دیا
تو میں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ مجھے ابھی اور اسی وقت ایسا
لاکٹ چاہیے یا یہی مجھے دے دو۔ میری ماں اور امان نے
مجھے سمجھا بجھا کر اس پر آمادہ کیا کہ صبح ہوتے ہی مجھے دکان
پہ لے جا کر میری پسند کا لاکٹ دلا دیں گی۔ میں سمجھتی
کیا...... مجھے تو صرف امان کی بیوی کو یہ جتانا تھا کہ وہ بیوی
سے زیادہ بہن کی مانے گا۔ جو خوف میری پانچوں بھائیوں
کی طرف سے ملا تھا۔ میں اس خوف سے نکلنا چاہتی تھی۔
لیکن انسان جو سوچتا ہے وہ ہوتا کب ہے...... امان کی
شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اماں ایسی سوئیں کہ پھر نہ اٹھ
سکیں...... میں سچ مچ میں دھاڑیں مار کر روئی۔ میرے پانچ
بھائیوں نے صرف سر پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا لیکن امان نے
گلے لگایا۔ مجھے تسلی ہو گئی کہ یہ اب بھی میری طرف ہی
ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ گھر میں اب بھی میرا ہی حکم چلتا،
کھانا میری مرضی کا پکتا...... ہر کام میری مرضی کے مطابق

ہو رہا تھا۔ امان کی بیوی...... امید سے ہوئی اور وہیں سے میرا درجہ نیچے ہوتا چلا گیا۔ پہلے جو وہ میرے کام کرتی تھی، امان نے اسے وہ کام کرنے کو بھی منع کر دیا...... یا اس نے خود ہی ہاتھ کھینچ لیا...... میرے کام کون کرتا، میرے بال بکھرے رہتے۔ اماں نے نہ جانے کون، کون سے تیل لگا کر میرے بال گھٹنوں تک پہنچائے تھے۔ مجھے وہی بال وحشت زدہ کر دیتے۔ میں نے کبھی بال نہیں سلجھائے تھے، وہ پہلا طعنہ امان کی بیوی نے مجھے مارا تھا۔

''آپی ان کو کاٹ لیں کون سا آپ نے اپنے شوہر کو دکھانے کے لیے رکھنے ہیں۔'' اس نے اپنے لمبی سلکی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ امان کو لمبے بال پسند تھے، یہ مجھے بھی معلوم تھا۔ میں تیزی سے اٹھ کر کمرے میں بند ہوگئی۔ اور پھر سچ مچ ان بالوں سے نجات حاصل کر لی۔ امان کے...... پہلا بیٹا ہوا مینا چلہ گزارنے ماں کے گھر چلی گئی تو امان نے مجھے دوسرے بھائی کے گھر بھیج دیا۔ وہاں بھی مجھے بات، بات پہ طعنے ملتے۔ میں وہاں پندرہ دن رہ کر اور دوسرے بھائی کے ہاں چلی گئی۔ اسی طرح پندرہ بیس دن ہر بھائی کے گھر میں رہ کر تقریباً چار ماہ بعد میں اپنے گھر آئی چند ماہ گزرے تھے کہ مینا ایک بار پھر امید سے تھی اور اس بار وہ زبان میں خنجر چھپائے ہوئے تھی بات، بات پر مجھے طعنے دینا، طنز کرنا، میری دو شادیوں کو ٹارگٹ بنا کہ مجھے یہ جملے کستا، میں بھی اسے دو بدو جواب دیتی۔ ایک دن حد ہوگئی۔ وہ مجھے میرے ادھورے بچے کے طعنے دینے لگی کہ اسے میں نے مارا ہے۔ میں نے اس کے بال پکڑ لیے۔ اس نے میرے منہ پر طمانچے مارنے شروع کر دیے۔ یوں مار کٹائی میں میرا پاؤں اس کے پیٹ پر پڑ گیا وہ وہیں پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے اپنا وقت یاد آ گیا۔ میں نے گھبرا کر امان کو کال کی وہ دس منٹ کے اندر، اندر گھر پہنچا اسے گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گیا۔ چار گھنٹے میں دعا کرتی رہی کہ اس کے بچے کو کچھ نہ ہوا ہو۔ اس کے بیٹے کو سنبھالتی رہی، اس کے کپڑے تبدیل کرائے فیڈر دے کر سلا دیا۔ چار گھنٹے بعد امان آ گیا۔ میں نے مینا کی حالت پوچھی تو اس نے مجھے قہر بھری نظروں سے دیکھا اور بنا کچھ کہے شایان کو گود میں اٹھایا اور چلا گیا۔ خدا جانتا ہے میں نے اس کے بچے کو جان بوجھ کر نہیں مارا۔ وہ مجھے ایسے، ایسے طعنے دیتی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتے۔ وہ تو مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ وہ امان کو کئی بار میرے بارے میں جھوٹ، جھوٹ لگاتی رہی تھی، بھڑکاتی رہتی تھی۔ رات تک مینا گھر آ گئی۔ میں شرمندہ تھی بہت شرمندہ...... میں نے سوچا تھا اس سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگوں گی۔ لیکن امان کو بہت جلدی تھی شاید مجھے یہاں لانے کی...... اس نے مجھے آ کر صرف اتنا کہا کہ مجھے نعمان کے گھر چھوڑنے جا رہا ہے میں سامان باندھ لوں۔ میں نے جلدی، جلدی اپنا بیگ تیار کیا...... میرے کپڑے مار کٹائی کے دوران پھٹ گئے تھے۔ مجھے جلدی میں بدلنے کا بھی خیال نہ آیا۔ یونہی اس کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔ گاڑی انجان راستوں کی طرف جا رہی تھی۔ میری ہمت نہیں تھی کہ اس سے پوچھ سکوں کہ مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ وہ اس عمارت کے آگے رکا۔ مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے اندر چلا گیا۔ اندر سے آیا میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اندر لے آیا وہاں میرا ہاتھ ایک نرس کے ہاتھ میں تھما دیا اور باہر کی طرف جانے لگا، میں چیخی۔

''امان کہاں جا رہے ہو مجھے چھوڑ کر......'' وہ مڑے بنا باہر نکل گیا۔ میری نظر بورڈ پر پڑی جہاں نفسیاتی اسپتال لکھا تھا۔ میں چیختی رہی، میں پاگل نہیں ہوں امان میری بات سنو...... لیکن وہ نکلتا چلا گیا۔ یہ لوگ مجھے اس کمرے میں بند کر کے چلے گئے۔ اب مجھے بتائیں کیا میں پاگل ہوں۔'' میں...... میں تو ماں کی لاڈلی ہوں...... اپنے بھائیوں کی لاڈلی ہوں......'' وہ کہتے کہتے وہیں گھاس پہ گر گئی۔ صرف اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔

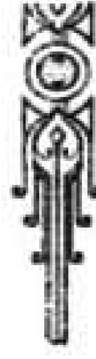
''میں تو ماں کی لاڈلی ہوں، ماں کی لاڈلی ہوں......''

ڈاکٹر دانیہ کسی گہری سوچ میں گم تھی کہ آخر کون عرشیہ کی اس حالت کا ذمے دار ہے، ماں کا بے جا لاڈ...... شعور کی کمی یا رشتوں کا عدم توازن......

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



سچا مکمل ناول



# آدھی صدی کے بعد

نسرین جمیل سیال



گولڈن فر کا لمبا کوٹ اور اس پر بلیک فر کے بڑے کالر...... بے بی کٹ ہیئر اسٹائل، سرخ چوڑے سلکی ربن میں بندھے ہوئے سلکی بال اسے سب سے منفرد اور جاذب نظر دکھا رہے تھے۔

وہ پہلی بار کسی شادی میں شریک ہوئی تھی اور ابھی تک امی جان کے پہلو میں چھپی بیٹھی تھی کہ ریحانہ دندناتی ہوئی آئی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے اسٹائل سے امی جان سے مخاطب ہوئی۔



''عائشہ آنٹی اس نیک پروین کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی اگر اس نے آپ کے کندھے سے ہی لپٹے رہنا تھا۔ اٹھو بی بی میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ اور میں ایویں چھوڑنے والی نہیں ہوں، ریحانہ اٹل ہوں۔''
اس نے نائلہ کا ہاتھ پکڑا اور یہ جا وہ جا......

بڑے ہال میں فرش پر سرخ قالین اور دیواروں کے ساتھ صوفے اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ سامنے بڑی سی کھڑکی کے نیچے اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر موسیقی کے آلات نظر آرہے تھے۔ ایک سائڈ پر بڑی سی بانسی ٹوکری پھولوں سے بھری پڑی تھی۔ لڑکیوں کا ایک ٹولا بڑی بے پروائی سے قالین پر آلتی پالتی مارے براجمان تھا۔ خوب قہقہے لگ رہے تھے۔

''تشریف لائیں میڈم! یہی ہیں ہمارے یار بیلی جو ہمارا کل اثاثہ ہیں۔'' ریحانہ نے سینے پر ہاتھ مار کر بڑے اسٹائل سے بتایا اور بڑا شوخ سا قہقہہ بلند ہوا۔

''آؤ نیلی (نائلہ) ادھر میرے ساتھ بیٹھو۔'' شہناز باجی نے مہندی اور ہری پیلی چوڑیوں والا ہاتھ بڑھا کر نائلہ کا ہاتھ تھام لیا۔

نائلہ اس شوخ ماحول میں جھجک محسوس کر رہی تھی، کھانے کے بعد مہندی کی رسم ہوئی اور ساتھ ہی اس شوخ ٹولے نے ڈھولک پیٹنا شروع کر دیا۔ چوڑیوں کی کھنک، مہندی لگے ہاتھ، رنگ برنگے آنچل بہت مختلف قسم کی خوشبوؤں کی لپٹیں مہندی کی رسم کو چار چاند لگا رہے تھے۔

ڈھولک پر ماہیے اور ٹپے گائے جا رہے تھے۔ تالیوں کی گونج میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نائلہ سمٹی سمٹائی رخسانہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ چہرے پر خوشی اور جھجک کے ملے جلے آثار تھے۔ اسے بھی یہ سب اچھا لگ رہا تھا۔

رسم حنا ختم ہوئی تو ڈھولک کی آواز بھی تھم گئی۔ خواتین کا رش کم ہونے لگا۔ نیلی نے امی جان کے پاس جانے کا ارادہ کیا تو ریحانہ راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔

''بھئی تم سے بور نگ لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔ یار تم تو مٹی کا مادھو ہو۔ میں نے بتایا نہیں کہ ابھی ذاکر بھائی آنے والے ہیں، ان کا پارٹ ٹو کا آخری پیپر تھا یونیورسٹی سے سیدھے یہیں آئیں گے۔ میری سب دوستیں تو ذاکر بھائی کے گانے سننے کو ترستی ہیں، تم بھی سنو گی تو ہمیشہ سننے کی خواہش کرو گی۔'' اس نے مزے لے کر کہا۔

''تم امی کی فکر نہ کرو، وہ دونوں دوستیں اپنی گپ شپ میں اتنی محو ہیں کہ انہیں ساری دنیا بھولی ہوئی ہے، ابھی چائے آنے والی ہے تم بیٹھو تو۔''

دس پندرہ منٹ بعد بلیک ٹو پیس میں ملبوس سانولا سا ذاکر اقبال خوشبوؤں میں بسا ہال میں داخل ہوا۔

ریحانہ نے آگے بڑھ کر بھائی کا ہاتھ تھام لیا۔ دو تین کزنز بھی ذاکر کے ساتھ تھے۔ سب اسٹیج پر براجمان ہو گئے۔ ریحانہ بھی بھائی کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھ گئی۔ ذاکر نے ہارمونیم کو چھوا تو لڑکیوں کی کھسر پھسر ایک دم بند ہو گئی۔ تب پھر ایک خوب صورت آواز کمرے کی خاموشی کو توڑتی ہوئی فضا میں لہرائی۔

''بے رحم آسمان میری منزل بتا ہے کہاں''

آواز میں اس قدر سوز تھا کہ ہال میں سکوت چھا گیا۔ ہر کوئی متوجہ تھا۔ بے شمار لمحے اسی خاموشی کی نذر ہو گئے آخر کار طلعت محمود والا یہ طویل نغمہ ذاکر نے اپنے اختتام کو پہنچا دیا۔ تالیوں کی آواز بلند ہوئی اور اسی دوران پھر لے چھڑ گئی۔

''میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی
مجھ کو راتوں کی سیاہی کے سوا کچھ نہیں ملا''

یہ پرسوز آواز نائلہ کے دل پر بھی اثر کر رہی تھی۔ وہ تو جب بہت چھوٹی تھی تب بھی ریڈیو پر بجنے والے سیڈ سانگ ہی سن کر متاثر ہوتی تھی۔

ملازمہ اپنی بیٹی کے ہمراہ ہال میں بیٹھے سب لوگوں میں چائے تقسیم کرنے لگی۔ ساتھ ہی پلیٹوں میں مٹھائی اور بسکٹ بھی رکھے جا رہے تھے۔ گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے کے ساتھ پرسوز گانوں کا سلسلہ جاری تھا جب پھر تھوڑی دیر کے لیے وقفہ آ گیا۔

لوگوں نے دوبارہ گانا سننے کی فرمائش کی...... فضا میں دوبارہ آواز بلند ہوئی۔

''گورے میں جانا پردیس......

میں جانا تیرے نال وے......''

ریحانہ بھی اپنی آواز کا جادو جگانے لگی۔

ذاکر اور ریحانہ مل کر گا رہے تھے اور تالیوں کی آواز اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔ گانا ختم ہوا تو ریحانہ نے اپنی شوخ آواز میں لوگوں کو مخاطب کیا۔

''دوستو آپ لوگوں کو اداس کر دیا ہے سیڈ سانگ نے، میرا خیال ہے کہ ہال میں اداسی کو کم کرنے کے لیے ایک مزے دار سا گانا سنیں۔

باؤ جی میں اِک عرض کراں

نہ کھکو جی اُراں اُراں......

ویکھو رہناں پَراں پَراں

نیڑے نیڑے آوندے او

ساڈا دل دھڑکاندے او......''

ریحانہ کے چہرے پر شوخیوں کے رنگ نے مست سی لالی بھر دی۔

وہ ذاکر کے کندے سے اپنا کندھا ٹکرا کر لہک، لہک کر گا رہی تھی اور تالیاں بجا کر یار، یارا سے داد سے نوازا جا رہا تھا۔

ماحول بڑا خوشگوار سا لگنے لگا۔ ایک کے بعد ایک گانا گایا جا رہا تھا۔ وال کلاک نے رات تین بجے کا اعلان کر دیا تو محفل برخاست ہونے لگی۔ لوگ اٹھ کر جانے لگے۔ نائلہ نے بھی رخسانہ کا ہاتھ تھام کر جانے کے لیے پر تولے۔

''جی نہیں آپ کو کس نے اجازت دی ہے جانے کی؟ ابھی تو مل بیٹھنے کا موقع ملنے والا ہے۔ تم دونوں کہیں نہیں جا رہیں...... سنا تم نے۔'' اور وہ دونوں دوبارہ بیٹھ گئیں۔

ذاکر اور ریحانہ بھی آ کر درمیان میں سب لڑکیوں کے پاس بیٹھ گئے۔ شہناز باجی بڑی پلیٹوں میں ڈرائے فروٹ اور چائے رکھوانے لگیں۔ نائلہ، رخسانہ اور شیریں بھی وہیں موجود تھیں۔ پندرہ، سولہ لوگوں کی یہ محفل بہرحال میں براجمان تھی۔

''آپ کی تعریف......؟'' ذاکر نے نائلہ عرف نیلی کو مخاطب کیا۔

''تعریف اس خدا کی جس نے انہیں بنایا......''

ریحانہ تمام تر شوخی اپنے لہجے میں سمیٹے درمیان میں کود پڑی...... ''بھائی مجھ سے پوچھیں، یہ آپ کو کیا بتائیں گی۔ یہ تو ''مٹی کا مادھو'' ہیں، میں جو موجود ہوں آپ کی ہیلپ کے لیے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر شوخ ہوتے ہوئے کہا۔

''ان کا نام نائلہ حمید ہے پیار سے نیلی بھی کہتے ہیں۔ یہ امی جان کی دوست عائشہ آنٹی کی بیٹی ہے، کسی کو لفٹ تو نہیں کراتی لیکن اچھی بہت لگتی ہے ایمان سے۔''

''کبھی کم بھی بولا کرو......'' ذاکر نے ہلکی سی چپت لگا کر بہن سے کہا۔

''بچوں آپ لوگ کب اٹھو گے یہاں سے، بس اپنے، اپنے بستروں میں گھس جاؤ...... کل بارات کی تیاری کرنی ہے۔'' صالحہ خالہ نے ہال میں آتے ہی سب کو مخاطب کر کے کہا اور باری، باری چائے ختم کرتے ہی سب اٹھنے لگے۔

☆☆☆

صبح دیر سے آنکھ کھلی، نیلی نے ٹوتھ برش پر پیسٹ لگایا اور صحن میں لگے واش بیسن پر جا کر دانت صاف کرنے لگی۔ کلی کرتے ہوئے اوپر لگے آئینے پر نظر پڑی تو دو آنکھیں آئینے میں اسے اپنی طرف گھورتی نظر آئیں۔

وہ ایک دم گھبرا کر پیچھے ہٹی...... جلدی، جلدی چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے اور ٹاول سے چہرہ صاف کرنے لگی۔ اور تیز قدموں سے امی کے کمرے میں چلی گئی اور جھٹ لحاف میں گھس گئی اور آنکھیں میچ لیں۔ امی جان کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد کسی نے پیشانی پر ایک انگلی سے دستک دی۔

''اٹھیے شہزادی صاحبہ! یہ چند دن نیند کی قربانی دے دیجیے...... سونے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔''

وہ بادلِ ناخواستہ اٹھ بیٹھی۔

"یار، بہت تنگ کرتی ہو، میں اب کہیں نہیں جارہی...... اس شادی سے پہلے تو میں نے کبھی کسی گیدرنگ کو فیس نہیں کیا تھا۔"

"یہ کیا منطق ہے تمہاری؟ عائشہ آنٹی آپ بھی کیا "مٹی کا مادھو" ساتھ لے کر آگئیں اس سے بہتر تھا کہ آپ شہلا کو ساتھ لے آتیں۔" ریحانہ منہ بسورنے لگی۔

"تمہاری آنٹی کے سب بچے اسی طرح کے ہیں۔" ریحانہ کی امی نے بتایا۔

"اوہو! اب سمجھ میں آیا کہ .. ملکوال" میں سارا مال ایک جیسا بنتا ہے لیکن سوری آنٹی آج میں اسے چھوڑ کر جانے والی نہیں چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ اسے بتادیں میرے ہوتے یہ سب نہیں چلے گا۔"

"لگتا ہے آج شیطان سے جان چھڑانی مشکل ہے۔" وہ مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بڑبڑائی اور بال ہیئر کیچر میں سمیٹتے ہوئے بستر سے نکل آئی۔ اس چنچل سی ریحانہ کو بھلا ایک معصوم سی نیلی کے بڑبڑانے سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"اٹھیے میڈم، واش روم جاکر ذرا اپنا حلیہ درست کیجیے، ہماری فرینڈز آپ کے درشن کرنا چاہتی ہیں۔"

گلابی چوڑی دار پاجامہ، ڈھیلا ڈھالا کرتا، کروشیہ سے بنا پرپل کلر سوئیٹر اور اسی کلر کی کروشیہ سے بنی چھوٹی سی خوب صورت شال کندھوں پر ڈالے، بالوں کی پونی ٹیل گلابی ربن میں جکڑی ہوئی اس کے حسن میں چار چاند لگارہی تھی۔ ہال میں داخل ہوئی تو سب کو وہ اچھی لگی۔

ریحانہ کی سب دوستوں نے باری، باری ہاتھ ملایا۔ گوشی، شیریں، مریم، ببلی، طیبہ، کائنات اور نہ جانے کتنی دوستوں نے اپنا تعارف کرایا۔ نیلی نظریں ملائے بغیر ہی سب سے ہاتھ ملارہی تھی۔

☆☆☆

"دیکھو چندا...... آج میرے سب ہی دوست اپنا، اپنا فن جھاڑیں گے، تمہیں بھی کچھ نہ کچھ سنانا پڑے گا۔" ریحانہ نے نیلی کی تھوڑی کو چھو کر کہا تو وہ بڑی معصومیت سے سر ہلانے لگی۔

"مجھے کچھ نہیں آتا ریحانہ...... یہ تمہاری فیملی کی شادیاں بہت مشکل ہیں۔"

"مشکل نہیں بڑی مزے کی شادیاں بلکہ بڑی شاندار ہوتی ہیں اور بڑی یادگار بھی ہوتی ہیں۔" شہناز باجی نے نائلہ کو اپنے ساتھ لگا کر کہا...... اتنے میں ریحانہ، ذاکر کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوئی۔

"سنو دوستو! عابدہ باجی کی شادی روز، روز تھوڑی ہونی ہے، میں اس شادی کو سب کے لیے یادگار بنادوں گی...... سب اپنا، اپنا حصہ اس میں ڈالیں گے۔" اتنے میں ایوب بھائی، طارق، خالد سب آن وارد ہوئے۔ محفل نے پھر اپنا رنگ جمانا شروع کردیا۔ باری، باری سب اپنا کمال دکھارہے تھے۔ نیلی بھی اس محفل کو انجوائے کرنے لگی۔

تب پھر اچانک محسوس ہوا کہ دو آنکھیں اس کے چہرے کا طواف کررہی ہیں، وہ گھبراگئی۔ رخ تھوڑا سا چینج کیا اور خود کو گانے والوں کی طرف متوجہ کیا لیکن کہیں کوئی گڑبڑ ضرور موجود تھی۔

☆☆☆

"اے دل تجھے اب ان سے یہ کیسی شکایت ہے
وہ سامنے بیٹھے ہیں کافی یہ عنایت ہے"

ذاکر گانے لگا اور ریحانہ گلاب کی پتیاں نچھاور کرنے لگی۔

نیلی کو یہ سب کسی فلم کا ڈراپ سین لگ رہا تھا۔

ریحانہ نے بڑھ چڑھ کر ہلا گلا کیا۔

"بچوں! آپ لوگ تھکے نہیں۔" زیبا آپا اپنا آنچل لہراتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ "رات بھر ہلا گلا کرتے رہے ہو۔ میرا خیال ہے اب کچھ بارات کی تیاری کا بھی سوچو۔" آپا نے بڑی اپنائیت سے کہا تو آوازیں آہستہ، آہستہ تھمنے لگیں۔

آہستہ، آہستہ سب اٹھنے لگے، ریحانہ کہیں کمرے سے باہر گئی ہوئی تھی۔ نیلی نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اٹھنا

چاہتی تھی کہ کہیں قریب سے آواز آئی۔

"ایکسکیوزمی! شادی والے گھر میں جو کام ہوتے ہیں وہ سب آپ کے ذمے ہیں کیا؟" ذاکر نے ایک دم سامنے آکر نائلہ سے سوال کر دیا۔

"جی میں سمجھی نہیں؟" نیلی کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"میرا مطلب ہے محترمہ اگر اس گھر کی کچھ ذمے داریاں آپ کے سر ہیں تو ضرور انہیں پورا کرنے کے لیے آپ اٹھ جائیں ورنہ یہاں بیٹھے رہنے میں کیا حرج ہے۔" وہ بڑے غور سے نیلی کے چہرے کا مشاہدہ کرتے ہوئے بولا۔ "ریحانہ ابھی آنے والی ہے۔" وہ سہمی ہوئی سی واپس بیٹھ گئی۔ سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"اور ڈریں مت، یقین کریں میں کوئی بھوت ووت نہیں ہوں، بڑا بے ضرر سا انسان ہوں، آپ بتائیں آپ حمید ملک صاحب کی صاحبزادی ہیں؟" وہ فری ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

"جی ہاں......!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کا کون سا نمبر ہے؟" ذاکر نے بات بڑھائی۔

"مجھ سے بڑی باجی اور بھائی ہیں۔" جواب پھر مختصر دیا گیا۔

"آپ کے بھائی کو میں ایک فنکشن میں مل چکا ہوں۔" وہ پھر بات کو طول دینے لگا۔ نیلی کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اتنے میں ریحانہ گوٹے کناری سے بھرا ہوا رائل بلو سوٹ ہینگر میں لٹکائے اندر داخل ہوئی۔

"ارے......ذاکر بھائی آپ نے موقع ڈھونڈ ہی لیا۔ میں نے سمجھایا تھا وہ بڑی معصوم سی لڑکی ہے میں تو اسے "مٹی کا مادھو" کہتی ہوں، آپ کیا توقعات لے کر بیٹھ گئے۔ اٹھیں آپ، میں نیلی کو اپنا ڈریس دکھانے لائی ہوں۔" وہ آکر نائلہ کے پاس بیٹھ گئی اور نیلی کی جان میں جان آئی۔

"دیکھو نیلی، یہ سوٹ میں نے خاص طور پر عابدہ باجی کی شادی کے لیے سلوایا ہے، اس پر سلور گوٹے کا کام ہے۔ سلور جوتا اور سلور جیولری......میک اپ کے لیے میں نے الگ سے بیوٹی بکس رکھا ہے۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہوئی لے لینا۔"

"ارے نہیں، میں میک اپ بھلا کب کرتی ہوں اور ڈریس بھی میں چمک دمک والے کب پہنتی ہوں۔ تم پر یہ سب بہت اچھا لگے گا۔ اس کے ساتھ تم جوڑے میں لگانے کے لیے موتیے کے ہار نیچرل ہی منگواؤ۔" نائلہ خوشی خوشی بول رہی تھی۔

"تم کیا پہن رہی ہو؟" ریحانہ نے پوچھا۔

"امی جو دیں گی پہن لوں گی، میک اپ میں کرتی نہیں۔ تم تو جانتی ہو۔"

"بھئی اتنی سی عمر میں اتنا پھیکا پن......میں نے ایویں تو تمہارا نام "مٹی کا مادھو" نہیں رکھا ناں...... میرے دل کو یہ بات کچھ ہضم نہیں ہوتی۔" ریحانہ کہہ رہی تھی۔

اِدھر اُدھر کی ہانکنے کے بعد دونوں اٹھ گئیں۔ نیلی نے اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کے دو تین اسٹیپ ہی لیے تھے کہ اوپر سے تیزی سے کوئی نیچے اترتا ہوا آیا اور اس کے قریب آکر رک گیا۔

نیلی ہولے، ہولے واپس نیچے اترنے لگی تو وہ ایک چھلانگ میں نیچے اتر کر اس کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔

"نو، نو مس نیلی اس راستے میں واپسی کی گنجائش نہیں رہتی۔ آپ جس طرف مڑیں گی، اس خاکسار کو سامنے پائیں گی۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ چند ساعتیں خاموشی سے گزر گئیں۔ ذاکر نے اس کے نازک ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا دیے۔ آنکھیں ساون بھادوں برسانے کی تیاری میں تھیں۔ ذاکر کا دل کٹ گیا۔

"سوری، آپ کو دکھ دینا میرا مقصد نہیں تھا۔ جائیں اوپر چلی جائیں۔" اور خود تیزی سے نیچے اتر گیا۔

وہ بہ مشکل خود کو سنبھال پائی چہرہ صاف کیا اور

سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔

امی جان اور معروف خالہ (ریحانہ کی امی) راز و نیاز میں مصروف تھیں۔ نیلی نے بیڈ پر بیٹھ کر تکیہ گود میں لے لیا۔ وہ ابھی تک نروس تھی۔

''کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' امی جان نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''جی ذرا سر میں درد ہے، میں سونا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''ارے نیلی میری بچی تم بھی اس شادی کو انجوائے کرو کیوں ٹینشن لیتی ہو بیٹا روز، روز یہ موقع تو نہیں ملتا ناں۔''

''بس آج اور کل کا دن ہے خیر سے...... پھر خدا خیر کرے زندگی میں ملاقات ہو نہ ہو...... میں تو بچوں کو کھلی چھٹی دے دیتی ہوں۔ ایسے موقعوں پر۔'' اتنے میں تیز، تیز قدموں سے چلتے ہوئے ذاکر اقبال معروف خالہ کے پاس آ کر رکا۔

''امی جان میں سوچ رہا ہوں آج واپس ہاسٹل چلا جاؤں؟''

''ارے کیوں تمہارے امتحان تو ختم ہو گئے ہیں؟''

''دراصل امی جان ضروری کام یاد آ گیا تھا؟''

اس نے کن انکھیوں سے دیکھا نیلی گود میں تکیہ رکھے نظریں جھکائے اپنی انگلیوں سے کھیل رہی تھی۔ اور یقیناً ذاکر کی اپنی والدہ کے ساتھ ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اسے لگا جیسے ذاکر کے جانے کا سن کر اس کے اندر ہی اندر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو رہی ہو۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی لیکن یہ جذبے جب دبے پاؤں دل پر دستک دینے لگیں تو بغیر آہٹ کیے دل میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ ذاکر کمرے سے واپس چلا گیا۔

شام کو سب لوگ تیاری میں مصروف تھے۔ نائلہ نے سفید فراک کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ پہنا...... بالوں کو سفید سلکی ربن میں باندھا، کانوں میں سفید پھولوں والے ٹاپس، پیروں میں نازک سی چپل اور نیٹ کا سفید دوپٹا سر پر اوڑھے وہ کوئی آسمانی مخلوق لگ رہی تھی۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ اور کسی قسم کی جیولری کے بغیر...... چہرے پر ہلکی سی لالی اور معصوم سی سنجیدگی نے اسے منفرد سا بنا ڈالا تھا۔

''کہاں چھپی بیٹھی ہو نائلہ؟'' ریحانہ اپنی شوخیوں سمیت بجلیاں گراتی ہوئی اوپر آئی۔ ''ارے، ارے یہ کیا بڑی بوڑھیوں والا لباس پہن رکھا ہے۔ تمہیں کوئی کلر نہیں ملا تھا۔ یہ میری طرف دیکھو۔'' اس نے گھوم کر اپنا پورا سراپا دکھایا بالوں کا بڑا سا جوڑا جس کے ارد گرد موتیے کے پھول لپٹے تھے۔ رائل بلیو سوٹ، سلور جیولری، فل میک اپ اور خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی ریحانہ کسی فلم کی ہیروئن لگ رہی تھی۔ سہیلیوں کے جھرمٹ میں گھری وہ اپنے منگیتر افتخار کی باتیں کر رہی تھی جو بارات کے ساتھ آ رہا تھا۔

نائلہ اسے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

''یہ لو، یہ گجرے ہاتھوں میں پہن لو۔'' ریحانہ نے گجرے دیتے ہوئے کہا۔'' ہلکا سا میک اپ اگر تم کر لیتیں تو کیا حرج تھا۔ لیکن بھئی ''مٹی کے مادھو'' سے کون مغز مارے۔''

نائلہ نے گجرے دونوں کلائیوں میں پہن لیے تھے۔ دور سے کہیں بینڈ کی آواز آئی تو بارات آ گئی...... بارات آ گئی کا شور بلند ہوا۔ لڑکیاں اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں۔ رخسانہ اور شیریں بھی تیار ہو کر نائلہ کے پاس آ گئیں اور سب بالکونی میں کھڑے بارات کو آتے...... دیکھنے لگیں۔

ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ شیریں نے نائلہ کو ٹہوکا دیا...... ''وہ سامنے دیکھو ذاکر بھائی کتنے محو ہیں تمہیں دیکھنے میں۔'' وہ ایک دم گھبرا سی گئی سامنے والی بالکونی میں ذاکر کندھے پر ٹاول پھیلائے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بے گناہ ملزم کی طرح ماتھے پر آئے پسینے کے قطرے صاف کرنے لگی۔

''چلو یار نیچے چلیں...... پھر جگہ نہیں ملے گی۔'' اس نے رخسانہ اور شیریں کو ساتھ لیا اور نیچے ہال میں پہنچ گئی

جہاں خواتین کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ ہال میں خاصا رش تھا لیکن جگہ مل ہی گئی۔ اتنے میں اس کا چھوٹا کزن طارق اپنے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑے اندر داخل ہوا اور کسی کو تلاش کرنے لگا اور پھر اچانک نائلہ کو دیکھا تو اسی طرف خواتین کے رش میں گھستا ہوا آن پہنچا......

”نائلہ باجی میں آپ کے لیے یہ چپس اور کشمش لے کر آیا ہوں جب تک کھانا نہیں لگتا آپ اس سے بھوک مٹائیں......“ اس نے مسکرا کر لفافہ پکڑا اور شکریہ کہا۔

”نائلہ باجی آپ کو میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں بس آپ آم کھائیں پیڑ نہ گنیں۔“ اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا بھیڑ میں کہیں غائب ہو گیا۔

اس نے لفافہ رخسانہ کی طرف بڑھایا وہ چپس نکالنے لگی تو ایک چٹ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ تینوں نے ایک دم دیکھا تو شعر درج تھا۔

”تجھے کیا خبر اے بھولے پن سے دیکھنے والے
کہ کتنی سادگی سے حشر برپا کر دیا تم نے“

اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا......

”ارے نہیں چندا پریشان نہ ہو۔ زندگی میں یہ دور تو آتا ہی ہے۔“ رخسانہ نے اس کا گال تھپتھپا کر کہا...... کب کھانا کھایا گیا کب عابدہ باجی کی رخصتی ہوئی وہ سارے فنکشن میں موجود رہ کر بھی گم صم تھی۔ ایک ہی جملہ بار، بار اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔ ”تو...... تو بس اس راستے سے واپسی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ آپ جس سمت بھی مڑیں گی اس خاکسار کو اپنے سامنے پائیں گی۔“ اس کے کانوں کی لوئیں تپنے لگیں۔

رات گئے رخصتی ہوئی لیکن وہ رخصتی سے پہلے ہی امی جان کے لحاف میں گھس کر سونے کی ایکٹنگ کرنے لگی۔

اگلے دن وہ ولیمے میں نہیں جانا چاہتی تھی لیکن پھر ریحانہ مصنوعی رعب جھاڑتے ہوئے اسے جانے پر مجبور کرنے لگی۔

سی گرین سوٹ پر ہلکا سا باریک موتیوں کا کام تھا جو اس نے امی جان کے اصرار پر پہن لیا۔ جو اس پر جچ بھی رہا تھا۔ میک اپ سے بے نیاز چہرہ...... کھلے بالوں کی خوب صورتی اس کے حسن کو دوبالا کیے دیتی تھی۔

عابدہ باجی کی سسرال پہنچ کر سب بہت خوش ہوئے وہ بہت پیاری لگ رہی تھیں، میکے والوں کی آمد پر خوشی، خوشی سب کے گلے مل رہی تھیں۔ دولھا بھائی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

ولیمے کی تقریب ختم ہوئی تو رسم کے مطابق دلہن کو لے کر سب لوگ خوشی، خوشی گھر واپس آئے۔ امی جان نے واپسی کی اجازت صالحہ خالہ سے مانگی تو کہنے لگیں۔

”نہیں بھئی عائشہ آج ہی تو فارغ ہوئی ہوں تم سے تو کوئی مل بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کل تمہیں ملکوال بھجوا دیں گے۔“

اس رات پھر ایک بار محفلِ موسیقی سج گئی۔ یہ الوداعی محفلِ موسیقی تھی اس میں بہت سے چہرے اداس، اداس تھے۔

”جھوم، جھوم کے ناچو آج گاؤ خوشی کے گیت......“ ذاکر اقبال پھر نغمہ سرا تھا۔ ”جب تم اکیلے ہو گے ہم یاد آئیں گے......“ اور پھر بہت سے گانوں کے بعد چائے کا دور چلا اور محفل اختتام کو پہنچی۔

☆☆☆

واپس گھر جانے کی اسے بہت خوشی ہوتی تھی، گھر سے دور وہ زیادہ دن نہیں رہتی تھی۔ آج بھی گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی وہی گولڈن فر کا کوٹ، وہی پرسنالٹی لیکن اندر ہی اندر دل میں اِک اداسی کی لہر اٹھتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سارے خیالات یہیں جھٹک کر جانا چاہتی تھی۔ لیکن کہیں کوئی گڑبڑ تھی۔ وہ اپنے رب سے دعا کرنے لگی کہ خداوند، مجھ سے کبھی کوئی بھول نہ ہو۔

”اِدھر آؤ میرے پاس بیٹھو اور میرے ساتھ ناشتا کرو۔ میں تو تم سے اداس ہو جاؤں گی تم اسی طرح کبھی پنڈی آنا صدیقہ آتی رہتی ہے کبھی اس کے ساتھ آ جانا۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی میرے لیے تم ریحانہ کی طرح ہو۔“ معروف خالہ نے اسے اپنے پاس بلایا۔

”جی اچھا......“ وہ مسکرا دی۔

''بس امی جان اس سے زیادہ کی امید مت رکھیے......جی اچھا کہہ کر محترمہ نے گویا بڑا معرکہ مارا ہے۔'' ریحانہ ابھی تک باز نہیں آئی تھی۔

سب گھر والوں نے اکٹھے بیٹھ کر الوداعی ناشتا کیا۔ سامنے والی چیئر پر ذاکر براجمان تھا لیکن خاموش، خاموش صرف چائے کے سپ لیتے ہوئے، چلتے سے سب نے نائلہ اور عائشہ آنٹی کو گلے لگایا۔ ریحانہ ایک دم سنجیدہ سی نظر آنے لگی۔ نائلہ کو گلے لگایا اور چپکے سے کہہ دیا۔

''نائلہ مجھ سے ذاکر بھائی کا اداس چہرہ نہیں دیکھا جاتا۔ مجھے ان سے بہت پیار ہے۔'' اس نے نائلہ کا گال چوم لیا۔ نائلہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

اور یوں پھر وہ سب سے جدا ہو کر ملکوال روانہ ہو گئی۔

☆☆☆

گھر پہنچتے ہی وہ بابا سے لپٹ گئی۔ بابا کے بغیر پہلی مرتبہ اتنے دن اس نے گھر سے باہر گزارے تھے۔ باجی اور بھائی بھی اداس تھے۔

''بھئی ہماری گڑیا لاہور کیا گئی کہ گھر کی رونقیں ہی کہیں کھو گئیں۔ اب کہیں مت جانا، ہم تمہارے بغیر اداس ہو جاتے ہیں۔'' بھائی جان نے کہا۔ شہلا باجی نے حسبِ عادت امی جان کے کندھے دبانے شروع کر دیے، صغراں نے چائے بنا کر سب کو پیش کی۔

نائلہ نے چینج کیا اور چائے کا کپ لے کر بابا کے پہلو میں آ بیٹھی اور پھر بابا کو شادی کا آنکھوں دیکھا حال سنانے لگی۔ بابا ہمیشہ اس کی باتیں سن کر خوش ہوتے تھے وہ سب کچھ سچ اور مکمل بتایا کرتی تھی لیکن آج وہ کچھ، کچھ حذف کرتی گئی، کچھ باتیں دانستہ گول کر گئی۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں، تعلیمی ادارے کھل گئے۔ زندگی اپنی روٹین پر آ گئی۔ وہ بھی پڑھائی میں مصروف ہو گئی لیکن اب پہلے والی مصروفیت میں کہیں کچھ تانک جھانک تھی......کبھی کتاب پر دو آنکھیں گھورتی ہوئی نظر آتیں اور کہیں ایک آواز پیچھا کرتی۔

''تو، تو مس اس راستے پر واپسی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ آپ جس طرف مڑیں گی خاکسار کو سامنے پائیں گی۔'' زندگی میں کوئی تبدیلی یقیناً آ چکی تھی۔

بے شمار دن گزر گئے۔ ایک روز صدیقہ بھابی اپنے بچوں کے ہمراہ آئیں اور سارا دن یہیں پر گزارا......انہوں نے امی جان سے چپکے، چپکے کوئی بات کی اور امی جان نے سوچنے کی مہلت مانگی۔ صدیقہ بھابی خوشی، خوشی گھر واپس چلی گئیں۔ گھر میں بڑوں کے درمیان کچھ کھسر پھسر ہونے لگی۔ اور ایک شام صغراں نے اسے بتایا کہ صدیقہ بھابی نے آپ کا رشتہ مانگا تھا۔ اپنے کسی بھائی کے لیے لیکن یہاں سے انکار ہو رہا ہے کیونکہ ذات برادری کو ایشو بنایا جا رہا ہے اور کوئی خاص وجہ نہیں......بہرکیف نائلہ کو ابھی اتنی سمجھ نہیں تھی کہ جہاں کوئی پسند آ جائے وہاں شادی ضروری سمجھی جاتی ہے۔

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہا......بے شمار دن گزر گئے۔ اسے آج بھی عابدہ باجی کی شادی کا منظر یاد آتا رہتا......دو گھورتی ہوئی آنکھیں......کاغذ پر لکھا ہوا وہ خوب صورت شعر جو اس نے یونہی سنبھال رکھا تھا اور سب سے زیادہ وہ خوب صورت آواز میں انتہائی خوب صورت گانا......

بے رحم آسماں میری منزل بتا ہے کہاں

یہ سب یادیں اسے ایک قیمتی سرمایہ لگتی تھیں۔

زندگی دھیرے، دھیرے گزر رہی تھی کہ ایک روز پھر صدیقہ بھابی اپنی فیملی کے ساتھ آن وارد ہوئیں لیکن ان کے ساتھ ایک نئی نویلی دلہن بھی آئی تھی۔ چھوٹا بھائی طارق بھی ہمراہ تھا۔

تب پھر پتا چلا کہ ذاکر اقبال نے اپنی دلہن کو بھیجا ہے تاکہ یہاں سب کو پتا چلے کہ کوئی کسی کے بغیر مرتا نہیں۔ بلکہ زندگی کی نئی شروعات ہو جاتی ہیں۔

امی جان نے خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں چھوڑی......دلہن کو اور طارق کو سوٹ دیے۔ طارق کی آنکھیں کشش سے بھری ہوئی تھیں اس نے مٹھی بھر کشش

نائلہ کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔
''بھئی ریحانہ باجی نے آپ کا نام ''مٹی کا مادھو'' ایویں ہی رکھ دیا تھا ہم تو آپ کو'' انارکلی'' کا نام دیتے ہیں۔'' کمرے میں موجود سب لوگ ہنس دیے تو طارق نروس ہوگیا اور فوراً بولا۔ ''نہیں مگر میں تو بھائی ہوں آپ کا۔''
''کوئی بات نہیں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں...... بہن کو'انارکلی' کہہ لینے میں کوئی حرج تو نہیں لیکن سچ میں، میں''انارکلی'' نہیں'مٹی کا مادھو'' ہوں......'' اور پھر سب لوگ ہنسنے لگے۔
وہ دن بھی گزر گیا...... ذاکر اقبال کی بیگم اپنے درشن کرا کے چلی گئیں۔ نائلہ کو قطعی جیلسی فیل نہیں ہوئی۔

☆☆☆

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی، نائلہ جب بھی اکیلی بیٹھتی تو ایک ہی آواز اس کا پیچھا کرتی...... ''جب تم اکیلے ہوگے ہم یاد آئیں گے۔'' اس نے بارہا ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن دل کے کسی نہاں خانے میں چپکے، چپکے کوئی آن بسا تھا۔
نہ جانے کب اور کیسے دبے پاؤں وہ کوئی آہٹ کیے بغیر زندگی میں شامل ہوچکا تھا۔ اس نے سچ کہا تھا۔ ''تو، تو مس اس راستے سے واپسی ممکن نہیں، آپ جس سمت بھی مڑیں گی اس خاکسار کو اپنی راہ گزر میں پائیں گی۔'' وہ خاصی ڈسٹرب تھی۔ کیونکہ اس سے رابطہ کرنا فضول تھا اس کی زندگی میں کوئی اور آچکا تھا اور اسے یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ ذاکر سے رابطہ کر کے اس کی بیوی کے لیے تکلیف کا باعث بنتی۔
شہلا نے ماسٹر کرلیا تو رشتے آنے شروع ہوگئے۔ گھر میں ہر وقت کوئی نہ کوئی مہمان آیا رہتا...... کہیں نائلہ کو امی جان کے ساتھ جانا پڑتا...... کبھی ابو اور امی دونوں چلے جاتے اور پھر جہاں اللہ کو منظور تھا وہاں شہلا کے لیے ہاں کردی گئی۔ علی رضا سرگودھا یونیورسٹی میں لیکچرار تھا۔ اونچا لمبا قد، خوب صورت نین نقش سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی مہذب لوگ...... اور

پھر یوں ہوا کہ آناً فاناً شہلا کی بات پکی ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ بازار کے پھیرے جہیز کی خریداری...... درزیوں کے پھیرے......
امی جان نے اپنی بھانجی نیلم کو بھی بلالیا۔ نیلم کی شادی چار پانچ ماہ پہلے ہوئی تھی۔ نیلم، شہلا سے بڑی تھی اور انتہائی سلیقہ مند لڑکی تھی...... اس نے خالہ کا بڑا بوجھ بانٹ لیا۔ اس نے شادی کے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے...... ماموں کی بیٹی ارم نے بھی کالج سے واپس آکر عائشہ پھپو کے گھر میں آنا شروع کردیا وہ نائلہ کی بیسٹ فرینڈ بھی تھی دونوں مل کر گپ شپ اور شادی کی تیاریوں میں مصروف ہو کر بہت خوش تھیں۔
''بھئی نائلہ میں تو اس وقت تک کچھ نہیں کرسکتی جب تک ساتھ میں میوزک نہ لگا ہو۔'' ارم نے دوپٹے کے کناروں پر گوٹا لگاتے ہوئے کہا۔
نائلہ نے جھٹ سے ٹیپ ریکارڈر آن کردیا...... آڈیو کیسٹ پر طلعت محمود کی آواز گونج اٹھی۔ بے رحم آسماں ارم نے ایک دم سوئی دھاگا اور دوپٹا ایک طرف رکھ دیا۔
''نیلی یار یہ گانا تم نے کہاں سے لیا۔ بھئی میں نے زندگی میں ایک بار سنا تھا پھر دوبارہ ہزار کوشش کے باوجود یہ کہیں سے ملا نہیں؟''
''بھئی ارم یہ بہت قیمتی گانا ہے اور ہر کسی کو سننے کو نہیں ملتا...... ما بدولت کو اس گانے سے عشق ہے، ہم جس روز نہ سنیں ہمیں بھوک لگتی ہے، نہ نیند آتی ہے اور نہ ہی کوئی کام کرسکتے ہیں۔''
''ارے، رے...... ذرا میری طرف دیکھو...... اِدھر رخ موڑو نیلی یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' نائلہ نے رخ موڑے بغیر سوئی میں دھاگا ڈالنا شروع کردیا...... لیکن دھاگا ڈالنا محض ایک بہانہ لگا ارم کو...... اس نے فوراً اٹھ کر دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھے اور نیلی کا رخ اپنی طرف موڑ لیا اور پھر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ نیلی کی آنکھیں برسات کا سماں پیش کر رہی تھیں۔

''یہ کیا میری جان...... تم نے مجھے کچھ بتایا کیوں نہیں؟ کیا بات ہے سچ سچ بتا دو۔''

اور پھر اس نے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور سسک پڑی۔ ارم کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اور اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

''بیٹھو یہاں، مجھے بتاؤ تمہیں کس نے رلایا ہے، میں اسے کالر سے پکڑ کر تمہارے قدموں میں نہ لاؤں تو میرا نام بدل دینا۔''

''نہیں، نہیں ارم ایسا کچھ بھی نہیں ہے، میرا تو شہلا باجی کی جدائی کا سوچ کر دل بھر آیا ہے۔'' وہ بہانے کرنے لگی۔

لیکن ارم کو تسلی نہیں ہوئی اتنے میں ابو اور وقار بھائی گھر میں داخل ہوئے۔ برتنوں کے کاٹن اور زیورات کے ڈبے لاؤنج میں لا کر رکھے...... امی اور نیلم باجی ابھی بازار میں تھیں۔ وقار بھائی نے شہلا کو زیورات پکڑائے اور خود کرسی پر بیٹھ کر پانی طلب کیا۔ ابو باہر مزدور کو اجرت دینے چلے گئے۔ اور ملازمہ نے جلدی سے چولھے پر چائے چڑھا دی۔

نائلہ واش روم سے باہر نکلی تو آنکھوں اور چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے ہوئے تھے تولیا لے کر چہرے کو تھپتھپانے لگی۔ اتنے میں ٹیبل پر چائے آگئی اور سب مل کر چائے پینے لگے۔

☆☆☆

کام کا رش تھا اور ارم کو دوبارہ نائلہ سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا لیکن اسے یہ بات ہضم کرنی بھی مشکل لگ رہی تھی۔

آخر کار موقع مل ہی گیا۔ ارم رات کو نائلہ کے کمرے میں ہی سوتی تھی۔ اس رات وہ چائے کے دو کپ ٹرے میں رکھے کمرے میں داخل ہوئی۔

''اٹھو میری جان یہ کڑک چائے لو اور آج اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ دو، آخر کون ظالم اس میں چھپا بیٹھا ہے ذرا میں بھی تو دیکھوں۔'' نیلی مسکرا دی۔

''ارے پگلی ایسا کچھ بھی نہیں، تمہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔''

''تمہیں اگر سچ نہیں بولنا تو جھوٹ بولنے کا طریقہ تو سیکھ لو...... مجھے تم کیسے بے وقوف بنا سکتی ہو، تم سے دو تین سال بڑی ہوں۔'' ارم نے اس کا گال چھو کر کہا۔

وہ خاموش ہو گئی اور بے شمار ساعتیں اس خاموشی کی نذر ہو گئیں۔

''چلو اب بکو بھی...... ورنہ......'' اس نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''دراصل ارم میرا تو خیال ہے کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ بس شاید مجھے ہی غلط فہمی ہوئی یا واقعی وہ مجھے پسند کرتا تھا۔'' اس نے بڑے اداس لہجے میں کہا اور پھر اس نے عابدہ باجی کی شادی والا چند روزہ قصہ سنا ڈالا۔ عابدہ باجی کی فیملی اور حمید صاحب کی فیملی کے تعلقات کئی دہائیوں سے بڑے مضبوط چلے آ رہے تھے اس بات کا علم سارے خاندان کو تھا۔ نائلہ نے مڑا تڑا وہ کاغذ جس پر وہ شعر درج تھا الماری سے نکال کر ارم کو دکھایا۔ ارم نے کاغذ پر لکھا شعر پڑھا۔

''اوہو میری جان تم واقعی میں بہت بھولی ہو، تمہارا نام ریحانہ نے ''مٹی کا مادھو'' صحیح رکھا تھا۔'' اس نے نائلہ کے گال پر پیار کر لیا۔ ''پاگل لڑکی یہ کیا عشق کی ڈگری الماری میں سنبھالے بیٹھی ہو۔ بھئی رات گئی بات گئی اور جب اس نے شادی بھی کر لی ہے تو تم اس سوغات کے ٹکڑے کر کے چولھے میں جھونک دو۔''

''نہیں ارم اس نے سچ کہا تھا کہ اس راستے پر چل پڑنے سے واپسی کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ میں جدھر کا رخ کرتی ہوں وہ سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔''

''نیلی مزید بکواس مت کرنا۔'' وہ غصے میں لال پیلی ہو گئی۔ ''کچھ عقل کے ناخن لو تمہیں ان خارزاروں پر ڈال کر وہ خود نئی نویلی دلہن کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے اور تم اس کی شاعری کا ماتم کر رہی ہو، بھول جاؤ یہ سب کچھ ورنہ میں چچا جان سے کہہ دوں گی وہ تمہاری خبر لیں گے۔''

''ایسا کچھ مت کرنا ارم...... اس سے شادی کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔''

''واہ میری بنو واہ...... وہ تو شادی کر کے تیری دنیا سے بھاگ نکلا تو کیا ان دیواروں سے محبت کر رہی ہے؟'' ارم آسانی سے ٹلنے والی نہیں تھی۔ لہٰذا نیلی نے سوری کہہ دیا اور بات وہیں ختم کردی۔

شادی کی تیاریوں اور بھاگ دوڑ میں سب مصروف تھے اس لیے ارم نے دوبارہ نیلی سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

شہلا کی شادی قریب آگئی۔ کارڈ بانٹ دیے گئے سارا دن ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی رہتی۔ ساتھ والے پلاٹ کی صفائی ستھرائی کر کے اسے بارات کے لیے تیار کردیا گیا۔

صدیقہ بھابی اور محسن بھائی ملکوال میں ہی رہتے تھے ان کے ہاں بھی کارڈ بھجوادیا گیا۔ شہلا کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ حمید صاحب نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا۔ محسن بھائی کی فیملی تو شادی میں شریک ہوئی لیکن لاہور سے صالحہ خالہ کے گھر سے کوئی نہ آسکا۔

شہلا رخصت ہوئی تو گھر میں گویا اداسی نے ڈیرے ڈال لیے۔ امی کی شہلا سے زیادہ دوستی تھی وہ تو بے حد اداس رہنے لگی تھیں نائلہ بھی بالکل اکیلی ہوگئی تھی گھر سے کالج اور کالج سے گھر...... وقار بھائی ایم بی بی ایس کے چوتھے سال میں تھے۔ لاہور میں ہی تھے۔ ابو البتہ شام کو گھر میں ہوتے۔

☆☆☆

ماحول میں اچھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ شہلا باجی نے تعلیمی مصروفیات کے باوجود پورے گھر کو سنبھالا ہوا تھا۔ امی جان کو کسی کام کی فکر نہیں ہوتی تھی۔

لیکن اب کافی وقت پیش آرہی تھی۔ نائلہ تو گھرداری میں زیرو تھی۔ امی اکثر اسے ڈانٹا کرتی تھیں کہ ''کبھی تو بھی کام کاج میں دلچسپی لیا کر...... شہلا اپنے گھر چلی گئی تو پھر دیکھنا کہ تیرا کیا حشر ہوگا۔'' نائلہ کو جب بھی ڈانٹ پڑتی وہ شہلا کے پہلو میں پناہ لیتی اور شہلا ہمیشہ اس کی طرف داری کرتی۔

''مت ڈانٹا کریں میری پیاری سی بلی کو...... یہ انشاء اللہ بڑی سلیقہ مند اور باشعور لڑکی ثابت ہوگی۔ ابھی تو میں ہوں ناں...... جب گھر اسے سنبھالنا پڑا تو آپ مجھے بھول جائیں گی۔''

اور اب شہلا کے بعد اس کی باری تھی اور وہ اپنی ڈیوٹی سنبھالنے کو تیار تھی۔ کبھی، کبھی بابا کی سپورٹ مل جاتی تھی جب وہ گھر میں ہوتے تو اکثر ہی کہتے کہ ''بھئی عائشہ تم ملازمہ سے کام کرا لیتی ہو پھر ہماری بیٹی پر اتنا رعب کس بات کا؟ اگر تم نے زیادہ پریشان کیا تو ہمارا بیٹا ہمارے ساتھ آفس جایا کرے گا۔'' یہ سن کر نائلہ ایک زوردار قہقہہ لگاتی اور بابا کے ہاتھ پر ہاتھ مار دیتی...... تب پھر امی جھنجلا کر رہ جاتیں۔

''ملک صاحب بیٹی کا دھن ہے آپ اسے اتنا فری نہ کریں کل کو اگلے گھر جائے گی تو والدین کو جوتیاں پڑوائے گی۔ اس پر رعب رکھا کریں تاکہ زندگی گزارنے کا سلیقہ آجائے اسے۔''

''نہیں بھئی عائشہ، ایسا مت کہو نیلی میری بیٹی ہے اور انشاء اللہ زندگی میں کبھی مایوس نہیں کرے گی۔'' اور نیلی اور قریب ہو کر اپنا سر بابا کے کندھے سے ٹکا دیتی۔ اور بابا اس کے گال تھپتھپانے لگتے۔

یہ باپ کی محبتیں، ماں کی ڈانٹ ڈپٹ ان سب چیزوں میں کس قدر مٹھاس تھی اس مٹھاس کے ساتھ اسے لگتا کہ جیسے جنت کے میووں کا مزہ چکھ رہی ہے۔ واقعی والدین کا گھر کسی طور جنت سے کم نہیں ہوتا۔

☆☆☆

کالج سے چھٹیاں تھیں گھر میں زیادہ کام کاج اماں صغراں کرتی تھی اور نائلہ اخبار، رسالے پڑھ کر ٹائم پاس کرتی تھی۔ ارم بھی کم، کم آتی تھی اس نے کسی دستکاری اسکول میں داخلہ لے لیا تھا اور اپنی دنیا میں مصروف تھی۔ نائلہ جب کمرے میں داخل ہوتی تو ٹیپ ریکارڈر آن کرلیتی اور اسے لگتا تھا جیسے بچھڑا ہوا وہ شخص کہیں آس پاس ہے۔

"جب تم اکیلے ہوگے ہم یاد آئیں گے۔" وہ بہت اداس ہو جاتی......اور اکثر سوچا کرتی کہ میں نے کس محبت کو کلیجے سے لگا رکھا ہے۔ وہ بندہ کہ جس نے مڑ کر کبھی دیکھا بھی نہیں۔ وہ ہزار بار اس کے خیالات کو جھٹلانے کی کوشش کرتی......اسے بھول جانا چاہتی لیکن جب دل میں جھانکتی تو اس غیر آباد گھر میں وہ اپنے قدم جمائے نظر آتا۔ "تو، تو مس جو اس راستے پر چل پڑتا ہے اسے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ آپ بھی جس طرف رخ موڑیں گی اس خاکسار کو اپنے سامنے پائیں گی۔"

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہتا ہے کون آگے نکل گیا کوئی پیچھے رہ گیا۔ اسے کسی سے کچھ غرض نہیں۔

شہلا اپنے گھر میں خوش تھی اس نے سسرال جاتے ہی سب کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ بابل کے گھر میں سیکھی گئی سلیقہ شعاری نے زندگی میں چار چاند لگا دیے تھے وہ بہت کم ملکوال آتی تھی۔ یہ نہیں کہ میکے آنے کو اس کا دل نہیں کرتا تھا بلکہ وہ بہت سمجھدار تھی اور جانتی تھی کہ سسرال میں امتحان پاس کرنے کے لیے میکے کی محبتوں کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر پاؤں جمتے ہیں اور گھر آباد ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کافی عرصے بعد اس کا ملکوال کا چکر لگا۔ نائلہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی، بہن اور بہنوئی کی خاطر مدارات میں لگی ہوئی تھی۔ وقار بھی لاہور سے آیا ہوا تھا گھر میں رونق لگی ہوئی تھی...مزے، مزے کے پکوان بن رہے تھے، سیر سپاٹے ہو رہے تھے......چار دن بعد اچانک شہلا نے واپسی کا اعلان کر دیا......نائلہ ایک دم بجھ سی گئی۔

"علی بھائی چند روز اور رک جاتے تو کیا تھا ابھی شہلا باجی سے میں نے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔"

"نہیں چندا انہیں بڑی مشکل سے اتنی چھٹی ملی ہے ہم پھر آجائیں گے۔"

"جو یہ کہتا ہے کہ ہم دوبارہ آئیں گے وہ پھر کبھی نہیں آتا۔" نائلہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

"ارے کبھی رونا مت......ہم اگر نہ آسکے تو ہوسکتا ہے تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے لے جائیں......" شہلا نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا......شہلا کا کہنا اور نائلہ کا سننا دو الگ، الگ ذہن تھے کچھ سمجھ نہ آسکی......لیکن شہلا نے جو بات کہہ دی وہ معنی خیز تھی۔

"نہیں شہلا باجی میں ہمیشہ اپنے ابو کے پاس رہوں گی یہی میری جنت ہے، جنت کو کیسے چھوڑ دوں؟"

شہلا چلی گئی تو گھر پھر ایک بار بے رونق ہو گیا۔ اداسیاں ہر سو چھا گئیں اور نائلہ کے اندر تو ویسے بھی سناٹوں کا راج تھا۔ اسے ہر چیز تنہا اور اداس نظر آتی۔

امی جان بھی اکثر بیمار رہنے لگی تھیں اور وہی خاموش قاتل بلڈ پریشر، شوگر اور نہ جانے کیا، کیا تھا......اوپر سے نائلہ کے بارے میں فکر مند کہ اگر انہیں اوپر سے بلاوا آجاتا ہے تو نائلہ کا کیا بنے گا؟

☆☆☆

ارم آج صبح ہی نیلی کو ملنے آگئی تھی۔

"بھئی آج تو ما بدولت کا ارادہ پورا دن پھپو جان کے ساتھ گزارنے کا ہے، پھپو جان بیمار ہیں یہ سن کر تو میری جان ہی نکل گئی اللہ نہ کرے کہ پھپو جان کو کچھ ہو۔ تم نے مجھے فون ہی کر دینا تھا ظالم لڑکی......"

"میں کیا بتاتی نیلم! امی جان اپنی تکلیف خود کب ظاہر ہونے دیتی ہیں۔ ابو کو بھی اسی بات پر غصہ آتا ہے، یہ اس وقت آرام کرتی ہیں جب بیماری انہیں نڈھال کر کے بستر پر گرا دیتی ہے۔ ہزار بار سلام کہا۔ امی جان خدا کے لیے اپنی تکلیف بروقت بتا دیا کریں لیکن مجال ہے جو تو کبھی ان پر اثر ہوا ہو۔"

"بھئی میرے متعلق کیا لیکچر دیا جا رہا ہے۔" امی جان سرخ غلاف میں لپٹا ہوا قرآن پاک سینے سے لگائے آہستہ، آہستہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"لائیں امی جان میں اسے رکھ دیتی ہوں۔" نیلی نے بڑے احترام سے قرآن پاک اس کی جگہ پر رکھا اور واپس آکر ماں کے کندھے دبانے لگی۔

''پھوجان آپ دوسروں کا اتنا خیال رکھتی ہیں اور اپنا کیوں نہیں؟'' ارم بھی بیڈ پر بیٹھ کر پاؤں دبانے لگی۔

''بیٹا تم سے کس نے کہا کہ میں اپنا خیال نہیں رکھتی، ویسے فکر والی کوئی بات نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

''خاک ٹھیک ہیں، آج میں ابو سے بات کروں گی کتنا پیلا رنگ ہو رہا ہے۔'' پھپو نے ارم کو ساتھ لگا کر ماتھا چوم لیا۔

''میں اب بالکل ٹھیک ہوں تم اور نیلی جاؤ کمرے میں گپ شپ لگاؤ اور میرے اوپر ایک پتلی دلائی ڈال دو، میں تھوڑی دیر سونا چاہتی ہوں۔''

ارم نے جلدی سے پاس رکھی دلائی پھپو پر ڈال دی۔ ان کے ماتھے کا بوسہ لیا اور پھر کمرے کا دروازہ ادھ کھلا چھوڑ کر نیلی کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔

''بے رحم آسمان میری منزل بتا ہے کہاں......''

ریکارڈ پلیئر کی دھیمی سی آواز کمرے کی فضا کو سوگوار بنائے ہوئے تھی۔

''بھئی تیری اس بے رحم آسمان سے کب جان چھوٹے گی.....نہیں تو میں آج چھڑوا دوں۔'' اس نے ٹھک سے ٹیپ ریکارڈ بند کر دیا اور آڈیو کیسٹ نکال لی۔ نائلہ کو یوں لگا جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو۔

''ارم ایسا مت کرنا بخدا میں مر جاؤں گی، مجھے یہ واپس لوٹا دو۔''

''پاگل ہو گیا؟ کس سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو، کہاں ہے وہ ظالم انسان میرے سامنے آئے تو اس کا منہ نوچ لوں، اس بدبخت کو شرم نہیں کہ چند لفظوں کے ہیر پھیر سے اس نے ایک معصوم لڑکی کا رخ تباہی کی طرف موڑ دیا ہے۔ میں آج پھپا جان سے بات کر کے ہی جاؤں گی کہ ذرا بیٹی پر غور کریں۔''

''نہیں ارم تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گی۔'' وہ روہانسی ہوئی۔ ''تم سمجھ نہیں سکتیں ہو کہ میں کس کیفیت سے گزر رہی ہوں۔'' اس کی آنکھیں اُمڈی پڑتی تھیں کہ ارم کو ترس آ گیا اس نے اسے گلے سے لگا لیا۔ نیلی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ارم نے اسے رونے دیا خوب سارا رونے کے بعد ارم نے اسے اپنے سے الگ کیا اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

''میری پیاری بہن تم نے یہ کیا روگ پال لیا ہے محبت وحبت سب بکواس ہے، محبت صرف والدین کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے اور بس......'' اس نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

''آج کے بعد تم نے اس برے آدمی کے لیے ایک آنسو بھی نہیں بہانا...... یہ سمجھ لو کہ تم نے ایک خواب دیکھا تھا اور ذاکر نام کا کوئی بندہ اس دنیا میں نہیں۔'' نیلی خاموش رہی۔

دوپہر کا کھانا دونوں نے ایک ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھایا۔ وہ بہانے، بہانے سے نیلی کو سمجھا رہی تھی۔ نیلی خاموشی سے سب سن رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے روز شہلا کا فون آ گیا وہ امی جان سے بہت دیر تک باتیں کرتی رہی امی بھی حسبِ عادت بڑی دھیمی آواز میں محوِ گفتگو تھیں۔

نائلہ صحن میں قطار در قطار لگے گملوں میں پانی دے رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پودوں کے نرم پتوں کو بڑی محبت سے دھو رہی تھی۔

کل ارم کے گلے لگ کر رونے سے دل کا بوجھ ذرا سا ہلکا ہوا تھا لیکن ان محبتوں کو جو بے پاؤں اس کی زندگی میں داخل ہو چکی تھیں انہیں نظر انداز کرنا بڑے جوکھوں کا کام تھا۔

''سنو نیلی...... بیٹا میرے بالوں میں ہلکا سا تیل لگا کر کنگھا کر دو۔'' امی جان جانماز تہ کرتے ہوئے نائلہ سے گویا ہوئیں۔

''جی امی جان ابھی لیجیے۔'' اس نے سارے کام چھوڑ دیے اور ماں کی طرف بڑھ گئی اور امی جان کے بال سلجھانے لگی...... تھوڑی دیر بعد امی اس سے مخاطب ہوئیں۔

"نائلہ میری بچی تجھے تو پتا ہے میں بیمار رہتی ہوں کچھ پتا نہیں کب بلاوا آجائے، میں چاہتی ہوں میری زندگی میں تو اپنے گھر کی ہو جائے۔"

"اللہ نہ کرے کہ آپ کو کچھ ہو، ایسا کچھ نہیں ہوگا انشاء اللہ اور دوسری بات یہ کہ آپ کس گھر کی بات کرتی ہیں، میری جنت تو یہ گھر ہے اور اس لیے میں کہیں نہیں جارہی۔ مجھے ہمیشہ یہی رہنا ہے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"نہیں بیٹا، بیٹیاں تو پرائی امانت ہوتی ہیں، ان کے گھر کہیں اور ہوتے ہیں جیسے میں کراچی سے بیاہ کر یہاں ملکوال آگئی اور شہلا یہاں سے سرگودھا چلی گئی۔"

امی جان اداس لہجے میں گویا ہوئیں۔

"لیکن کیا والدین کا گھر چھوڑنے والی آپ دونوں کافی نہیں ہیں؟" وہ عجیب بات کررہی تھی۔

"نہیں بیٹا، ہم دو نہیں پوری کائنات میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے، ہمارے نبی پاک کی بیٹی بھی اپنے باپ کے گھر سے وداع ہو کر دوسرے گھر چلی گئی تھیں تو ہم گناہ گار کیا چیز ہیں؟ ہم والدین ہیں، ہمارا یہ فرض ہے کہ اپنی زندگی میں ہی اپنی بچیوں کو عزت و آبرو سے اس پاکیزہ بندھن میں باندھ دیں...... اللہ تبارک و تعالیٰ ہر ایک کی اولاد کے نصیب اچھے کرے...... اور سب کو اس فرض سے سبکدوش ہونے کی توفیق دے، آمین۔"

نائلہ کی آنکھیں بھر آئیں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ اس نے امی کے بالوں میں برش کیا اور پھر چٹیا بنادی......

"آپ کو چائے بنادوں؟" اس نے ماں کے گال پر بوسہ دیا۔

"واہ جی نیکی اور پوچھ پوچھ......" امی نے ماحول کو غمناک دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسنے کی کوشش کی۔

"ارے بھئی آپ کے قدموں میں تو ہم اپنی جان بھی قربان کردیں، یہ چائے کیا چیز ہے؟" نائلہ نے بڑی محبت سے ماں کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر کہا۔

"میرا رب میرے بچوں کے ساتھ، ساتھ پوری دنیا کے بچوں کی جان کو سلامت رکھے، آمین۔"

"اور میرا رب پوری دنیا کے والدین کو ہمیشہ سلامت رکھے، آمین۔"

پھر دونوں ماں، بیٹی بڑا معصوم سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں تو فضا خوشگوار سی لگنے لگی۔

☆☆☆

وقار ہاؤس جاب کررہا تھا اور لاہور سے ہر ماہ نہیں آسکتا تھا۔

ابو کسی دوست کے ساتھ پارٹنرشپ پر کنسٹرکشن کا کام کرتے تھے۔ دونوں فریق بچپن کے دوست تھے اور بڑی ایمانداری سے تیس سال سے ایک کمپنی کو چلارہے تھے کبھی کوئی ٹینشن نہیں ہوئی تھی۔

دونوں فیملیوں میں بڑی محبت تھی ایک دوسرے کے گھر آنا جانا ہوتا تھا۔ حیدر صاحب کی بڑی بیٹی میڈیکل میں تھی بڑی پیاری اور ذہین بچی تھی، کشف نام تھا اور حمید صاحب نے بچپن میں ہی اس پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

"بھابی جان کشف میری بیٹی ہے اور وقار آپ کا بیٹا...... میرا خیال ہے مزید کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ آپ کے پاس میری امانت ہے۔" بیس سال پہلے کی بات نبھائی جارہی تھی۔

آئے دن حمید صاحب کچھ نہ کچھ کشف کے لیے بھجواتے رہتے تھے۔ شہلا اور نائلہ کے کپڑوں کے ساتھ ہی کشف کے کپڑے بنتے تھے۔ گھر میں آنے والی ہر چیز میں کشف کا حصہ موجود ہوتا۔ حیدر صاحب کی چار بیٹیاں ہی تھیں ورنہ نائلہ کے لیے اتنا سوچنا نہ پڑتا۔

وقت کی چرخی اپنی رفتار سے گھومتی جارہی تھی۔ آن کی آن میں نائلہ کے لیے رشتہ آیا جو دور پار کے رشتے دار ہی نکل آئے تھے۔ امی نے حمید صاحب کے گوش گزار کیا اور رشتے والوں کو گھر آنے کا عندیہ دے دیا گیا...... گھر میں باقاعدہ دعوت کا اہتمام کیا گیا، ارم کو بھی بلالیا گیا تھا۔ اس نے نائلہ کو زبردستی تیار کردیا۔

امی جان نے اماں صغراں سے کہہ کر نائلہ کو مہمانوں کے سامنے بلوایا۔

وہ مکمل خاموش تھی اس کے گال تپ رہے تھے۔

وہ سر پر دوپٹا اوڑھے چپ چاپ ڈرائنگ روم میں آگئی۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ہماری بیٹی تو بہت پیاری ہے۔ایک بزرگ خاتون اپنی جگہ سے اٹھیں اور نیلی کو گلے لگا کر پیار کیا اور پھر اپنے ساتھ جگہ دی۔

''بھئی حمید صاحب ہمیں اپنی منزل نظر آگئی۔ ہماری بیٹی اگر ہمارے نصیب میں ہے تو سمجھو کہ ہمارے بھاگ جاگ گئے۔'' امام دین صاحب نے اٹھ کر نائلہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بھئی اتنی بھی کیا جلدی ہے امام صاحب ابھی تو چند گھنٹے کی ملاقات ہے آپ بھی سوچیں اور ہمیں بھی موقع دیں۔ دیکھیں جو اللہ کو منظور ہو۔'' حمید صاحب بولے۔

''حمید صاحب ہم تو سوچ چکے آپ بھی ہمیں شرف باریابی بخشیں......''

''چلیے جی کھانا لگ گیا ہے۔'' عائشہ بیگم نے آکر اطلاع دی اور سب ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

کھانا بہت اچھے ماحول میں کھایا گیا۔ حمید صاحب کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر مہمان رخصت ہوئے۔ ارم ابھی تک صغراں کے ساتھ ہاتھ بٹا رہی تھی۔ امی، ابو دونوں تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔

نیلی اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

''تو، تو مس اس راستے پر واپسی کی گنجائش نہیں رہتی۔ آپ جس طرف مڑیں گی اس خاکسار کو سامنے پائیں گی۔'' اس ایک جملے کی بازگشت اسے مسلسل بے چین کیے دے رہی تھی۔

☆☆☆

اگلے ہفتے حمید صاحب، عائشہ بیگم اور ثریا خانم (ارم کی والدہ) کو ساتھ لے کر لڑکے والوں کے گھر گئے۔

بڑا پُرتپاک استقبال کیا گیا...... بڑی خاطر مدارت ہوئی، عامر بھی دل کو بھلا لگا۔

''عامر دبئی میں ہوتا ہے اور چھٹی پر پاکستان آیا ہوا ہے۔'' امام صاحب نے بتایا تھا۔

امام دین کی بڑی بہو اور بیٹی مہمانوں کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ عائشہ اور ثریا دونوں ہی اس فیملی سے متاثر تھیں۔

یہ بڑی عجیب منطق ہے کہ شادی سے پہلے تک تو دونوں طرف سے محبتوں کی بارش ہوتی ہے...... لیکن شادی کے بعد ملمع اترنا شروع ہو جاتا ہے۔ شادی ہونے تک کبھی اصلیت ظاہر نہیں ہوتی چاہے آپ دس سال تک منگنی قائم رکھیں۔

دونوں طرف سے پسندیدگی کی سند مل گئی اور یوں بڑی سادگی سے منگنی کی رسم ادا کر دی گئی اور فیصلہ یہ ہوا کہ چھ ماہ بعد وقار اور نائلہ کی شادی ایک ساتھ کر دی جائے۔ کشف کی باقی پڑھائی سسرال میں رہ کر مکمل ہو جائے گی۔

☆☆☆

''نیلی، نیلی...... اے میرا بیٹا کہاں ہے بھئی، چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی ہے۔'' حمید صاحب ہاتھ میں تازہ اخبار لیے گھر میں داخل ہوئے۔

اور وہ دنیا جہاں سے بے خبر اپنے بیڈ پر لیٹی گانا سن رہی تھی۔

''بے رحم آسماں......'' آنکھوں سے ننھے قطرے نرم تکیے میں جذب ہوتے جا رہے تھے اور کمرے میں نیم تاریکی تھی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ابو کمرے میں چلے آئے۔

''واہ جی واہ ان اندھیروں میں کیا ہو رہا ہے، لائٹ جلائیں میڈم، ہم آپ کے ہاتھ کی چائے کے طلبگار ہیں۔'' بابا جان نے سوئچ آن کیا اور کمرا روشنی میں نہا گیا۔

''آیئے بابا جان تشریف رکھیں۔'' نائلہ ایک دم

اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں...... نصیب دشمناں ہماری ننھی سی گڑیا اس قدر اداس کیوں ہے، بابا نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا تو آنکھیں برسنے لگیں۔

”ارے، ارے بھئی ہم یہ ساون بھادوں نہیں دیکھ سکیں گے۔“ اور نیلی اپنے باپ کے سینے سے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

”نیلی...... میرا بیٹا کچھ بتاؤ آخر کیا وجہ ہے رونے کی؟“ انہوں نے بیٹی کا ماتھا چوم لیا اور پشت سہلانے لگے۔

”بابا جان آپ کے پاس میرے لیے دو وقت کا کھانا نہیں ہے کیا؟ میں نے کبھی آپ کا دل دکھایا؟ آپ سے بغیر ضرورت کے کوئی ڈیمانڈ کی؟ کبھی اونچی آواز میں آپ سے سوال جواب کیا؟ پھر آخر کیوں آپ مجھے اس گھر میں رکھنا نہیں چاہتے؟ آخر میرا قصور کیا ہے؟ مجھے شادی نہیں کرنی، میں ہمیشہ آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں آپ دونوں کی خدمت کروں گی۔“ بابا کی آنکھیں بھی پانیوں سے بھر گئیں۔ نیلی کو اپنے سے الگ کیا اس کے آنسو صاف کیے۔ چہرے سے بال ہٹائے۔

”میری پاگل بچی...... بہت پاگل ہو، کیا تمہارا کھانا ہم پر بھاری ہے بیٹا، یہی ازل سے ہوتا آیا ہے، بیٹیاں والدین کے گھر میں کسی کی امانت ہوتی ہیں تم امام دین صاحب کی امانت ہو ان کی بیٹی ہو، حیدر علی کے گھر میں میری بیٹی پل رہی ہے وہ ہماری امانت ہے۔ اسی طرح ہوتا آیا ہے۔ چلو اب کبھی مت رونا، ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔ تم کون سا کسی دوسرے شہر جا رہی ہو، تمہارا جب دل چاہے چلی آنا۔ ہم سے دوری صرف ایک فون کال پر ہوگی، دل چھوٹا نہیں کرتے اٹھو پانی کے چھینٹے لو اور چائے بنا کر امی کے کمرے میں لے آؤ۔“ نیلی واش روم کی طرف گئی تو حمید صاحب آنکھیں پونچھتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

☆☆☆

پلک جھپکتے چھ ماہ گزر گئے۔ شادی کی تیاریاں زور شور پر تھیں۔ دو، دو شادیاں تھیں وقار بھی ہاؤس جاب مکمل کر چکا تھا۔ شہلا بھی سسرال سے لمبی چھٹی لے کر آئی تھی۔

شادی کا دن آ گیا اور کشف، حمید صاحب کے آنگن میں بہار بن کر اتری...... اور نائلہ زمانے بھر کی اداسیاں بخش کر پیا دیس سدھار گئی۔

زندگی اسی کا نام ہے اور دنیا میں ازل سے یہی پھرکی گھوم رہی ہے۔ حسب دستور شروع کے دن بڑے خواب ناک سے گزر رہے تھے۔ وقار اور کشف کی جوڑی تو گویا آسمانوں سے اتری تھی، ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ ہنی مون کو فی الحال موخر کر دیا گیا تھا کیونکہ کشف کا ایم بی بی ایس کا آخری سال چل رہا تھا۔ صرف چھ مہینے کی بات تھی۔ فائنل کے بعد لمبے چوڑے پروگرام تھے۔

اُدھر نائلہ پوری طرح کمپرومائز کی کوششوں میں مصروف تھی۔ عامر نے پہلے دن ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ ”مجھے خواہ مخواہ کی دوستیاں پسند نہیں ہیں لہٰذا لڑکیوں کا زیادہ آنا جانا مناسب نہیں لگتا۔ اپنے بالوں کی سیٹنگ کو درست کرو...... چٹیا بنانے کی عادت ڈالو، میک اپ تو ایک طرف خالی لپ اسٹک بھی پسند نہیں۔“ نائلہ نظریں جھکائے میاں صاحب کے لیکچر سنا کرتی۔ دل میں اِک عجیب سی لہر اٹھتی۔ نظروں کے سامنے نہ جانے کیا گھوم جاتا، کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

”عامر جب تک پاکستان میں ہے تمہیں زیادہ میکے جانے کی ضرورت نہیں، وہ واپس چلا جائے گا تو پھر ماں کے گھر چلی جایا کرنا......“ ساسو ماں کا حکم تھا۔

”جی اچھا......“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

عامر کسی قسم کا جھگڑا تو نہیں کرتا تھا لیکن نائلہ کی زندگی کے سارے فیصلے اس نے ماں کی جھولی میں ڈال دیے تھے۔

نائلہ نے محسوس کیا تھا کہ اس کی شادی کر کے ابو نے بڑا گھاٹے کا سودا کیا تھا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ تیر

کمان سے نکل چکا تھا۔

وہ شادی سے انکار بھی کیسے کر سکتی تھی اس کے سامنے ایک چٹیل میدان تھا۔ کہیں کوئی پگڈنڈی کسی طرف کو مڑتی نظر نہیں آتی تھی۔ انکار کر کے وہ آخر کس راستے کا انتخاب کرتی۔ وہ جھلی لڑکی ''مٹی کا مادھو'' تھی بہت پہلے اس نے چند شعروں اور چند گانوں کے عوض ایک آدھ جملے کے بدلے میں ایک بے پروا شخص کو دل کے ایک انتہائی نرم گوشے میں پوری دنیا سے چھپا کر بند کر لیا تھا...... اسے یہ علم نہیں تھا وہ شخص اِک سراب تھا۔

☆☆☆

امی، ابو بھی بہت کم آتے زیادہ تر فون پر ہیلو ہائے ہو جاتی تھی امی جان بڑی محبت سے کہتیں۔

''عامر بیٹے تم دونوں ہماری طرف آؤ، ہمیں خوشی ہوگی، چند دن ہمارے پاس بھی رہ لو پھر تو تمہیں واپس چلے جانا ہے۔''

''آنٹی میں جب بھی پاکستان آتا ہوں تو زیادہ تر اپنی ماں کو ہی وقت دیتا ہوں، کہیں آتا جاتا نہیں۔ پردیس کا مسئلہ ہے، روزی کمانے کے لیے دھکے کھانے پڑتے ہیں۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے کہتا۔

''باہر کون سا زندگی بڑی پُرسکون گزرتی ہے ہر وقت آنکھوں کے سامنے والدین، بہن، بھائی اور گھر کا نقشہ گھومتا رہتا ہے، ایک سال بعد جب اپنی دھرتی پر پاؤں رکھنا نصیب ہوتا ہے تو پھر دل کرتا ہے کہ چھٹی کے چار دن بس گھر میں ہی گزارے جائیں۔''

عائشہ بیگم یہ سب سن کر خاموش ہوگئیں۔ اس گفتگو میں انہیں انتہائی کڑواہٹ محسوس ہوئی تھی ان کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

''نائلہ کے ساتھ ہم نے زیادتی تو نہیں کر دی؟'' عامر کی ساری گفتگو میں نیلی کا کہیں ذکر نہیں آیا...... وہ یہ سوچ کر سہم سی گئی تھیں۔

''اے میرے پروردگار میرے دو جہانوں کے رب...... میری بچی تو بڑی معصوم، بڑی بے ضرر ہے مولا...... اسے اپنی پناہ میں رکھنا۔'' یہ سوچتے ہوئے ان کی نگاہیں بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

☆☆☆

نائلہ کی شادی کو چار مہینے ہوگئے تھے ان چار ماہ میں اس نے تین چکر لگائے تھے فون پر جب بھی بات ہوتی وہ خود ہی کہتی۔

''امی جان میں بہت خوش ہوں یقین کریں۔ یہاں دل اتنا لگ گیا ہے کہ اب کہیں آنے جانے کو نہیں کرتا۔''

''بیٹا ہم کوئی اور نہیں ہیں۔ تمہارے والدین ہیں، اس گھر سے تمہیں بڑا پیار تھا، اپنے باپ سے بے پناہ محبت تھی پھر دل کیوں نہیں کرتا ہمارے پاس آنے کو؟''

''امی جان اب اپنے گھر میں دل لگانا بری بات تو نہیں ناں...... آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی جو شادی سے دور بھاگتی تھی اب اس کا اپنے گھر میں دل لگ گیا ہے۔''

''وہ شکریہ بیٹا، شکریہ ادا کرتی ہوں تمہارا کہ تم نے شکایت کا موقع نہیں دیا ورنہ میں ڈرتی تھی کہ باپ کا ہاتھ تھام کر سونے والی لڑکی نے سسرال میں نہ جانے کیسے خود کو ایڈجسٹ کیا ہوگا۔'' عائشہ بیگم کوشش کے باوجود خود کو مطمئن نہیں کر پا رہی تھیں۔ اندر ہی اندر دل میں کچھ پھانس سی گڑ گئی تھی لیکن انہوں نے کسی سے بھی اس اندیشے کا ذکر نہیں کیا بلکہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھیں کہ میرے مولا جو میں چبھن سی محسوس کر رہی ہوں، کاش یہ میرا وہم ہو......

لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ماں جو اپنی اولاد کی تخلیق اپنے وجود کے اندر کرتی ہے اور اس پھول کی آبیاری اپنے خون سے کرتی ہے اور جب وہ وجود اس دنیا میں آنکھ کھولتا ہے تو پھر اپنی راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام اس کی پرورش پر قربان کرتی ہے۔

اور پھر خدانخواستہ اگر اولاد کو کوئی تکلیف ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ماں...... محسوس نہ کرے...... عائشہ بیگم کے دل کی چبھن بھی کوئی واہمہ نہیں تھا چند دن بعد ہی اس کا انکشاف ہو گیا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ صبح کے دس بجے حمید صاحب حسب عادت اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وقار، کشف کے ساتھ ایک دن پہلے ہی اپنی سسرال گیا تھا۔ اماں صغراں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ چھٹی کے دن ناشتا دس بجے تک ہوتا تھا۔ عائشہ بیگم اپنے کسی کام میں مشغول تھیں۔ اتنے میں کاریڈور میں رکھے ہوئے ٹیلی فون نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

''ٹرررن......ٹرررن......''

''یا اللہ خیر......'' عائشہ بیگم نے حمید صاحب کی طرف دیکھا......وہ اخبار رکھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھ گئے۔

''ہیلو......جی وعلیکم السلام، یہ تو میرا بیٹا بول رہا ہے۔ واہ بھئی آج تو رب سے کچھ اور مانگ لیتے۔''

عائشہ بیگم کا دل دھڑک اٹھا انہوں نے الماری بند کرتے ہوئے اپنے بیڈ کی طرف قدم بڑھائے۔

حمید صاحب، نائلہ سے بات کر رہے تھے۔

''لو بھئی عائشہ بیگم نیلی آ رہی ہے آج...... عامر کل دوبئی جا رہا ہے، آج وہ دونوں ہماری طرف آئیں گے۔''

''اچھا عامر کل جا رہا ہے اور ہمیں پہلے بتایا تک نہیں......میرا تو ارادہ تھا کہ عامر نے جب جانا ہوگا ساری فیملی کی دعوت کریں گے۔ سب کو ایک ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ لیکن یہ اچانک آج آنے کی خبر دے دی۔'' عائشہ بیگم اداسی سے بولیں۔

''چلو خیر ان چھوٹی، چھوٹی باتوں کو محسوس نہیں کرتے۔ نیلی میری بھی اتنی ہی بیٹی ہے جتنی تمہاری...... میں بھی اداس ہوتا ہوں لیکن اگر وہ اپنے گھر میں خوش ہے تو بیگم ہم کیوں برا منائیں؟'' حمید صاحب بڑی سادگی سے بولے۔

''خاک خوش ہے۔'' عائشہ بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔

''میں تو چاہتی تھی کہ نائلہ نے جب آنا ہوگا میں ایک دن پہلے شہلا اور علی کو فون کروں گی وہ بھی آ جائیں گے سب اکٹھے مل کر دو دن گزار لیں گے۔ آج جب کشف اور وقار بھی گھر میں نہیں ہیں تو وہ صاحبزادے نیلی کو لے کر آ رہے ہیں۔ آپ نے کہنا تھا کہ سب گھر والوں کو بھی ساتھ لے کر آؤ۔''

''میں نے کہہ دیا تھا کہ گھر والوں کو لے کر آنا لیکن عامر کے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے اس لیے وہ دونوں اکیلے ہی آئیں گے۔''

''یہ کیا طریقہ ہے ملک صاحب، شادی کو پانچواں مہینہ لگ گیا ہے اور بیٹی چوتھی دفعہ آ رہی ہے اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے......کیا ہم نے اسے......''

''بس، بس بیگم بات بڑھاؤ مت، عورتوں کی عادت ہوتی ہے بال کی کھال اتارنا، بیٹی اپنے گھر میں خوش ہے تو تمہیں اعتراض کیوں ہے؟''

عائشہ بیگم خاموش ہو گئیں لیکن چہرے پر ایک غیر مطمئن سا تاثر تھا۔

☆☆☆

دوپہر کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ حمید صاحب بہت خوش تھے اور نیلی کی پسند کے کھانے بنوا رہے تھے۔ وقار اور کشف کو فون کر دیا تھا اور وہ دونوں واپس آ رہے تھے۔ عائشہ بیگم بھی کچن میں صغراں کے ساتھ ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ کشف گھر پہنچ چکی تھی اس نے آتے ہی امی کا ہاتھ پکڑ کر کچن سے نکالا۔

''میں آ گئی ہوں، اب آپ آرام سے اپنے بیڈ پر بیٹھ جائیں۔ میں اور وقار سب سنبھال لیں گے۔ صغراں بھی ہمارے ساتھ ہے لہٰذا آپ کو دوبارہ کچن میں آنے کی ضرورت نہیں۔'' کشف نے تمام ترمحبتیں سمیٹ کر عائشہ بیگم کو بیڈ پر بیٹھا دیا اور عائشہ نے اسے اپنے قریب کر کے اس کا منہ چوم لیا......اور دعائیں دینے لگیں۔ وقار تین چار شاپرز گاڑی میں سے نکال کر لایا اور ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیے۔

''سلام امی جان......!'' وہ آ کر ماں کے گلے لگ گیا......ماں نے دعائیں دیں۔

''بھئی ہمارا نمبر تو بعد میں آتا ہے ہر کوئی جنت کی طرف بھاگتا ہے۔'' حمید صاحب مسکراتے ہوئے عائشہ بیگم کی طرف اشارہ کر کے بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

''ارے نہیں بابا جان آپ بھی کمال کرتے ہیں

اُدھر جنت ہے تو یہاں دروازہ ہے جنت کا...... بھئی یہاں سے گزریں گے تو جنت میں داخل ہوں گے ناں......؟'' اور دونوں باپ، بیٹا ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس پڑے۔

☆☆☆

دوپہر کے دو بجے باہر بائیک رکنے کی آواز آئی۔

''میرا خیال ہے نائلہ آگئی ہے۔'' وقار باہر کی طرف لپکا۔

''السلام علیکم......!'' دروازہ کھول کر اس نے عامر کو گلے سے لگایا پھر نیلی کو ساتھ لگا کر پیار کیا...... بھائی سے مل کر وہ باپ کی طرف دوڑ کر لپٹ گئی اور بہت دیر تک سینے سے لگی رہی۔ بابا نے ماتھا چوم لیا۔

''تمہاری ماں بہت اداس ہے۔'' انہوں نے نیلی کو ماں کی طرف متوجہ کر کے عامر کو گلے لگالیا۔

نیلی بہت دیر تک ماں سے لپٹی رہی...... یوں جیسے کوئی پیاسا مسافر کنواں دیکھ کر اس کی منڈیر سے اپنے ہونٹ تر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بہت سی ساعتیں بیت گئیں ماں، بیٹی کی سانسیں بڑی خاموشی سے ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہی تھیں۔

''آجاؤ بیٹا یہاں ڈرائنگ روم میں آرام سے سب بیٹھتے ہیں۔'' بابا جان نیلی کو ساتھ لگائے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔

''السلام علیکم عامر بھائی کیسے ہیں آپ......؟'' کشف کچن سے تیزی سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی اور نندوئی کو سلام کرتی ہوئی نائلہ سے لپٹ گئی۔

''نائلہ میری جان ہم لوگ تو بہت اداس تھے، بھئی تم نے تو سسرال میں خوب دل لگایا کہ ہماری یاد ہی نہیں آئی۔''

''نہیں بھابی جان ایسی بات نہیں ہے۔'' پھر اس نے ایک دم عامر کی طرف دیکھا اور بات گول کر گئی۔

''ارے بھابی، مجھے بھوک لگی ہے کیا بنا رہی ہیں؟''

''جو تم پسند کرو وہی تیار ملے گا...... بس تم کچن میں مت آنا گرمی ہے۔'' کشف نے اسے امی جان کے ساتھ بٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔

صغراں کولڈ ڈرنک اور ٹرے میں گلاس سجائے اندر آئی۔ عامر اور نائلہ کے سر پر پیار بھرا ہاتھ پھیرا اور بوتلیں کھول کر گلاسوں میں ڈالنے لگی۔

''عامر بیٹا تم بھی کچھ بولو، گھر والے کیسے ہیں تمہاری امی جان کا کیا حال ہے؟ ہم نے تو آپ کی ساری فیملی کو کھانے پر بلایا تھا؟'' عائشہ بیگم بولیں۔

''آنٹی آپ کو پتا ہے کہ امی جان تو کہیں آتی جاتی نہیں ہیں، بھابی کے بغیر گھر نہیں چلتا اس لیے ہم دونوں آگئے ہیں۔'' عامر کے ماتھے پر بل دیکھ کر کسی نے مزید کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا...... وقار اپنی جگہ سے اٹھ کر عامر کے پاس آبیٹھا اور اسے باتوں میں لگایا، وہ اس کی سنجیدگی محسوس کر رہا تھا۔ ٹیبل پر کھانا چن دیا گیا۔ نائلہ، عامر اور امی کے درمیان والی کرسی پر بیٹھ گئی اور عامر کے لیے پلیٹ میں کھانا نکالنے لگی۔

سب نے خاموش نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عامر کے تلخ مزاج کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

☆☆☆

کھانا ختم ہوگیا تو سب دوبارہ صوفوں پر آبیٹھے۔

عامر نے بازو پر بندھی گھڑی کو دیکھا۔

''ہمیں تین گھنٹے ہو چکے ہیں، گھر میں بھی ملنے والوں کا آنا جانا لگا ہوا ہے، امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔''

''ارے بھئی اب اتنی بھی کیا جلدی ہے بیٹا...... آپ گھر میں تو بتا کر آئے ہیں ناں...... نیلی بہت دنوں بعد آئی ہے اس کی ماں اداس ہے تھوڑی دیر ماں کے پاس تو گزارے۔''

''چلیں پھر ٹھیک ہے، میں چلا جاتا ہوں اسے آپ رکھ لیں جب آنا چاہے گی وقار بھائی چھوڑ آئیں گے...... دراصل میرے بہت کام ہیں تیاری کرنی ہے، پیکنگ ابھی رہتی ہے لہٰذا میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' عامر بڑے روکھے پن سے بولا۔

''نہیں بابا جان، واقعی دیر ہو رہی ہے، میں پھر کبھی آؤں گی عامر کی ابھی کافی تیاری کرنے والی ہے۔'' نائلہ نے التجائیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

''آپ سے گزارش ہے چاچا جی میں تو پرسوں چلا جاؤں گا۔ نائلہ کو روز، روز نہ بلاتے رہیے گا، اس کا دل لگنے دیں اپنے گھر میں، ویسے بھی ابو، امی اب بوڑھے ہو چکے ہیں، ہمارا فرض ہے ان کی خدمت کریں' بھابی جان کو تو گھر کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ چار بچے بھی سنبھالتی ہیں، اس لیے امی، ابو کے پاس نائلہ کا ہمہ وقت ہونا ضروری ہے۔'' اس نے ساری بات ختم کر دی۔

عائشہ بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ملک صاحب کو مزید بولنے سے منع کر دیا۔ نائلہ کی آنکھیں برسنے کو بے تاب تھیں، وہ جلدی سے اٹھی اور واش روم میں گھس گئی۔ آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے، آنکھیں دوپٹے کے پلو سے خشک کیں اور باہر نکل آئی۔

''عامر صاحب ایک کپ چائے ہو جائے؟'' وقار نے مؤدبانہ گزارش کی۔

''نہیں وقار بھائی اگلی دفعہ سہی، آج ٹائم نہیں ہے۔'' اور یوں نائلہ اس گرمی کے موسم میں ہوا کے خوشگوار جھونکے کی طرح آئی اور چلی بھی گئی۔ عائشہ بیگم کی آنکھیں بھیگتی رہ گئیں کشف نے پاس بیٹھ کر اپنے پلو سے امی کی آنکھیں یہ کہہ کر صاف کیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔

☆☆☆

نائلہ خاموش تھی۔ اپنی فیملی سے مل کر اتنی جلدی بچھڑ جانے کا دکھ تھا یا عامر کو پا کر بھی نہ پانے کا دکھ......

''یہ تمہارا موڈ خراب ہے کہ میں تمہیں وہاں سے جلدی لے آیا۔ میں نے تو کہا تھا کہ تم شام تک رک جاؤ۔ وقار کے ساتھ آ جانا۔''

''یہ آپ سے کس نے کہا کہ میرا موڈ خراب ہے؟'' نائلہ نے اٹیچی میں اس کی بنیانیں اور جرابوں کے جوڑے رکھتے ہوئے کہا...... ''اور آپ نہیں جانتے کہ آپ جا رہے ہیں اور میں اس لیے اداس ہوں؟''

''یہ سب ڈھکوسلے ہیں، عورتوں کے...... کوئی کسی کے لیے اداس نہیں ہوتا سوائے والدین کے...... جیسے تم اپنے والدین کو لپٹ لپٹ کر مل رہی تھیں۔''

''تو پھر اس گھر میں، میں کس حیثیت سے ہوں؟''

''جتنی ایک بہو کی حیثیت ہوتی ہے، تم نے دیکھا نہیں بھابی جان کس طرح کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہیں، بھائی جان کو اٹلی گئے تین سال ہو گئے ہیں، کبھی بھابی کی زبان پر شکوہ سنا؟ ابا جان کی مرضی کے بغیر تو وہ گھر سے قدم نہیں نکالتیں۔ تم نے بھی بھابی جان کو کاپی کرنا ہے، یہ آئے دن امی، امی کی گردان نہ کرتی رہنا۔'' یہ اتنا لمبا لیکچر سن کر نیلی کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنسو اندر ہی اندر پیتی گئی۔

اگلے دن اسے صبح گیارہ بجے گھر سے لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ شام پانچ بجے کی فلائٹ تھی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ اور عامر ابھی تک اپنے ابو، امی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دو بج کر تیس منٹ پر وہ کمرے میں آیا۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو، بھئی یہ نہ ہو کہ صبح تمہاری آنکھ نہ کھلے اور میری تیاری دھری کی دھری رہ جائے۔''

''صبح اگر میں نہ اٹھی تو آپ نے کون سا تردد کرنا ہے، میں جانتی ہوں آپ اپنا اٹیچی کیس اٹھائیں گے اور دوستوں کے ساتھ لاہور چل دیں گے آپ نے تو کبھی یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ آپ کی زندگی میں میری بھی کوئی وقعت ہے؟'' اس نے دکھی لہجے میں کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہوئی ہے، تم میری بیوی ہو خوب صورت ہو لیکن برا نہ ماننا نائلہ بیگم میں خوب صورت عورتوں کو پسند تو کرتا ہوں' اعتبار نہیں کرتا۔ اب تمہیں چھوڑ کر جاؤں گا تو ہر وقت دھیان پیچھے ہی رہے گا کہ تم کہیں کوئی گل نہ کھلا دو......'' وہ عجیب سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

## معما ھے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا

سودا سلف لانا عورت کی ذمے داری نہیں ہوتی بلکہ پٹھانوں میں تو باہر کا کام مردوں کا اور گھر کے اندر کا کام عورتوں کا ہوتا ہے۔ خیر...... آج کل تو حالات بدل گئے ہیں، آج کی عورت کے لیے ماحول بہت سازگار ہو گیا ہے...... وہ دھڑلے سے جاب کرتی ہے جبکہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ میں کل کی عورت کی بات کر رہی ہوں کیونکہ میں کل کی عورت ہوں، میری شادی ہوئی تو میرے میاں آفس جاتے اور انہیں گھر کے کاموں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نوکر سودا لینے جاتا تو ایک چیز لاتا چار چیزیں بھول جاتا بھی مجھے قیمتیں زیادہ لگتیں...... خیر تنگ آ کر میں نے سب کچھ اپنے ذمے لے لیا...... سودا سلف لانا اور دوسرے چھوٹے، موٹے کام بھی اپنے ذمے لے لیے۔ آہستہ، آہستہ گھر کے سارے کام میرے کندھوں پر ہی آ گئے جن میں گھر کی خراب چیزوں کو ٹھیک کرنا بھی ہوتا تھا یعنی کاریگروں کے پاس جانا، انہیں گھر بلا کر لانا بھی میری ذمے داری بن چکی تھی۔ میرے میاں واپڈا کے محکمے میں چیف انجینئر تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ بیوی تو اچھی طرح سے سب کچھ سنبھال رہی ہے تو مزید پیچھے ہٹ گئے اور آج تک پیچھے ہٹے ہوئے ہیں، کئی سال پہلے ہمارا اے سی خراب ہوا تھا میں نے پوچھ تاچھ کر کے ایک اچھا کاریگر ڈھونڈا، اسے اپنا ایڈریس دیا، وہ گھر آیا...... باہر بورڈ لگا دیکھا تو پوچھنے لگا...... باجی آپ کے میاں واپڈا میں ہوتے ہیں؟ میں نے اثبات میں سر ہلایا...... اس نے بڑے دل سے ہمارا کام کیا جب میں نے اسے معاوضہ دینا چاہا تو اس نے صفا چٹ انکار کر دیا۔ میں پریشان ہو گئی...... اب میں اصرار کروں اور وہ انکار کرتا رہا۔ خیر میں نے بصد اصرار اسے رقم کی ادائیگی کی...... اسے کوئی کام ہوتا تو میں اپنے میاں سے سفارش کرا کر اس کے چھوٹے، موٹے کام بھی کر دیا کرتی اور پھر تو وہ ہمارا خاندانی بندہ بن گیا یعنی فریج خراب ہوتا، ٹی وی خراب ہوتا یا پانی کی مشین خراب ہوتی...... ایک فون پر وہ اپنا بندہ بھیج دیتا...... اور معاوضہ نہ ہونے کے برابر لیتا اور کام تسلی بخش کر لیتا...... میں اکثر اس کی تعریف کرتی، ورکرز بھی اس کے پاس بے شمار تھے جو ہر طرح کا کام جانتے تھے...... اس کے

حسنہ سلسل

"خدا کے لیے عامر...... میرے لیے آپ کے پاس کوئی اچھا جملہ نہیں جو آپ ہر وقت تیر برساتے رہتے ہیں، آخر میں نے کیا بگاڑا ہے آپ کا جو آپ پردیس جاتے ہوئے اس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔" نیلی رو دینے والے انداز میں بولی۔

"پردیس کون سا پہلی مرتبہ جا رہا ہوں، بیوی کو البتہ پہلی بار چھوڑ کر جا رہا ہوں...... تم سے گزارش ہے کہ اپنا دھیان رکھنا...... میری عزت کا خیال رکھنا۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہے کہ عامر امام بڑی عزت والا بندہ ہے، کبھی کسی نے انگلی نہیں اٹھائی اس کی طرف......" اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور ایش ٹرے میں اسے مروڑ کر بجھا دیا۔ نائلہ نے اسے سگریٹ توڑ موڑ کر بجھاتے دیکھا تو ایک عجیب سا خوف آیا۔ رب جانے یہ خوف اس کا وہم تھا یا حقیقت کہ اسے لگا عامر چیزوں کو اسی طرح مروڑ دیتا ہے۔

"میں آپ کا سر دبا دوں، آپ تھک گئے ہوں گے۔" نیلی نے رسانیت سے کہا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں، میں جتنی دیر امی جان کے پاس بیٹھا رہا ہوں وہ اتنی دیر میرا سر سہلاتی رہی ہیں۔ میرا خیال ہے اب تم بھی سو جاؤ، صبح بھابی جان سے پہلے اٹھنے کی کوشش کیا کرو...... وہ بڑی ہیں ہماری ماں کا درجہ رکھتی ہیں، کوشش کیا کرو کہ ان پر گھر کا بوجھ زیادہ نہ پڑے۔ تمہارے اس عمل سے میری ماں اور خدا دونوں خوش ہوں گے۔ چلو اب سو جاؤ......" اس نے ہولے سے اس کے گال کو چھوا اور کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

وہ خاموش بیٹھی دور خلاؤں میں کچھ تلاش کرتی رہی۔ ہلکی نیلی روشنی میں اسے گالوں پر آنسوؤں کی قطاریں موتیوں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ چند منٹوں میں عامر نیند کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا اور وہ بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی اس نے دوپٹے سے آنکھوں سے بہتے پانیوں کو خشک کیا اور

ورکرز معاوضہ لینے میں آنا کانی کرتے اور اکثر صدیق صاحب کا فون آتا...... ناراضی سے کہتا۔ ''باجی، آپ پیسے دے کر مجھے شرمندہ کرتی ہیں، میں ان گدھوں سے کہتا بھی ہوں کہ آپ سے پیسے نہ لیا کریں۔'' وغیرہ...... میں جواب میں کہتی ''تم کام اچھا کر لیتے ہو یہی میرے لیے بہت ہے۔''

وقت گزرتا گیا...... چھوٹے موٹے کام اس کے بھی پیش آتے، میرے میاں، میری سفارش پر اس کے کام کر دیا کرتے۔ پھر میاں کی ریٹائرمنٹ ہو گئی...... اب کے گرمیاں آئیں تو اے سی چیک کیا...... صحیح طرح کولنگ نہیں کر رہا تھا...... اس نے کام ختم کیا تو میں نے اسے پیسے دیے...... پیسے دیکھ کر وہ بولا۔ ''یہ پیسے کم ہیں باجی۔'' میں حیران رہ گئی۔ پہلے تو پیسے لیتے وقت اس کے ورکرز انکار کرتے لیکن آج؟ میں نے انہیں بتایا کہ ''اپنے استاد سے بات کر لو میں اتنے ہی پیسے دیتی ہوں۔'' خیر فون ملایا گیا تو صدیق بولا۔

''باجی مہنگائی بہت ہو گئی ہے، اب کہاں پورا پڑتا ہے اور ابھی چند دن پہلے میں آفس گیا تھا معلوم ہوا صاحب تو ریٹائر ہو گئے ہیں، وہ مجھے تھوڑا سا کام تھا ان سے پر......''

''صدیق۔'' میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''میں پیسوں کی بات کر رہی ہوں تمہارا بندہ بہت زیادہ پیسے مانگ رہا ہے...... ان سے کہہ دو کہ پیسے تو میں دیتی ہوں لیکن اتنی زیادتی بھی ٹھیک نہیں۔ اے سی میں بہت تھوڑا مسئلہ تھا جو جلد ہی ٹھیک ہو گیا۔''

''وہ جی...... پیسے تو آپ کو اتنے ہی دینے ہوں گے۔ جتنا ورکرز ڈیمانڈ کر رہا ہے اور...... ویسے بھی صاحب تو ریٹائر ہو گئے ہیں۔''

فون میرے ہاتھ میں لہرا کر رہ گیا...... صاحب کی ریٹائرمنٹ اور صدیق کا معاوضہ......؟ دونوں کے درمیان بھلا کیا تعلق ہے؟ وہ یار، یار صاحب کی ریٹائرمنٹ کا ذکر کیوں کر رہا تھا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کیا آپ کی سمجھ میں آ رہا ہے؟

(شمیم فضل خالق...... پشاور)

---

آنکھیں میچ کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

بہت کوشش کے باوجود آنکھوں میں نیند نہیں اتری بلکہ دور بہت دور کچھ تصویریں سی ابھرتی ڈوبتی نظر آئیں۔ وہی شادی والا گھر...... بڑے ہال میں قالین پر بیٹھی لڑکیاں، وہی سامنے اسٹیج پر بیٹھی شوخ اور چنچل سی ریحانہ اپنے بھائی کے کندھے سے کندھا ملائے لہک، لہک کر گاتی ہوئی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

گوریے میں جانا پردیس...... یہ کوئی اور نہیں ذاکر اقبال تھا جو ایسا پردیس گیا کہ پھر اس کی خبر تک نہیں ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا اور آج عامر امام پردیس جا رہا تھا۔ اس کی دنیا سے دور جا رہا تھا۔

ذاکر اقبال نے جدا ہونے سے پہلے خوب صورت جملے بول دیے تھے۔

لیکن عامر امام شکوک و شبہات کے بیج بو کر جا رہا تھا۔ آنے والا وقت نہ جانے کیسا ہو۔

ذاکر اقبال نے اپنے اسٹائل میں اظہارِ محبت کر دیا تھا۔ صرف چند جملوں سے اس نے ایک معصوم سی لڑکی کے دل میں چاہتوں کی خوشبو چھڑک دی تھی اور اس نادان لڑکی نے چاہتوں کی اس خوشبو کو دل کے نہاں خانوں میں ہمیشہ کے لیے بند کر لیا تھا۔ لیکن وہ اس کا نصیب نہ بن سکا تھا۔ اس میں قصور کسی کا بھی نہیں تھا۔

قصور ان رسم و رواج کا تھا، ان روایتوں کا تھا، جن کا پابند ہونا پڑتا ہے، یہ اس دور کی باتیں ہیں جن میں لوگ رشتہ طے کرنے کے لیے ذات برادری کا بھرم رکھتے تھے، خاندان اور برادری الگ، الگ ہوں تو محبتیں صرف دلوں میں مقید رہ جاتی تھیں...... کسی کو حدود پھلانگنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

ذاکر اقبال کی بہن نے بھائی کی محبت میں ان روایتوں کو کراس کر لینے کا اظہار کیا تھا لیکن حمید صاحب اور عائشہ بیگم نے اپنی برادری کی حدود و قیود کو کراس

کرنے کا سوچنا بھی گناہ کے مترادف سمجھا اور اس طرح وہ دونوں انتہائی شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی محبتوں کو دل کے نرم گوشوں میں محفوظ کر کے اپنے، اپنے راستے پر چل دیے تھے۔ ذاکر اقبال اپنی منزل کی طرف پہنچا تو اس نے مڑ کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا لیکن نائلہ حمید اپنی منزل پر پہنچ کر بھی دور تک کانٹوں بھری روش دیکھ رہی تھی۔ یہی راستہ اس کا مقدر ہے' اسی کانٹوں بھری روش پر اسے چلتے رہنا ہے' پاؤں چھلنی ہوتے ہیں تو بھلے ہوں۔ اسے اپنے آپ کو ایک فرماں بردار بیٹی اور ایک باعزت بیوی ثابت کرنا ہے۔

وہ رات بھر انہی بھول بھلیوں میں بھٹکتی رہی، آنکھیں ساون بھادوں برساتی رہیں۔

☆☆☆

عامر نے دبئی پہنچ کر اپنی والدہ کو فون کیا۔

''شکر ہے بیٹا تو خیریت سے پہنچ گیا۔ میں تو سارا دن اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتی رہی ہوں۔'' ماں خوشی سے دیوانی ہو رہی تھیں۔

''جی ماں جی' یہ آپ کی دعائیں ہی تو ہیں جو میں ہر مقصد میں کامیاب ہوتا ہوں، گھر میں سب کیسے ہیں؟ ابا جان کیسے ہیں؟ بھابی کا کیا حال ہے؟ میں نیلی سے کہہ کر آیا ہوں کہ بھابی جان کا بھی خیال رکھے۔ ہماری بھابی بھی ہماری ماں کی ہی طرح ہیں۔'' ماں، بیٹا تبادلۂ خیالات کرتے رہے اور پھر فون بند ہو گیا۔

نائلہ حیران و پریشان کپڑے پریس کرتی رہی..... کیا عامر کا رشتہ صرف اپنے ماں، باپ سے ہے تو میری جگہ کہاں ہے آخر؟ میں یہاں کس لیے لائی گئی ہوں؟''

''امی جان عامر کا فون تھا؟'' نائلہ نے ڈرتے، ڈرتے سوال کیا۔

''ہاں خیر سے پہنچ گیا ہے سب کو سلام کہہ رہا تھا۔'' امی نے بس اتنا جواب دینا مناسب سمجھا۔ نیلی نے اس سے آگے کچھ بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

☆☆☆

اگلے روز فجر کی نماز کے لیے اٹھی تو بستر سے اٹھنا محال نظر آیا آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور صوفے پر گر گئی۔ نہ جانے کب تک پڑی رہتی' بھابی جان نے دروازے پر دستک دی اور اندر آ گئیں۔

''نیلی، نیلی، کہاں ہو آج اٹھنے کو دل نہیں کر رہا؟'' اور ایک دم شاک لگا...... ''ارے یہ کیا ہوا ہے تمہیں۔'' انہوں نے فوراً اس کے ماتھے کو چھوا۔ بہت تیز بخار تھا بھابی نے فوراً اپنے بیٹے ارسل کو آواز دی۔

''بیٹا جلدی آؤ' دیکھو نیلی چاچی کو کیا ہوا ہے۔''

ارسل بھاگتا ہوا اندر آیا ماں، بیٹے نے مل کر اسے بیڈ پر لٹایا اور ارسل سامنے رہنے والی لیڈی ڈاکٹر کو بلانے دوڑا۔ اس نے آ کر چیک کیا۔

''ماشاء اللہ امید سے ہیں' ان کا بہت خیال رکھیں بے حد کمزوری ہے، میں کچھ دوائیں لکھ دیتی ہوں باقاعدگی سے دیتے رہیں اور زیادہ سے زیادہ آرام کرنے دیں۔'' اور کچھ دیر میں ارسل قریبی اسٹور سے دوا لے آیا۔ بھابی نے جلدی سے اسے ناشتا لا کر دیا اور دوا دے کر اسے آرام سے لیٹنے کو کہا اور خود کمرے سے باہر آ گئیں۔

''مبارک ہو امی جان، عامر باپ بننے والا ہے۔'' بھابی جان نے امی کے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ماشاء اللہ، ماشاء اللہ ...... اللہ خیر کرے خیر مبارک بہو، اللہ نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔'' اس خبر سے گھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ امام صاحب نے فوراً عامر کا نمبر ملایا اور بیٹے کو مبارک باد دینے لگے۔

کچھ دیر بعد نائلہ کے فون کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو...... جی......''

''بھئی ہم یہ کیا سن رہے ہیں کہ ہم باپ بننے والے ہیں تم نے ہمارے یہاں پہنچتے ہی بڑا اچھا میسج دیا ہے، چلو تمہیں شکریہ کہہ دیتے ہیں۔'' وہ حسبِ عادت بڑا روکھا سا بولنے لگا۔

''دیکھو نیلی، تمہیں اپنا بہت خیال رکھنا ہوگا، تم

ماں بننے جارہی ہو اس کنڈیشن میں زیادہ آنا جانا، بھاگ دوڑ مناسب نہیں ہوتی۔ یہ نہ ہو آئے دن امی جان کے لیے اداس ہو کر دوڑ لگادو، جسے تم سے ملنا ہوگا خود آکر مل لے گا ویسے کوئی کسی کے لیے اداس نہیں ہوتا۔ سب سیر سپاٹے کے بہانے ہوتے ہیں۔ بہر کیف تمہیں میری امانت کو سنبھالنا ہوگا اس کے لیے چاہے تمہیں نو ماہ تک اسی کمرے میں بند رہنا پڑے سمجھیں بس اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔''

فون بند ہو گیا نیلی ہاتھ میں لیے ریسیور کو گھورتی رہ گئی۔ آنسوؤں کی دو لمبی قطاریں رفتہ، رفتہ اس کے دامن کو بھگو رہی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا کیا قصور ہے؟

''اٹھو نائلہ باہر چل کر بیٹھو۔'' بھابی نے اندر جھانکا اور ششدر رہ گئیں۔ ''یہ کیا؟ بھئی خوشی کے اس موقع پر اتنے ڈھیر سارے آنسو......؟ چندا اس حالت میں روتے نہیں ہیں، بچے پر برا اثر پڑتا ہے۔'' بھابی نے اسے گلے سے لگالیا اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ بھابی نے اسے بہت سا پیار کیا۔

''چلو پہلے منہ دھو کر آؤ اور آنسو صاف کرو پھر باہر لے کر جاؤں گی۔'' اس نے باتھ روم میں جا کر آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے......سرخ ہوتے چہرے کو منی ٹاول سے تھپتھپایا اور بھابی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بیڈ پر بٹھالیا۔

''بھابی جان ایک بات آپ کو سچ، سچ بتانا ہوگی آپ نہیں بتائیں گی تو میں اس کمرے سے کبھی باہر نہیں نکلوں گی۔'' اس نے بڑی بے بسی سے التجا کی۔

''بولو تمہیں کیا الجھن ہے؟'' بھابی نے اس کی پیشانی پر آئے بال بڑی محبت سے ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''بھابی یہ بتائیں کہ مجھ سے پہلے عامر کی زندگی میں کون تھا؟''

''یہ تم کیا بک رہی ہو، ایسا کچھ بھی نہیں تھا؟'' بھابی نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ میں عامر کی زندگی میں موجود ہوں لیکن کہیں بھی فٹ نہیں ہو پا رہی۔ میری جگہ آخر کہاں ہے یا میں آخر کس کی جگہ پر آگئی ہوں بھابی؟'' چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

''بتائیں ناں بھابی جان......'' اس نے بھابی کو دونوں کندھوں سے تھام کر جھنجوڑا۔

''نائلہ میری جان اس دنیا میں ہر انسان کہیں نہ کہیں ان فٹ ہے، یہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوا۔ عامر کے بھی دل پر بڑا گہرا زخم آیا ہوا ہے، وہ تو شادی پر تیار ہی نہیں تھا۔ ہم نے زبردستی اسے منایا کہ شاید زندگی میں کسی کے شامل ہونے سے وہ سنبھل جائے اور اپنی زندگی ہنسی خوشی جینے لگے۔'' بھابی روہانسی سی ہو کر بولیں۔

''ایسا کیا چھن گیا عامر سے بھابی جان جس کی سزا مجھے مل رہی ہے۔'' وہ بڑی بے چین تھی۔

''دراصل عامر جس لڑکی کو یونیورسٹی میں پسند کرتا تھا وہ ہمارے ہی گھر میں عاشر سے بیاہ کر آگئی، عامر بالکل بکھر کر رہ گیا۔ مونا جانتی تھی کہ عامر اسے پسند کرتا ہے لیکن دونوں کے درمیان بھی اظہارِ محبت جیسے ڈائیلاگ نہیں چلے تھے۔ عاشر کا رشتہ کسی آنٹی نے کروایا تھا جو عامر کی امی جان کی دوست تھیں اور مونا کو کسی شادی کی تقریب میں دیکھا اور اس کی والدہ سے فوراً رابطہ نمبر لے لیا۔ اور اس طرح یہ رشتہ چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ عامر کو اس وقت پتا چلا جب عاشر بھائی کی دلہن گھر میں آگئی اس بیچارے پر بجلی گر پڑی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے کسی دوست کے ذریعے دبئی میں بڑی اچھی جاب مل گئی۔ وہ ویزے کی بھاگ دوڑ میں تھا اس کا خیال تھا کہ دبئی جانے سے پہلے امی کو بتادے گا کہ اس کی پسند کون ہے؟ لیکن اسے اس کا موقع ہی نہ ملا اور وہ آنٹی بیچ میں ٹپک پڑیں اور مونا کو عاشر کا بنادیا۔ یہ سب قدرت کے کھیل ہیں، یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان جو پسند کرے اسے وہی مل بھی جائے۔''

بھابی کے الفاظ ختم ہوتے ہی نائلہ کو بہت پیچھے جیسے دھند کے پار اسے کچھ ہلکا سا نظر آیا۔
''تیری آنکھ کے آنسو پی جاؤں ایسی میری تقدیر کہاں؟''
ذاکر اقبال اسے دھند کے اس پار بھی اپنے گیتوں سمیت نظر آیا۔
''بھابی ٹھیک کہتی ہیں ہر انسان اپنی زندگی کے خانوں میں کہیں نہ کہیں ان فٹ ہے۔ میں بھی تو ان فٹ ہوں اور شاید ذاکر بھی......''
''تم چپ کیوں ہو نیلی...... دل چھوٹا مت کرو انشاء اللہ عامر تمہاری محبت اور اپنا بچہ پا کر سب بھول جائے گا...... تمہیں بہت خوشیاں ملیں گی انشاء اللہ۔'' نیلی کی آنکھوں میں اداسیوں نے ڈیرے ڈال لیے تھے۔
بھابی جان اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھیں۔ واقعی عامر سچ کہتے تھے کہ بھابی جان ہماری ماں جیسا درجہ رکھتی ہیں۔ اب نائلہ کو پتا چلا کہ عاشر بھائی اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ کیوں سیٹ ہیں۔

☆☆☆

''حمید منزل'' میں جب یہ خبر پہنچی کہ ملک صاحب نانا بننے والے ہیں تو خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کشف اور وقار بھی مامی، ماما بننے کی خبر سن کر خوش ہو گئے اور عائشہ بیگم کے پاس بیٹھ کر مستقبل کے منصوبے بنانے لگے۔ عائشہ بیگم کو تو بیٹی سے ملنے کا بہانہ میسر آ گیا۔
''ملک صاحب آج آپ آفس سے چھٹی کرلیں۔ حیدر بھائی جو موجود ہیں دیکھ لیں گے سب۔ آپ مارکیٹ جائیں اور نیلی کے لیے کچھ ضروری چیزیں خرید لائیے میری بچی بہت کمزور ہے کچھ منہ میں جائے گا تو وجود میں طاقت پیدا ہوگی۔'' عائشہ بیگم کے چہرے پر ممتا بکھر گئی۔
''جی بیگم صاحبہ جیسے آپ کا حکم، آپ تیاری پکڑیں ہم یوں گئے اور یوں آئے۔'' حمید صاحب بولے۔
''امی جان آپ آج ہو آئیں ہم دونوں کل تھوڑی سی شاپنگ کر کے جائیں گے۔'' وقار نے چائے کا خالی کپ کشف کو پکڑاتے ہوئے کہا۔
کشف نے شہلا باجی کو بھی فون کر کے بتایا کہ وہ خالہ بننے والی ہیں اور اسریٰ بھی جلد آپا بن جائے گی۔ شہلا کی بیٹی اسریٰ گیارہ مہینے کی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں بیٹی کے گھر داخل ہوئے تو سامنے ہی نائلہ نظر آ گئی جوں ہی اس نے باہر کی طرف دیکھا تو دوڑ لگا دی اور ماں سے لپٹ گئی اور بہت دیر تک سانسیں روکے سینے سے لگی رہی۔ عائشہ بیگم نے چہرہ سامنے کیا تو آنسوؤں سے تر تھا۔
''نہ بیٹے نہ، یہ رونے کا وقت نہیں یہ تو اپنے رب کا شکر ادا کرنے کا وقت ہے۔'' ماں نے بیٹی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر چوم لیا اپنے آنچل سے اس کے آنسو صاف کیے...... عائشہ بیگم کا دل دھک، دھک کرنے لگا۔ نیلی اتنا کس لیے روئی ہے ماں کے لیے زندگی کا سب سے تکلیف دہ لمحہ وہی ہوتا ہے جب اولاد کی آنکھ سے آنسو گرتا ہے۔ انہوں نے بیٹی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے......
''ارے بھئی آسمان سے اتری ہوئی ننھی پری کچھ محبتیں ہماری جھولی میں بھی آپ کے لیے بھری ہیں ہمیں بھی موقع دیجیے۔'' حمید صاحب نے بانہیں پھیلا کر کہا تو نائلہ بے اختیار باپ کے سینے سے لپٹ گئی اور دیر تک اسی کندھے سے سر ٹکائے رکھا جس کندھے سے لگ کر وہ جھوٹ موٹ سوتی بن جایا کرتی تھی۔
''بھئی اب سوتی نہ بن جانا' اب تو ہم تمہیں بازوؤں میں نہیں اٹھا سکیں گے تم جانتی ہو تم بڑی ہو گئی ہو اور ہم بوڑھے۔'' انہوں نے خود سے الگ کر کے بیٹی کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔
اتنے میں صفیہ بیگم دوسرے دروازے سے اندر کمرے میں داخل ہوئیں۔
''آیئے، آیئے، بھئی آج تو بڑا اچھا دن چڑھا ہے ہماری سمدھن صاحبہ تشریف لائی ہیں۔'' انہوں نے عائشہ بیگم سے گلے ملتے ہوئے مصنوعی محبت کا اظہار کیا۔

''نہیں صفیہ آپا، میں آپ کی سمدھن نہیں بہن کہلانا پسند کرتی ہوں آپ میری بڑی بہن ہیں اور میرے دل میں بڑا احترام ہے آپ کے لیے۔'' عائشہ بیگم پس پردہ اپنی بیٹی کو سپورٹ کر رہی تھیں۔

''چلو عائشہ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ آپ دل میں ہمارے لیے احترام و محبت کا جذبہ رکھتی ہیں...... سلام بھائی صاحب آپ کیسے ہیں؟'' وہ اب حمید صاحب سے مخاطب تھیں۔

''آپ کی دعائیں ہیں صفیہ بہن......'' حمید صاحب بولے۔

بڑی بہو ثروت بیگم کمرے میں داخل ہوئیں اور بڑی محبت سے ملیں اور ہولے سے عائشہ آنٹی کو نانی بننے کی مبارک باد دی۔

''بھئی صفیہ آپ کو سب سے پہلے مبارک باد اور ثروت تمہیں بھی مبارک ہو اللہ پاک خیر کا وقت لائے۔'' اتنے میں رانی چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور سلام دعا کے بعد چائے اور دیگر لوازمات سرو کرنے لگی۔

ہنسی خوشی سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ نائلہ بھی والدین کی موجودگی میں بڑا سکون محسوس کر رہی تھی۔

اچانک سامنے دیوار پر لگے کلاک نے ٹن، ٹن، ٹن، ٹن کی آواز لگا کر خوش گپیوں میں مصروف لوگوں کو متوجہ کیا۔

''میرا خیال ہے عائشہ بیگم اب چلنا چاہیے بہت ٹائم ہوگیا ہے۔'' حمید صاحب بولے۔

''نہیں بھائی صاحب، یہ کیسے ہوسکتا ہے رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔'' صفیہ بیگم نے فارمیلٹی نبھائی۔

''پھر کبھی کھانا کھالیں گے ہمارا اپنا گھر ہے اور ہم کون سا دور سے آئے ہیں۔'' وہ بولے اور یوں باتوں باتوں میں چلنے کی تیاری ہوگئی۔ نیلی کا چہرہ اداس ہوگیا۔

''صفیہ آپا چند دن بعد نیلی کو ایک ہفتے کے لیے ہماری طرف بھیج دیجیے گا بلکہ فون کر دیجیے گا وقار آ کر لے جائے گا۔ عامر کے جانے سے اداس سی ہے۔ ذرا دل بہل جائے گا۔ جب سے شادی ہوئی ہے ہماری طرف رہنے نہیں آئی۔'' انہوں نے بڑی لجاجت سے کہا۔

''عائشہ بیگم بیٹیاں اپنے گھر میں خوش ہوں تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔'' نائلہ نے ایک دم ماں کا چہرہ دیکھا۔ اداسی کی ایک لہر سی چہرے پر سے گزر گئی۔

''امی جان میں خود فون کر دوں گی جب آنا ہوگا آپ فکر نہ کریں۔'' نیلی بڑی خوب صورتی سے بات بنا گئی تھی۔

☆☆☆

بارش کی بوندیں تسلسل سے اِک ہی راگ الاپ رہی تھیں۔ کبھی کبھی بجلی چمکنے اور کڑ کنے کی آواز سے دل ہولنے لگتا۔ سب کو ناشتا کروا کے وہ اپنا چائے کا مگ ہاتھ میں لیے اپنے کمرے میں آگئی گھر کے کام کے لیے ملازمہ رانی موجود تھی جو مستقل اسی گھر میں ایک کمرے میں رہتی تھی، آگے پیچھے کسی کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی تھی۔ بڑی ایمانداری اور شرافت سے اس گھر میں رہتے ہوئے اسے چھ سال کا عرصہ ہوگیا تھا۔ بہت کم بات کرتی تھی لب پر کبھی کوئی شکوہ نہیں لاتی تھی۔ نہ ہی کسی کی بات کرتی تھی۔ نائلہ چائے کا مگ لیے اپنے کمرے میں داخل ہوئی مگ سائڈ ٹیبل پر رکھا اور کھڑکی سے پردے ہٹا دیے۔

بڑا اداس کر دینے والا منظر تھا۔ موسلا دھار بارش نے موسم کو نیم تاریک کر دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دن کے دس بجے ہی مغرب کا سماں ہو رہا تھا۔ نائلہ کے کمرے کی کھڑکی باہر لان میں کھلتی تھی۔ گلاب اور موتیا کی خوشبو بھینی بھینی بڑی مسحور کن محسوس ہو رہی تھی۔

اس نے بھاپ اڑاتی چائے کا ایک سپ لیا اور کھڑکی کے باہر سڑک پر نظریں جما دیں۔ سڑک پر اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے کبھی کوئی گاڑی اور کہیں کوئی سر پر چھتری تانے پائنچے اوپر چڑھائے گزرتا نظر آ جاتا۔

کبھی کبھی کوئی سائیکل پر بیٹھا اپنے آپ کو جھٹکنے سے بچانے کی ناکام کوشش کرتا ہوا گزرتا۔

عامر کی طرف سے فون اکثر امی جان کو آتا وہ گھنٹوں فون پر بیٹے سے بات کرتیں، ہفتے میں ایک آدھ بار دو چار منٹ کے لیے نیلی کو بلا کر پاس ہی ریسیور پکڑا دیتیں وہ خیر خیریت پوچھتی اور اللہ حافظ کہہ دیتی۔

امی، ابو کے گھر سے ہفتے میں ایک بار فون آجاتا تھا، اسے کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ شہلا باجی کبھی کبھار ہی فون کرتی تھیں۔

آج وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کررہی تھی، اداسیوں نے ہر طرف ڈیرے جمالیے تھے۔ اس نے دراز کھول کر اپنی وہی پرانی آڈیو کیسٹ نکالی اور ٹیپ ریکارڈر میں لگا کر سوئچ آن کردیا۔

اس بھری دنیا میں کوئی بھی ہمارا نہ ہوا
غیر تو غیر تھے اپنوں کا سہارا نہ ہوا

ذاکر اقبال اپنی مدھ بھری آواز میں اتنے اداس ماحول کو اور بھی سوگوار کررہا تھا۔ یہ آڈیو کیسٹ جو تمام ذاکر کی آواز میں ریکارڈ تھی یہ ریحانہ نے نیلی کو گفٹ کی تھی۔ ریحانہ نے کیسٹ نیلی کو پکڑاتے ہوئے بس اتنا کہا تھا کہ ذاکر بھائی سے مجھے بہت محبت ہے...... نیلی کے سامنے وہ سارا منظر ایک فلم کی طرح چلنے لگا۔ دل اور بھی بے چین ہونے لگا۔ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور الماری کھول کر اس کی دراز میں سے ایک ڈائری نکال لائی۔ ڈائری میں ذاکر کے ہاتھ کا لکھا وہی مڑا تڑا کاغذ جس پر شعر درج تھا۔ سب سے پہلے اس کے ہاتھ آیا۔

پھر وہ مختلف لوگوں کے فون نمبرز میں سے ایک نمبر ڈھونڈنے میں کامیاب ہوگئی۔ رخسانہ شبیر مزنگ، لاہور۔ اس نے فوراً نمبر ڈائل کیا...... بہت دیر تک فون کی بیل بجتی رہی پھر کسی بچے نے فون اٹھا کر ہیلو کہا۔

''ہیلو بیٹا رخسانہ شبیر سے بات ہوسکتی ہے؟''

''جی آپ کون ہیں؟'' بچے نے پوچھا۔

''میں آپ کی خالہ نائلہ بات کررہی ہوں ماما کو بتاؤ۔''

''جی اچھا میں ابھی ماما کو بتاتا ہوں۔'' اس نے ریسیور ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ ٹھیک دو منٹ بعد چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ رخسانہ ماؤتھ پیس میں گویا ہوئی۔

''ارے نائلہ کہاں ہو تم...... یار میں نے تمہارا نمبر بہت ڈھونڈا......''

''السلام علیکم رخسانہ، میں نیلی بات کررہی ہوں یار اپنی سانس تو درست کرو کہیں سے بھاگی آرہی ہو؟''

''ہاں بھئی تمہارا نام سنتے ہی استری کو وہیں چھوڑ کر بھاگی، بھاگی آئی ہوں، مجھے فکر تھی کہ کہیں تم پھر سے نہ گم ہوجاؤ۔''

''کیا بتاؤں رخسانہ کون، کون... کہاں، کہاں گم ہوگیا۔ میں تو آج بھی وہی کھڑی ہوں۔''

''ٹھیک کہا تم نے کون کہاں کھوگیا ہے، کس نے کسی کو ڈھونڈنا چاہا لیکن بیکار گیا۔ یار بس جو ایک بار دنیا کی بھیڑ میں کھوگیا وہ واپسی کا راستہ بھول گیا۔'' رخسانہ کا بھی شاید کوئی زخم تازہ ہوا۔

''چلو چھوڑو، تم اپنی سناؤ شبیر بھائی کہاں ہیں، کیسے ہیں، تمہارے بچے کیسے ہیں۔ امی، ابو کا کیا حال ہے؟''

''ابو چلے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر کبھی نہیں آتا۔ امی، بیمار رہتی ہیں، بھائی اپنی بیگمات کے ساتھ خوش ہیں۔'' رخسانہ نے بتایا۔ ''تم نے نیلی شادی کرلی یا آج بھی میاں مجنوں کا انتظار ہے؟''

''کیسا انتظار رخسانہ......؟ انتظار تو اس کا کیا جاتا ہے جس نے اپنے پیچھے کوئی وعدے چھوڑے ہوں وہ تو اپنے قدموں کے نشان تک مٹا گیا۔'' وہ اپنی آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسیاں سمیٹے بولی۔

''تو پھر تمہاری کھوپڑی میں یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ تمہیں شادی کرلینی چاہیے، بیٹیاں اس وقت تک برداشت ہوتی ہیں جب تک والدین زندہ ہوتے ہیں، ان کے بعد بھائیوں اور بھابیوں کے سر پر بوجھ بن جاتی ہیں۔''

''میں نے شادی کرلی ہے۔ رخسانہ جہاں

والدین کا حکم تھا لیکن جس سے شادی کی وہ بھی ادھورا تھا۔ وہ میرے ساتھ ان فٹ ہے اس نے بھی والدین کی آواز پر لبیک کہا اور میرا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال لیا۔" چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"نائلہ تم ٹینشن مت لو بھول جاؤ سب کچھ...... دل کی تختی پر جو لکھا تھا مٹا ڈالو سب صاف کر دو لوگ تو بڑے، بڑے گناہ کر کے بھول جاتے ہیں اور تم نے چند خوب صورت جملوں کے درمیان خود کو قید کر لیا ہے تم سمجھو کہ تم عابدہ باجی کی شادی پر گئی ہی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے تمہارے والدین نے جب صدیقہ باجی سے ذات برادری میں رشتہ کرنے کی روایت کو قائم رکھنے کی مجبوری بتائی تو ذاکر کے دل کو بھی ٹھیس پہنچی ہو اور اس نے واپسی کے سارے راستے بند کر لیے ہوں؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو شاید میں سب بھول جاتی لیکن عامر کمپرومائز پر تیار نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے، وہ جسے چاہتا تھا وہ لڑکی اس کی بھابی بن کر اسی گھر میں آ گئی۔ تم قدرت کے کھیل تو دیکھو......"

"ہاں نیلی یہاں دم مارنے کی کس کی مجال ہے انسان کچھ نہیں کر سکتا، وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہو۔ خیر تم سناؤ شادی کب اور کہاں ہوئی؟"

"شادی تو اپنے ملکوال میں ہی ہوئی ہے۔" عامر دبئی ہوتے ہیں اور تم خیر سے خالہ بننے والی ہو۔" نائلہ نے شرماتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ...... اتنی بڑی خبر تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ مبارک ہو۔"

"بس تم سے ملنے کی خوشی میں یہ خبر سنانی بھول گئی۔ خیر مبارک......" پھر نہ جانے کتنی دیر تک دونوں باتیں کرتی رہیں۔ دوبارہ جلدی فون کرنے کا وعدہ ہوا اور فون بند ہو گیا۔

"یہ اتنی دیر سے تم کمرے میں کیوں بند ہو کر بیٹھ گئی ہو؟" بھابی نے دروازے پر کھٹ کھٹ کی اور اندر آ گئیں۔

"وہ دراصل رخسانہ کا فون تھا بہت مدت بعد اس سے بات ہوئی ہے۔"

"ہاں بھئی دوستی جتنی پرانی ہو اتنی ہی مضبوط ہوتی ہے۔" بھابی نے کہا۔ "چلو آؤ میں نے رانی سے پکوڑے بنانے کا کہا ہے موسم بہت شاندار ہو رہا ہے۔"

نائلہ بھابی کے ساتھ وہ بڑے کمرے میں آ گئی۔ بارش اب پہلے سے ذرا کم ہو گئی تھی۔ نیلی نے شال اپنے اردگرد لپیٹ لی تھی اور بڑے کمرے میں بچھے پلنگ پر بیٹھ کر کمبل اوڑھ لیا۔ سب کے ساتھ وہیں بیٹھ کر پکوڑوں اور گرما گرم کبابوں کے ساتھ انصاف کیا۔

بچے بھی اسکول سے آ گئے اور نیلی کے ساتھ مل کر لطف اندوز ہونے لگے۔ برسات کا دن بڑا پُررونق رہا...... عامر کا فون بھی امی جان کے کمرے میں آیا اس تک صرف سلام پہنچا دیا گیا۔ آج جمعرات کا دن بڑا اداس لگ رہا تھا رات بھر دل عجیب سے وسوسوں میں گھرا رہا تھا...... نیند بھی کوسوں دور رہی۔ نائلہ درود شریف اور آیت الکرسی پڑھ، پڑھ کر دعائیں مانگتی رہی۔ صبح فجر کے بعد اس نے نماز سے فارغ ہو ایک کپ چائے بنائی اور کمرے میں آ گئی۔

اچانک امی جان کے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اللہ خیر، اس کے منہ سے بے اختیار نکلا اور کپ واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

امام صاحب فون پر بات کر رہے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آئی۔ لیکن دل دھڑک رہا تھا۔ فون بند ہوا اور نیلی کے دروازے پر دستک ہوئی۔

"جی بابا جان خیریت......؟"

"خیریت ہے بیٹا، تمہاری والدہ کی طبیعت تھوڑی سی خراب ہے اور تمہیں یاد کر رہی ہیں۔"

"کیا ہوا بابا جان؟" وہ گھبرانے لگی۔

"کچھ خاص نہیں معمولی سا بخار ہے اور لگتا ہے تم سے دل اداس ہے، تم ناشتا کر لو تو پھر میں تمہیں لے چلتا ہوں۔" بابا نے بات ختم کی اور باہر نکل آئے۔ ناشتا کس کو سوجھتا وہ تو بھابی کو بتانے ان کے کمرے میں چلی گئی۔

☆☆☆

گاڑی گھر کے گیٹ تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ نیلی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنے لگا گیٹ دور سے کھلا نظر آیا اور لوگ آجارہے تھے۔

"امی جان یہ گھر میں اتنے لوگ کیونکر آجارہے ہیں؟" وہ گھبرا گئی۔

"بیٹا حوصلہ رکھو اللہ پاک کے کاموں میں کوئی دخل نہیں دے سکتا۔" صفیہ بیگم نے بہو کو ساتھ لگالیا۔ دوسری طرف بھابی اس کی کمر سہلانے لگیں۔ گاڑی پورچ میں جاکر رک گئی۔ نیلی کو کانوں پر یقین نہ آیا۔ گھر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آرہی تھیں، وہ گاڑی سے اتری اور بھاگتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی۔ لاؤنج میں خواتین ایک دوسرے سے گلے مل کر رو رہی تھیں۔ کمرے کے عین وسط میں چار پائی پر عائشہ بیگم ہمیشہ کی نیند سو رہی تھیں۔ نیلی چیخ مار کر ماں کی میت کے پاس گر کر بے ہوش ہوگئی۔ کشف.... روتے ہوئے آکر نیلی کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگی، شہلا بھی بے ہوش نیلی سے لپٹ کر رونے لگی۔ ملازمہ پانی کا گلاس لے کر بھاگتی آئی اور نیلی کے منہ پر چھینٹے مارنے لگی اور انگلیوں کی پوروں سے اس کے منہ میں پانی ڈالنے کی کوشش کرنے لگی اتنے میں وقار کو کسی نے آواز دی، وہ بھاگا، بھاگا آیا اور نیلی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر کمرے میں لے گیا۔ بھابی جان بھی تیز قدموں سے نیلی کے پاس کمرے میں چلی گئیں۔

عجیب روح فرسا سا منظر تھا، رونے کی آوازیں پھر سے آنے لگیں۔ قریبی ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا۔ انہوں نے آکر نائلہ کو چیک کیا۔ اچانک ماں کی موت کا منظر اس سے دیکھا نہ گیا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب نے طاقت کا انجیکشن دیا اور اسے مکمل آرام کا مشورہ دے کر چلے گئے۔ بھابی نے شہلا کو اس کے پاس ہی رہنے کی تاکید کی اور دروازہ بند کر کے پھر لاؤنج میں آگئیں۔

نمازِ عصر کے بعد جنازے کا ٹائم تھا اور اس سے ذرا پہلے صدیقہ بھابی، محسن بھائی اور ذاکر اقبال بھی آن پہنچے۔

صدیقہ بھابی کو عائشہ خالہ سے بہت محبت تھی، وہ لوگ اب یہاں سے بہت دور شفٹ ہوچکے تھے۔ محسن بھائی کو اچانک کہیں سے خبر مل گئی تھی اور اتفاق سے ذاکر بھی ملکوال آیا ہوا تھا۔ کینیڈا روانگی سے پہلے وہ صدیقہ اور بچوں سے ملنے آیا تھا۔ اور یہاں آکر عائشہ خالہ کی وفات کی اطلاع مل گئی اور وہ بہن اور بہنوئی کے ہمراہ عائشہ بیگم کی آخری رسومات میں شامل ہوگیا۔

یادوں کی نہ جانے کتنی لہریں دل میں اٹھیں اور محبوب کا چہرہ دیکھنے کو دل بے چین بھی ہوا لیکن زبان پر تالے لگ چکے تھے اس نے چاہنے کے باوجود بہن سے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا، اس کا خیال تھا نیلی اپنی دنیا میں بہت خوش ہوگی لہٰذا اس کا سامنا کر کے پرانے کسی زخم کو تازہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رخسانہ بھی لاہور سے پہنچ چکی تھی اس نے باہر گیٹ پر ہی ذاکر کو محسن بھائی سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا اس کا دل چاہا کہ بھاگ کر اس کے قریب جاکر اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑے اور پوچھے کہ بتاؤ ظالم شخص تو نے چند خوب صورت جملوں اور چند اشعار سنا کر ایک معصوم لڑکی کو اپنی محبت کے حصار میں قید کیوں کرلیا؟ لیکن اتنے بے شمار مردوں میں اس نے نیلی کی محبت کا بھرم رکھ لیا۔ اس نے خود پر قابو پا کر اپنی بہت پیاری دوست کی عزت کی لاج رکھ لی۔ اور اپنے جذبات پر کنٹرول کرتے ہوئے تیزی سے گھر کے اندر گھس گئی اور ایک چیخ مار کر شہلا سے لپٹ گئی۔

پھر اسے بتایا گیا کہ نائلہ تو کمرے میں بے ہوش پڑی ہے، جب اسے ہوش آیا تھا تو ڈاکٹر نے ہلکی سی غنودگی کا انجیکشن لگا دیا تھا تاکہ وہ دوبارہ ماں کی میت کے پاس آکر بے حال نہ ہوجائے۔

حسبِ روایت جنازہ اٹھا تو خواتین میں کھانا سرو کردیا گیا۔ رخسانہ اور صدیقہ بھابی نے اندر آکر نائلہ کو دیکھا وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر گردن تک کمبل اوڑھے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ رخسانہ نے قریب جاکر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس کی آنکھوں سے کتنے ہی

قطرے نائلہ کے چہرے پر جا گرے۔

''کاش نیلی تم ہوش میں ہوتیں تو میں تمہیں بتاتی کہ وہ ظالم شخص جس کی محبتوں کو دل کے نہاں خانوں میں چھپائے تم حالات سے کمپرومائز کرتے ہوئے اپنی زندگی کو جینے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ شخص تمہاری والدہ کے جنازے کو کندھا دینے آن پہنچا ہے شاید وہ تمہاری بے غرض محبت کی قیمت چکانا چاہتا ہے۔'' لیکن نیلی کے چہرے پر چھایا کرب اور پیلی رنگت اس بات کی اجازت نہیں دے رہے تھے کہ اسے گہری نیند سے ڈسٹرب کیا جائے۔

صدیقہ بھابی بھی نیلی کے بیڈ کے قریب والی کرسی پر بیٹھی اس کے چہرے پر نظریں جمائے بے آواز آنسوؤں سے اپنے دلی دکھ کا اظہار کر رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ لوگوں کا ہجوم کم ہونے لگا۔ شام آہستہ آہستہ رات میں ڈھل گئی تھی۔ رانی نے آ کر صدیقہ بیگم کے کان میں کچھ کہا تو وہ نیلی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے گال کو چوم کر اور کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور رخسانہ سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں۔

ذاکر کی کل رات کینیڈا کی فلائٹ ہے وہ ملنے آیا ہوا ہے۔ صبح فجر کے ٹائم پر وہ یہاں سے نکل جائے گا۔'' رخسانہ نے چند رسمی جملے ادا کیے اور صدیقہ بھابی کو وداع کر دیا۔

☆☆☆

رخسانہ سوئم کر کے جانا چاہتی تھی اس لیے وہ رک گئی تھی۔ رات دس بجے کے قریب نائلہ کی آنکھ کھلی رخسانہ کو اپنے پاس پا کر اس کے گلے لگ گئی۔ رخسانہ نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا اور نیلی کو رونے نہیں دیا۔

''دیکھو ڈاکٹر صاحب نے منع کیا ہے تم نے بالکل رونا نہیں ہے اس طرح بچے کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔ تمہیں پتا ہے تمہارا بچہ یا بچی جو بھی اس دنیا میں آ رہا ہے۔ وہ تمہارے لیے دنیا کی بیش قیمت دولت ہے، تمہاری زندگی کا سب سے خوب صورت رشتہ تمہارے وجود کا حصہ ہے، تم نے اس کے لیے اپنے آپ کو مضبوط رکھنا ہے۔''

''تم بتاؤ رخسانہ میرے لیے ضبط کا اِک اور امتحان شروع ہو چکا ہے۔ آخر میں ہی کیوں...... میرا کیا قصور ہے کہ میں اپنی ماں کے لیے رو بھی نہیں سکتی۔''

''تم رو سکتی ہو، ماں کی جدائی میں تو بندہ عمر بھر بھی روتا رہے تب بھی کم ہے، میری جان......'' رخسانہ نے انتہائی دکھ سے کہا۔ ''لیکن ذرا سوچو تم خود بھی ماں بن رہی ہو اور ماں اپنی اولاد کے لیے بڑے سے بڑا امتحان دینے کو تیار ہو جاتی ہے لہٰذا حوصلے سے کام لو۔ نیلی، ماں کی یاد میں آنسو بہانے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔'' رخسانہ اسے اپنے کندھے سے لگائے اس کی کمر سہلا رہی تھی۔

☆☆☆

رخسانہ اس کے ساتھ ہی سوئی تھی اس نے رات بھر صدیقہ بھابی اور ذاکر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ صبح فجر کی نماز کے بعد نائلہ صحن میں نکلی تو بابا جان مسجد سے فارغ ہو کر گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ نائلہ سے رہا نہ گیا اور دوڑ کر بابا کے سینے سے لگ گئی اور بے اختیار آنسوؤں پر قابو نہ رہا۔

بابا اسے اپنے سینے سے لگائے تسلی کے بول بولتے رہے۔

سوئم پر صدیقہ بھابی آ گئیں، نیلی سے ملیں تو دونوں کو خود پر قابو نہ رہا اور نہ جانے کتنے زخم تازہ ہو گئے۔

وقار، کشف اور شہلا، علی سب لوگ نیلی کو ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔ اس کی صحت کے پیش نظر سب اسے حوصلہ اور تسلی دیتے رہے...... نائلہ کے سسرال سے سب لوگ آئے۔ عامر کا فون بھی آیا۔ اس نے نیلی سے نہ رونے کی تاکید کی مبادا اس کے بچے کی صحت پر اثر پڑے۔

☆☆☆

سوئم بھی گزر گیا۔ رخسانہ بھی چلی گئی۔ سب لوگ اپنے، اپنے گھروں کو لوٹ گئے گھر میں بڑی پُراسراری

خاموشی نے ڈیرے ڈال لیے۔

علی کے گھر والے اسی دن سوئم کر کے سرگودھا چلے گئے اور وہ اگلے دن واپس گیا۔ شہلا اور نائلہ ابھی یہیں پر تھیں' وقار اور کشف نے بھی چھٹیاں لے رکھی تھیں۔

شام کی چائے اماں صغراں نے لا کر ٹیبل پر رکھی اور ٹی پاٹ سے چائے کپوں میں انڈیلنے لگی پہلا کپ انہوں نے بابا جان کی طرف بڑھایا اور دوسرا نیلی کی طرف......

کپ پکڑتے سے اس کے کانوں نے سنا کہ ذاکر نے بھی جنازے کو کندھا دیا تھا۔ یہ وقار بھائی کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ تھے کہ بجلی کا شاک...... نیلی کے ہاتھ کو جھٹکا سا لگا اور چائے تھوڑی سی چھلک پڑی اور اس کے کپڑوں پر گری۔

''سنبھل کر نیلی میری جان......!'' کشف نے کپ اس کے ہاتھ سے لینا چاہا۔

''نہیں بھابی' میں ٹھیک ہوں۔'' کہتے ہوئے اس نے چائے کا ہلکا سا سپ لیا۔

''ذاکر آیا تھا؟'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''ذاکر کو کیسے خبر ہوئی کہ میری دنیا لٹ گئی۔ میری جنت چھن گئی...... وہ کیوں آیا تھا، وہ مجھے پرسہ دینے آیا تھا یا میری جنت چھن جانے کا تماشا دیکھنے؟ یا پھر کوئی اور زخم دینا ابھی باقی تھا؟'' چائے ختم کرتے ہی اس نے سر درد کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں آگئی اور اپنے بستر میں گھس گئی۔ اچانک دروازے پر ہولے سے ٹک، ٹک کی آواز آئی اور ارم اندر آگئی۔ عائشہ بیگم کی سب سے پیاری بھتیجی اور نیلی کی بیسٹ فرینڈ...... کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہوگئے۔

''سنا تم نے نیلی، تمہارا وہ ذاکر اقبال آیا تھا؟ وہ دھوکے باز ظالم شخص جس نے میری نیلی کے ہونٹوں سے ہنسی چھین لی۔ میں نے جب اسے دیکھا تو وہ پھوپھو جان کے جنازے کو کندھا دیے ہوئے تھا۔ ورنہ میں نے جب سنا کہ صدیقہ بھابی کے ساتھ آیا ہوا ہے تو میرا پورا ارادہ تھا کہ اسے سب کے سامنے گریبان سے پکڑوں گی۔ اور تمہارے آنسوؤں کا حساب لوں گی لیکن......''

''بس، بس اس سے آگے مت بولو ارم......'' نیلی نے التجا کی۔

''وہ دھوکے باز نہیں تھا۔ اس کا کوئی قصور نہیں، صدیقہ بھابی نے میرا ہاتھ مانگا تھا لیکن بابا نے ذات برادری کی آڑ لے لی۔ برادری کے طعنوں کے ڈر سے انہوں نے صدیقہ بھابی سے انکار کردیا۔''

''یار یہ کیا منطق ہے پھوپا جان کو برادری کے طعنوں کا زیادہ احساس تھا انہوں نے ایک بار بیٹی سے پوچھ لیا ہوتا؟''

''ایسا نہیں کہتے ارم، بابا جان میرے دشمن نہیں ہیں، برادری ازم کی اِک ریت چلی آرہی ہے لوگ دوسری برادری میں رشتے داری کر کے اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتے۔''

''لیکن میں اس رسم کو توڑ دوں گی۔ یہ ظالم رسم نہ جانے کتنے دلوں پر گھاؤ لگاتی ہے۔'' ارم بڑے جوش سے کہہ رہی تھی۔

''تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ یہ فیصلے بزرگوں کے ہیں اور ان رسموں کو بنانا اور توڑنا بھی نہیں بزرگوں کا کام ہے، ہوسکتا ہے کبھی کوئی بزرگ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو۔ اور یہ فضول رسمیں ختم ہوجائیں...... شاید۔''

☆☆☆

اگلے دن ناشتے کی ٹیبل پر نائلہ کو نہ پا کر بابا ٹھٹک گئے۔

''نیلی کیا ابھی تک سو رہی ہے شہلا......؟'' ان کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

''بابا جان سر درد کی گولی لے کر سوئی ہے، میں نے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔''

''میں دیکھتا ہوں۔'' ملک صاحب کرسی سے اٹھ کر نیلی کے کمرے کی طرف گئے۔ اندر جھانکا وہ بستر میں موجود تھی۔ بابا نے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بخار میں تپ رہی تھی۔

''نائلہ میری بچی یہ اس قدر بخار ہے تمہیں اور بتایا کیوں نہیں۔'' انہوں نے بیٹی کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں

میں تھام لیا۔ نیلی نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ پپوٹے بڑے بھاری ہو رہے تھے۔

''جی بابا جان......'' اس نے آنکھیں پھر میچ لیں۔

''اٹھو بیٹا، اٹھ جاؤ گھر میں دو، دو ڈاکٹرز موجود ہیں اور تم بخار میں تپ رہی ہو۔'' بابا نے پیشانی چوم لی۔

نیلی نے آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی بابا نے بازوؤں کا سہارا دیا اور گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر اسے بٹھا دیا۔

''بابا جان پانی......؟'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''ابھی لایا بیٹا۔'' وہ تیزی سے باہر نکلے، کشف اسی طرف آ رہی تھی۔

''نیلی بخار میں تپ رہی ہے گھر میں دو، دو ڈاکٹرز کے ہوتے ہوئے۔''

''کیوں خیریت بابا جان میں ابھی دیکھتی ہوں۔'' وقار اور شہلا بھی ٹیبل سے اٹھ کر ادھر لپکے۔

کشف نے چیک کیا اور کچھ دوائیں تجویز کیں جو گھر میں موجود تھیں شہلا نے دوا کھلانے سے پہلے چائے کا ایک کپ نیلی کو پلایا۔ پھر دوا کھلائی اسے تسلی دی۔ انتہائی نرمی سے کندھے دبائے اور پھر اسے لٹا دیا۔

''میں اتنی بھی بیمار نہیں شہلا باجی...... آپ لوگ کیوں فکر مند ہیں، میں تو ابھی اٹھ کر باہر آنے والی تھی۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''ہرگز نہیں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے گڑیا۔'' وقار نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی محبت سے کہا۔

''آپ لوگ نہیں جانتے میں کتنی بہادر ہوں وقار بھائی۔''

''جی نہیں آپ بہادر نہیں، آپ بہادر بننے کی کوشش کر رہی ہیں، ہم بھی ڈاکٹر ہیں اور اپنے مریض کی ہر ادا سے واقف ہیں۔'' وقار نے بی پی اپریٹس سے ہوا نکال کر کور میں رکھتے ہوئے کہا۔ سب لوگ ہنسنے لگے تاکہ کمرے کی سوگواری کے اثرات ذرا کم ہوں۔

## انمول موتی

☆ اگر کوئی تم سے بھلائی کی امید رکھے تو اسے مایوس مت کرو کیونکہ لوگوں کی ضرورتیں تم سے وابستہ ہونا تم پر اس ذاتِ واحد کی خاص رحمت کی نشانی ہے۔

☆ دوستی کی زینت ایک دوسرے کی بات کو برداشت کرنا ہے۔ بے عیب لوگ تلاش کرو گے تو تنہا رہ جاؤ گے۔

☆ عبادت کی معراج نیکی کرنا نہیں بلکہ گناہوں کو چھوڑ دینا ہے۔

☆ کیا انسان صرف دکھ کے دنوں میں ہی بہتر بن سکتا ہے جب اس پر عذاب نازل ہوا تو توبہ کر لی مگر جب اسے سکون، آرام ملا تب ہی اس نے دوسروں کا سکون برباد کر دیا۔

مرسلہ: ایمان چوہدری، فیصل آباد

''صغراں ایسا کرو ناشتا لے آؤ، ہم سب نیلی کے پاس بیٹھ کر پیٹ پوجا کریں گے۔ آج یہ محترمہ ہماری پیر و مرشد بن گئی ہیں۔'' وقار نے اس سے کہا۔

''وقار بھائی ایسا تو مت کہیں، میں تو آپ کی گڑیا تھی ابھی چند منٹ پہلے۔''

''چند منٹ پہلے کی بات اور تھی۔ تم جانتی ہو منٹوں میں دنیا کیا سے کیا ہو جاتی ہے اور ہم تو آپ کو پیر و مرشد بنا رہے ہیں۔''

اس ننھی منی چھیڑ چھاڑ کا مطلب صرف نائلہ کو خوش کرنا تھا ورنہ جس گھر سے دو، چار روز پہلے ماں کا سایہ اٹھ گیا ہو۔ وہاں تو مہینوں تک چہرے پر ہنسی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

سب نے ہلکا پھلکا ناشتا کیا اور نیلی کو آرام کا مشورہ دے کر بابا جان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

ٹرررن...... ٹرررن...... فون کی گھنٹی نے نائلہ کو

اپنی طرف متوجہ کیا، اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگالیا۔

''ہیلو، جی نائلہ بات کر رہی ہوں۔''

''خالہ جان کی اچانک وفات کا سن کر بڑا دکھ ہوا۔'' عامر نے سلام دعا کے بعد بڑا احسان بھرا جملہ ادا کر دیا۔

''آپ کا بہت، بہت شکریہ......'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ ٹھیک ہو ناں......؟'' وہ بڑے خشک لہجے میں بولا۔

''جی عامر، میں ٹھیک ہوں۔''

''دیکھو جلدی گھر جانے کی کوشش کرنا یہاں بھاگ دوڑ میں بیمار نہ پڑ جانا۔ اس طرح بچے کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔''

''دیکھیں عامر، امی جان کو گئے آج تیسرا دن ہے، میں کیسے جلدی گھر چلی جاؤں، آپ کو ذرا احساس نہیں میری جنت لٹ گئی ہے اور آپ کو اپنے بچے کی فکر ہے۔'' اس نے بڑی جرأت کر کے کہا۔

''دیکھو بی بی سب کو اس دنیا سے چلے جانا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا میں آنے والوں کا رستہ کھوٹا کر دیں۔ تم ماں کے غم میں بیمار پڑ گئیں تو میرا تو نقصان ہو گا ناں۔''

''اف کس قدر سفاک انسان ہے یہ۔'' نائلہ تڑپ اٹھی۔ ''مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اور اس سفاک ظالم کو صرف اپنے بچے کی فکر ہے۔'' وہ سوچ کر رہ گئی۔

''ٹھیک ہے اللہ حافظ، میں پھر بات کروں گی کچھ مہمان آ گئے ہیں۔'' اور نائلہ نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس نے انتہائی کرب سے چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

☆☆☆

زندگی میں بڑے بے کیف اور تکلیف دہ دنوں کی شروعات ہو چکی تھی۔ امی جان کی جدائی، عامر کا کٹھور پن ان سے بری تکلیفیں بھلا کیا ہو سکتی تھیں۔ دن گزرتے جا رہے تھے۔

چالیسویں کے بعد امام صاحب اور صفیہ بیگم اسے ساتھ گھر لے آئے۔ اپنے کمرے کی سوگوار فضا اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ وہ اکثر بیمار رہنے لگی۔ بھابی اس کا بہت خیال رکھتیں، بچے بھی اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتے......لیکن جب دل کی دنیا ہی ویران ہو تو دل بہلتا کیسے؟

''تمہیں اس معصوم جان کے لیے ہی اپنا خیال رکھنا چاہیے۔'' بھابی نے بڑی محبت سے اسے دودھ میں کمپلان گھول کر دیتے ہوئے کہا۔

''بھابی جان کسی چیز کو دل نہیں مانتا کیا کروں...... مجھے لگتا ہے میں اس ننھے وجود کو دنیا میں نہیں لا پاؤں گی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو چھلک پڑے۔

''بکو مت......اللہ نہ کرے کبھی ایسا لفظ زبان پر مت لانا۔'' بھابی نے اسے مصنوعی ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

''چلو دودھ پیو اور آرام کرو۔''

☆☆☆

بے شمار دن گزرے تو ایک ننھا سا وجود اس دنیا میں آ گیا۔ نائلہ نے پہلو میں لیٹے ہوئے اس جیتے جاگتے کھلونے کو دیکھا تو ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس نے بے اختیار اسے چوم لیا۔ ''کس قدر پیارا ہے یہ بچہ اور میں اس کی ماں......'' یہ سوچ کر اس کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ ''تیرا شکر ہے میرے مولا۔'' گھر میں خوشیوں کا اک سماں بندھ گیا۔

امام صاحب نے پوتے کی پیشانی چوم کر اس کا نام ولی تجویز کر دیا سب نے اس سے اتفاق کیا۔ عامر خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ اپنی ماں کو گھنٹوں فون کرتا......اور بچے کے بارے میں باتیں کرتا۔

''مبارک ہو آپ کو......'' نیلی نے فون پر عامر کو مخاطب کر کے کہا۔

''خیر مبارک بھئی......ہمارے ولی عہد نے دنیا میں آ کر ہمیں خوش کر دیا۔ میں تو اسے دیکھنے کے لیے

بے چین ہو رہا ہوں۔" وہ اپنی دھن میں مسلسل بول رہا تھا۔ اس کی تمام گفتگو میں کہیں نائلہ کی محبت میں دو لفظ نہیں تھے۔ نائلہ کا سارا وجود جل رہا تھا۔ دکھ سے اس کے آنسو نکل آئے۔

"اے میرے پروردگار کیا نصیب لکھتے ہوئے لفظ محبت میرے حصے میں لکھنا تو بھول گیا۔ آخر میرا کیا قصور ہے۔ میں تو پاؤں تلے مسلی جانے والی چیونٹی کو بھی اٹھا کر اپنی ہتھیلی پر رکھ لیتی ہوں کسی کا دکھ برداشت نہیں کر سکتی مولا لیکن تیری یہ دنیا اتنی سفاک کیوں ہے؟"

☆☆☆

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے گھومتا رہا دن ہفتے اور ہفتے، مہینے اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ بالوں میں چاندی اتر آئی۔

نائلہ کے آنگن میں خیر سے چار پھول کھل چکے تھے، ولی یونیورسٹی جوائن کر چکا تھا۔ فجر میٹرک میں تھی حمرا اور ابیض دونوں بہن، بھائی مڈل میں تھے۔ عامر پاکستان واپس آکر اپنا بزنس سیٹ کر چکا تھا۔

بھابی اور بھائی جان وقفے وقفے سے بچوں کی شادیاں کر رہے تھے۔ عاشر نے اسلام آباد میں بہت بڑا گھر بنایا تھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ کبھی کبھار پاکستان آتا تھا۔ گھر نوکروں کی وجہ سے آباد نظر آتا تھا۔ امام صاحب اور صفیہ بیگم اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔

نائلہ کے بابا جان حج اکبری کی ادائیگی کے فوراً بعد مکہ میں ہی وفات پا گئے تھے اور انہیں وہیں پر دفن کر دیا گیا تھا۔ وقار اور کشف اپنے دو بچوں کے ہمراہ سویڈن میں آباد تھے۔ شہلا اور علی اپنی فیملی کے ساتھ کراچی شفٹ ہو چکے تھے۔ شہلا کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ ارم کے ہاں دو بیٹیاں تھیں اور بڑی پیاری سی...... رخسانہ سے فون پر ہیلو ہائے آج بھی تھی، وہ ایک بیٹے کی شادی کر چکی تھی اور باقی بھی اب جوان تھے۔

عامر اور نیلی آج بھی ریل کی دو پٹریوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ عامر اپنے کاروبار میں مگن تھا اور نائلہ گھریلو ذمے داریوں سے نبرد آزما رہتی تھی۔

کبھی، کبھی دل بہت اداس ہوتا تو آڈیو کیسٹ نکال کر سن لیتی۔ جب تم اکیلے ہو گے ہم یاد آئیں گے۔

☆☆☆

آج دل بڑا اداس تھا۔ بھائی اور بھابی جان عمرے پر جانے کے لیے تیار تھے، گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ مہمان آ جا رہے تھے۔ کچن سے ہر وقت کھانوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ ملازمہ بھی اب بوڑھی ہو چکی تھی اس لیے اپنی بھتیجی کو ساتھ لے آئی تھی۔ سلمیٰ بڑی پھرتیلی تھی اس نے سارے گھر کو سنبھال رکھا تھا۔ کل صبح دس بجے کی فلائٹ تھی۔ باقر بھائی اور بھابی رات کو ہی اسلام آباد روانہ ہونے والے تھے۔ نیلی کو بابا جان شدت سے یاد آ رہے تھے۔

شام کو بھابی ثروت اور باقر بھائی نے تیاری مکمل کر لی۔ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھانے کے بعد بھائی باقر سب گھر والوں سے مخاطب تھے۔ ارسل اب بڑا تھا۔ اس کے سپرد داری میں سارا گھر دیا جا رہا تھا۔ طوبیٰ اس کی بیگم بڑی ذمے دار بچی تھی... بھابی عامر اور نائلہ کو بھی آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہی تھیں۔

نیلی تو ویسے بھی سب کا خیال رکھنے والی تھی۔ باہر گاڑی کے ہارن کی آواز پر سب لوگ ٹیبل سے اٹھنے لگے، عامر، ارسل اور طوبیٰ کے ساتھ ائر پورٹ جا رہے تھے۔ جو بچے پڑھائی سے چھٹی کر سکتے تھے وہ ساتھ اور باقی سب نیلی ماما کے پاس گھر میں ہی موجود رہیں گے۔

ملازمہ رانی تو ویسے بھی دادیوں کی طرح بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ بھی لیتی تھی اور گھر کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔

سب لوگ جب گاڑی میں بیٹھنے لگے تو نیلی بانس کی تیلیوں سے بنی ایک باسکٹ میں گلاب اور موتیے کے پھول لے کر آ گئی۔

پھولوں کی ٹوکری دونوں ہاتھوں میں تھام کر ثروت بھابی کی طرف بڑھ گئی۔

"بھابی جان میرے پاس اور کچھ نہیں بس یہی

پھول ہیں، یہ بابا جان کی قبر پر ڈال دیجیے گا اور کہیے گا کہ اتنی لمبی جدائی کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“
آنکھیں ساون بھادوں برسا رہی تھیں اور بھابی بھی نیلی کو گلے لگا کر بے اختیار رو پڑی تھیں۔ باقر بھائی نے نیلی کو اپنے ساتھ لگایا۔
”نہیں بیٹا دل چھوٹا نہیں کرتے وہ تو بڑی اچھی جگہ پر دفن ہیں وہ جگہ تو سب کا خواب ہے۔“ لیکن نیلی کی آواز ہچکیوں میں بندھ گئی۔

☆☆☆

ثروت بھابی گھر سے کیا گئیں کہ ساری رونق بھی ساتھ ہی لے گئیں۔ گھر میں اِک عجیب اداسی کا ساماحول لگ رہا تھا۔ بچوں کو ان کے کمروں تک پہنچا کر سونے کی تلقین کر کے نائلہ اپنے کمرے میں آگئی۔
نیلی روشنی میں نائلہ نے الماری کا سیف کھولا اس میں سے وہی من پسند آڈیو کیسٹ نکالی ٹیپ ریکارڈر میں لگائی اور بٹن دبا کر گول تکیے سے ٹیک لگائی اور آنکھیں میچ لیں۔

”جو نہ سوچا تھا وہ ہوگیا کیا نصیب میرا کھو گیا
غم کی ایسی گھٹا چھا گئی چین دل کا کہیں کھو گیا
کیا کہیں دور تک روشنی کا نہیں ہے نشاں
بے رحم آسماں میری منزل بتا ہے کہاں“

بڑی مدھم آواز میں ذاکر اقبال درد کی اِک داستان سنا رہا تھا۔ وہ حسبِ عادت آنکھیں بند کیے پُرسوز آواز سن رہی تھی کہ آنکھیں بے آواز نیر بہا رہی تھیں۔
”ذاکر تم کہاں جا کر آباد ہوگئے، کیا تمہیں میرے والدین کا جواب برا لگا تھا یا تم نے میری خاموشی کو محبت کا انکار سمجھ لیا تھا۔ اگر یہ بھی نہیں تو پھر تم محبتوں کو فلرٹ سمجھتے تھے۔ اظہارِ محبت تمہارے لیے ایک ہلکی پھلکی شرارت تھی اور یہی شرارت شاید تمہارا مشغلہ ہو، ذاکر اقبال تم پڑھے لکھے ایک آئیڈیل سی شخصیت کے مالک تھے۔ یہ شرارتیں، یہ مشغلہ آخر تم نے کیوں اپنایا؟ تمہیں یہ احساس کیوں نہ ہوا کہ تمہاری چھوٹی سی شرارت کسی کا عمر بھر کا روگ بن جائے گی۔“

تمام رات یادوں کی یلغار نے اسے چین سے سونے نہ دیا۔
کبھی عامر کی کٹھور طبیعت کا دکھ تازہ ہو جاتا اور اپنی انسلٹ محسوس ہونے لگتی لیکن کہیں پر عامر کی محبت چھن جانے کا احساس دل میں ہلچل مچا دیتا۔
ثروت بھابی ٹھیک کہتی ہیں کہ ہر انسان اپنی زندگی کے خانوں میں کہیں نہ کہیں ان فٹ ہے۔
تمام رات خیالات کا ہجوم اس کے گرد دائرے کی شکل میں موجود رہا نہ جانے کب رات تمام ہوئی اور کب وہ جانماز پر بیٹھی اپنی دعاؤں میں اپنے رب سے دل کا قرار مانگتی ہوئی اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت بے لگام گھوڑا ہے جو بھاگتا چلا جاتا ہے۔ کون پیچھے رہ گیا۔ کس نے کیا پایا، کیا کھویا اسے کچھ غرض نہیں کسی سے، اس کا اپنا اسٹائل ہے، وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آئیں۔
باقر بھائی کی زارا کی شادی ولی سے ہوگئی۔ ولی کو پی ایچ ڈی کے لیے امریکا جانا تھا۔ عامر نے اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا اور زارا کو ساتھ بھیجنے کی کوشش کرنے لگے۔ فجر اپنی تعلیم مکمل کر چکی تھی اور اس کی شادی بتول پھپو کے بیٹے مظاہر سے کر دی گئی۔ بتول پھپو کی سارہ بیاہ کر اسلام آباد عاشر کی بہو بن گئی تھی۔ عاشر کا بیٹا احمر ہارٹ اسپیشلسٹ تھا اور سارہ بھی ڈاکٹر تھی۔
عامر اپنے بھائی عاشر کے بیٹے کی شادی میں شامل نہیں ہوا تھا۔ بتول آپا کے گھر بھی شادی میں صرف ایک دن ہی شرکت کی تھی تاکہ مونا اور عاشر کا سامنا نہ کرنا پڑ جائے۔ عامر کا دوسرا بیٹا حمد یونیورسٹی میں کسی لڑکی کو پسند کرتا تھا اس لیے عامر کا ارادہ تھا کہ تعلیم مکمل کرتے ہی اس کی شادی اس کی پسند سے کر دی جائے گی۔ ابیض کو باقر بھائی نے اپنے بیٹے موسیٰ کے لیے مانگ لیا تھا۔

☆☆☆

نیلی نے ٹی وی کا سوئچ آن کیا۔

کسی کی آنکھ جو پُرنم نہیں ہے نہ سمجھو یہ کہ اس کو غم نہیں ہے
کنارہ دوسرا دریا کا جیسے وہ ساتھی ہے مگر محرم نہیں ہے

امجد اسلام امجد کی اس شاعری نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ سننے میں محو تھی کہ عامر دندناتا ہوا لاؤنج میں داخل ہوا۔

''اگر تمہیں اپنے غموں پر ماتم کرنے سے فرصت ملے تو میری بات سن لینا۔'' کہتا ہوا وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور نیلی کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ جلدی سے عامر کے پیچھے ہی کمرے میں گھس گئی۔

''جی آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھ سے؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ اولاد کی ذمے داریوں میں بھی دلچسپی لو اب غزلوں کا پیچھا چھوڑ دو۔''

''کیا ہوا ہے، مجھے کچھ بتائیں بھی تو؟''

''حمد جس لڑکی کو پسند کرتا ہے سنا ہے اس کا رشتہ کہیں اور ہونے لگا ہے ڈاکٹر رمیض ان کے ساتھ والے گھر میں رہتا ہے بتا رہا تھا کہ ظفر صاحب کی بچی جنت میری بیٹی فاطمہ کی کلاس فیلو ہے اور فاطمہ کا کہنا ہے کہ جنت کے لیے کوئی رشتہ آیا ہے، ساری فیملی ناروے میں سیٹل ہے۔ میں کہتا ہوں تم فوراً تیار ہو جاؤ، ڈاکٹر رمیض کے گھر چلیں، ان کی بیگم کے ذریعے ان تک پیغام پہنچائیں کہ جنت میرے بیٹے کی پسند ہے اور میں ہر قیمت پر اس کا رشتہ لینے پر تیار ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ حمد بھی میری طرح برباد ہو جائے، اس کے گلے میں بھی میری طرح غم کا طوق ڈالنا پڑ جائے...... میں اسے ہر قیمت پر خوشیاں دوں گا۔'' وہ بے اختیار بولے جا رہا تھا اور نائلہ سر سے لے کر پاؤں تک گویا آگ کی بھٹی میں جلنے کے لیے ڈال دی گئی ہو۔

''تو کیا میں عامر کے گلے میں غم کا طوق کی حیثیت میں ہوں؟ کیا عامر کی بربادی کی ذمے دار میں ہوں؟ لیکن میں کس کو گریبان سے پکڑ کر اپنی بربادیوں کا حساب لوں؟''

''جی اچھا، میں تیار ہو جاتی ہوں۔'' اس نے نظریں جھکا کر کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ آنکھوں میں مچلتے ہوئے پانیوں کے آگے بند باندھنے کے لیے اسے آنکھوں کو جھکا کر باہر نکلنا پڑا۔

یوں پھر ڈاکٹر رمیض کی بیگم نے جنت کی والدہ تک یہ خبر پہنچا دی کہ جنت جس کی پسند ہے اسی کے سپرد کر دی جائے تاکہ پچھتاوؤں کی آگ میں عمر بھر جلنے سے بچ جائے اور یوں جلد ہی حمد کی منگنی جنت سے کر دی گئی۔

عامر بہت خوش تھا کہ کم از کم اس کے بیٹے کو اس کی پسند کا جیون ساتھی مل گیا اور نائلہ اس لیے خوش تھی کہ دو مختلف برادریوں نے آپس میں رشتے داری کر کے برادری کلچر کو ختم کرنے میں بارش کا پہلا قطرہ بننے کا ثبوت دیا۔

☆☆☆

چند ماہ بعد ابیض کی شادی موسیٰ سے اور حمد کی شادی جنت سے کر دی گئی۔ عامر کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور اسی خوشگواریت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نائلہ نے ناشتے کی ٹیبل پر عامر کی پلیٹ میں مکھن لگے سلائس رکھتے ہوئے ایک سوال کر دیا۔

''عامر میں نے کبھی آپ سے کچھ نہیں مانگا۔ آج آپ سے ایک سوال ہے؟'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''بولو کیا چاہیے؟'' عامر نے چائے کا کپ منہ کے قریب لے جاتے ہوئے ٹیبل پر واپس رکھ دیا۔

سب بچے ایک دم متوجہ ہو گئے۔

''میں عمرے پر جانا چاہتی ہوں۔''

''ویری گڈ ماما......'' ولی اور حمد ایک ساتھ بولے۔

''لیکن کیسے...... کس کے ساتھ...... مطلب میں تو فارغ نہیں ہوں۔'' عامر بولا۔

''میں آپ کے ساتھ جانا بھی نہیں چاہتی...... میرا مطلب ہے میں بالکل اکیلے جانا چاہتی ہوں...... میں عمرہ ویزہ لگوا کر جاؤں گی پورا رمضان وہیں گزاروں گی اور حج ادا کرنے کے بعد ہی واپس پاکستان آؤں

گی۔'' وہ بلا جھجک رکے بغیر بول رہی تھی۔

''آپ سب کو پتا ہے کہ بلال ماموں اپنی فیملی سمیت جدہ میں مقیم ہیں، میں سیدھی ان کے پاس جاؤں گی انہی کے پاس ٹھہروں گی اور حج بھی ماموں جان کے ساتھ کروں گی، اور پھر جب دل چاہا واپس آجاؤں گی اور اس کے لیے مجھے جتنی رقم چاہیے میرے اکاؤنٹ میں موجود ہے اس کے علاوہ مجھے ایک روپیہ نہیں چاہیے۔'' وہ بلا تکان بولتی چلی گئی اور ٹیبل پر بیٹھے سب لوگ حیران ہونے لگے خاص طور پر عامر پھٹی، پھٹی آنکھوں سے نیلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''مگر پوچھنا پڑے گا کہ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے......'' عامر کے منہ سے نکلا۔

یہ آدھی صدی بعد اس بے زبان عورت کو بنا جھجک بولتے دیکھ کر عامر اور اس کے بچے حیران ہو رہے تھے۔

ولی اور حمد دونوں نے اٹھ کر ماں کے گرد ایک حصار بنا لیا۔

''ماما یقین نہیں آرہا کہ یہ آپ بول رہی ہیں، اور پاپا کے سامنے بے دھڑک بات کر رہی ہیں۔''

''ماما میں تو آپ کو شروع سے ایسے ہی اپنے حق کے لیے بولنے والی خاتون کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن آپ نے آج تک اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنی گوارا نہیں کی۔'' ولی نے ماں کی پیشانی کا بوسہ لے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''آپ کو جتنے بھی پیسوں کی ضرورت ہے، پاپا آپ کو دیں گے، یہ ان کا فرض ہے۔'' حمد اور جنت بولے۔

''نہیں بچو، مجھے عامر امام کی رقم کی ضرورت ہرگز نہیں ہے، میرے پیارے رب نے میرے حج کی رقم کا بہت پہلے بندوبست کر دیا تھا اگر بندوبست نہ بھی ہوتا تو میں عامر صاحب سے ایک روپے کا بھی مطالبہ نہیں کرتی۔''

عامر امام ابھی تک ہکا بکا سکتے کے عالم میں نظر آرہا تھا۔ اس کی چائے رکھے، رکھے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''لیکن پاپا سے رقم لینا آپ کا حق ہے۔'' بڑی بہو زارا بولی۔

''یہ سب کچھ تم کیوں کر رہی ہو نائلہ بی بی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔ تمہیں جتنے پیسوں کی ضرورت ہے تم لے سکتی ہو میں تمہیں خدا کے گھر جانے سے کیسے روک سکتا ہوں۔'' عامر بولا۔

''نہیں عامر صاحب مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے، آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں آدھی صدی پہلے جب آپ کی زندگی میں آئی تو آپ نے اپنی محرومیوں کا بدلہ لینے کے لیے لحہ، لحہ اپنے اور میرے درمیان غیر محسوس طریقے سے ایک دیوار چننی شروع کر دی۔ آہستہ، آہستہ وہ دیوار اتنی بلند ہوتی گئی کہ آسمان کو چھونے لگی۔ میں اپنی محرومیوں کا بدلہ آپ سے نہیں لینا چاہتی تھی کیونکہ مجھے آپ جیسا نہیں بننا تھا۔ میں اپنے آنسوؤں کو چھپائے، اپنے رب سے انصاف طلب کرتی رہی.... اور میرا رب... میرا رب جو دو جہانوں کا والی ہے جو ایک ماں سے بھی ستر گنا بڑھ کر اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ وہ پروردگار اپنے اور میرے درمیان دیوار کیسے کھڑی کر سکتا تھا......دیواریں تو ہم گناہ گار کھڑی کرتے ہیں، وہ تو اوپر بیٹھا انصاف کا ترازو ہاتھ میں لیے سب کے ساتھ انصاف کرتا آرہا ہے پھر میں اس کی رحمتوں سے جھولی کیسے نہ بھر پاتی۔''

نائلہ کسی جھجک کے بغیر بول رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ کسی نے اسے ٹوکا نہیں، اسے رونے دیا خوب رونے دیا تاکہ آدھی صدی پہلے سے دل و دماغ پر پڑا ہوا غبار ڈھل جائے اور وہ ہلکی پھلکی ہو جائے......زارا سے مزید برداشت نہ ہوا تو اس نے اٹھ کر نائلہ کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

''بس کریں ماما آپ نے بہت رو لیا اس سے زیادہ میں آپ کے آنسو نہیں دیکھ سکتی۔'' جنت بھی اس کا ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں لیے سہلا رہی تھی، بار بار چوم رہی تھی۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد وہ دوبارہ بولنے لگی۔

''عامر صاحب آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے لیے رقم کا بندوبست تو میرے مالک نے بیٹھے بٹھائے کردیا تھا۔ وہ اس طرح کہ بابا جان جب ہم سب سے آخری بار مل کر حج اکبر پر روانہ ہورہے تھے تو انہوں نے وہ رقم جو امی جان کے حج کے لیے بینک میں بہت پہلے رکھوائی تھی، وہ میرا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں جمع کرادی بلکہ اس سے کہیں زیادہ میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردی اور خود ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوگئے۔'' وہ پھر آنسوؤں کی لڑیاں پرو رہی تھی۔

''میں خاموشی سے وقت کا انتظار کرتی رہی کہ نجر اور ابیض اپنے گھروں کی ہوجائیں اور بیٹے اپنی زندگی کے ساتھی چن لیں تو میں حج پر چلی جاؤں گی۔ شاید ہمیشہ کے لیے چلی جاؤں کیونکہ بابا جان بھی تو وہیں پر ہیں۔'' اس کی داستان ختم ہوئی تو ایک دم خاموشی چھاگئی۔

☆☆☆

پھر ڈیڑھ دو ماہ بعد وہ دن بھی آن پہنچا جب وہ گلے میں گلابوں کے ہار ڈالے سب سے رخصت ہورہی تھی۔

ثروت بھابی، باقر بھائی اور سب کے بچے بڑے گھر میں اکٹھے ہوچکے تھے۔ ایک عید کا سا گمان ہورہا تھا۔ خوشی اور اداسی کی ملی جلی کیفیت تھی۔ سب کی ٹیلی فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔

باہر دیگیں پک رہی تھیں۔ قریبی رشتے دار بھی اکٹھے ہوچکے تھے۔ جن میں ارم بھی پیش پیش تھی۔

وقت رخصت آنسوؤں کی برسات میں رندھے ہوئے گلے کے ساتھ اس نے عامر امام سے غلطیوں کی معافی مانگی، عامر خود بھی شرمندہ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ دو تین گاڑیوں میں گھر کے افراد اسے اسلام آباد تک چھوڑنے گئے وہاں عاشر اور مونا بھی نائلہ سے ملنے پہنچ چکے تھے۔ ائرپورٹ پر اک ہجوم سا تھا۔

فلائٹ کا وقت ہوا تو وہ بھیگی پلکوں سے سب کو گلے مل رہی تھی۔ عامر ائرپورٹ پر نہیں آیا تھا۔ اسے عمر بھر کی شرمندگی نے نہیں آنے دیا یا پھر عاشر اور مونا اس کی وجہ تھے۔

جہاز نے براستہ کراچی، جدہ کے لیے روانہ ہونا تھا اور کراچی ائرپورٹ پر شہلا اور علی بھی ملنے آگئے تھے۔

☆☆☆

جدہ ائرپورٹ پر اس کی دنیا ہی بدل گئی اس نے تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ یوں خدا کے گھر بھی پہنچ سکے گی۔

ماموں جان اپنی فیملی کے ساتھ ائرپورٹ پر موجود تھے۔

کسٹم کے دوران میں اسے اپنے سامان سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑا سا چرمی بیگ نظر آیا۔ جس پر درج تھا۔ ڈاکٹر اقبال ایل فرام کینیڈا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سر گھومنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ گر پڑتی، اس نے ستون کا سہارا لیا اور پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

پھر چند ساعتوں کے بعد اسے لگا کہ کوئی اس کے ہونٹوں سے پانی کی بوتل لگائے اسے پانی پلانے کی کوشش کررہا ہے۔ ایک گھونٹ اس نے اپنے حلق سے اتارا اور آنکھیں کھولیں۔ اٹھارہ بیس سال کی بچی اسے پانی پلارہی تھی۔

''بیٹا میں کہاں ہوں اور آپ کون؟''

''جی یہ ڈاکٹر صاحب آپ کو دیکھنے آئے ہیں، میں ماہین ہوں اور یہ میرے دادا جان ڈاکٹر اقبال ہیں، ہم کینیڈا سے عمرہ ادا کرنے آئے ہیں۔'' نائلہ کی آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے۔

''تو، تو مس...... اس راستے سے واپسی ناممکن ہے، آپ جس سمت کا رخ کریں گی اپنی راہ گزر میں اس خاکسار کو پائیں گی۔'' وہ حیران و پریشان اپنے سامنے کھڑے اس باریش آدمی کو دیکھ رہی تھی۔

# ان کو عادت ہے بھول جانے کی

شائستہ زریں

معزز قارئین! السلام علیکم!

بھول جانا تو رسم دنیا ہے
آپ نے کون سا کمال کیا

اور جب لوگ یہ کمال کردکھاتے ہیں، غضب ہی توڑھاتے ہیں ناں۔ بھولنے کا عارضہ اب عام ہوتا جارہا ہے۔ کبھی یہ شکایت ضعیف العمری سے مشروط تھی، اب اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں رہی۔ تعلق کی نوعیت خواہ کوئی سی ہو جس سے آپ کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں اس کا بھول جانا بہت گراں گزرتا ہے۔ اکثر خواتین شاکی ہوتی ہیں کہ ہمارے میاں کو تو کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ ایک خاتون کی تو حیرانی ہی نہیں جارہی تھی۔ حیرت ہے انہیں گھر آنا کیسے یاد رہ جاتا ہے؟ اس سے زیادہ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ شکر کے مقام پر بھی لوگ ناشکری کرتے ہیں۔ بیویوں کی ایک قسم وہ بھی ہے جن کا دعویٰ ہے کہ اپنے مطلب کی ساری باتیں یاد رہتی ہیں، ہماری کبھی ہر بات بھول جاتے ہیں۔ بالخصوص شادی کی تاریخ یاد نہ رکھنے کی شکایت تو ہر دوسری بیوی کرتی نظر آتی ہے۔ ایک خاتون نے اپنے میاں کی یادداشت کا امتحان لینے کی نیت سے اپنی شادی کی سالگرہ کی تاریخ بتا کر کہا آپ کو یاد ہے آج کیا خاص بات ہے۔ میاں نے پُرجوش جواب دیا"ہاں کیوں نہیں پاک بھارت میچ کا فائنل ہے ناں" اور جواب میں موصوفہ مسکرا کر رہ گئیں۔ واقعی یادداشت تو بہت اچھی لیکن اپنے مطلب کی۔ کبھی کبھی بہت معمولی اور کبھی بہت اہم بات بُھلا دینا بھی اکثر شوہروں کا خاصہ ہے۔ ایسے میں اگر بیگم صاحبہ دفترِ شکایت کھول دیں تو صاحب جی کو برا تو نہیں منانا چاہیے ناں!

ہم نے چند خواتین سے معلوم کیا کہ "عموماً آپ کے شوہر نامدار کیا بھول جاتے ہیں جس سے آپ کو بہت شکایت ہے"۔ آپ بھی شکایت بھری حکایتیں پڑھیے۔

## مہناز رحمن

(ریذیڈنٹ ڈائریکٹر عورت فاؤنڈیشن۔ اہلیہ احفاظ الرحمن ممتاز صحافی)

شادی کے ابتدائی سالوں میں ظاہر ہے شادی کی سالگرہ بہت اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن انہیں کبھی یاد نہیں رہتی تھی۔ ہر بار میں اہتمام کرتی اور ان کے لیے تحفہ بھی خرید کر رکھتی تھی۔ ان کو یاد نہیں رہتا تھا یہ ۱۹۷۹ء یا ۱۹۸۰ء کا ذکر ہے میری ایک سہیلی کچھ میٹھا بنا کر لائی اور ان کا منہ میٹھا کروا کر بولی کہ آج سے آپ میرے منہ بولے بھائی ہیں۔ اگلے روز ہماری شادی کی سالگرہ



مہناز رحمن

تھی جو حسب سابق انہیں یاد نہ تھی۔ یہ میری سہیلی یعنی اپنی منہ بولی بہن کے لیے ایک مہنگا سا جوڑا خرید کر لائے۔ گھر میں داخل ہوئے تو میز پر کیک اور تحفہ سجا ہوا تھا۔ یہ بہت پشیمان ہوئے کہ میرے لیے کچھ نہیں لائے۔ کہنے لگے یہ جوڑا تم رکھ لو۔ میں نے کہا یہ آپ نے اپنی منہ بولی بہن کی نیت سے خریدا ہے۔ اسے ہی دیں، مجھے خوشی ہو گی۔ اور محض ہماری شادی کی سالگرہ کی کیا بات ہے۔ انہیں اپنی، میری اور بچوں کی سالگرہ کا دن بھی یاد نہیں رہتا۔ بھول جاتے ہیں۔

## رشیدہ رضی حیدر

(سابق سرکاری آفیسر۔ اہلیہ خواجہ رضی حیدر، نامور محقق)

ہمارے میاں نامور محقق ہیں۔ دنیا بھر کی شخصیات کی تاریخ ولادت مع سن اور دن کے یاد رہتی ہے۔ لیکن اپنے صرف تین عدد بچوں کی سالگرہ کی تاریخ بھول جاتے ہیں۔ ان کی مصروفیت کی وجہ سے اور باتوں کا تو گلہ نہیں کرتی



رشیدہ رضی حیدر

لیکن ان گنت شخصیتوں کی تاریخ یاد رکھنے اور مرتب کرنے والے شخص کو صرف تین تاریخیں یاد نہیں رہتیں اور وہ بھی اپنے بچوں کی سالگرہ کی تاریخ۔۔۔ گلہ تو ہو گا ناں۔

## پروفیسر خالدہ سمیع

(ریٹائرڈ پروفیسر۔ اہلیہ۔ ڈاکٹر سمیع الزماں، ماہر ماحولیات)

دفتر سے آتے ہی گرما گرم چائے کی پُرزور فرمائش ہوتی ہے۔ جو فوراً پیش بھی کر دی جاتی



پروفیسر خالدہ سمیع

ہے لیکن اکثر چائے پینا بھول جاتے ہیں۔ سبب؟ کبھی آنکھ لگ جاتی ہے اور کبھی کوئی ضروری فون آجاتا ہے اور یہ چائے پینا بھول جاتے ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ نیند پر تو اختیار نہیں لیکن مجھے یہی گلہ رہتا ہے کہ پہلے سکون سے چائے پی لیجیے پھر فون کال بھی سن لیں اور آرام بھی کر لیں۔

## خالدہ مظہر

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ مظہر قریشی۔ سابق بنکر، آر جے ایف ایم ۱۰۵)

ان کو رات گئے تک مطالعے کی عادت ہے۔ دوران مطالعہ تیز گرم چائے طلب کرتے ہیں جو میں فوری پیش بھی کر دیتی ہوں اور جب میں کپ اٹھانے کے لیے جاتی ہوں تو یہ دیکھ کر مجھے بہت کوفت ہوتی ہے کہ حسب عادت مطالعے میں غرق ہو کر چائے پینا بھول جاتے ہیں۔ کھولتی ہوئی چائے ٹھنڈی ہو چکی ہوتی ہے اور یہ ٹھنڈی یخ چائے ایک ہی گھونٹ میں پی کر

کپ واپس کر دیتے ہیں۔ یہ معمول کا قصہ بن گیا ہے اب اس کا کیا گلہ کروں۔

## نیلوفر اعوان

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ ضیا اعوان۔ ممتاز قانون دان)

ضیا بے انتہا مصروفیت کے باوجود میری سالگرہ کا دن یاد رکھتے ہیں لیکن ہماری شادی کی سالگرہ پر بھول



نیلوفر اعوان

جاتے ہیں جو بچے یاد دلاتے ہیں تو اہتمام بھی کرتے ہیں اور انجوائے بھی اور مجھے گلہ یہی ہے کہ اتنا اہم دن بھولتے کیسے ہیں؟

## شاہانہ جاوید

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ جاوید اظہر انصاری۔ الیکٹریکل انجینئر)

ماشاء اللہ ہماری شادی کو ۳۵ سال ہو چکے ہیں اور اس زندگی میں اتار چڑھاؤ بھی آتے ہیں۔ لیکن ہم نے ایک پُرسکون زندگی گزاری ہے۔ میرے میاں اکثر بہت سی باتیں بھول جاتے ہیں تو پہلے تو میں انتظار کرتی ہوں کہ کب یاد آتا ہے اور جب شام ہونے لگتی ہے تو میں فون کر کے کہتی ہوں۔ خیریت ہے آج آپ نے کام شروع کرتے ہوئے تاریخ لکھی تھی۔ تو ان کو فوراً یاد آجاتا ہے کہ آج ۱۴ فروری ہے اور وہ سالگرہ کی مبارک باد دینے کے ساتھ تحفہ اور پھول بھی لے کر آتے ہیں۔



شاہانہ جاوید

## ہما سلیم

(گھریلو خاتون، اہلیہ محمد سلیم مغل۔ معروف صحافی، استاد جامعہ اردو)

کیے وعدے پورے نہیں کر پاتے، وقت دے کر بھول جاتے ہیں۔ صرف مجھے ہی نہیں کسی کو بھی اور ایسا صرف اور صرف مصروفیت کی وجہ سے ہوتا ہے، وعدہ خلاف نہیں ہیں۔ جب بچے چھوٹے تھے تو میری بڑی بیٹی امیمہ کو جو نیشنل مونٹیسوری میں پڑھتی تھی اسے اسکول چھوڑ کر دفتر چلے جاتے۔ امیمہ کی چھٹی ہوتی تو اسے امی کے گھر چھوڑ دیتے اور دفتر سے واپسی میں گھر لے آتے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امیمہ کو اسکول سے گھر لانا بھول گئے، چھٹی کے بعد تین بجے تک اسکول میں رہی پھر اسکول سے امی کے گھر فون آیا کہ بچی کو لے جائیں تب ہلچل مچی۔ اس زمانے میں موبائل کی سہولت بھی نہیں تھی۔ امی امیمہ کو جا کر لے آئیں۔ اب جبکہ امیمہ کی تعلیم بھی ختم ہو گئی لیکن سلیم کی مصروفیت اور بھول کا عالم آج بھی وہی ہے۔ زیادہ مصروفیت میں کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-




ارم کاشف

## نازش گل

(ٹاؤن آفیسر تعلقہ ایجوکیشن۔ اہلیہ رفیع مصطفیٰ
ڈپٹی منیجر فنانس لکی سمینٹ)

اب تو میرے ساتھ رہ رہ کر ان کی یادداشت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے لیکن بعض باتیں اب بھی بھول جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بڑی، بڑی باتیں یاد رکھتے ہیں اور چھوٹی، چھوٹی باتیں بھول جاتے ہیں۔ بازار سے جو چیز لانے کو زیادہ زور دوں گی وہی عموماً بھول جاتے ہیں اور جس چیز کی اہمیت ثانوی ہوگی۔ وہ سب سے پہلے خرید لیں گے اور تاویل یہ پیش کرتے ہیں کہ آپ بھول رہی ہیں آپ


نازش گل

نے ہی تو کہا تھا۔

## ارم کاشف

(آر جے ایف ایم ۱۰۱ کراچی۔ اہلیہ کاشف
بقائی سینئر پروڈیوسر نیوز ون)

اپنی ذات ہی سے متعلق چیزیں بھول جاتے ہیں اور جب پوچھو تو بڑی معصومیت سے کہتے ہیں تم ہو ناں خیال رکھنے کے لیے۔ گاڑی کی چابی جیب میں رکھ کر بھول جاتے ہیں خود ڈھونڈتے رہتے ہیں اور سب کو پورے گھر میں تلاش کرنے میں لگا دیتے ہیں۔ سب اپنی مصروفیات ترک کر کے ان کی چابی تلاش کرتے ہیں جو بالآخر ان کی جیب ہی سے نکلتی ہے۔

## سمیرا یاسر

(ڈاکٹر آف فارمیسی۔ اہلیہ یاسر پیرزادہ،
نیوز اینکر میٹرو ون)

میرے شوہر اکثر جلد بازی میں دفتر جاتے وقت اپنا موبائل فون لے جانا بھول جاتے ہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر جلد ہی یاد آ جاتا ہے تو واپس گھر لینے کے لیے آتے ہیں۔ گھر سے فاصلے پر ہوں تو دفتر جا کر فون کرتے ہیں میرا اسیل فون گھر پر رہ گیا ہے۔ ڈرائیور کو


سمیرا یاسر

بھیج رہا ہوں بلی کو نیچے بھیج دینا سیل فون دینے کے لیے۔ خود کہتے ہیں کہ اگر موبائل نہ ہو تو دنیا سے رابطہ کٹ جاتا ہے نیوز اینکر ہیں اس لیے موبائل فون ہر وقت ساتھ رکھتے ہیں لیکن دفتر جانے کی عجلت میں ایسا ہو جاتا ہے اور ان کی پریشانی کے خیال سے میں پریشان ہو جاتی ہوں۔

## اسما جاوید

(گھریلو خاتون۔ اہلیہ پروفیسر جاوید اسمٰعیل)

یاد داشت بہت اچھی ہے اور کیوں نہ ہو ریاضی کے پروفیسر جو ہیں لیکن چونکہ پروفیسر ہیں اس لیے عموماً نام بھول جاتے ہیں اکثر تو بہت قریبی عزیزوں کے نام تک یاد نہیں رہتے، تقریبات خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی ان کی تاریخیں بھول جاتے ہیں ہمیشہ میں ہی یاد دلاتی ہوں۔ بس ایک یہی شکایت ہے مجھے ان سے۔

☆☆☆

قارئین کرام!

آپ نے شوہر حضرات کی یادداشت کے حوالے سے ان کی بیگمات کے گلے شکوے پڑھے، ممکن ہے کہ جب پاکیزہ کے توسط سے شوہر حضرات تک اس کی رسائی ہو تب اپنی بیگم کی بہترین یادداشت پر ہر شوہر کے لب پر یہی حیرت انگیز شکوہ ہوگا۔ مانا کہ

بھول جانا میرا کمال سہی

لیکن آپ کا ہنر بھی تو لائقِ ستائش ہے کہ میں نے تو محض کمال کیا اور

یاد رکھنے کی تم نے حد کر دی

اور یہ باہمی گلے شکوے ہی زندگی کا حسن ہیں بشرطیکہ کسی بھی فریق کی جانب سے اسے انا کا مسئلہ نہ بنایا جائے۔ بے شک درگزر سے کام لیں تو رشتوں کی ڈور بہت مضبوط ہو جاتی ہے۔ ویسے قارئین اگلی دفعہ بیویوں کے حوالے سے یہی سوال ہو سکتا ہے بتیئے آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆☆

## غزل

دیے امید کے بجھاتی ہیں
کچھ ہوائیں عجیب ہوتی ہیں

معذرت دور کر نہیں پاتیں
کچھ خطائیں عجیب ہوتی ہیں

روک لیتی ہیں چلتے راہی کو
کچھ صدائیں عجیب ہوتی ہیں

ہاتھ اٹھتے ہیں لب نہیں ہلتے
کچھ دعائیں عجیب ہوتی ہیں

دل کو دل کے قریب لاتی ہیں
وہ فضائیں عجیب ہوتی ہیں

عشق کا انجام بے وفائی ہے
وہ وفائیں عجیب ہوتی ہیں

بھول جاتی ہیں اپنی ہستی کو
ساری مائیں عجیب ہوتی ہیں

موسم گل کو روکتی ہیں کنول
یہ خزائیں عجیب ہوتی ہیں

شاعرہ: یاسمین کنول۔ پسرور

## بھروسا

آپ کی آنکھیں اکثر وہی لوگ کھولتے ہیں۔ جن پر آپ اکثر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر لیتے ہیں۔

مرسلہ: مہرین ضیا بخش۔ کراچی

# وہ آئے بزم میں.....

نزہت اصغر



## پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی، بے شمار
## حسین و یادگار تحریروں کی خالق
## مایہ ناز مصنفہ..... نگہت سیما سے دلنشیں گفتگو

اپنے باذوق قارئین کی خدمت میں سلام اور دعائیں لیے ایک مرتبہ پھر حاضر ہیں۔
جناب کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ جن کے تعارف کے سلسلے میں الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، البتہ

جذبات کہتے ہیں یہ بھی لکھو اور وہ بھی لکھو...... کچھ ایسی ہی صورت حال ہمیں محترمہ نگہت سیما کے تعارفی کلمات میں بھی پیش آئی کہ ہماری یہ رائٹر سدا پاکیزہ کے ساتھ، ساتھ رہیں وہ بھی اپنی پیاری، پیاری خوش نما، سبق

آموز، چشم کشا اور بے حد یادگار اچھوتے موضوعات کی حامل تحریروں کے ذریعے......ہم نے ان سے فرمائش کی اور انہوں نے ہماری یہ فرمائش بہت پُر خلوص انداز میں پوری کی۔

نگہت سیما کی تحریریں ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں......ان کے قلم سے نکلا ایک، ایک حرف قابلِ ستائش اور دلنشیں ہے۔ نگہت نے ہر دور میں ہر موضوع پر بھرپور لکھا اور قلم کی حرمت کا پورا حق ادا کیا......دل تو یہی چاہتا ہے کہ ہم ان کے بارے میں لکھتے چلے جائیں......مگر مضمون کی طوالت کا خوف ہے سو اتنے ہی لکھے کو بہت جانیں۔ یہ بھی بتاتے چلیں کہ نگہت سیما نے اپنے حالیہ ناول کے بارے میں بھی چند وضاحتیں دی ہیں اور جناب تصویری ملاقات آپ کی اپنی اس ہر دلعزیز مصنفہ سے نہ ہو سکے گی لیکن آپ ان کی تحریر میں ان کی تصویر بخوبی تلاش کر سکتی ہیں تو بات چیت کے منتظر باذوق قارئین اب مزید دیر کیے بغیر ہم اپنی مہمان سے سوالات کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......نگہت سیما آپ کو آج کی اس بزم میں خوش آمدید کہتے ہیں، بتائیے جناب یہاں آمد پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

نگہت سیما ❖......مجھے آپ نے اس بزم میں آنے کی دعوت دی بہت شکریہ......مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے اور اچھا لگ رہا ہے کہ اس محفل میں محبتوں کی مہک ہے، پھولوں کی خوشبو ہے۔ میں نے اس بزم میں آنے والی سب رائٹرز کے جواب اور آپ کے سوالات کو پڑھا، بلاشبہ یہ ایک منفرد سی محفل سجائی ہے آپ نے اور اس کے لیے ادارہ پاکیزہ انجم انصار، عذرا رسول اور نزہت اصغر آپ مبارک باد کی حقدار ہیں۔ ہر رائٹر سے عام انٹرویو سے الگ اور منفرد سوالات تھے۔ میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کسی روز آپ مجھے بھی اس بزم میں آنے کی دعوت دیں گی......بہت شکریہ! (نگہت ذرہ نوازی کا شکریہ......ہم آپ کا ناول اختتام پزیر ہونے کے منتظر تھے)

پاکیزہ ✧......قاری بہنیں ایک عرصے سے آپ کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھیں، اپنے پڑھنے والوں کے لیے ہی تو آپ رائٹرز سے انٹرویو کا یہ سلسلہ شروع کیا گیا ہے تو ذرا بے تکلفی سے تشریف رکھیں اس لیے کہ سوالات کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہے آپ تیار تو ہیں ناں؟

نگہت سیما ❖......ضرور جی، آپ بلا تکلف جتنے اور جیسے چاہیں سوال کر سکتی ہیں کہ یہ سوالات یقیناً میرے اور میرے قارئین کے درمیان رابطے کا ایک ذریعہ ہوں گے۔ (بے شک)

پاکیزہ ✧......سیما اگر بات آپ کے ابتدائی زمانے سے شروع کروں کہ جب آپ کوئی تحریر لکھنا چاہ رہی تھیں تو پہلی تحریر کہانی کی صورت کب اور کیسے کسی بھی صفحات کی زینت بنی؟

نگہت سیما ❖......میں نے لکھنے کی ابتدا بچوں کی کہانیوں سے کی۔ تب میں چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی۔ کہانی سوچنا اور بُننا تو اس سے بھی پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے، پھرتے کہانیاں سوچتی رہتی تھی۔ کراچی سے بچوں کا ایک رسالہ نکلتا تھا......غنچہ......اس میں کہانیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ دیے گئے عنوان پر کہانی لکھنا ہوتی تھی اور پہلی پانچ بہترین کہانیوں پر انعام دیا جاتا تھا۔ یہ انعام کہانیوں کی کتابوں کی صورت میں ہوتا تھا۔ ہمارے گھر میں ہم بچوں کے لیے بچوں کی دنیا، اور تعلیم و تربیت آتا تھا۔ غنچہ پہلی دفعہ میں نے خود خریدا تھا۔ اس میں پریوں، شہزادوں، شہزادیوں کی کہانیاں نہیں تھیں۔ میں نے سوچا میں بھی اس مقابلے کے لیے لکھوں......وجہ انعام میں ملنے والی کتابیں تھیں۔ سو میں نے اپنی اردو کی کاپی سے سادے صفحات نکالے......کہانی لکھی اور گھر میں کسی کو بتائے بغیر عام ڈاک کے لفافے میں بند کر کے

گھر کے نزدیک بنے ہوئے لیٹر باکس میں ڈال دی۔ ٹھیک سے مجھے یاد نہیں کہ اس کا عنوان کیا تھا انصاف یا ظلم کا بدلہ، کچھ ایسا ہی تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ کہانی چھپے گی کیونکہ میری اردو کی لکھائی اچھی نہیں تھی جو اَب بھی نہیں ہے خیر...... لیکن میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب اگلے ماہ میری کہانی پر پہلا انعام ملا...... اگر غنچہ اس سے پہلے ملا ہوتا تو شاید میں اس سے بھی پہلے کہانی لکھ چکی ہوتی۔ یوں یہ سلسلہ چل نکلا...... میں ہر ماہ ہی کہانی لکھنے لگی۔ میری بہن شاہدہ طلعت اور بھائی طارق شاہین بھی ہر ماہ کہانی بھیجنے لگے اور مزے کی بات یہ کہ ہر ماہ ہی ہم تینوں کو کوئی نہ کوئی انعام ملتا...... مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے رائٹر بنانے میں غنچہ کا بھی ہاتھ ہے۔ غنچہ کے ادبی مقابلوں نے لکھنے کا شوق ابھارا۔ میں بہت سارا لکھنا چاہتی تھی اس لیے میں نے ایک کہانی ایک غریب سپاہی لکھ کر سیارہ ڈائجسٹ میں بھیج دی نہ صرف یہ کہ وہ کہانی چھپ گئی بلکہ مقبول جہانگیر صاحب نے جو اُن دنوں سیارہ ڈائجسٹ کے مدیر تھے انہوں نے خط لکھ کر کہانی کی تعریف بھی کی اور مجھے بڑے ادیبوں کو پڑھنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ آپ کے خط سے مجھے اندازہ ہوا کہ آپ اسکول کی طالبہ ہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ ایک روز بڑی کہانی نگار بنیں گی لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنا مطالعہ وسیع کریں۔ (کتنا اچھا کارآمد مشورہ تھا نگہت) سیارہ ڈائجسٹ میں جو پہلی کہانی چھپی تھی اس کا اعزازیہ مجھے پچاس روپے ملا تھا اُن پچاس روپوں کی جو خوشی تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ سیارہ ڈائجسٹ کے بعد میرا اگلا پڑاؤ اوراق تھا...... ڈاکٹر وزیر آغا صاحب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور میری کہانیاں اوراق میں چھپنے لگیں۔ ساتھ ہی ایک روزنامے کے خواتین کے صفحہ پر مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین بھی لکھنے لگی۔ ادبی پرچے چونکہ تین، تین چار، چار ماہ بعد چھپتے تھے اس لیے میں نے اپنی کہانیوں کے لیے دیگر رسالوں کو چنا...... یوں میں ادبی پرچوں سے ڈائجسٹوں کی طرف آگئی۔ جن دنوں میں غنچہ میں لکھ رہی تھی ان دنوں جام نو نام کا ایک پرچہ جو ہماری پڑوسن لیتی تھیں اس میں بھی دو تین افسانے لکھے تھے ایک دن مجھے اقبال بانو کا خط ملا اور انہوں نے مجھے دیگر ڈائجسٹوں میں لکھنے کے لیے کہا۔ یوں دیگر رسالوں میں لکھنے کے ساتھ، ساتھ ایک روز انجم انصار کا خط ملا اور میں پاکیزہ کے لیے بھی لکھنے لگی۔ یوں یہ سلسلہ اب تک چل رہا ہے۔ درمیان میں کبھی کئی، کئی مہینے نہیں بھی لکھا۔ تاہم سفر جاری ہے۔ محترم انور عنایت اللہ (مرحوم) اور امراؤ طارق نے میری کچھ کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور انور عنایت اللہ نے ایک کہانی کا ترجمہ ہرالڈ میں چھپوایا اور پھر ایک کہانی انٹرنیشنل شارٹ اسٹوریز رائٹرز میں بھی چھپی...... یہ کتاب امریکا سے چھپتی تھی اور اس میں مختلف ممالک کے ادیبوں کی کہانیوں کے تراجم چھپتے تھے۔ پاکستان سے میرے علاوہ ایک اور رائٹر کی کہانی بھی منتخب ہوئی تھی۔

**پاکیزہ ✧......** یعنی اسی وقت پتا چلا کہ آپ میں یہ صلاحیت موجود ہے اور پھر گھر والوں نے کتنا ساتھ دیا؟

**نگہت سیما ❖......** باقاعدہ لکھنا تو غنچہ سے ہی شروع کیا تھا لیکن دل ہی دل میں کہانیاں بہت پہلے سے سوچتی رہتی تھی اور اسکول میں سہیلیوں کو سناتی تھی۔ بادشاہوں اور شہزادوں والی کہانیاں، تھری کلاس میں اسکول میں ہونے والے ڈرامے میں ایک شرارتی لڑکا بنی ہوئی تھی تو ٹیچر نے جو مکالمے رٹائے تھے ان میں تبدیلی اور اضافہ کرلیا تھا جو ٹیچر کو بھی پسند آیا تھا۔ یعنی صلاحیت تو بچپن سے ہی تھی۔ جہاں تک گھر والوں کے ساتھ دینے کی بات ہے تو گھر میں امی، ابو اور بڑے بھائی سب ہی اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ابو کے پاس کتابوں کا اچھا ذخیرہ تھا۔ وہ اپنے دور

میں چھپنے والی کتابیں اور تقریباً سب رسالے خریدا کرتے تھے۔ میرے بڑے بھائی جمیل نے بھی اپنے تعلیمی دور میں اور بعد میں خوب صورت شاعری کی۔ شاہدہ طلعت نے میرے ساتھ ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ بہت خوب صورت کہانیاں اور افسانے لکھے۔ جمیل بھائی میری اور شاہدہ کی ہر کہانی پر تبصرہ کرتے تھے......اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ہمیں انگریزی ادب پڑھنے کے لیے بھی کہتے تھے۔

پاکیزہ ✧......آپ کے کریڈٹ پر بے انتہا افسانے، ناولٹ اور ناولز ہیں، کتابی شکل میں یہ کب منظرِ عام پر آئے؟

نگہت سیما ❖...... ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ میرا پہلا افسانوی مجموعہ 2000ء میں کتابی شکل میں آیا۔ مراجعت اس میں سوائے ایک کہانی کے باقی سب اوراق میں چھپنے والی کہانیاں تھیں۔ علامتی، نیم علامتی اور وہ ایک کہانی تھی طاق پر دھری عورت......اور یہ پاکیزہ میں چھپی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی 2000ء اور 2001ء میں محترم طارق اسماعیل ساگر نے میری دو کتابیں تریاق اور رے ڈے چھاپیں......اب تک میری 35 پینتیس کتابیں چھپ چکی ہیں، بچوں کے لیے ایک کتاب حدیث کہانیاں لکھی ہیں، جس کا حصہ اول چھپا جبکہ حصہ دوم کا مسودہ پبلشر سے گم ہو گیا ہے...... یہ بارہ کہانیاں تھیں (اوہو پھر نہیں دوبارہ لکھ بھی پاؤں گی یا نہیں...... میں ایک ہی بار لکھتی ہوں اور اسے ری رائٹ نہیں کرتی۔ بس لکھا اور بھیج دیا......اس عادت کی وجہ سے میں نے کئی اچھی کہانیاں کھودیں۔ ایک بار ایک ناولٹ ڈاک میں گم ہو گیا۔ دوبار کہانیاں گم ہوئیں......دوبارہ پھر وہ نہیں لکھ سکی۔ اب کچھ عرصے سے میں فوٹو اسٹیٹ کروا کے نقل رکھ لیتی ہوں۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ چند ایک کہانیاں ایسی بھی تھیں جن کے متعلق چھپنے کے بعد مجھے لگا کہ میں اگر انہیں دوبارہ لکھتی تو یہ زیادہ بہتر ہو جاتیں...... پھر بھی کبھی، کبھی جلدی بھیجنے کے چکر میں سستی ہو جاتی ہے اور میں فوٹو اسٹیٹ نہیں کروا پاتی......ابھی پچھلے دنوں کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکیزہ ✧......آپ نے کن موضوعات کو ترجیح دی؟

نگہت سیما ❖......میں نے تقریباً ہر موضوع پر ہی لکھا۔ کوئی ایک خاص موضوع میری ترجیح نہیں رہا۔ کرنٹ افیئرز، سوشل ایشوز، نفسیاتی مسائل وغیرہ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر تو محبت بھی ان موضوعات کے ہم سفر رہی......جب میں غنچہ میں لکھ رہی تھی تو تب بھی کرنٹ افیئرز میرا موضوع رہے۔ جیسے کشمیر، فلسطین، ویت نام وغیرہ......ظاہر ہے وہ بچپن تھا تو کہانیاں بھی کشمیری، فلسطینی بچوں کے دکھوں اور سوچوں پر مبنی ہوتی تھیں۔

پاکیزہ ✧......آپ نے سوشل ایشوز سے لے کر سیاسی، عسکری اور بڑے، بڑے گلوبل مسائل پر بھی لکھا اس کے لیے آپ کیسے اپنے آپ کو آمادہ کرتی ہیں مطلب پورا ہوم ورک کر کے؟ مشاہدہ کر کے؟ ان کرداروں کو عام زندگی میں جانچنا مختلف رائٹرز کو پڑھنا؟ کرنٹ افیئرز سے باخبر رہنا؟

نگہت سیما ❖......یقیناً ان سب مسائل پر لکھنے کے لیے مشاہدہ، مطالعہ اور کرنٹ افیئرز اور سوشل ایشوز سے باخبر رہنا ضروری ہے۔ غنچہ میں جو کہانیاں میں نے کشمیری، فلسطینی اور ویت نامی بچوں پر لکھیں ان سے میں نے اپنے اردگرد دیکھنا، حالات و واقعات کو محسوس کرنا اور انہیں لفظوں کا روپ دینا سیکھا۔ یہ کرنٹ افیئرز وغیرہ پر لکھنے کی ابتدا تھی۔ میں کوئی سیاسی بصیرت نہیں رکھتی، نہ میں کوئی بہت بڑی تجزیہ نگار ہوں میں حالات و واقعات سے اسی طرح متاثر ہوتی ہوں جیسے عام لوگ ہوتے ہیں لیکن میں انہیں اپنی سوچ، فکر اور احساس کے ساتھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں۔ میں ٹی وی...... نہ دیکھنے کے برابر دیکھتی ہوں۔ اخبارات ہفتے میں تین دن پڑھتی ہوں لیکن جتنا اور جس قدر پڑھتی

ہوں مجھ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ میری ساری کہانیاں تخیلاتی ہیں لیکن میں نے ان میں حقائق کو اس طرح سمونے کی کوشش کی ہے کہ کہانی وعظ نہ بنے اور اس کی دلچسپی برقرار رہے اور لوگ جان سکیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے فلسطین، افغانستان، کشمیر، بوسنیا، کراچی، عراق، مشرقی پاکستان، این جی اوز، جادو ٹونے، صحافت پر بہت لکھا۔ یہ سب میرے اپنے احساسات ہیں ہاں اعداد و شمار میں نے اخبارات سے لیے ہیں۔

کبھی تو خود ہی کسی کہانی کا پلاٹ ذہن میں آجاتا ہے اور کبھی میں کوئی ایک ایشو منتخب کر کے اس کے ارد گرد کہانی کا تانا بانا بُنتی ہوں......ہمیں وہ سہولتیں حاصل نہیں تھیں جو آج کی رائٹرز کو حاصل ہیں، انگلی کی ایک جنبش اور سب معلومات سامنے......

میں نے مطالعے کے علاوہ اپنے ابو اور بھائیوں سے بھی بعض اوقات کسی خاص ایشو پر لکھنے سے پہلے معلومات لیں۔ ایسے موضوعات پر لکھنے کے لیے ہوم ورک تو ضروری ہے۔ مثلاً میں سقوطِ ڈھاکا کے پس منظر میں کہانی لکھنا چاہتی تھی تو میں اپنے کالج کی چھٹیوں میں جمیل بھائی کے گھر تربیلا گئی ہوئی تھی تو ان کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ میں اس موضوع پر لکھ رہی ہوں تو پہلے تو انہوں نے مجھے اس موضوع پر دو کتابیں لا کر دیں۔ ایک تھی میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا......اور دوسری انگلش میں تھی، نام اب یاد نہیں......انہوں نے اپنے ایک بریگیڈیر دوست کو جو 71ء میں مشرقی پاکستان میں تھے اور جنگی قیدی بھی رہے۔ ان کی فیملی سمیت ڈنر پر انوائٹ کیا اور ان سے کہا کہ میری سسٹر کو کہانی لکھنی ہے تو جو کچھ آپ بتا سکتے ہیں اسے بتائیں۔ اپنی پڑھائی کے چکر میں اس ناولٹ کو جمیل بھائی کی زندگی میں نہ لکھ پائی لیکن بعد میں شکستہ آئینے کے نام سے لکھا......وہ جو نامہ بر ہے بہار کا......یہ کشمیر کے ایشو پر لکھی گئی تھی اور اس کے لیے معلومات مجھے ایک اسٹوڈنٹ کے بھائی سے ملیں جو کشمیر میں جہاد کرنے کے لیے چلا گیا تھا لیکن بعد میں اس کے والد اسے لے آئے کہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہاں کیمپ میں جہاں انہیں ٹریننگ دی جاتی تھی مجاہدین کو ہر روز اپنا روزنامچہ لکھنا ہوتا تھا اس نے وہ روزنامچہ بھجوا دیا تھا جس سے مجھے ان کے روز و شب کے معمولات اور دوسری باتوں کے متعلق علم ہوا......ہالینڈ کے پاس منظر میں لکھی جانے والی کہانی کے لیے معلومات شیریں سے لیں جو دو سال ڈیلف میں رہی......وہاں یونیورسٹی ہاسٹل کا ماحول وغیرہ......اس طرح بھائیوں، بھتیجوں وغیرہ سے معلومات حاصل کرتی رہی۔

پاکیزہ ✧......آج تو انٹرنیٹ نے آسانی کر دی ہے ہم دیکھتے ہیں کچھ مصنفات اس سے اپنے مطلب کا مکمل فائدہ اٹھاتی ہیں آپ کا کیا خیال ہے؟

نگہت سیما ❖......انٹرنیٹ سے فائدہ اٹھانا چاہیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں بھی سوچتی ہوں کہ مجھے اس جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن کچھ جاب کی مصروفیات اور کچھ سستی حالانکہ بہت پیاری سدرہ نے میرا page بنایا ہے لیکن میں نے صرف ایک بار ہی کھول کر دیکھا ہے۔ انٹرنیٹ صرف skype کی حد تک شیریں وغیرہ سے بات کرنے کو استعمال کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......کوئی ایسا موضوع یا مسئلہ رہ گیا ہے جسے آپ چاہنے کے باوجود چھیڑ نہیں پائیں؟

نگہت سیما ❖......کچھ ایسا خاص موضوع یا مسئلہ تو نہیں کہ جس پر خواہش کے باوجود نہ لکھ سکی ہوں۔ البتہ مختلف موضوعات پر بے شمار نامکمل کہانیاں پڑی ہیں جنہیں مکمل کرنے کی خواہش ہے۔ بچوں کے لیے کچھ لکھنے کی خواہش ہے۔ ہمارے دور میں بچوں کے لیے بڑی اچھی دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں لکھی جاتی تھیں مجھے یاد ہے......الف، ن والے الن، کمال احمد رضوی صاحب کا ناول ایک مکان دو دیواریں اور چیتل کی ٹوپی وغیرہ سبق آموز بھی تھے اور دلچسپ بھی......

آج کل بچوں کے لیے ایسے ناول نظر نہیں آتے، پکار

کے نام سے بچوں کے لیے ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا اسے مکمل کرنے کی خواہش ہے...... یہ اس لیے ادھورا رہ گیا ہے کہ میں اسے انگریزی زبان میں لکھنا چاہتی ہوں یا پھر اس کا ترجمہ انگریزی میں ہو...... یہ دنیا بھر کے مظلوم بچوں کی پکار ہے۔ اسی طرح میرا ایک ناول...... اللہ صیب جی ہے جس کا پہلا حصہ ایک میگزین میں چھپ کر ایوارڈ بھی حاصل کر چکا ہے۔ وہ اپنی جگہ مکمل ہے لیکن اس کے مزید حصے بھی ہیں جو آدھے ادھورے لکھے پڑے ہیں۔ بچوں کے لیے سیرتِ نبی آسان اور سادہ زبان میں لکھنے کی خواہش بھی ہے۔ اور بے شمار ناولٹ کہانیاں اور افسانے ہیں جنہیں کتابی شکل میں چھپوانے کی خواہش ہے۔ خاص طور پر کہانیوں کا مجموعہ۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے خیال میں آج کی رائٹرز کیسا لکھ رہی ہیں...... کھل کر بتائیں، آپ کے یا آپ کے ہم عصروں کے مطابق ہے یا نہیں؟

نگہت سیما ❖...... آج کل کچھ رائٹرز تو اچھا لکھ رہی ہیں اور کچھ گزارے لائق...... ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، میں نے اور میرے ہم عصروں نے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق لکھا اور وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق لکھ رہی ہیں، کچھ موضوعات تو ہر دور میں ایک ہی ہوتے ہیں، بھوک، محبت، غربت وغیرہ بس حالات و واقعات مختلف ہوتے ہیں۔ پہلے خطوط کا دور تھا اب انٹرنیٹ اور موبائل کا دور ہے تو کچھ نہ کچھ فرق تو ہے۔

پاکیزہ ✧...... ماہنامہ پاکیزہ سے دوستی کی کیا کہانی ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتائیں؟

نگہت سیما ❖...... پاکیزہ کے ساتھ دوستی کا رشتہ بہت گہرا ہے اور مضبوط ہے یاد نہیں کتنے سال ہو گئے لیکن جب پہلی بار انجم نے لکھنے کے لیے کہا تو تب سے ہی لکھ رہی ہوں۔ میں نے پہلا قسط وار ناول بھی ''دھوپ، بارش اور سائے'' پاکیزہ کے لیے لکھا۔ اس سے پہلے ایک ناولٹ بہ نوک خارجی رقص تیرہ اقساط پر مبنی لکھ چکی تھی لیکن قسط وار ناول کے متعلق میں سمجھتی تھی کہ یہ صرف مخصوص رائٹر ہی لکھ سکتے ہیں کیونکہ مجھے ایسا ہی باور کرایا گیا تھا۔ جب مجھے انجم نے ناول لکھنے کے لیے کہا تو حیرت کے ساتھ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ یہ ناول پاکیزہ میں تقریباً ساڑھے تین سال تک چھپتا رہا اور اسے کتابیات پبلیکیشنز نے کتابی شکل میں چھاپا۔ اور اب ایک بار پھر پاکیزہ نے مجھے ناول لکھنے کا اعزاز دیا۔ پاکیزہ کے لیے میرے دل میں بہت محبت ہے۔ پاکیزہ نے ہمیشہ سینئر اور جونیئر رائٹر کو یکساں عزت دی۔ کبھی سینئر رائٹرز کو اس لیے ڈی گریڈ نہیں کیا کہ ینگ لڑکیوں نے ان کی تحریروں کو نہیں پڑھ رکھا۔ ایک اور بات جس نے پاکیزہ کی قدر میرے دل میں بہت بڑھا دی ہے وہ یہ ہے کہ سینئر رائٹرز کو مان دیا جاتا ہے اور بلاوجہ کٹنگ نہیں کی جاتی۔ (بہت بہت شکریہ نگہت آپ کے جذبات قابلِ قدر ہیں)

پاکیزہ ✧...... اب تک کی پاکیزہ میں چھپی آپ کی تحریروں میں آپ خود کس سے مطمئن ہوئیں؟

نگہت سیما ❖...... اگر رائٹر اپنے لکھے سے مطمئن ہو جائے تو شاید اس کے سفر کا اختتام ہو جائے...... مزید اچھا لکھنے کی خواہش میں وہ لکھتا چلا جاتا ہے۔ پاکیزہ میں چھپنے والی کئی تحریریں ایسی ہیں جو مجھے پسند ہیں بہت پرانی تو مجھے یاد نہیں ہیں لیکن گزرے چند سالوں میں جو چھپیں ان میں کوئی شہر ایسا بساؤں میں جو کارگل اور وزیرستان کے پس منظر میں تھی۔ ایک کشمیر کے متعلق تھی شاید راہِ جنون نام تھا۔ پھر ایک امید صبح والی پاکستان اور کراچی کے حالات کے پس منظر میں لکھی تھی۔ نام یاد نہیں...... تو ایسی کئی کہانیاں ہیں۔

پاکیزہ ✧...... اپنی تحریروں پر تنقید کس حد تک برداشت کرتی ہیں؟ کیا یہ اصلاح میں معاون ثابت ہوتی ہے؟

نگہت سیما ❖...... مجھے اپنی تحریروں پر تنقید بری

نہیں لگتی اگر وہ مثبت اور تعمیری ہو......ایک دو بار میرے قارئین نے میری معمولی غلطیوں کی نشاندہی کی تو مجھے اچھا لگا تھا کہ وہ اتنے دھیان سے پڑھتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں نئی نسل رسالے، جرائد اور ڈائجسٹ پڑھنے کی شوقین ہے؟ اگر نہیں تو کیوں؟

نگہت سیما ✧......میرے خیال میں نئی نسل میں کتابیں پڑھنے کا رجحان ہے تو لیکن مجھے اندازہ نہیں کہ پہلے زیادہ رجحان تھا یا اب......میرے محدود مشاہدے کے مطابق تو رجحان کم ہوا ہے۔ جس طرح ہم سب بہن بھائی بچپن سے ہی مطالعے کے شوقین تھے۔اس طرح ہمارے بچوں کو شوق نہیں ہے۔صرف اشفاق بھائی کے سب بچوں میں یہ شوق بہت زیادہ ہے بلکہ ان کی ایک بیٹی ماہم لکھتی بھی تھی۔ مریم غازی کے نام سے۔ ہمارے بچپن میں ہماری فرینڈز کو بھی پڑھنے سے دلچسپی تھی اور ہم آپس میں کتابوں کے تبادلے کرتے رہتے تھے لیکن اب اس طرح نہیں ہے۔ شاید ترجیحات بدل گئی ہیں۔ کتاب کی جگہ انٹرنیٹ اور دوسری مصروفیات نے لے لی ہے۔

پاکیزہ ✧......آج تو آن لائن پڑھنے کا رواج ہو رہا ہے کیا اس سے وہ لطف آتا ہے جو مزہ رسالہ ہاتھ میں لے کر اپنے فالتو وقت کو پُرلطف انداز میں گزارنے پر آتا تھا کہ اس کے لیے بجلی کا ہونا بھی ضروری نہیں؟

نگہت سیما ✧......مجھے آن لائن پڑھنے کا مزہ نہیں آتا۔ میں تو اپنے بیڈ پر آرام وسکون سے ٹیک لگا کر پڑھتی ہوں۔ایک دو بار میں نے ایک آدھ چیز دیکھی ہے، اسکول سے آکر نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر جب چار بجے میں بیڈ پر آرام کے لیے لیٹتی ہوں تو پھر عصر کی نماز تک یہ میرا مطالعہ کا وقت ہوتا ہے۔ اخبار کوئی ڈائجسٹ یا کوئی کتاب...... دوسری شفٹ عشا کے بعد سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھنا...... درمیان میں کچھ لکھنے کا موڈ بن جائے تو لکھنا۔

پاکیزہ ✧......یہ بات تو ہے کہ جدید زمانے کے ساتھ جدید آلات کا استعمال بھی وقت کی ضرورت ہے، ظاہر ہے زمانے کے ساتھ تو چلنا پڑتا ہے مگر آج بھی ترقی یافتہ ممالک کے افراد کے ہاتھ میں اخبار اور کتابیں چاہے comics ہی کیوں نہ ہوں نظر آتی ہیں، کیا ایسا نہیں ہے؟

نگہت سیما ✧......یورپ میں ٹرین میں بیٹھے ہوئے ہر دوسرے شخص کے ہاتھ میں بھی کتاب نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں کتاب سے ایسی محبت نہیں پائی جاتی۔(اسی بات کا تو افسوس ہوتا ہے)

پاکیزہ ✧......وہاں کوئی بوڑھا بغیر اخبار کے نظر نہیں آتا، ہمارے ہاں آج بچے، بڑے کیا اتنے ہی شوق وذوق سے ڈیلی پیپر پڑھتے ہیں؟

نگہت سیما ✧......نہیں، ہمارے ہاں اتنے ذوق وشوق سے اخبار نہیں پڑھا جاتا جس طرح دوسرے ممالک میں پڑھا جاتا ہے۔ میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ کئی گھروں میں دو، دو اخبار آتے ضرور ہیں لیکن پڑھے نہیں جاتے۔

پاکیزہ ✧......مطالعے کا رجحان یا اس کی ترغیب کون دلاتا ہے؟ والدین، استاد یا ماحول؟

نگہت سیما ✧......مطالعے کا رجحان گھر کے ماحول اور والدین کی ترغیب سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ صرف استاد کے ترغیب دلانے سے نہیں ہوتا۔ میں اپنے اسٹوڈنٹ سے کہتی رہتی ہوں کہ اپنی انگریزی اردو بہتر کرنے کے لیے کتابیں پڑھا کریں لیکن میرا نہیں خیال کہ میرے کہنے سے کسی نے پڑھا ہو۔ ہم نے اپنے گھر میں فارغ وقت میں سب کو کتابیں پڑھتے دیکھا تو ہمیں بھی شوق پیدا ہوا۔ ابو نے ہمارے دل میں کتاب سے محبت ڈالی۔ بچپن سے ہی کتابیں ہم سب بہن، بھائی بہت احتیاط سے سنبھال کر پڑھتے اور رکھتے تھے۔ صفحے نہیں موڑتے تھے، ابو نے درجنوں کے حساب سے بک ٹوکن لا کر رکھے ہوئے تھے۔ پھر

ہمارے نام الگ، الگ رسالے جاری کروا رکھے تھے۔ چھوٹا بھائی ون میں تھا تو اس کے نام بچوں کی دنیا آتا تھا۔ میں تھری میں تھی میرے نام تعلیم و تربیت اور شاہدہ سکس میں تھیں تو ان کے نام زیب النسا آتا تھا۔ اور وہ ہمارے رسالے بھی پڑھتی تھیں اور اپنے بھی۔ مجھے یاد ہے جب دادی جان ہمارے گھر ہوتی تھیں تو وہ ہم سے ناول سنا کرتی تھیں۔ محلے کی لائبریری سے اے آر خاتون اور زبیدہ خاتون کے ناول منگوائے جاتے تھے اور رات کو جب ہم اپنے بستروں پر لیٹتے تو شاہدہ پڑھ کر سنایا کرتی تھیں اور ہم سب شوق سے سنتے تھے۔ ایک بار شاہدہ ٹامس ہارڈی کا ناول ٹیس آف دی ڈی اربر ویلز پڑھ رہی تھی تو دادی جان بضد کہ خود پڑھ رہی ہے ہمیں بھی سناؤ۔ اب شاہدہ پہلے انگلش پڑھتیں اور پھر ترجمہ کر کے سناتی جاتیں...... اب ہنسی آتی ہے لیکن ایسا ہی ہوا تھا اور ہم نے شوق سے سنا تھا۔ (واہ بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... آج افسانوں کے موضوعات بدل گئے ہیں، خالص رومان اور افسانوی محبت کہیں دور ہی چلی گئی ہے، آپ کس حد تک اس بات سے متفق ہیں؟

نگہت سیما ✧...... یہ سچ ہے کہ آج افسانوں کے موضوعات بدل گئے ہیں لیکن محبت ایک ایسا لافانی جذبہ ہے کہ خالص افسانوی محبت نہ ہونے کے باوجود ہر دور میں کہانیوں میں کسی نہ کسی صورت، محبت کم یا زیادہ موجود رہی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو خالص افسانوی محبت بھی کہیں کسی کہانی میں نظر آجاتی ہے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کا تعلق درس و تدریس سے ہے اگر کسی اسٹوڈنٹ کے بیگ میں رسالہ دیکھتی ہیں تو کیا ردِعمل ہوتا ہے؟

نگہت سیما ✧...... مجھے تقریباً تیس سال ہو گئے ہیں پڑھاتے ہوئے لیکن ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا کہ میرے لیکچر کے دوران کسی نے کوئی اور کتاب پڑھی ہو...... ہاں اگر بیگ کے اندر کسی نے کوئی کتاب رکھی ہوئی ہو تو میں اگنور کروں گی۔

پاکیزہ ✧...... اپنے پسندیدہ مصنفین بھی بتائیں۔ کیا موضوعات پڑھتی ہیں؟

نگہت سیما ✧...... کوئی خاص موضوع نہیں جو مل جائے پڑھ لیتی ہوں، پسند نہ آئے تو تھوڑا سا پڑھ کر چھوڑ دیتی ہوں میرے پسندیدہ مصنفین کی فہرست بہت طویل ہے۔ بعض اوقات کوئی چھوٹا ادیب بھی بڑی کہانی تخلیق کر دیتا ہے اور کوئی بڑا ادیب چھوٹی کہانی...... اس لیے اگر مجھے کسی کی کوئی ایک تحریر بھی پسند آتی ہے تو وہ میرے پسندیدہ ادیبوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف مصنفین کو پڑھا اور پسند کیا...... آج آپ کے ان صفحات کے ذریعے ان سب مصنفین کو خراج تحسین پیش کرنا چاہتی ہوں اگر اجازت ہو تو......

(جی ضرور) بچپن اور لڑکپن میں ابنِ صفی اور نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کو پڑھا۔ پانچویں جماعت تک میں نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کے وہ سب ناول پڑھ چکی تھی جو ہمارے گھر میں تھے۔ نسیم حجازی کے خاک و خون، آخری چٹان اور رشید اختر ندوی کے ناول یلغار کو بے شمار بار پڑھا۔ اسی طرح پانچویں جماعت میں ہی ابنِ صفی کے بے شمار ناول پڑھ لیے تھے۔ خاک و خون نے پاکستان سے محبت پیدا کی اور ہجرت کے دکھوں سے آشنا کرایا۔ دوسرے تاریخی ناولوں نے اپنی شاندار اور کربناک تاریخ سے روشناس کرایا۔ انکل سام زکیبن، جیسے ناولوں سے دنیا کے حالات پتا چلے۔ طارق ابنِ صفی کے ناول پڑھنے کے لیے لاتا وہ جہاں بھی چھپاتا ہم (میں اور شاہدہ) ڈھونڈ لیتے تکیے کے غلاف میں گدے کے نیچے، الماری میں...... ابنِ صفی وہ رائٹر ہے جس نے پڑھنے والا ایک بڑا طبقہ پیدا کیا۔ خیر اور شر کی جنگ میں خیر کی فتح اور وطن اور اہلِ وطن سے محبت کا جذبہ اور کچھ کر لینے کی آرزو ان ناولوں کو پڑھ کر خود بخود دل میں پیدا ہوتی ہے۔ ابنِ صفی کو اتنی کم عمری میں

پڑھا کہ میں عمران، حمید اور فریدی کو حقیقی کردار سمجھتی تھی اور بس میں سفر کرتے ہوئے مسافروں میں حمید، فریدی اور عمران کو ڈھونڈتی تھی اور imagination power اتنی زیادہ تھی کہ بس میں بیٹھے، بیٹھے پوری ایک کہانی بنا لیتی تھی۔ ابو کے ذخیرہ کتب میں پیری میسن وکیل اور شرلاک ہومز کے تراجم بھی تھے لیکن ان میں وہ چاشنی نہیں تھی کہ جو ابنِ صفی کے ناولوں میں تھی۔

بچپن گزرا مطالعے میں وسعت پیدا ہوئی تو پہلے تو ابو کے پاس موجود بہت ساری کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ابوالکلام آزاد کی غبارِ خاطر بھی چھٹی ساتویں میں ہی پڑھ ڈالی تھی۔ کچھ کتابوں کے متعلق ابو نے کہا تھا یہ آپ کے پڑھنے کی نہیں ہیں جیسے عصمت کی ٹیڑھی لکیر...... اور منٹو کی کتابیں...... اور ہم نے ان کی عدم موجودگی میں بھی کبھی ان کتابوں کو نہیں پڑھا۔ بی ایڈ میں مجھے مسز افضل توصیف نے عصمت اور منٹو کو پڑھنے کے لیے کہا...... دو تین کتابیں پڑھیں۔ عصمت چغتائی کی تحریر میں مجھے شگفتگی اور برجستگی لگی لیکن منٹو کی جو چند ایک کہانیاں پڑھیں وہ طبیعت پر گراں گزریں حالانکہ ایک دنیا انہیں بہت بڑا ادیب مانتی ہے۔ مزے کی بات بتاؤں ابو نے جن کتابوں کو تب پڑھنے سے منع کیا تھا آج تک نہیں پڑھیں۔ ابو نہیں ہیں اب اور ہم بوڑھے ہو گئے ہیں پھر بھی نہیں...... آپ کو شاید یقین نہ آئے لیکن ایسا ہی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرا مطالعہ وسیع نہیں ہے۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، عبد اللہ حسین، الطاف فاطمہ، نشاط فاطمہ، قراۃ العین حیدر، کرشن چندر، نجیب محفوظ گورکھی، مستنصر حسین تارڑ ان کی سب تحریریں تو میں نے نہیں پڑھیں لیکن جو پڑھیں ان میں سے کوئی نہ کوئی مجھے پسند ہے۔ اس لیے میرے پسندیدہ مصنفین میں شامل ہیں۔ الطاف فاطمہ کی چلتا مسافر اور دستک نہ دو نے بہت عرصہ اسیر رکھا۔

جمیلہ ہاشمی کی دشت سوس...... کا سحر بھی عرصہ تک رہا...... بہت سے نام رہ بھی گئے ہوں گے۔ اب یاد نہیں آ رہے۔ ڈائجسٹ پڑھنے شروع کیے تو پہلی پسندیدہ رائٹر بشریٰ رحمن تھیں۔ پھر اس قافلے میں مزید رائٹر شامل ہوتے گئے۔ رفعت ناہید سجاد، انجم انصار کہ طنز و مزاح میں کوئی خاتون رائٹران کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ رفعت سراج، غزالہ نگار، ہما کوکب، آسیہ رزاقی، آسیہ مرزا، رخسانہ نگار، فرحت اشتیاق، عنیزہ سید، عالیہ بخاری، فارحہ ارشد، سعدیہ آفریدی، اقبال بانو...... ان کی خالص رومانی کہانیاں بھی لڑکیاں پسند کرتی تھیں...... یہ سب وہ رائٹر ہیں جنہوں نے ڈائجسٹوں کے ادب کو مقبول بنایا۔ بشریٰ سعید اور عمرانہ عبداللہ وہ رائٹر ہیں جن کی صرف ایک، ایک تحریر پڑھی ہے میں نے۔ بشریٰ سعید کی سفال گر اور عمرانہ عبداللہ کی لڑکی ایک چارلسٹن کی کیا تحریر تھی...... پھر نمرہ احمد ہیں وہ بھی اپنی تحریر کے حصار سے نکلنے نہیں دیتیں ان کی تحریر میں ابنِ صفی کے ناولوں کی چاشنی ہے اور جو خوبیاں ہیں وہ تو ہیں آج کل بنت سحر، سائرہ رضا، نایاب جیلانی، صائمہ اکرم و چند دیگر خوب لکھ رہی ہیں۔ میں یہاں اپنی چند بہت پیاری رائٹرز کا بھی ذکر کرنا چاہوں گی۔ جن کی مختصر کہانیاں مجھے پسند آتی تھیں۔ صبیحہ شاہ، دردانہ نوشین، فریدہ، تسنیم نیازی وغیرہ...... خالدہ اسد اور عظمت عزمی بھی یادگار ناموں میں سے تھیں، اس سوال کا جواب بہت طویل ہو گیا ہے پھر بھی لگتا ہے بہت نام رہ گئے ہیں۔

عزیز قارئین نگہت سیما کی خوشبو بھری گفتگو جاری ہے اور ابھی مزید سوالات بھی ہیں اور پھر ان کے ناول پر بھی بات ہوگی...... اس مرتبہ صفحات کا کوٹا محدود تھا لہٰذا معذرت...... اگلے ماہ دسمبر میں اس خوب صورت گفتگو کا سلسلہ دوبارہ یہیں سے جوڑیں گے، فی الحال اجازت دیجیے۔ اللہ حافظ

## باتیں بہار وخزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضرِ خدمت ہے تاکہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

### نگینہ ضیا بنگش......کراچی

1۔ اگر آپ کو اپنا آپ منوانا ہے تو سب سے پہلے حُسنِ اخلاق کو اپنا ساتھی بنالیں آپ ہمیشہ سرخرو رہیں گی۔ شخصیت کو پُر اثر بنانے کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے پر دوسروں سے ملنے، بات چیت کے طریقے سے بھی خود کو منفرد بنا سکتے ہیں۔ اگر میں دل کی بات کہوں تو میری زندگی میں دو خواتین کا بہت بڑا کردار ہے۔ جن کو میں اپنی استاد مانتی ہوں اور ان کے زبردست اخلاق نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ ہماری پیاری باجی انجم انصار اور میری پیاری بہبود ایجوکیشن کی پرنسپل میڈم شاہینہ شیخ جو اپنے اخلاق اور محبت سے بہت دلوں میں جگہ بنا چکی ہیں، میرے خیال میں اخلاق ایک ایسی چیز ہے کہ اگر آپ تعلیم یافتہ نہ بھی ہوں تو تب بھی آپ کو کامیابی کی بلندی تک پہنچا سکتا ہے۔

2۔ میری زندگی کا دردناک واقعہ جس نے میرے فکرو خیال کا رخ موڑ دیا۔ کچھ عرصہ پہلے میں بے حد بیمار ہوگئی تھی اگر صاف کہوں تو نفسیاتی مریضہ بن گئی تھی۔ دل و دماغ کو مایوسی نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ ہر وقت یہی خیال کہ میں مرجاؤں گی۔ میری چھوٹی چھوٹی بیٹیاں اکیلی رہ جائیں گی شوہر تو دوسری شادی کرلے گا اور بیٹا بھی نہیں ہے کہ بہنوں کا خیال رکھ سکے حالانکہ ضیا نے بیماری میں میرا اتنا خیال رکھا کہ میری دعا ہے کہ ایسا جذبہ ہر مرد میں پیدا ہو اپنی بیوی کے لیے مگر وسوسے اور مایوسی میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں نے دنیاداری چھوڑ کر مکمل اپنے رب سے لو لگالی۔ آپ یقین کریں کہ اللہ سے میری دوستی اتنی گہری ہوگئی کہ پانچ وقت کی نماز، قرآن پاک کی تلاوت نفلی روزے تہجد پڑھنے لگی اور سب بھول گئی۔ میرے مالک نے ایسا کرم کیا کہ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگئی لگتا ہی نہیں تھا کہ مجھے کوئی بیماری بھی تھی اور اللہ پاک نے دو پیارے، پیارے بیٹوں سے بھی نواز دیا۔ چپل مولانہ قربان شم

تو ہے واحد تو احد تیرے سوا کوئی نہیں
کیوں مانگوں غیر سے میرا خدا تو ہی تو ہے

مانگنے والے نے جو مانگا اسے وہ مل گیا
اور بن مانگے بھی جو کردے عطا تو ہی تو ہے

(ذکیہ بلگرامی)

3۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے بے حد پسند ہیں جن میں سرِ فہرست بہنوں کی محفل، شمع ہدایت، یادوں کی مالا، اداریہ، جلترنگ، پاکیزہ ڈائری، بزمِ پاکیزہ، روحانی مشورے، نزہت اصغر کے کیے گئے انٹرویوز اور شائستہ زریں کے سروے بہت پسند ہیں۔ میری دلی خواہش ہے کہ پاکیزہ ایوارڈز کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوجائے کیونکہ میں جب اپنے پانچ ایوارڈز کو دیکھتی ہوں تو یقین نہیں آتا کہ مجھ ناچیز کو بھی یہ قیمتی ایوارڈز ملے ہیں تو اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے اور دل چپکے سے سرگوشی کرتا ہے کہ، اے نگینہ اب اتنی بھی نالائق نہیں ہو اچھا...... ہاہاہا
سو پلیز ہم سب بہنوں کو مزید جو نئی بہنیں ہیں ان کو بھی ایوارڈز جیتنے کا موقع دیں بس یہی میری خواہش ہے کہ یہ سلسلہ شروع ہو۔

4۔ پاکیزہ کی پاکیزہ سی مصنفات کو سلام پیش کرتی ہوں اور دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صحت و تندرستی کے ساتھ لمبی عمر دے آمین۔ ماشاءاللہ سب بہت محنت سے لکھ رہی ہیں اور ہم سب کو بہت اچھا پیغام دے رہی ہیں۔ اچھی تحریر دل پر اثر کرتی ہے جب دل پریشان ہوتا ہے تو آپ کی تحریریں دل کو ڈھارس دیتی ہیں۔ میری پیاری، پیاری مصنفات آپ سب ہمیشہ ہمیشہ خوش رہیں الٰہی آمین۔

5۔ میں تو بہت ناچیز ہستی ہوں، اپنے بارے میں کیا کہوں۔ دوسروں کی رائے آپ کے بارے میں صحیح شخصیت کی عکاسی کرتی ہے پھر بھی یہ شعر عرض ہیں جو میری فطرت اور شخصیت کا آئینہ دار ہیں۔

اداس رکھو یا خوش، کچھ گلہ نہیں کرتے
خزاں کے پھول کبھی یوں کھلا نہیں کرتے
ملا دو خاک میں ہم کو مگر دھیان رہے
ہم جیسے لوگ دوبارہ ملا نہیں کرتے

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُراثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں...... کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

## انجم طاہر......کراچی

1۔ جہاں تک اپنی شخصیت کو پُرکشش اور پُراثر بنانے کی بات ہے تو بہت سے طریقے ہیں۔ تعلیم تو بہت ضروری ہے اس کے ساتھ، ساتھ کوئی ایکسٹرا صلاحیت یا ہنر ہو تو کیا بات ہے اور پھر اپنے کردار سے ثابت کریں کہ آپ ایک تعلیم یافتہ، ذمے دار اور معاشرے کا فعال رکن ہیں...... ورنہ مردوں کے اس معاشرے میں اپنے آپ کو پُراثر بنانا بہت مشکل کام ہے۔ یہاں تو گھریلو طور پر (معذرت کے ساتھ) خواتین ہی ایک دوسرے کو دھکیلنے میں مصروف ہیں۔ اگر دیورانی نے اچھا کام کر لیا تو جناب جیٹھانی کو برداشت نہیں اگر نند کی تعریف ہوئی تو بھاوج ناراض یہاں تک کہ بہن، بھائیوں میں بھی مقابلے...... تو ایسے میں ایک خاتون کیا کرے۔ جہاں تک میری بات ہے، میں شادی سے پہلے بھی جاب کرتی تھی پھر شادی ہوئی تو پوری سسرال میں بھی سب کا خیال رکھنے کی کوشش کی۔ جاب جاری نہ رکھ سکی کہ بچے چھوٹے ہیں ویسے بھی میری صحت اب صحیح نہیں رہتی آپ لوگ بھی دعا کیجیے گا اور جناب جاب اور گھر کی ذمے دار لڑکی ہونے کی وجہ سے ہی مجھے پسند کیا گیا تھا۔ یوں میں تو پُراثر رہی ناں!

2۔ جی ہاں اول تو شادی ہی فکر و خیال کا رخ موڑ دیتی ہے مگر میں ایک انوکھا واقعہ ضرور سناؤں گی۔ میں بینک میں جاب کرتی تھی۔ ایک دن ایک بوڑھا شخص 750/= روپے والا بوسیدہ سا بانڈ لے کر آیا کہ اسے کیش کر دیں۔ کیشیر نے کہا بزرگو ابھی اگلے ماہ اس کی قرعہ اندازی ہے شاید آپ کا بانڈ نکل آئے اس نے کہا نہیں اتنے عرصے سے رکھا ہے نہیں نکلا مجھے ابھی پیسوں کی شدید ضرورت ہے۔ اتنے میں ایک صاحب جو چیک کیش کرا رہے تھے انہوں نے وہ بانڈ اس سے خرید لیا اور اسے ہاتھ کے ہاتھ پیسے مل گئے۔ بوڑھا واپس چلا گیا۔

کیشیر نے پوچھا صاحب آپ نے کیوں خریدا ہے اسے ہم پیسے دے ہی دیتے اس کے بدلے وہ صاحب بولے۔ وہ شخص مدد لینا نہیں چاہتا تھا بس اپنی رقم کا ہی تقاضا کر رہا تھا میں بانڈ لے سکتا تھا سو لے لیا ویسے بھی میری چھوٹی بہن دو مہینے سے ضد کر رہی تھی کہ بانڈ لادیں میں اپنی قسمت آزماؤں گی خیر بات ختم ہو گئی۔ اگلے مہینے قرعہ اندازی ہوئی کسی نے غور نہیں کیا لیکن وہ صاحب پندرہ دن بعد آئے اور مٹھائی ہاتھ میں لیے، چونکہ ریگولر کانٹ ہیں اس لیے کیشیر، سیکنڈ کلاس آفیسر اور منیجر سب ہی واقف تھے معلوم ہوا کہ ان کی چھوٹی بہن کا بانڈ کا دوسرا انعام نکلا ہے۔ مزید حیران اس بات نے کر دیا کہ ان کی بہن دعا کر رہی تھی کہ بانڈ نکل آئے تو میں اپنی سہیلی کو تحفے میں موبائل فون دوں گی کیونکہ وہ کافی غریب لڑکی تھی ان کی بہن کی تو دعا قبول ہوئی...... اور ان صاحب نے یہ بات کہہ کر ہمیں مزید حیران کر دیا کہ ان کی بہن کی سہیلی اسی بزرگ شخص کی بیٹی تھی جو مجبوری میں بانڈ بیچنے آیا تھا جق بحقدار رسید والی مثال ہو گئی۔ اس واقعے نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ اور میں خدائی قدرت پر حد درجہ حیران تھی۔ (واقعہ کافی لمبا ہے میں نے مختصراً لکھنے کی کوشش کی ہے)

3۔ پاکیزہ کے سب ہی سلسلے پسند ہیں، آپ لوگ تہواروں اور موقعوں کے حساب سے اچھی اچھی چیزیں دیتے ہیں، میں تو ایک سلسلہ ایسا شروع کروں گی کہ لڑکیاں میک اپ کرنا اور مہندی لگانا سیکھ لیں گی یعنی بیوٹیشن کا کورس آپ کے رسالے کے ذریعے اور تصویروں کے ذریعے...... کہیے کیسا لگا آئیڈیا میں نے بھی بیوٹیشن کا کورس کیا ہوا ہے۔

4۔ پاکیزہ کی مصنفات بہت، بہت پیارا لکھتی ہیں، نئے، نئے موضوعات ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی طرح کے موضوع کو بہت مختلف طرح سے لکھتی ہیں۔ جیسے میاں، بیوی کے رشتے پر ایک سے ایک نئی بات پڑھنے کو ملتی ہے...... یعنی اتنی باصلاحیت ہیں کہ ہر دفعہ نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔

5۔ جناب تصویر تو ہم چار سال پہلے دے چکے تھے شادی کے احوال میں اب تو موٹے بھی ہو گئے ہیں اور تعارف تو بتا ہی دیا پھر بھی شعر سناتی ہوں کہ میں بھی اسی پر عمل کرتی ہوں۔

دیتا ہوں میں خلوص سے اک مشورہ تجھے
ہمت کبھی نہ ہار و مخالف سے ہارنا
ہر چند زندگی کی زمیں سنگلاخ ہے
لیکن کدال صورت فرہاد مارنا

# شادی مبارک

عظمیٰ آفاق سعید

لفظ ''شادی'' اپنے اندر خوشی اور مسرت سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ لفظ آتے ہی اپنے تو اپنے غیروں کے بھی چہرے خوشی سے کھل سے جاتے ہیں۔ اپنوں کا تو سمجھ آتا ہے مگر غیروں کے خوش ہونے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ جیسے آج رات کو کھانا نہیں پکانا پڑے گا......دوپہر کو کھچڑی پکا لو رات کو ڈٹ کر کھائیں گے۔ شاید بھائی، بیٹے کے لیے کوئی لڑکی نظر آجائے۔۔ وغیرہ، وغیرہ...... بہت دنوں سے ایک شادی ہونے کی گونج ہم اپنی پڑوسن کے گھر سے سن رہے تھے چونکہ ان کے بچے اور میرے بچے ہم عمر ہیں اس لیے شادی میں ہونے والی تیاریوں سے ہم خود بخود آگاہ ہو رہے تھے۔ شادی پڑوسن کی بھانجی کی تھی لیکن ہم اور ہمارے بچے خوش ایسے تھے جیسے شادی ہمارے ہی کسی عزیز کی ہو رہی ہے۔ ہماری پڑوسن ہما اپنی بہن فوزیہ، دیورانی اسما اور نند جمیلہ باجی کے ساتھ اس شادی کی تیاریوں میں پیش پیش تھیں۔

''امی مایوں میں پیلے کرتے، مہندی میں واسکٹ اور سفید شلوار قمیص اور شادی کی تھیم پرنس سوٹ ہیں......'' میرے بچے (ایمان اور علی) مجھے آگاہ کر رہے تھے تاکہ اماں جلدی، جلدی تیاری کرلیں۔

''بیٹا ماموں کی شادی میں جو مایوں میں پیلے کرتے پہنے تھے وہ رکھے ہیں۔'' میں نے ان کو اطمینان دلایا۔

''امی، ماموں کی شادی کو دو سال گزر چکے ہیں اگر آپ نے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں تو ہماری اولادوں کے لیے رکھ لیں کیونکہ ہم لوگوں کو تو وہ چھوٹے ہوگئے ہیں۔'' بڑا بیٹا ایمان مجھے کہہ رہا تھا۔

ہماری دوست اور پڑوسن ہما کافی محبت کی خاتون ہیں جتنی بھی بار ہم ملے ہیں ان سے مل کر ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ غرور اور تکبر ان کے پاس سے بھی نہیں گزرا اور یہی حال ان کے بچوں اور گھر کے باقی افراد کا بھی ہے۔ ان کے شوہر سہیل بھائی ہمارے میاں کے بھی دوست ہیں اور وہ بھی ان کے اخلاق اور تمیز کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ ہر تھوڑے دنوں پر ان کی طرف سے کھانے پورے محلے میں بانٹے جاتے ہیں اور کھانے بھی ایسے کہ آدمی اپنے گھر کی ہانڈی پیچھے کردے۔

''امی آپ بھی کچھ بھیج دیا کریں ہما آنٹی کے گھر، ہر تھوڑے دن پر ان کے گھر سے کچھ نہ کچھ آجاتا ہے۔'' میری بیٹی اجیہ مجھ سے ایک دن کہنے لگی۔

''بیٹا ابھی میں سوچ ہی رہی ہوتی ہوں کہ ان کے گھر کچھ بھیجوں تو اتنے میں پھر ان کے گھر سے بریانی اور زردہ آجاتا ہے تو اس میں میری تو کوئی غلطی نہیں ہے ناں......'' میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں، ہاں آپ کی کوئی غلطی نہیں ہے، ہما آنٹی کی ہی غلطی ہے کہ وہ اتنا بھیج رہی ہیں۔'' چھوٹے بیٹے علی نے میری سائڈ لیتے ہوئے کہا۔

اور بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور ہما سہیل کے گھر سے شادی کے کارڈز آگئے جن کا انتظار پچھلے ایک دو مہینوں سے ہو رہا تھا۔ کارڈز تھے یا کہ چھوٹا سا ڈیکوریشن پیس، کارڈ کے اوپر لکڑی کا جھروکا اس کے نیچے لکڑی سے دلہن انعم اور دولہا مبشر کے نام کا لوگو چسپاں تھا۔ کارڈز کے اندر مختلف رنگوں کے امتزاج کے کئی کارڈز موجود تھے۔ جیسے مایوں کا کارڈ پیلا، شادی کا لال جبکہ ولیمے کے کارڈ کا رنگ جامنی تھا۔

شادی کی تقریبات کا آغاز یوں تو اللہ کا نام لے

# پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُم مریم | نایاب جیلانی | ایماء راحت |

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کر شروع ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر قریبی رشتے دار کے گھر ڈھولکی رکھی جا رہی تھی۔ جس سے آپس میں محبت اور اتفاق کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"امی، آج چاچا پرویز کے گھر ڈھولکی ہے، میں بھی جاؤں گا۔" بڑا بیٹا ایمان ہما کے دیوروں کو چاچا ہی کہتا ہے چونکہ وہ ہما کے بچوں (حسین، رافع، عثمان اور ملا لیج کے چاچا ہیں) اسی لیے محلے کے تمام بچوں کے بھی چاچا ہیں، ان کی بیوی فوزیہ بھی بچوں کو ایسے ہی ٹریٹ کرتی ہیں جیسے کوئی اپنوں کو کرتا ہے۔

"کل ٹیسٹ ہے تمہارا، کہیں میرے ہاتھوں تمہاری ڈھولکی نہ بج جائے۔ کوئی نہیں جائے گا......" میں نے اسے دھمکایا۔

خیر جناب 21 اگست سے شادی کا باقاعدہ تقریبات کا آغاز ہوا۔ اس دن مایوں تھا، ظاہر ہے مایوں کی تقریب ایک بالکل نجی تقریب ہوتی ہے، خاص رشتے دار اس میں مدعو کیے جاتے ہیں۔ ہما ہی مایوں کر رہی تھیں اس لیے ہما مایوں کریں اور محلہ مدعو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا، ایک نکڑ سے دوسرے نکڑ تک کے لوگ مدعو تھے۔ چونکہ یہ لوگ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کے ہاں سندھ کا کلچر دیکھنے کا بھی موقع میسر آ رہا تھا جو کہ عام طور پر نظر نہیں آتا۔

رات نو بجے کا بلاوا تھا اور ہم دس بجے ان کے گھر موجود تھے۔ میری امی بھی میرے پاس آئی ہوئی تھیں۔ سو آج وہ بھی مہمان تھیں۔ پورے گھر کو گیندے کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ گھر کی چھت پر تقریب کا انتظام تھا۔ اسٹیج اجرک، سندھی رلی اور کناروں کو لالٹینوں سے سجایا گیا تھا۔ ماحول میں سندھی گانے گونج رہے تھے۔ جمیلہ باجی، فوزیہ، اسما اور ہما بہت تپاک سے ملیں اور اپنے گھر کی سب خواتین کو لا کر تعارف کراتی رہیں۔ دلہن کی امی فرزانہ باجی بھی بڑی محبت کی خاتون ہیں۔ میں پہلی دفعہ ملی تھی مگر ایسا نہیں لگا جیسے پہلی ملاقات ہو۔ تھوڑی دیر میں ہی مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ہم اپنے محلے والوں سے ملے۔ جن میں ہما عارف تھیں جو اپنی بیٹی مومنہ کے ساتھ موجود تھیں۔ بڑی محبت کی خاتون ہیں، جب بھی ملتی ہیں ہمیشہ ایک پوزیٹو فیلنگ آتی ہے۔ پھر نوشین، سائرہ، روزینہ اور روبینہ بھی موجود تھیں۔ نوشین ہمارے محلے کی انتہائی ماڈرن خاتون ہیں مگر وہاں ان سے بات کر کے لگا کہ جتنی وہ ماڈرن ہیں اندر سے اتنی ہی دیسی ہیں، وہ بڑے پیارے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھیں۔ روزینہ کا تعلق سیاسی گھرانے سے ہے مگر خود کبھی سیاست نہیں کرتیں کم بولتی ہیں مگر ٹھیک بولتی ہیں، وہ بھی سلک کے سوٹ میں تھیں، سائرہ بھی موجود تھیں جو بڑی شفیق خاتون ہیں، ہمارے گروپ میں سب سے بڑی ہیں لیکن چونکہ دوست ہیں اسی لیے یہ طے ہوا ہے کہ سب ان کو ان کے نام سے پکاریں گے۔ دوستوں میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔ ایک اور ہما انجم بھی اس تقریب میں آئی تھیں۔ ہنستی مسکراتی ہما کو جب دیکھو پیار آتا ہے۔ میزبان خواتین سب بہت خوب صورت گوٹے کے روایتی لباسوں میں ملبوس تھیں۔ سب ہی بڑے چھوٹوں نے ماتھا پٹی لگائی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دلہن کو اسٹیج پر لایا گیا اس کے آنے پر سندھی روایت کے حساب سے باجے بجائے جا رہے تھے۔ جیسا ہم ٹی وی پر سندھی شادیوں میں دیکھتے ہیں، تین چار پگڑی باندھے لوگ جھومتے ہوئے بڑی دلکش دھنیں بکھیر رہے تھے۔ دولھا والوں کا استقبال شاندار آتش بازی سے کیا گیا۔ دلہن انعم اور دولھا مبشر دونوں ڈاکٹر ہیں۔ دولھا کے والد اور والدہ بھی ڈاکٹر ہیں (ماشاء اللہ) دلہن کے منہ پر لال رنگ کا گوٹا لگا ہوا کپڑا باندھا گیا۔ نقاب کے طور پر شاید مایوں پر لگایا جاتا ہو کہ لڑکی مایوں بیٹھ گئی ہے، سات سہاگنوں کے ماتھے سے چھوا کر اسے باندھا گیا...... سات کیا میرے خیال سے ستائیس ہو گئی ہوں گی۔ جمیلہ باجی آئی ہوئی تمام مہمان خواتین کو عزت دینے کے لیے ان کا ماتھا چھو رہی تھیں۔ بچے، بڑے روایتی سندھی گانوں پر جھوم رہے تھے۔

جیسے مور تھور ٹلے راتا...... وغیرہ۔

دولھا کی والدہ ڈاکٹر روبینہ تمام چیزیں دیکھ کر کافی خوش ہو رہی تھیں۔ تمام چیزوں کا انتظام کافی طریقے اور سلیقے سے کیا گیا تھا۔ ہم بھی بہت خوش ہو رہے تھے۔ مگر ہمارے خوش ہونے کی وجہ ایک اور بھی تھی، وہ یہ تھی کہ کھانا لگ گیا تھا اور تمام مہمانوں کو کھانے کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ لذیذ کھانا ہو اور گھر جانے کی بھی جلدی نہ ہو تو پھر اس سے زیادہ آرام کی بات اور نہیں ہو سکتی تھی۔

دوسرے دن مہندی کا انتظام مقامی ہال میں کیا گیا تھا۔ ہر طرف خوشی اور مسرت کا ماحول تھا۔ ہما اینڈ فیملی نہایت قیمتی ملبوسات اور زیورات سے سجی ہوئی تھیں۔ آج کی تھیم جیولری جھومر تھا۔ تمام میزبان خواتین نے جھومر لگایا ہوا تھا۔ سب گجرا ئے کی ایشوریائیں...... لگ رہی تھیں۔

ڈھول کی تھاپ پر دلہن کی انٹری ہوئی پھر اسے اسپورٹس کار میں بٹھایا گیا جو بھائی چلا رہا تھا۔

ہماری بیٹی اجیہ کی کافی سہیلیاں ہیں، اسے ہر جگہ اپنی دوست مل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے سال ہم لوگ فیملی ٹرپ پر جب ملائشیا گئے ہوئے تھے۔ وہاں بھی ایک پہاڑی علاقے جینٹنگ ہائی لینڈ تک پر اس کی سہیلی اپنی فیملی کے ساتھ ٹکرا گئی تھی۔

”اجیہ یہاں اگر تمہاری کوئی دوست مل جائے تو میں مانوں؟“ میں نے ازراہِ مذاق اس سے کہا۔

”امی مل گئی......“ کوئی دس منٹ بعد اجیہ نے مجھ سے کہا۔

”کیا مل گئی......؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”سہیلی امی اور کون......؟“ اجیہ خوشی، خوشی کہہ رہی تھی۔ اس کی اسکول اور پھر کالج کی سہیلی شمزہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ موجود تھی۔

”ہم لوگ لڑکے والوں کی طرف سے آئے ہیں، بہت ہی اچھے اور ملنسار لوگ ہیں، ہمارے تو فیملی ڈاکٹر ہیں۔ یہ لڑکا لندن سے پڑھ کر آیا ہے......“ شمزہ کی اماں شگفتہ رپورٹ دے رہی تھیں۔

ہما عارف بہت پیارے شوکنگ پنک کلر کے سوٹ میں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ان کی بیٹی مومنہ بہت ہی کلر فل لہنگے میں تھی۔ فوزیہ گرین کلر کے لہنگے میں چوتھی کی دلہن لگ رہی تھیں۔

ہما (ہماری میزبان) ٹی پنک کلر کے ڈھاکا پاجامہ سوٹ جس پر سلور کام تھا۔ آفت لگ رہی تھیں۔ جمیلہ باجی ہمیشہ کی طرح سوبر لگ رہی تھیں۔ اندرونِ ملک حیدرآباد اور اندرون سندھ کے علاوہ بیرونِ ملک سے بھی مہمان آئے ہوئے تھے۔ اسما کالے اور سرخ کلر کے لہنگے میں اِدھر اُدھر ڈول رہی تھیں۔ نازک سی اسما اپنے آپ کو بھی سنبھال رہی تھیں اور بھاری بھرکم جوڑے کو بھی۔

تھوڑی دیر بعد گانوں پر ڈانس شروع ہوئے۔ خاص طور پر ڈانس فلور بنوایا گیا تھا۔ چاروں طرف گاؤ تکیے اور فلور کشن سیٹ تھے۔ کچھ طرف تخت سجے تھے ڈسکو لائٹ جگ مگ کر رہی تھیں۔ ہال کی چھتوں سے زمین تک گیندے کی لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ بھرپور ڈانس پروگرام جس میں لڑکے والوں کی طرف سے شاندار پرفارمنس دی گئی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ہما کے بیٹوں حسین اور عثمان کے ڈانسر نے بھی چار چاند لگا دیے۔

تھوڑی دیر بعد ہی پُرتکلف کھانے کا اعلان ہوا جس کو ہم نے بھی بے تکلف ہو کر کھایا۔ اور پھر گھر کی راہ لی۔

اگلے دن شادی کا ایونٹ تھا۔ صبح سے ہی بے موسم برسات ہو رہی تھی، جس سے پورا شہر جل تھل ہو گیا تھا۔ حالانکہ کراچی میں برسات شاذ و نادر ہی ہوا کرتی ہے۔

”اللہ، آج شادی میں کیسے جائیں گے؟“ ایمان پریشان ہو رہا تھا۔

”شادی میں رات کو جانا ہے بھائی، ابھی سے کیوں پریشان ہو رہے ہو......“ چھوٹا بیٹا علی، بھائی کی پریشانی دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی خیر خیریت

سے موسم ٹھیک ہو گیا۔

''آج اللہ بھی چاہ رہا ہے کہ ہم شادی میں ضرور جائیں۔'' ایمان خوش ہو کے کہہ رہا تھا۔ ''آج پرنس سوٹ پہننا ہے ناں......آپ کوٹ پینٹ پہننے کے لیے کیوں نکال رہی ہیں......؟'' ایمان کو کپڑے دیکھ کر غصہ آرہا تھا۔

''بیٹا پرنس سوٹ کا دوسرا نام کوٹ پینٹ ہوتا ہے۔'' میں نے بچوں کو بتایا۔

''پرنس سوٹ اور کوٹ پینٹ آپس میں رشتے دار ہوتے ہیں۔''

''سوتیلے رشتے دار، یہ بھی تو بتائیں......'' بڑی بیٹی لقمہ دے رہی تھی۔

خیر جناب کسی طرح بیٹوں کو منا کر راضی کیا گیا اور رات کو تیار شیار ہو کر مطلوبہ ہال پہنچے۔ جب ہال پہنچے تو وہاں پر نکاح ہو رہا تھا۔ مولانا صاحب نے بہت اچھی دعا کرائی جس پر تمام اہلِ محفل نے آمین کہا۔ اللہ تمام لڑکیوں کے نصیب اچھے کرے، آمین۔ سب سے پہلے میں نے دلہن کی امی (فرزانہ باجی) کو مبارک باد دی۔ آج ان کے لیے بہت بڑا دن تھا۔ خوشی اور مسرت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس کے بعد جمیلہ باجی، اسما اور ہما سے بھی فرداً فرداً ملاقات ہوئی۔ ہما عارف آج بھی لائٹ مار رہی تھیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دولھا اور دلہن کی انٹری ہوئی دونوں ہاتھ پکڑ کر اندر آرہے تھے۔ دلہن بھاری جوڑے، قیمتی زیورات سے مزین تھی لیکن سب سے بڑی بات اس کی معصومیت اور خوب صورتی کی تھی یا شاید شادی ایک ایسا دن ہوتا ہے کہ ہر لڑکی ہی حسین لگتی ہے۔

دلہن کی انٹری 3.D لائٹ کی مدد سے آتش بازی کر کے کی گئی جو ایک نئی چیز لگی۔ ہال میں ایک کونے پر اسکرین لگی تھی جس پر پچھلے پروگراموں کی تصویریں چل رہی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر میں کھانے کا اعلان ہو گیا۔

## ذرا سوچیے

کچھ عرصے پہلے ایک ریس کا انعقاد کیا گیا......ریس میں آٹھ بچوں نے بھاگنا شروع کیا...... ابھی کچھ ہی دور تک بھاگے تھے کہ ایک چھوٹی بچی گر گئی۔ چوٹ لگنے کی وجہ سے زور، زور سے رونے لگی۔ جب باقی سات بچوں نے یہ دیکھا تو ایک لمحے کے لیے رکے اور پھر پلٹ کر اس بچی کی طرف دوڑ لگادی قریب پہنچ کر اس بچی کو سب نے مل کر اٹھایا اور پھر ایک ساتھ فنشنگ لائن تک پہنچے۔ یہ منظر دیکھ کر بہت سے لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس ریس کا انعقاد national institute of mental health نے کیا تھا اور جن آٹھ بچوں نے اس میں حصہ لیا تھا وہ سب mentally retarded بچے تھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس ریس میں ہم لوگ شامل ہوتے، تو کیا یہی کرتے؟ شاید نہیں کیونکہ ہمارا دماغ اور ہماری انا ہمیں یہی بتاتی کہ ''چھوڑ سب کو اور جیت جا۔'' ہم شعور اور دماغ والے لوگ شاید یہی کرتے۔

مرسلہ: فرحین عمران، کراچی

کھانے میں کیا تھا جو نہیں تھا۔ کھانے کی میز کا ایک چکر لگانے کے بعد ہی ہم جیسوں کا آدھا پیٹ بھر جائے......لذیذ کھانا جو کہ چاق و چوبند اسٹاف سرو کر رہا تھا۔ حالانکہ کھانے سے پہلے اسٹارٹر کے طور پر جوس اور سموسے کھا چکے تھے۔ لیکن کھانا تو کھانا ہوتا ہے۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔

تھوڑی دیر بعد، معاف کیجیے گا کافی دیر بعد گھر کی راہ لی۔ ایک بھرپور شادی میں شرکت کر کے کافی دنوں بعد کافی مزہ آیا۔

اللہ دلہن انعم اور دولھا مبشر کو خوش رکھے۔

اللہ ہمیں ایسی ہی بھرپور شادیوں کے کارڈز آتے رہیں کہ پھر اُن کے حال لکھ کر کہیں کہ

''میری دوست کے ہاں شادی ہے۔''

☆☆☆

# بلاوا آ ہی گیا

رفیعہ ابدالی



یہ یکم اپریل 2008ء کی بات ہے جب ہمارے بہار کالونی کے مکان کا سودا ہوا، یہ مکان ابو کے نام تھا اس لیے امی نے سب ورثا میں تقسیم کردیا۔ میں نے اس رقم سے حج کرنے کا ارادہ باندھا۔ گزشتہ سات سال سے میں روزانہ تہجد کے وقت اور رمضان میں افطار سے دس منٹ پہلے بہت رقت سے دعا مانگا کرتی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے حج کروا دیجیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہر کام میں مصلحت ہے جسے بندہ نہیں سمجھ سکتا...... میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ میں عمرہ کرنے جاؤں گی۔ میرے ابو ڈاک خانے میں کام کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد امی کو پنشن ملتی تھی ماں کے انتقال کے بعد حکومت غیر شادی شدہ لڑکی کو پنشن دیتی ہے سو مجھے امی کے انتقال کے تیرہ مہینے بعد پنشن ملی جو کہ اچھی خاصی رقم تھی۔ میرے بڑے بھائی نے مجھ سے کہا کہ اس رقم کا تم کیا کرو گی میں نے فوراً کہا میں عمرہ کرنے جاؤں گی انشاء اللہ بس پھر کیا تھا میں نے اور میرے چھوٹے بھائی نے پاسپورٹ بنوایا۔ اس کے بعد اس برق رفتاری سے سارے کام انجام پائے کہ میں خود حیران رہ گئی۔ میری خواہش تھی کہ میں ربیع الاول کے مہینے میں عمرہ کرنے جاؤں، میں پانچ جنوری 2015ء بروز منگل بمطابق 25 ربیع الاول کو عازم سفر ہوئی۔ الحمدللہ، اللہ تعالیٰ نے میری یہ خواہش پوری کی۔ تمام رات میں خوشی اور گھبراہٹ کی وجہ سے سو نہ سکی...... میں اگرچہ کراچی میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی لیکن شہر کی لڑکیوں کی طرح تیز طرار نہیں ہوں میں کبھی تنہا کہیں نہیں گئی ہوں اس کے علاوہ مجھے راستوں کی پہچان بھی جلدی نہیں ہوتی خیر مجھے اور میرے بھائی کو سی آف کرنے کے لیے میری دونوں بھابیاں، بھتیجیاں، بھائی، میری کزن اور ان کے شوہر ہمارے گھر میں ہمیں رخصت کرنے آئے۔ محلے والے بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ ہماری فلائٹ دن کے گیارہ بجے کی تھی لیکن ہم لوگ آٹھ بجے ہی ائرپورٹ جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ نو بجے ائرپورٹ پہنچے میری اور سامان... کی بھی اچھی طرح تلاشی لی گئی، آخر کار ہمارے پاس پرس سے اسلحہ برآمد ہو ہی گیا جو کہ ایک چھوٹے سائز کی قینچی تھی جو میں نے عمرہ کرنے کے بعد بال کاٹنے کے لیے تولیے میں چھپا کر رکھی تھی۔ ائرپورٹ کے عملے نے وہ قینچی رکھ لی۔ فلائٹ لیٹ تھی ایک بجے جہاز نے اڑان بھری ہم لوگ سعودی ائرلائن سے گئے تھے۔ تقریباً ساڑھے چار بجے جدہ ائرپورٹ پر اترے وہاں سب مسافروں کا سامان بے کسی کی حالت میں پڑا تھا۔ ہم دونوں بہن، بھائی کا سوٹ کیس ملے ہی نہیں اگرچہ میں نے دونوں سوٹ کیس پر گہرے جامنی کلر کا کپڑا باندھ دیا تھا۔ خیر بالآخر دونوں سوٹ کیس مل گئے اور اس کے بعد ایک لمبی لائن میں لگ گئے جو عورتوں اور مردوں کی علیحدہ تھی آخر کار ہمارے فنگر پرنٹس اور تصویریں لی گئیں اس کے بعد رہائی ملی اور ہم دونوں بس پر بیٹھ گئے۔ جو ہمیں سیدھا مکہ لے گئی۔ ہوٹل پہنچ کر نہائے اور پھر کھانا کھا کر سیدھا عمرہ کرنے گئے۔ خانہ کعبہ پر جیسے ہی نظر پڑی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں کیا دعا مانگتے کچھ یاد نہیں رہا۔ عجیب ہی کیفیت تھی جسے بیان کرنے سے قاصر ہوں مگر جلد ہی خیال آیا کہ یہ قبولیت کی گھڑی ہے جلدی، جلدی اپنے لیے بھائیوں کے لیے اور جن، جن لوگوں نے کہا تھا اور ملک کے لئے تمام عالمِ اسلام کے لیے دعا مانگی طواف کے بعد سعی کی جہاں، جہاں نماز پڑھنا تھی پڑھی اور خوب دعائیں کیں۔ جی بھر کر آبِ زم زم پیا اور بوتلوں میں بھر کر لائے۔ رات کے تین بجے ہوٹل واپسی ہوئی۔ میرے ایک کزن حسن عثمانی مکہ میں رہتے ہیں۔ ہم نے کراچی سے ہی ان کو بتا دیا تھا پھر مکہ پہنچ کر فون کیا وہ فوراً ملنے چلے آئے فروٹ کے ساتھ وہ دس لیٹر کے کین میں آبِ زم زم بھی بھر کر لائے تھے۔

9 جنوری کی صبح مکہ سے مدینے کے لیے بس میں بیٹھے، مزے کی بات یہ تھی کہ اس دن میرے بھائی کی سالگرہ تھی۔ ایسی منفرد سالگرہ تو اس نے کبھی نہیں منائی تھی۔ بس میں ہمارے سامنے والی سیٹ پر ایک مہذب سی خاتون اور ایک پیاری سی لڑکی بیٹھی تھی۔ میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ اس سے بات چیت کرلو۔ میں نے اس سے کہا کہ پہلے تم ان کے ساتھ آئے ہوئے آدمی سے بات کرو۔ میرے بھائی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی انہوں نے ان آدمی سے بات کی تو پتا چلا کہ وہ ریٹائرڈ کرنل ہیں اور رفیق نام ہے انہوں نے بہت خوش دلی سے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا اور اپنی بیٹی کا موبائل نمبر لینے کی اجازت دے دی۔

لڑکی کا نام انعم رفیق تھا۔ ہم دونوں نے موبائل نمبرز کا تبادلہ کیا۔ انعم نے کہا کہ میں نماز کے لیے جانے سے پہلے بیل دے دوں گی اس طرح ہم سب نماز میں ساتھ ہوجاتے تھے۔ پہلے ہی دن عصر کی نماز کے بعد آنٹی نے مجھے کہا کہ میں ہوٹل واپس جارہی ہوں، مغرب کی نماز کے لیے آؤں گی وہ تو چلی گئیں مگر میرے پاس کوئی لڑکی آئی اور مجھ سے بہت اپنائیت کے ساتھ بات کرنے لگی۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کون ہے میں نے اس سے کہا کہ میں اپنے بھائی کے ساتھ آئی ہوں پھراس نے کہا کہ آپ نے ریاض الجنہ کی زیارت کی میں نے کہا کہ میں آج ہی آئی ہوں اس نے کہا میں آپ کو ریاض الجنہ کی زیارت کراؤں گی آپ اپنے بھائی سے پوچھ لیجیے۔ وہ لڑکی آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی لیکن دیکھنے میں بہت تیز طرار تھی، میرا مشاہدہ ہے کہ کسی کی شخصیت جاننے کے لیے اس کی آنکھوں کو غور سے دیکھیں آنکھوں ہی سے تیزی طراری یا سادگی عیاں ہوجاتی ہے۔ دوسرے ہی دن وہ دوبارہ موجود تھی اس نے مجھ سے کہا کہ آپ اپنے بھائی سے کہیے کہ وہ عشا کی نماز کے بعد ہوٹل واپس چلے جائیں۔ میں آپ کو ریاض الجنہ کی زیارت کے بعد ہوٹل واپس چھوڑ دوں گی اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کے پاس ہوٹل کا کارڈ ہے میں نے اثبات میں جواب دیا تو میں نے اس سے کہا کہ اپنا موبائل نمبر دو اس نے کہا میرے پاس تو موبائل ہی نہیں ہے تو میں نے اس سے کہا کہ اپنی امی کا موبائل نمبر دے دو اس نے کہا کہ امی کسی کو اپنا موبائل نمبر نہیں دیتی ہیں۔ میں تو سوچ میں پڑ گئی کہ اگر میں اس کے ساتھ چلی گئی اور واپس ہوٹل نہ پہنچی تو میرے بھائی مجھے کیسے تلاش کریں گے میں نے فوراً انکار کردیا' وہ لڑکی چلی گئی اور پھر کبھی نہیں ملی۔ میں نے آنٹی سے کہا میرا دل اس کے ساتھ جانے کے لیے بالکل راضی نہیں ہوا انہوں نے کہا کہ آپ میرے ساتھ چلیے گا۔ دوسرے دن میں ان کے ساتھ ریاض الجنہ گئی وہاں بہت رش تھا میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور بہت ساری دعائیں مانگیں۔ واپسی پر میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ایک روز ہم لوگ مدینے کی زیارت کو گئے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے کھجوروں کے باغات دیکھے اور ان کے کنویں کا ٹھنڈا پانی پیا۔ مسجد قبا، مسجد قبلتین میں نماز پڑھی غارِ ثور دیکھا۔ آٹھ دن کیسے گزرے کچھ پتا نہیں چلا۔ 17 جنوری کو نم آنکھوں اور بجھے دل کے ساتھ ہم واپس مکہ آگئے۔ 18 تاریخ کو مکہ کی زیارت کی، غارحرا، جبلِ رحمت کو دیکھا اور دعائیں مانگیں۔ مسجد نمرہ کی زیارت کی۔ میدانِ عرفات دیکھا۔ مسجد نمرہ کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ یہ مسجد سارا سال بند رہتی ہے، صرف حج کے موقع پر یہاں نماز ہوتی ہے۔ 19 تاریخ کو شام کے وقت احسن بھائی کا فون آیا کہ میں گاڑی لے کر آرہا ہوں۔ تم لوگوں کو لینے کے لیے، آج رات دعوت ہے، بھائی نے کہا کہ ہم لوگ تو مغرب کے بعد جارہے ہیں انہوں نے کہا تھا کہ بیس تاریخ کو واپسی ہے۔ بھائی نے بتایا کہ ہماری فلائٹ تو صبح ساڑھے پانچ بجے کی ہے لیکن بس والا اسی وقت ہم لوگ کو جدہ پہنچا رہا ہے۔ اگرچہ بس رات کے دس بجے آئی اگر صحیح وقت بتاتے تو ہم لوگ احسن بھائی کے گھر ضرور چلے جاتے۔ بھابی سے نہ ملنے کا افسوس ہی رہا۔ میں نے دو تین باتیں نوٹ کیں جو مجھے بالکل اچھی نہیں لگیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ مسجد نبویؐ اور خانہ کعبہ دونوں جگہ موبائل سے تصویریں بنائی جارہی تھیں جبکہ تصویر کھنچوانا ہی گناہ ہے پھر ایسی مقدس جگہوں پر تو اور بھی زیادہ گناہ ہے۔ دوسری بات جو میں نے محسوس کی کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں ایسا لگتا تھا کہ یہ کوئی پکنک پوائنٹ ہے کھانے کے ساتھ قہقہے بھی لگ رہے تھے۔ مسجدیں تو عزت اور احترام کی جگہیں ہیں...... ساتھ ہی کھجوروں کی گٹھلیاں پانی کے گلاس ٹافیوں کے ریپر لوگ یونہی چھوڑ کر چلے جاتے تھے جبکہ بڑے، بڑے سبز رنگ کے ڈسٹ بن تھوڑی، تھوڑی دور پر رکھے ہوئے ہیں، تیسری بات جو مجھے سخت بری لگی کہ خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں لوگ کھانے پینے کی چیزیں بانٹتے تھے اور پاکستانی عورتیں اس بری طرح ٹوٹتی تھیں جیسے کبھی کھایا ہی نہ ہو۔ اس طرح کی حرکتیں کرنے سے پاکستانی قوم بدنام ہوتی ہے۔ خدا ان کو ہدایت دے، آمین۔ 20 جنوری کو دن کے ایک بجے واپسی ہوئی اس طرح یہ مبارک سفر اختتام کو پہنچا۔ میں یہاں واپس تو آگئی ہوں لیکن بقول شاعر......

ہم مدینے سے اللہ کیوں آگئے
قلبِ حیراں کی تسکین وہیں رہ گئی
دل وہیں رہ گیا جاں وہیں رہ گئی
خم اُسی در پہ اپنی جبیں رہ گئی
ہم مدینہ سے اللہ کیوں آگئے
زندگانی وہیں کاش ہوتی بسر
کاش بہزاد آتے نہ ہم لوٹ کر
اور پوری ہوئی سب تمنا مگر
یہ تمنائے قلبِ حزیں رہ گئی

آخر میں اپنی تمام قارئین بہنوں سے یہ گزارش کروں گی کہ میرے لیے یہ دعا کریں۔

شہہ والا کے قدموں میں میرا گھر بار ہوجائے۔ الٰہی آمین......

☆☆☆

# بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ......!

☆حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانہ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو...... یاالٰہی دونوں جہاں میں ازل سے ابد تک سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے...... الٰہی آمین

☆☆☆

☆پیاری بہنوں نیا قمری سال شروع ہو چکا ہے، ہماری دعا ہے کہ یہ سال ہم سب کی خوشیوں اور کامرانیوں کا سال ہو جو ایمان کی سلامتی کے ساتھ بسر ہو، آمین۔

اس ماہ کئی خطوط ایسے ملے جس میں خانگی جھگڑوں کا تفصیل سے ذکر تھا۔ نند، بھاوجوں کی لڑائیاں تو سنا کرتے ہی تھے مگر بہنوں کی بہنوں سے لڑائیاں اور ماں کی اپنی بیٹی سے لڑائی کے احوال پڑھ کر حیرت بھی ہوئی اور جب ان تمام معاملات کو بنظرِ غائر دیکھا تو معلوم ہوا کہ صرف برداشت کی کمی اور تیز و ترش جملوں نے جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا تھا۔

پیاری بہنو...... اچھا اخلاق اور نرم لہجہ کسی بھی خوب صورت شخصیت کی عکاسی کرتا ہے...... یہ حقیقت ہے ایسے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو زبان سے کوڑے مارنے کا کام کرتے ہیں مگر ان لوگوں کو کوئی بھی دل سے پسند نہیں کیا کرتا...... سورۂ کہف کی انیسویں آیت کا ایک لفظ ہے وَلْيَتَلَطَّفْ یہ تھوڑا ابھرا کر کے لکھا ہوتا ہے کیونکہ یہاں قرآن کریم کا درمیان آجاتا ہے اور یہ لفظ پورے قرآن کا خلاصہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور اس کا ترجمہ ہے "اور نرمی سے بات کرنا۔" اور جب اللہ نے موسیٰ کو فرعون کے پاس بھیجا تو تب بھی یہی کہا کہ تم اس سے نرمی سے بات کرنا شاید کہ وہ مان جائے۔ وہ انسان کہ جس سے زیادہ متکبر اور گھمنڈ والا شخص دنیا میں اور کوئی نہیں آیا۔ زندگی کتنی ہی بدل جائے اگر ہم اس بات کو مان جائیں کہ نرمی سے بات کرنے کا مطلب بے وقوفی اور کمزوری نہیں بلکہ عاجزی اور اعلیٰ ظرفی ہے۔ جس کو اپنا کر کسی سے بھی لڑائی جھگڑے کا امکان نہیں رہتا۔ مگر یہ خوبی شاید صرف وہ ہی اپنا سکتے ہیں...... جو دل سے صلح پسند ہوتے ہیں۔

اس ماہ کئی خطوط پر بہنیں اپنا اور اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئیں...... اور ظاہر ہے کہ وہ شامل نہیں ہو پائے...... اسی طرح ایک بہن نے اپنا اور اپنے گاؤں جنڈیال فیض اللہ کا تعارف لکھ کر بھیجا مگر اس میں وہ اپنا نام لکھنا بھول گئیں...... اب آپ ہمیں جلدی سے بتادیں کہ اس تعارف کے ساتھ کیا نام لکھا جائے...... اگر آپ اپنا اصلی نام پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں تو اپنا کوئی قلمی نام بھی رکھ سکتی ہیں۔ اس محفل میں ہم نے دو بہنوں کے نام رکھے ہیں...... جی ہاں قلمی نام انہوں نے ہم پر ذمے داری ڈال دی تھی...... باجی آپ کوئی اچھا سا نام رکھ دیں...... اور ہم نے جھٹ رکھ دیے...... (ظاہر ہے اس کام میں تو ہم ماہر ہیں...... درجنوں تو کیا سیکڑوں کہانیوں کی ہیروئنز کے نام بھی تو سوچ بچار کر رکھے ہی تھے...... آہم)

آیئے اب! سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

## مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆اس ماہ ہمیں قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، لاہور کینٹ کی جانب سے دو بہت خوب صورت کتابیں ملیں...... پہلی کتاب خادم انسانیت عبدالستار ایدھی کے بارے میں ہے۔ جس کے مؤلف رانا عامر رحمٰن محمود ہیں...... جس میں عبدالستار ایدھی پر لکھے گئے، پچپن مضامین یکجا کیے گئے ہیں...... عبدالستار ایدھی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لکھا جارہا ہے اور لکھا جائے گا...... ایسی شخصیات دنیا میں کم، کم ہیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانیت کی خدمت بے لوث کی جائے اور یہی ایدھی صاحب کا مشن تھا۔ اس کتاب کا انتساب معروف و مقبول سماجی شخصیت جناب رانا فضل الرحمٰن محمود (مرحوم) ایڈووکیٹ کے نام ہے اور دوسری کتاب مقبول اور محبوب مصنف انتظار حسین کے نام ہے۔ جس کا نام ہے، انتظار حسین ایک عہد، ایک داستان اس کے مؤلفین افتخار مجاز اور عبدالستار

عاصم ہیں۔ اس کے صفحات 655 ہیں۔ یہ بڑے سائز کی بے حد ضخیم کتاب ہے یہ انتظار حسین کے بارے میں 21 دسمبر 1925ء سے دو فروری 2016ء تک پر محیط ہے۔ جس میں ان کا آخری انٹرویو تک شامل ہے۔ انتظار حسین پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے یہ ایک نہایت مفید کتاب ہوگی۔ انتظار حسین جیسے ادیب روز، روز پیدا نہیں ہوتے، ان کی اپنی ادبی خدمات اس قدر طویل اور لائق صد تحسین ہیں کہ ہمیشہ ملکی ادب کا قابلِ فخر سرمایہ رہیں گی۔ ان کے ہم عصروں نے ان پر جو مضامین لکھے ہیں اور جو اخبارات میں اداریے لکھے گئے وہ سب اسی کتاب میں شامل ہیں جو انتظار حسین کے حوالے سے نہ صرف پہلی کتاب ہے بلکہ ان کو خراجِ تحسین بھی پیش کرتی ہے۔
دونوں کتب کی قیمتیں انتہائی معمولی ہیں...... رابطے کے لیے آپ فون کر سکتے ہیں۔ 042.3661302،0300.0515101

☆ عظمیٰ آفاق کی کتاب ذرا سا گھوم لوں میں کا پہلا ایڈیشن ختم ہونے کے قریب ہے، اس کتاب میں تین ملکوں کے سفر نامے بے حد دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں، فلیپ پر محترمہ عذرا رسول، عامرہ شاہد اور دیگر کی رائے ہے، قیمت صرف تین سو روپے، کتاب گھر بیٹھے بذریعہ وی پی حاصل کرنے کے لیے القریش پبلشرز لاہور سے اس نمبر پر رابطہ کیجیے...... اس سے قبل کہ کتاب آپ کو نہ مل پائے۔ (03004183997)

☆ معروف شاعرہ شگفتہ شفیق لندن میں نواسی کے خوب لاڈ اٹھا کر مشاعروں میں شرکت کر کے ٹی وی چینل پر اپنا انٹرویو دے کر واپس کراچی آگئی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ ہماری پیاری تبصرہ نگار نسیم ماپارا امریکا میں عزیز و اقارب سے خوب، خوب ملاقاتیں کر کے کراچی پہنچ چکی ہیں اور انہوں نے یہاں آ کر اپنی سالگرہ منائی۔ (ماشاءاللہ)

☆ مصنفہ سیما مناف کی بہن ریحانہ رومی ان دنوں پاکستان آئی ہوئی ہیں اور ماشاءاللہ اپنے بیٹے شارق رومی کی شادی کے سلسلے میں۔ شارق کی دلہن کی تصویر سوشل میڈیا پر دیکھی بہت پیاری ہے۔ (سیما آپ کو اور ریحانہ رومی کو دلی مبارک باد)

☆ رعنا پاکیزہ کی زبردست فین ہیں اور پاکیزہ کے حوالے سے اپنے بیوٹی سیلون میں خصوصی ڈسکاؤنٹ دیتی ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی بھانجی کے ہاں امریکا میں لڑکا ہوا ہے۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار ارم کمال، فیصل آباد کی بیٹی کرن کمال کے ہاں بیٹا ہوا ہے اور یوں اب ارم نانی اماں بن گئی ہیں۔ (مبارکاں)

☆ مصنفہ نگہت غفار کے بیٹے فہد غفار کی شادی گزشتہ دنوں انجام پائی۔

☆ مستقل قاری بشریٰ رضوی کی بڑی بہن معصومہ بتول کی شادی بخیر و خوبی انجام پائی۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی قاری مسز ستارہ شیخ بہت جلد کراچی میں اپنے نئے بنگلو میں شفٹ ہونے والی ہیں۔ (مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی قاری عمدہ خاں، کراچی کی منگنی ہوگئی ہے۔ (مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار فیروزہ بیگم کی چھوٹی بہن ان دنوں امریکا گئی ہوئی ہیں، اپنے بچوں کے پاس۔

☆ پاکیزہ کی قاری ساجدہ، سندھ کا نکاح بقر عید کے تیسرے دن ان کے گاؤں میں ہوا۔ (مبارکاں)

## دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی قاری شہلا ظفر کی طبیعت بے حد خراب ہے۔

☆ آرزو شاہد تاحال بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی طبیعت ناساز ہے۔

☆ غزل خاں، امریکا ہنوز بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار امینہ عندلیب، سلانوالی کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عذرا بی بی، راولپنڈی بیمار ہیں۔

☆ رخسانہ شہناز صدیقی کی طبیعت ناساز ہے۔

☆ عظمیٰ زہری، اوستا محمد کے جیٹھ کے بیٹے کے لیے دعا کی ضرورت ہے

## انتقالِ پُرملال

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اوکاڑہ کی چھوٹی بہن نصرت گل امریکا میں انتقال کر گئیں۔

✤ مصنفہ نسرین جمیل سیال، گجرات کے بہنوئی غفور صاحب اسلام آباد میں چل بسے اور نسرین جمیل کے شوہر کی جواں سال بھتیجی راحیلہ وفات پا گئی۔

نوٹ: تمام مرحومین کی مغفرت کی دعا کے ساتھ صرف تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر انہیں بخش دیجیے۔ اللہ تعالیٰ تمام مرحومین کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

✤ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”آج جی کچھ ماندہ، ماندہ سا ہے، دل پر بوجھ ہے اور طبیعت پریشان...... جب سے عندلیب انگلینڈ گئی ہیں اکثر ایسا کچھ ہو جاتا ہے کہ بچے یاد آتے ہیں تو دل جیسے کوئی مٹھی میں جکڑ کر زور، زور سے دبوچنے لگتا ہے...... زرک خان میرے ساتھ بہت خوش رہتا تھا اور چھوٹی سی عمر میں میرے ساتھ وقت گزارہ کرتا تھا رات کو مجھ سے لپٹ کر سویا کرتا تھا۔ چھوٹا ہاشم خان رو، رو کر آنکھیں سجا لیتا تھا کہ بڑی مما کو لاؤ اور رات گئے عندلیب مجھے لینے آجاتی کہ ہاشم چپ نہیں ہو رہا تم میرے ساتھ چلی چلو میں بھی سب چھوڑ چھاڑ اس کے ساتھ چلی جاتی۔ زرک خان اور ہاشم خان میرے نواسوں کے نام ہیں، انجم ڈیئر...... ساری بہنیں آپ کے ساتھ اپنے دکھ سکھ شیئر کرتی ہیں...... میں ہمیشہ افسانوں کا ذکر کرتی ہوں یا تحریروں پر تبصرہ کرتی ہوں...... آج میرا دل بہت اداس ہے اس لیے نہ افسانوں کی بات کروں گی نہ کسی افسانے پر کوئی تبصرہ کروں گی...... آج اپنے دل کی باتیں کروں گی...... آج آپ سے اپنے احساسات شیئر کروں گی خیر...... خدا سب کی اولادوں سمیت میرے بچوں کو خوش رکھے لیکن دل پر کسی کا اختیار کہاں ہوتا ہے انجم ڈیئر۔“ (شمیم بہن جب اولاد پردیس چلی جاتی ہے تو وہ ہمارا دل بھی اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ تب ہم بھی پردیسی سے ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر بے وجہ بھی رونے کو جی چاہتا ہے۔ اللہ ہمارے بچوں کو سلامت رکھے۔ ہمیں اپنے اندر حوصلہ تو پیدا کرنا ہی ہے...... ورنہ کر بھی کیا سکتے ہیں)

✤ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے، لاجواب اس لیے کہ آخر میں آپ نے بہت اچھی بات کی اکثر مہمان آتے ہیں یا کہیں جاتے ہیں تو ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل ہوتی ہے جیسے ابھی ابھی لندن یا امریکا سے آئے ہیں میرے گھر میں تو ڈسپنسر لگا ہے اور آج کل ہم جیسے عام لوگوں کے گھر لگا ہی ہوتا ہے مگر میں کہیں بھی جا کر ہر طرح کا پانی پی لیتی ہوں اور اللہ کا شکر کبھی کچھ نہیں ہوا یعنی لکڑ ہضم پتھر ہضم...... اب آتے ہیں افسانوں کی طرف...... گم شدہ محبت سادگی میں پُر کاری کہنا چاہیے پھر بہنوں کی محفل پڑھ کر مزہ آتا ہے اس مرتبہ عنیزہ سید نے بڑا مایوس کیا انجام پڑھ کر بڑا دل دُکھا کہ صرف ایک جملے کے لیے کہ میرا اور آپ کا خون ایک جیسا ہے آپ نے اتنا بڑا افسانہ لکھا اور اینڈ بھی positive نہیں۔ اتنی اچھی اور بڑی رائٹر سے اس انجام کی توقع نہیں تھی اور کوئی ماں اتنی بے رحم اور سخت بھی نہیں ہوتی اس کے نتیجے میں اچھائی سے لوگوں کا اعتماد ختم ہو جائے گا بہویں کان پکڑ کر لیں گی اچھائی سے سنگ سفر سائبان بھی فرحین اظفر کی اچھی تحریر ہے، عقیلہ حق کی قربانی تو دینی ہی پڑے گی سے نے کچھ مزہ نہیں دیا کیونکہ کم از کم میں اپنے ایریے کی حد تک کہہ سکتی ہوں کہ ہر گھر کا ڈیپ فریزر نہ صرف ماسیوں، دھوبی، مسلمان جمعدار اور مالیوں کے گوشت سے بھرا ہوتا ہے معلوم اس طرح ہوتا ہے کہ ملنے ملانے پر ہر خاتون یہ کہتی نظر آتی ہے کہ یار ماسیوں کی وجہ سے ڈیپ فریزر چلا رکھا ہے ورنہ ہمارے لیے تو فریج ہی کافی ہے کیونکہ آج کل لوگ ہیلتھ کانشس بھی ہو گئے ہیں اور گوشت سے کافی حد تک (کم از کم میری جیسی عمر کے لوگ) پرہیز کرتے ہیں، تم جو مل گئے ہو نادیہ احمد نے خوب لکھا خاص طور پر سوتیلی ماں کا کردار positive مجھے اچھا لگا۔“ (تبصرے کا شکریہ)

✤ نگہت سیما، چکوال سے۔ ”ابھی اگست اور ستمبر کا پاکیزہ نہیں پڑھا۔ سوائے آپ کی قسط کے بہت خوب، اچھا جا رہا ہے، اپنا خیال رکھیے گا۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔“ (شکریہ)

✤ نسرین جمیل، سیال گجرات سے۔ ”آپ سے بات کرنا بہت اچھا لگتا ہے آپ کی آواز سن کر دلی سکون ملتا ہے ایک عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ فون اٹینڈ کرتی ہیں اور کبھی مایوس نہیں کرتیں۔ ابھی، ابھی عید گزری ہے اللہ تعالیٰ آپ سب کو ایسی ہزاروں عیدیں نصیب کرے اور ہر عید آپ سب کے لیے مبارک ثابت ہو، آمین۔ آپی آپ کو پتا ہے میرا معصوم سا اکلوتا پوتا عرصہ دراز سے بیمار ہے۔ آپ پاکیزہ میں دعا کے لیے اپیل کر دیجیے گا موسیٰ کے لیے۔ (جی ضرور) پاکیزہ میں بہت سے نئے لکھنے والے ماشاءاللہ شامل ہو گئے ہیں اس لیے مجھے نہیں جانتے کیونکہ میرا آخری ناولٹ

1999ء ستمبر اور اکتوبر میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا میں نے 1983ء سے لکھنا شروع کیا تھا بہت سے پرچوں میں نسرین جمیل کے نام سے لکھتی رہی ہوں۔ 99ء سے بیمار ہوئی تو چھوڑ دیا۔ اب دوبارہ مئی 2016ء کو دوبارہ پاکیزہ سے رابطہ کیا ہے۔ پاکیزہ میں اب نسرین جمیل سیال کے نام سے دوبارہ حاضر ہوئی ہوں اب صرف پاکیزہ میں ہی لکھنے کا ارادہ ہے۔'' (دوبارہ سے آجائیں آپ کو بھی خوشی ہوگی)

یاسمین جاوید اقبال، کراچی سے۔ ''میں پاکیزہ کا آپ کا اور ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہوگا۔ آج میں نے آپ کو یہ بتانا ہے کہ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا پڑھنے کے بعد میں نے ہر جمعرات کو قرآن پاک پڑھنا شروع کیا اور اگلی جمعرات کو ختم کیا... بفضلِ اللہ میں اب تک 25 قرآن پاک پڑھ چکی ہوں۔ اور اس کے پڑھنے سے میں بہت خوش ہوں...... اللہ تعالیٰ زندگی کا ہر مسئلہ خود ہی حل کر دیتا ہے۔ اور اب مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔'' (پیاری یاسمین اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور ہم سب کو بھی ایسی توفیق عطا فرمائے، آمین)

اختر جہاں، بھکر...... آپ کو شمیم فضل خالق کی کتاب چاہیے...... میں شمیم سے کہہ رہی ہوں کہ وہ اپنی کتب بھکر کے اردو بازار میں رکھوا دیں۔ اور چند کتب مجھے بھیج دیں...... میں بہنوں کو انعام کے طور پر دے دوں گی۔

مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ ''ماشاء اللہ اس ماہ آپ کے ناول کی قسط نے دھاک بٹھا دی۔ ہر کردار کے حوالے سے لکھا گیا اور بے حد خوب...... ایسے فاسٹ ناول پر ٹی وی کے سوپ بھی اچھے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس شمارے کے افسانے بھی اچھے رہے۔ ام ایمان، ہاجرہ ریحان، عاشفہ مسعود اور عنیزہ سید کی تحریریں بہت اچھی لگیں۔ اختر شجاعت کی تو میں فین ہوں اور وہ ہر بار بڑی ریسرچ کر کے موضوع کو بڑی عمدگی سے لکھا کرتی ہیں۔ عظمیٰ آفاق کے افسانے یا ناولٹ کا انتظار ہے۔ ثمینہ عظمت کا انٹرویو اچھا اور تصویریں بہت ڈِم لگیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

مسز طاہرہ کا فون خوشاب سے...... ''پاکیزہ بہنوں کی محفل سے پڑھنا شروع کیا تھا اور اب تو اس کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ پاکیزہ پڑھے بغیر رہا نہیں جا سکتا...... گزشتہ ماہ ایک بہن کا ہولناک خط پڑھ کر کانپ کر رہ گئی...... کیسی کیسی شریف زادیاں ان پیروں فقیروں کے چکر میں آکر بھی دامن ہو جایا کرتی ہیں۔ میں نے اس خط کا تذکرہ اپنے شوہر سے کیا...... تب ہم دونوں نے مل کر سوچا اس لڑکی کی شادی ہم اپنے حلقۂ احباب میں کسی نیک اور شریف شخص سے کروا دیتے ہیں اگر وہ بہن شادی کر کے شریفانہ زندگی گزارنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں...... تو میں ان کی مدد کرنے کے لیے حاضر ہوں۔ مذکورہ بہن میرا فون نمبر انجم باجی سے لے کر پہلے مجھ سے بات کرے پھر ہم جلد ملاقات کر کے تمام امور طے کر لیں گے۔'' (پیاری طاہرہ، اس وقت میں اپنی اس خوشی کے بارے میں نہیں بتا سکتی...... جو تمہارا فون سن کر مجھے ہوئی ہے، پاکیزہ کی یہ محفل واقعی محبت کے پھولوں سے گندھی ہوئی ہے...... جہاں ہر بہن دوسروں کا دکھ محسوس کیا کرتی ہے۔ اب آپ لوگ ایک دوسرے سے مل کر آئندہ زندگی کے بارے میں سب بات کر لیں آگے آپ.... خود بہتر جانتی ہیں، تفصیلی طور پر میں نہ لڑکی کو جانتی ہوں اور نہ لڑکے کو مگر آپ سب کے لیے بے شمار دعائیں ہیں، اب جو بھی کچھ ہو وہ مثبت ہو اور دونوں فریقوں کو دلی خوشیاں ملیں۔ مدآمین، ثم آمین۔)

شاہینہ مبارک، ہالہ سے۔ ''اکتوبر کا پاکیزہ پڑھا سب سے پہلے گم شدہ محبت پڑھنا شروع کیا کیونکہ گزشتہ ماہ بے حد سسپنس پر قسط ختم ہوئی تھی...... اس ناول کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ اس میں ہر بات تیزی سے ہوتی نظر آ رہی ہے ناول کی رفتار تیز ہے۔ مجھے آہستہ، آہستہ چلنے والی قسطیں اچھی نہیں لگتیں...... بہنوں کی محفل بار، بار پڑھ کر بور نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ میری دو بھتیجیاں بھی پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہیں یہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں اور ان کی یہ فرمائش ہے کہ ڈراموں میں کام کرنے والی دو جڑواں بہنیں ایمن خان اور منال خان کا انٹرویو پڑھنا ہے۔'' (آپ کی فرمائش نوٹ کی جا رہی ہے)

امینہ عندلیب، سلانوالی سے۔ ''گزشتہ شمارہ آہستہ، آہستہ پڑھا۔ سرورق عام انداز سے مختلف ہے۔ اداریہ سب کے دل کی بات ہے۔ تمام ناول کی اقساط پسند آئیں۔ باتیں بہار و خزاں کی دلچسپ انداز میں ہونا چاہیے۔ اس میں سعدیہ ہما شیخ کو مزاحیہ انداز میں انٹری دینی چاہیے۔ طیبہ عنصر وغیرہ دلچسپ انداز میں لکھیں تاکہ پڑھنے والوں کو سوا دآئے۔ رفعت سراج اپنے ناول میں اگر انگریزی کا استعمال نہ کریں تو...... بس استدعا ہی کر سکتے ہیں۔ سحر ساجد نے اچھا لکھا۔ ام ایمان، نیلم احمد بشیر، ہاجرہ ریحان، فرحین اظفر، عقیلہ حق، صاعقہ عاطف، عاشفہ مسعود سب کے ہی افسانے اچھے لگے، عنیزہ سید نے اپنے انداز سے مختلف لکھا، نزہت اصغر کا کیا گیا انٹرویو اچھا رہا۔ اس سے رائٹرز سے

تفصیلی طور پر متعارف ہو جاتے ہیں...... اختر شجاعت تو ہمیشہ ہی اچھا لکھتی ہیں۔ عظمیٰ کی ڈائری شاندار...... مگر اسے اور بھی کچھ لکھنا چاہیے۔ میں اپنی تمام بہنوں کی مشکور ہوں جو باقاعدگی سے میری صحت یابی کے لیے دعا کرتی ہیں۔“ (تبصرے کا شکریہ آپ کی بہنیں کہہ رہی ہیں کہ جن سے محبت کی جاتی ہے...... ان کے لیے دعائیں تو خود بخود دل سے نکلا کرتی ہیں)

٭ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ ”لندن سے آتے ہی پہلے پاکیزہ پڑھا...... کیا شاندار اداریہ لکھا ہے باجی آپ نے...... گم شدہ محبت پڑھ کر مزہ آرہا ہے۔ رفعت سراج بھی خوب لکھ رہی ہیں۔ سیمارضا ردا کے منی ناول کی ابھی پہلی قسط پڑھی ہے اور اچھی لگی...... اب دیکھتے ہیں کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ اس مرتبہ سارے کے سارے ہی افسانے بہت عمدہ ہیں مگر ان میں ام ایمان، ہاجرہ ریحان اور فرحین اظفر بازی لے گئیں۔ عنیزہ سید کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ثمینہ عظمت علی سے مل کر اچھا لگا۔ ہاں باتیں بہار و خزاں کی... میں مزہ نہیں آرہا۔“ (اس سلسلے میں سب شرکت کر سکتے ہیں، تم بھی کر سکتی ہو)

٭ رابعہ خان، جھنگ سے۔ ”پہلی مرتبہ رائے دے رہی ہوں...... جب ہمارے ہاں پاکیزہ آتا ہے تو میری امی کہتی ہیں کہ اب تو رابعہ کام سے گئی...... جب تک پورا پاکیزہ ختم نہیں کرے گی، اٹھے گی ہی نہیں...... اور میں تو بہت جلد پڑھ لیتی ہوں، مجھے سارے کا سارا ہی پاکیزہ پسند ہے پورا پڑھتی ہوں مگر جو تحریر سب سے زیادہ پڑھتی ہوں، وہ پاکیزہ کے خطوط لگانے والا حصہ ہے اپنے خط میں نے دوسرے ڈائجسٹوں میں نہیں لگے دیکھے...... یہاں اپنائیت سی لگتی ہے، مجھے پاکیزہ کے صفحات کے کونوں میں لکھی ہوئی تحریریں تک پسند ہیں اور پاکیزہ ڈائری بھی اچھی لگتی ہے۔“ (اس محفل میں خوش آمدید...... رابعہ تم اپنا اور اپنی سہیلیوں کا انٹرویو لکھ کر ہمیں بھیجو...... بغیر تصویر کے بھی لگ سکتا ہے، ہاں پاکیزہ کے لیے اتنی محبت کے لیے تو جزاک اللہ ہی کہوں گی کہ یہ تو آپ کا اپنا ہی ڈائجسٹ تو ہے)

٭ ایک بہن، کراچی سے۔ ”انجم باجی میں بہت کام کرتی ہوں، گھر کے، باہر کے لوگوں کے سب کے کام آتی ہوں بس مجھ میں سب سے بڑی خامی ہے کہ مجھ سے باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھی جاتی، بہت کوشش کرتی ہوں کوئی آسان سی ترکیب بتائیں۔“ (پیاری بہن آپ کو اس بات کا احساس ہے تو انشاء اللہ آپ باقاعدگی سے پڑھنے لگیں گی۔ وہ تمام بہنیں جو سرے سے نماز پڑھتی ہی نہیں ان سب کے لیے بے حد آسان ترکیب ہے کہ سب سے پہلے آپ صرف عصر کی نماز پڑھنی شروع کر دیں، عصر کے بعد مغرب کا وقت ہو جاتا ہے تو آپ لامحالہ مغرب کی نماز بھی ضرور پڑھ لیں گی۔ جب تک آپ باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی عادی نہیں ہو جاتیں یہ کوشش ضرور کریں کہ آپ کا کوئی دن نماز کے بغیر نہ گزرے اور جب آپ کو مزہ آنے لگے گا تو پھر نماز پڑھے بغیر آپ کو خود سکون نہیں ملے گا۔ اللہ آپ سمیت ہم سب کو ہمیشہ نماز کا عادی بنائے رکھے، آمین)

٭ قیصرہ حیات، سیالکوٹ سے۔ ”میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ نہیں پڑھ پاتی۔ مگر پاکیزہ کو گاہے بگاہے دیکھتی ضرور ہوں۔ کافی عرصے کے بعد ایک افسانہ بدصورت پڑھا...... اور اس میں مجھے مصنفہ کا بدصورت لوگوں کے لیے پیغام بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔“ (قیصرہ میں آپ کی رائے سے متفق ہوں، آئندہ مزید محتاط ہو کر ہم افسانوں کا انتخاب کریں گے، ہاں توجہ دلانے کا شکریہ)

٭ مسز امین، ملتان سے۔ ”مسز انجم آپ سے پہلی بار رابطہ کر رہی ہوں، میں ٹیچر ہوں، بے حد مصروف رہتی ہوں اس لیے وقت کم، کم ہوتا ہے مگر پاکیزہ ضرور پڑھتی ہوں، آپ کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں، دوسری مصنفات بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں عظمیٰ آفاق کو میرا سلام اور اس کے ساتھ یہ بھی کہنا ہے کہ ہر ماہ حاضری دیا کرو......“ (اس محفل میں خوش آمدید، آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

٭ ایم ثمینہ، کراچی سے۔ ”باجی آپ فیس بک پر کم کم ہی نظر آتی ہیں، (جی ہاں) یہاں کی دنیا ہی عجیب ہے...... ہر رائٹر اپنے آپ کو افلاطون سمجھتی ہیں۔ دو چار افسانے کیا شائع ہو گئے اپنے آپ کو افسانے پرکھنے کی جج سمجھ بیٹھی ہیں...... ایک دوسرے سے محبتیں بھی جتاتی ہیں اور پیٹھ پیچھے نفرت بھی...... میرا تو دل اچاٹ ہو گیا اس فیس بک سے اب تو میں نے اپنی سہیلیوں تک سے رابطے میں کمی کر دی ہے کہ کسی پر کوئی اعتبار ہی نہیں رہا ہے۔“ (پیاری ثمینہ، جو جیسا بھی کرے، آپ کو اس سے غرض نہیں رکھنی چاہیے...... افسانہ لکھ کر اور افسانہ جج کر کے ہی تجربے میں اضافہ ہوا کرتا ہے، اچھا ہے لڑکیاں اپنا پڑھنے لکھنے میں ہی وقت گزار رہی ہیں اور یہ کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ تم اپنے مزاج اور رویے میں تبدیلی لاؤ...... پھر سب اچھا لگے گا۔)

٭ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ”ستمبر کا شمارہ بروقت ملا، ماڈل کا دلہن کا روپ دل میں سما گیا۔ اداریہ حج سے متعلق بہترین تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حج کروائے، آمین۔ گم شدہ محبت ٹاپ پر جا رہا ہے۔ شہلا کے محبت آمیز مظاہرے خوب مزہ دے رہے ہیں، رفعت سراج کا ناول یہ کہاں بھیں کہ دل ہے۔ ابھی تعارفی مراحل میں ہے۔ اے عشق ترے ہیں کھیل عجب...... میں اقصم نے تو

دھماکا ہی کر دیا۔ ویسے طریقہ کار تو غلط تھا مگر کیا کریں کہتے ہیں کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ زویا اپنی نفرت کا بدلہ لینے کے لیے زارون کو نشانہ بنانے پر تلی ہوئی ہے، دیگر کہانیوں میں احسن الخالقین، پیام محبت لائی ہے عید، دیر سے سمجھے اور عمر قید بہت ہی متاثر کن تحریریں تھیں۔ نیلوفر عباسی سے ملاقات سحر زدہ سی کر گئی۔ شادی مبارک میں ویسے تو ساری دلہنیں بہت پیاری تھیں لیکن معصومہ تو دل میں اتر گئیں...... بہنوں کی محفل سے سب بہنوں کے دکھ سکھ سے آگاہی تو ہوتی ہے۔'' (پاکیزہ کی پسندیدگی کا شکریہ)

صدف نورین، لاہور کینٹ سے۔'' آپ کی باتوں سے مجھے بہت ہمت اور حوصلہ ملا۔ وہ دن میری زندگی کا سب سے حسین دن تھا جب آپ نے مجھے فون کیا، بہت اچھا لگا آپ سے بات کر کے اللہ پاک آپ کو صحت و تندرستی دے اور سدا سلامت رکھے، آمین۔ پاکیزہ پڑھا اور سب ہی سلسلے بہت عمدہ تھے۔ آپ کے ناول گم شدہ محبت کی تو کیا ہی بات ہے...... بہنوں کی محفل تو ہے ہی لاجواب یقین کریں آنٹی جب آپ سے بات کی تو ایسا لگا کہ آپ کا اور میرا کوئی رشتہ ہے، بالکل اپنوں کی طرح ہیں آپ میرے لیے جیسے ایک ماں اپنی بیٹی کو حوصلہ دیتی ہے۔'' (پیاری بیٹی تم خوش رہو، تمہارا خط پڑھ کر میرا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ اس لیے رابطہ کیا تھا۔ اس محفل میں آتی رہو...... تمہارا دل لگے گا، اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے، آمین)

شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری سے۔'' اس دفعہ کا بھی پاکیزہ زبردست تھا۔ ڈائجسٹ اے ون جا رہا ہے، گم شدہ محبت نے تو میرا دل ہی لے لیا۔ در ثمن بلال نے تو کیا ہی خوب لکھا ہے اگر پاس ہو تو آپ کے ہاتھ چوم لوں، رفعت سراج کی تو ہر تحریر ہی زبردست ہوتی تعریف کے لیے لفظ ہی نہیں ملتے۔ مدیحہ شاہد آپ کی پہلی تحریر پڑھی مزہ آگیا جی۔ تمام سلسلے اے ون جا رہے ہیں۔ پروین فرینڈ کیسی ہیں آپ میں نے آپ کو یہاں بھی ڈھونڈ لیا۔ کیا خوب لکھتی ہیں آپ بھی۔ حرا قریشی آپ بھی یہاں موجود ہیں۔'' (یہ بھی اچھا ہے کہ آپ کو اپنی سہیلیاں بھی نظر آ گئیں)

سونیا ملک، فیصل آباد سے۔'' پاکیزہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے اس میں ہر وہ چیز ہے جسے پڑھ کر انسان کی طبیعت سیر ہو جائے اس کے ناول اور کہانیاں اس قدر دلچسپ ہیں کہ ایک بار شروع کریں تو پھر چھوڑ نہ سکیں۔ (خوش آمدید) اس میں ہر نئے آنے والوں کو اپنائیت دی جاتی ہے جس سے نئے آنے والوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ میں نے اپنی بہت پیاری اور ہر دلعزیز آنٹی جو پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ہیں ذکیہ ایوب سے آپ کی محبت اور نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کا بہت ذکر سنا ہے۔ جس سے مجھے آج یہ حوصلہ ملا ہے ادر کیا میں آپ کو اپنا افسانہ بھجواؤں تو کیا آپ اسے پاکیزہ کے خوب صورت صفحات کی زینت بنا دیں گی ؟'' (پیاری سونیا...... یہ آپ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ یہاں آنے والوں کی ہم حوصلہ افزائی ضرور کرتے ہیں۔ آپ کا افسانہ پہلے پڑھ تو لوں، اس کے بعد ہی کوئی رائے دے سکوں گی)

نبی فردوس، گوجرانوالہ سے۔'' سب سے پہلے ستمبر کے سرورق پر براجمان خوب صورت اور من موہنی سی دلہن سے نظریں چار ہوئیں...... چند لمحے آنکھوں ہی آنکھوں اس کے حسن نوخیز کی تعریف کی اور پھر آگے بڑھی...... بے تابی سے افسانوں اور ناولٹ وغیرہ کی فہرست کے کھنگالنے لگی۔ اپنا افسانہ نہ پا کر مایوسی تو ہوئی مگر یہ کہہ کر دل کو ڈھارس دی کہ یقیناً اگلے شمارے میں لگے گا...... خیر...... پھر اڑان بھری اور بہنوں کی محفل میں جا پہنچی...... عمیرہ احمد اور دیگر نامور رائٹرز کا تبصرہ پڑھ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی...... جو شہرت کی اتنی بلندیوں پر پہنچ کر بھی پاکیزہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں...... شاید ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کے ہاتھ آسمان تک بھی پہنچ جائیں تو قدم زمین پر ہی جمائے رکھتے ہیں...... انجم آپی میں بھی وعدہ کرتی ہوں...... میں جتنی بھی ترقی کر لوں...... پاکیزہ سے رشتہ کبھی نہیں توڑوں گی...... (سچ میں) سب سے پہلے ہمیشہ کی طرح گم شدہ محبت پڑھی...... کہانی بڑی خوب صورتی سے آگے کا سفر طے کر رہی ہے۔ رفعت سراج کا ناول ان کے دلکش طرز تحریر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عقیلہ حق کی رسی میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ماں کی غلط تربیت بیٹوں کی زندگی زہر آلود کر دیتی ہے، سعدیہ رئیس کا افسانہ عمر قید اچھا تھا...... مگر اس کا اینڈ پسند نہیں آیا۔ ڈیزائنر سوٹ ہم جیسے مڈل کلاس لوگوں کے لیے باعث سبق تھی۔ میں اس بات سے اتفاق کرتی ہوں کہ سوٹ کی قیمت سے زیادہ پہننے والے کی پرسنالٹی اہمیت رکھتی ہے۔ اگر آپ خوب صورت شخصیت کے مالک ہیں تو آپ پر ہر لباس اچھا لگے گا۔ چاہے وہ ڈیزائنر کا ہو یا کسی عام دکان کا۔ (بالکل) نظیر فاطمہ کا افسانہ دیر سے سمجھے سمجھ سے باہر لگا۔ بھئی آج کے دور میں ہمیں تو ایسی صابر اور کامی بہو کبھی کہیں نظر نہیں آئی۔'' (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔'' مجھے کچھ کہنا ہے...... ہمیں بن کر عمل کی کوشش کرنی ہے۔ گم شدہ محبت مل کے ہی رہے گی۔ لگتا

ہے ندیم، عامر ہے۔ پہ کہاں بچیں کہ دل ہے، عنوان تو بچ ہے ہم بھی نہ بچ پائے شفاف جھاگ والے پرنس سے۔ کیا یہ تاریخی کہانی ہے یا آدھی حقیقت آدھا فسانہ ضرور بتائیں؟ اے عشق ترے کھیل عجب من چلے کا سودا ہے۔ محبت ہے سمندری، فاخرہ جی جیسا آپ کا سنا تھا ویسا ہی پایا...... لیجیے ستائش بھی سمندری۔ کیا رواں قلم، کیا ساگری تائی...... کیا دریا سی حنا...... اور کیا موجی کوکو...... کیا ثابت قدم ارمغان...... احسن الخالقین، صورت ہو اور سیرت نہ ہو تو زندگی اجیرن ہو جائے لہٰذا ہم تو دین کو ترجیح دیں گے انشاء اللہ سالوں کے رنگ میرے بھی تو ہیں ناں...... ڈیزائنر سوٹ حق ہا...... گولی ماردی...... دفع کرو...... سادگی میں سکون ہے جناب عمر قید، اچھی ہے ناں...... کام، کام کام اور بس کام...... فسانہ نہیں حقیقت ماشاء اللہ نیلوفر میں ایسی کشش ہے کہ دیکھ، دیکھ دل نہ بھرے...... اور باتیں کہ رک رک کر پڑھیں اور کہانی تو واقعی قلمی...... اور جوڑی بڑی پیاری...... بس رویا نہ کریں اور خواہ مخواہ انہیں جنت میں اداس نہ کریں...... شادی مبارک پاکیزہ مہمان، دولھا حسن اور ڈاکٹر شاہد کتنے ملتے جلتے ہیں۔ دین کی باتیں ہمارا سرمایۂ حیات، بہنوں کی محفل نعت و حمد کے فوراً بعد اُدھر ہی تشریف لایا کرتے ہیں، پاکیزہ ڈائری شکر ہے اس میں تین، تین چار، چار حمد و نعت ہیں، کاش یہ ساری نعتوں کے لیے مختص ہو جائے تو زیادہ لوگوں کی نعتیں پڑھ سکوں...... عالیہ بشیر تم کہاں کھو گئی ہو۔ نعت لے کر آؤ ناں عالیہ ضیا تم نے بھی تو نور حاصل کر لیا، مبارک ہو مصباح رضا سعید تم مجھے بہت پسند ہو...... اور فرح ناز، ملکوال تم میری بھانجی ہو بھئی؟ جلترنگ نام ہی کافی ہے، کارڈ پڑھ کر ہنسی وہ نکلی کہ بس...... ورنہ ہم تو لقمان حکیم سے متاثرہ ہیں۔" (دلچسپ تبصرہ پڑھ کر ہماری ہنسی بھی نکل کر پتا نہیں کہاں چلی گئی)

☜ نفیسہ آرا...... راس الخیمہ یو اے ای سے۔ "ہم تو دیارِ غیر میں پاکیزہ کے ذریعے اپنے پیاروں سے جُڑے رہتے ہیں۔ جیسے سرگودھا کی نگہت اعوان سے اسی ذریعے۔ دوبارہ ملاقات ہوئی اور بچھڑی ہوئی دوست سے رابطہ ہو گیا...... یہ پاکیزہ کا ہی کمال ہے۔ اس کے علاوہ بہنوں کی محفل میں بہنوں کی آپس کی باتیں، محبتیں اور ایک دوسرے کے مسائل کے حل کے لیے ٹوٹکے اور دعائیں بتانا بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ اب بات ہو جائے کچھ کہانیوں پر جو نئے ناول شروع ہوئے ہیں، سیمار رضا اور رفعت سراج کا ناول تو لگتا ہے پندرہ بیس سال پہلے والا انداز ہے خالص افسانوی اور سسپنس سے بھرا مزہ آ رہا ہے پڑھنے میں...... گرینڈ مام کا کردار بہت خوب صورتی سے چل رہا ہے اور پرنس کی بھی مکمل شخصیت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ سیمار رضا کے ناول کی کہانی کچھ الجھی ہوئی ہے۔ ابھی آگے شاید واضح ہو...... سحر ساجد شاید نئی ہیں مگر بے حد خوب صورت عنوان کے ناول کے ساتھ آئی ہیں، معلومات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ ثمینہ عظمت علی کا انٹرویو سادہ مگر بہت ہی باشعور شخصیت کو ظاہر کر رہا ہے رائٹرز کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ خیر یہ تو الگ، الگ اپنی، اپنی طبیعت ہوتی ہے...... اکتوبر کے دلہن نمبر میں سعدیہ رئیس کی کہانی عمر قید بہت خوب صورت تھی۔ یہ تو شاید بیشتر لڑکیوں کے حالات کی عکاسی کر رہی تھی۔ عقیلہ حق نے کہانی میں کافی نصیحتیں کی ہیں برائی کا انجام بے شک برا ہی ہوتا ہے۔ شگفتہ شاہ کی کہانی فیصلہ بہترین کہانی ہے۔ کاش کہ ہمارے معاشرے میں اس طرح کے مرد ہوں آج کل تو کسی لڑکی کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو لوگ اس سے شادی نہیں کرتے کہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہو گا۔ آخر لوگوں کی یہ جاہلانہ سوچ کب بدلے گی...... اپنے گھر میں بیٹیاں رکھ کر بھی ایسی، ایسی باتیں کرتے ہیں کہ اللہ کی توبہ......:: (تفصیلی تبصرے کا شکریہ)

☜ نیلوفر خان، بہارہ کہو سے۔ "باجی میں تو پاکیزہ خیر عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں اور میری بیٹیاں اب چند سال سے پڑھ رہی ہیں...... وہ بہت خوش ہوتی ہیں جب ان کے نام کی کوئی چیز شعر، ترکیب یا احوال وغیرہ لگ جاتے ہیں۔ میری بیٹی اپنے علاقے کا تعارف بھی بھیجنا چاہ رہی ہے۔ (ضرور بھیجیں) باجی اس ماہ دو قسط وار سلسلے شروع ہوئے ہیں جو ابھی تو پورے واضح نہیں ہو رہے ہیں مگر سحر ساجد کی کہانی کچھ، کچھ ٹریجک لگ رہی ہے...... ہے ناں...... اس کے علاوہ شیریں حیدر کی سلسلے وار تحریر کی خوشخبری تو سن لی ہے بلکہ پڑھ لی ہے اب دیکھیں کب لگتا ہے۔ کیا آپ نگہت سیما صاحبہ سے بھی ان کے ناول کے متعلق لکھوائیں گی میری بھی تعریف ان تک پہنچا دیں۔ (جی اس ماہ آپ نے ان کا انٹرویو پڑھ لیا ہو گا) ذکیہ آپا کے کیا حال ہیں؟ (ان دنوں وہ بیمار ہیں) اختر شجاعت کے دینی مضمون معلومات بڑھاتے ہیں، اچھا لگتا ہے پڑھ کر ہاں بھئی اس دفعہ تو غزلوں کے انتخاب نے مزہ دے دیا۔" (تبصرے کا شکریہ ہاں آپ اپنی شاعری ہمیں ضرور بھیجیں)

☜ زرینہ مشتاق، منڈی بہاؤالدین سے۔ "اب میں پاکیزہ مستقل لگوا رہی ہوں ورنہ تو سرگودھا سے منگواتی ہوں خیر...... آپ سے کہنا ہے کہ کیا کہانیاں کسی خاص موضوع پر لکھیں مطلب جلدی کیسے لگیں گی۔ میں بھی لکھنا چاہتی ہوں (ضرور لکھیں، آپ کو دوسری

مصنفات کی کہانیاں اور پڑھ کر اندازہ ہو جائے گا) انجم باجی آپ کا ناول گم شدہ محبت میں کیا فرزانہ دو ہیں؟ دوسرے صبا تو اب ندیم خان کو پسند کرنے لگی ہے تو عامر کی انٹری ہوگی یا نہیں....؟ رفعت سراج کے ناول کا نام شاعرانہ ہے مگر لمبا ہے پر بہت خوب صورت چل رہا ہے کہ لو اسٹوری لگ رہی ہے۔ ویسے جولیڈی صوفیہ ہیں وہ بھی اپنی لو اسٹوری ہی بتا رہی ہیں.... کیا یہ بھی طویل ناول ہوگا۔ (جی ہاں) کہانیاں تو سب ہی ٹھیک تھیں نیلم احمد بشیر کی کہانی مغربی معاشرے کی مکروہ شکل کو بیان کر رہی ہے۔ ہاں صاعقہ عاطف نے سمجھدار بہت ہی سمجھداری سے لکھی ہے کیا بات ہے بھئی...... عاشفہ مسعود کی کہانی میں جو ہوا وہ ہماری ملازمہ کی کہانی لگ رہی تھی کہ اس نے ایک ہفتے بعد خوش ہو کر ہمیں بتایا تھا کہ اس کا ظالم میاں بالآخر مر ہی گیا۔ ہاجرہ ریحان تو ہر مہینے ہی چھوٹی، چھوٹی کہانیاں لکھ رہی ہیں ویسے اچھی ہی ہوتی ہیں۔ شعری انتخاب ملا جلا ہوتا ہے۔ اس دفعہ مصطفیٰ زیدی کی غزلیں پڑھ کر اچھا لگا اور بھی دیں ناں...... اچھے شاعروں کی شاعری پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ رائٹر ثمینہ عظمت بھی کا انٹرویو اچھا تھا۔ پڑھ کر مزہ آیا۔" (تبصرے کا شکریہ)

معصومہ حلیم، اسلام آباد سے۔ "میری شادی کا احوال میری نند نے لکھا تھا۔ اپنی تصویر دیکھ کر اچھا لگا۔ ویسے تفصیلات تو بہت تھیں مگر شاید ہر اک کو جگہ دینی ہوتی ہوگی...... کیا دوبارہ بھی اور حال لکھ سکتے ہیں (پر کسی اور کی شادی کا) آپ کا شکریہ کہ پڑھنے والوں کا اتنا خیال رکھتے ہیں، کیا کسی سالگرہ کا حال بھی لکھ سکتے ہیں؟" (ہاں اگر دلچسپ ہو تو ضرور)

سیدہ مدیحہ، مقام نامعلوم "پاکیزہ ایک انتہائی معیاری رسالہ ہے اور میں گزشتہ کئی سالوں سے اس کی قاری ہوں۔ اس بار میری توجہ کہانی دیر سے سمجھے کے ایک جملے نے اپنی طرف مبذول کروائی۔ نظیر فاطمہ نے ایک جملہ بیٹیوں کی قسمتیں اگر ماں، باپ خود اپنے ہاتھ سے لکھتے تو کبھی کسی کی بیٹی دکھی نہ ہوتی۔ لکھ کر کہانی کو بدمزہ بنا دیا ہے۔ قسمتیں لکھنے والا تو اللہ رب العزت ہے۔ مصنفہ کی بات کا بے شک ایسا کوئی مطلب نہ بھی ہو تو لکھنے میں احتیاط کرنی چاہیے آپ خود سوچ سکتی ہیں کہ اس جملے کا ادھر کیا مطلب نکل سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ سے زیادہ ماں، باپ انسان کے مخلص ہوتے ہیں جو ان کی زیادہ اچھی قسمتیں لکھتے ہیں یہ انتہائی شرکیہ جملہ ہے۔ ہم انسان خطا کے پتلے ہیں یقیناً بھول چوک سے ایسی غلطی ہوگئی ہوگی جو آپ کی نظروں سے اوجھل ہوگئی ہے۔" (مدیحہ بہن، آپ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ بعض غلطیاں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور ایسے جملے بولنے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ عموماً اس طرح کے جملے اکثر خواتین عام بول چال میں بولتی بھی ہیں۔ آئندہ احتیاط کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہماری دانستہ اور غیر دانستہ خطاؤں کو معاف فرمائے، آمین)

پیاری بہنو! اس سے قبل کہ آپ سے رخصت ہوں...... آیئے پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور پھر وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم اے کریم اللہ ہمارے اور اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری امت کے سارے گناہوں کو معاف فرما دے اور ہمارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے اور نیک کام کی توفیق، ہمت، طاقت اور مہلت ہم کو ضرور عطا کرنا...... اے پاک پروردگار موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا...... بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ، اے میرے معبود، اے عرشِ عظیم کے مالک تو آدمؑ سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت تک آنے والے سارے ایمان والے مردوں، عورتوں، انسانوں جنوں سب کو ہی بخش دے۔ ہمارے تمام مسائل حل کر دے...... اے سلامتی دینے والے اور سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہمیں ہر بیماری اور ہر پریشانی سے بچا، خاص کر لاعلاج بیماریوں اور جان لیوا پریشانیوں سے بچا...... یا اللہ ہمیں تمام شرور سے بچا...... اور تمام خیر عطا فرمائے ہمیں ہمیشہ عافیت والی زندگی دے تاکہ ہم تیرے دین کو ساری انسانیت تک پہنچا سکیں...... آمین ثم آمین۔

یا مجیبُ یا مجیبُ یا مجیبُ (آخر میں ایک بار درود ابراہیمی پڑھ لیں)

دعا گو

آپ کی اپنی باجی، انجم انصار

**پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا**

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118



# پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

## حمدِ باری تعالیٰ

وہ جس کے جلوے افق، افق ہیں
وہ جس کی کرنیں شفق، شفق ہیں
وہ جس کی رحمت نے دشت کے دشت
سبزہ و گل سے بھر دیے ہیں
وہ جس کی مدحت میں حرف، آواز گنگنائیں
خموشیاں جس کے گیت گائیں
ازل سے پہلے ابد سے آگے
اسی کو ہر اختیار حاصل
اسی کو عزت وقار حاصل
وہ ایک مالک اسی کا سب ہے
بس وہی تو سب کا رب ہے

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

## نعتِ رسول مقبولؐ

آپؐ کا نور بنایا گیا سب سے پہلے
واہ کیا شان ہے کیا آن مدینے والے
آپؐ جیسا نہ ہوا ہے نہ ہی ہوگا کوئی
آپؐ پر جان بھی قربان مدینے والے
دل یہ چاہے کہ فقط دیکھ سکوں ایک جھلک
میری آنکھوں کا یہ ارمان مدینے والے
اُمتی آپؐ کے ہم اور گناہ گار بھی ہیں
پھر بھی بخشش کے طلب گار مدینے والے
آپؐ کہہ دیں گے تو ہو جائے گی بخشش سب کی
آپؐ پر ہی تو ہے یہ مان مدینے والے
آ رہی ہے جو مدینے سے یہ خوشبو شاید
پورا ہونے کو ہے ارمان مدینے والے
آپؐ سنتے ہیں جو بھیجوں میں درود اور سلام
ہے یہی آپؐ کا احسان مدینے والے
دل میں اِک نور بسا آنکھ میں ٹھنڈک اتری
لے کے آئے ہیں جو قرآن مدینے والے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

## دعا

مدینے کی گلیاں، مدینے کی راہیں
ڈھونڈتی ہیں ہر دم میری نگاہیں
روضۂ نبیؐ پر میں پھر پہنچوں کیسے
اسی غم میں ڈوبی ہیں بھیگی نگاہیں
کرم کر دے مولا بُلا لے تو پھر سے
دعا کر رہی ہیں سوالی نگاہیں

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

## اقوال حضرت علی کرم اللہ وجھہ

☆ ہر عمل سوچ سمجھ کر کرو کیونکہ ہر عمل کے اندر اس کا انجام اسی طرح چھپا ہوا ہے جس طرح بیج کے اندر درخت۔

☆ سچائی زبان کی امانت ہے اور سنجیدگی عقل کی زینت۔

☆ جس دن ہم اللہ کی نافرمانی نہ کریں، وہ دن ہمارے لیے عید کا دن ہے۔

☆ بیماری گناہوں کو اس طرح گراتی ہے جیسے درخت خشک پتوں کو۔

☆ ایمان کی پہچان یہ ہے کہ جھوٹ کے مقابلے میں سچ کو وہاں بھی اپنائے جہاں نقصان کا اندیشہ ہو۔

مرسلہ: فریدہ ہاشمی تخفی، کراچی

## استغفار

حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جب شیطان مردود ہو گیا تو اس نے کہا۔

# یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

## پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایڈ فری لنکس
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

**Click on http://paksociety.com to Visit Us**

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

Dont miss a singal one of your Favourite Paksociety's Update !

i. Open Paksociety Page.
ii.Click Liked.
iii.Select Get Notifications.
iv.Select See First.
All Done

Liked　Message
Get Notifications
Add to Interest Lists...
Unlike
IN YOUR NEWS FEED
See First
See new posts at the top of News Feed
Default
See posts as usual
Unfollow

"اے رب تیری عزت کی قسم! میں تیرے بندوں کو ہمیشہ بہکاتا رہوں گا۔ جب تک ان کی روحیں ان کے جسموں میں رہیں گی۔"

اللہ رب العزت نے فرمایا۔ "مجھے قسم ہے اپنی عزت اور جاہ وجلال کی اور اپنے اعلیٰ مقام کی جب تک وہ استغفار کرتے رہیں گے، میں ان کو بخشتا رہوں گا۔"

مرسلہ: ممتاز خانم، اورنگی ٹاؤن کراچی

## بہت زیادہ انعام

حضرت سعید بن المسیبؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دس مرتبہ قل ھو اللہ احد پڑھ لی اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دیا جائے گا اور جس نے بیس مرتبہ پڑھ لی اس کے لیے جنت میں دو محل بنا دیے جائیں گے اور جس نے تیس مرتبہ پڑھ لی اس کے لیے جنت میں تین محل بنا دیے جائیں گے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! اس صورت میں تو ہم اپنے بہت زیادہ محل بنا لیں گے۔" آپ نے فرمایا۔ "اللہ بہت بڑا داتا ہے، جتنا عمل کرو گے، اس کے پاس اس سے بہت زیادہ انعام ہے۔"

مرسلہ: نجمہ اصغر، کراچی

## عقل اور انسان

امام ابو حنیفہؒ ایک روز امام جعفر صادقؒ کے پاس گئے، جو ان کے استاد بھی رہ چکے تھے، دوران گفتگو حضرت جعفر صادقؒ نے ان سے سوال پوچھا۔ "عقل کا کیا کام ہے؟"

امام ابو حنیفہؒ نے جواب دیا۔ "عقل اچھے اور برے میں تمیز پیدا کرتی ہے۔"

اس پر امام جعفر صادقؒ نے فرمایا۔ "یہ تو جانور بھی کر لیتے ہیں مثلاً اپنے دانہ، پانی اور چارا دینے والوں کو وہ اچھی طرح پہچانتے اور ایک طرح کا انس کرنے لگتے ہیں (یعنی انہیں بھی دوست اور دشمن کی پہچان ہوتی ہے) تو پھر انسان اور جانور میں کیا فرق رہا؟"

یہ سن کر امام ابو حنیفہؒ نے کہا۔ "آپ ہی اس پر روشنی ڈالیے۔"

امام جعفر صادقؒ نے فرمایا۔ "انسان کو عقل اس لیے دی گئی ہے کہ وہ اس سے بہتر اور مفید چیزوں میں سے زیادہ بہتر اور زیادہ فائدہ مند چیزوں کا انتخاب کرے اور بری چیزوں میں سے کم سے کم نقصان دہ چیزوں کو اپنائے۔"

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب۔ چونیاں

## فیکٹ

پیا تیری
چاہت ہے
کھجور کے درخت جیسی
جو دھوپ لگے
تو سایہ نہیں
اور بھوک لگے
تو پھل دور

شاعرہ: سعدیہ ہما شیخ
مرسلہ: صبا نور، لیہ

## اے انسان

☆ اے انسان صرف جینا ہی زندگی کا مقصد نہیں ہم کو مرنا بھی ہے۔

☆ یاد رکھ...... عمدہ لباس کے شوقین، لٹھے کا کفن بھی یاد رکھ۔

☆ اچھے مکان کے شیدائی قبر کی گہرائی بھی یاد رکھ۔

☆ لذیذ چیزیں کھانے والے قبر کے کیڑے بھی یاد رکھ۔

☆ برائی کر کے جھومنے والے موت کی سختی بھی یاد رکھ۔

☆ دنیا کے مال کا حساب رکھنے والے آخرت کا حساب بھی یاد رکھ۔

☆ دنیا کی روشنیوں میں مست رہنے والے قبر کا اندھیرا بھی یاد رکھ۔

مرسلہ: ناظمہ شاہین اعوان۔ واہ کینٹ

## سانحہ

چار سُو اشفاق ہے بس اک قیامت کا سماں
سانحہ ایسا ہے کہ سب کہہ رہے ہیں الاماں
شاعر: اشفاق احمد ایڈووکیٹ
مرسلہ: اسما جمشید۔ ڈی آئی خان

## غزل

درد دل میں دبا رکھے ہیں
اپنے جذبات چُھپا رکھے ہیں
تجھ سے جو نین ملا رکھے ہیں
خوب ہی ربط بڑھا رکھے ہیں
دوست اس نے جو بنا رکھے ہیں
میری نظروں سے بچا رکھے ہیں
رنگ پھولوں کے چُرا رکھے ہیں
تم نے کچھ راز چُھپا رکھے ہیں
اور کچھ پاس نہیں ہے میرے
بس تیرے خواب سجا رکھے ہیں
تجھ کو روشن ملیں راہیں ساری
راہ میں دیپ جلا رکھے ہیں
پھول اس نے جو کبھی بھیجے تھے
سب کتابوں میں چُھپا رکھے ہیں
اپنی نظروں سے جہاں میں تم نے
کتنے طوفان اٹھا رکھے ہیں
شاعرہ: شگفتہ شفیق
مرسلہ: شمسہ الماس۔ ناروے

## ایسا بھی ہوتا ہے

پیار میں لوگ بہت مضبوط ہو جاتے ہیں اور بہت کمزور بھی۔
مضبوط اتنے کہ دنیا سے لڑ جاتے ہیں کمزور اتنے کہ صرف اِک انسان ہارہ نہیں پاتے۔
مرسلہ: مصباح رضا سعید۔ فیصل آباد

## دوست

دوستوں کے غم میں شامل ہوا کرو

ہر حال میں
لیکن
خوشیوں میں تب تک نہ جانا
جب تک وہ خود نہ بلائیں
مرسلہ: مہرین ضیا بخش۔ کراچی

## چاہتیں

لبِ خاموش سے اظہارِ تمنا چاہیں
بات کرنے کو بھی کیا تیری اجازت چاہیں
تم چلو ساتھ تو آہٹ بھی نہ ہونے پائے
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تمہیں تنہا چاہیں
کاوش: نوشین اقبال نوشی۔ گاؤں بدر مرجان

## چوری

نوجوان نے رومانوی انداز میں محبوبہ سے کہا۔
”جان! تم اب بہت بدل گئی ہو، پہلے جیسی بات نہیں ہے۔“
محبوبہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیسے......؟“
نوجوان نے کہا۔ ”اب میں تمہارا ہاتھ پکڑتا ہوں تو تم شرماتی نہیں ہو۔“
محبوبہ نے اٹھلا کر کہا۔ ”پچھلی بار میں نے شرما کر آنکھیں بند کیں تو پرس سے دو سو روپے غائب تھے، چور کہیں کے۔“
مرسلہ: ارم کمال۔ فیصل آباد

## مسکرائیں

استاد، شاگرد سے۔ ”تم نے جغرافیے کا سوال کیوں یاد نہیں کیا؟“
شاگرد۔ ”کل ایک سیاستدان ٹاک شو میں کہہ رہا تھا کہ عنقریب دنیا کا نقشہ بدل دیں گے۔“

☆☆☆

ایک پاکستانی نے امریکا میں جلیبی بنانے کا کاروبار شروع کیا تو ایک امریکی روز اس سے 5 کلو جلیبی خرید کر لے جاتا رہا آخر ایک دن اس پاکستانی نے اس سے پوچھا۔
”آپ اتنی جلیبیوں کا کیا کرتے ہیں۔ یہ آپ کو

اتنی پسند ہیں؟"

امریکی بولا۔"ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان ٹیوبوں میں رس کیسے بھرا جاتا ہے؟"

☆☆☆

ایک شخص کو اتفاق سے ایک بڑا سرکاری عہدہ مل گیا۔

اس کے دوست احباب خوش ہو کر اسے مبارک باد دینے آئے مگر اس نے کسی کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیا۔

اگلے دن پھر ایک دوست آ گیا۔"اس شخص نے پوچھا کون ہو اور کس لیے آئے ہو؟"

دوست نے جواب دیا۔"افسوس کرنے آیا ہوں جناب! میں نے سنا ہے آپ اندھے ہو گئے ہیں۔"

مرسلہ: ماہ نور خان، بہارہ کہو

## خوب صورت بات

"اپنے دوست کی عزت کرو اس لیے نہیں کیونکہ وہ تمہارے عیب جانتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تمہارے عیبوں سے واقف ہوتے ہوئے بھی تمہیں دوست مانتا ہے۔"

مرسلہ: شبنم کنول۔ پاپا نگری

## حشر تک

شاپنگ کر کے آئے تو غصے میں تھی مسز
کیوں عورتوں کو آپ وہاں گھورتے رہے
حملہ بہت شدید تھا میں بو کھلا گیا
دل نے کہا لو آج تو ہم بھی برے پھنسے
قلب و دماغ میں ہوئی میٹنگ منعقد
بولا دماغ کوئی بہانہ تو سوچ لے
میں سوچتا رہا کوئی صورت بچاؤ کی
تدبیر ایک مل گئی پھر مجھ کو خیر سے
میں نے کہا کہ جانِ جہاں بات سن مری
ہرگز نہیں درست کہ تو مجھ پہ شک کرے
چھوڑوں گا گھورنا میں اسی وقت خود بخود
زیادہ حسین تجھ سے کوئی آئے سامنے
سن کر مرا جواب بہت خوش ہوئی مسز
اِک آن میں شکوے گلے سب دور ہو گئے
بولی وہ ناز سے میری خواہش ہے بس یہی
تو عورتوں کو حشر تک گھورتا رہے

کلام: تشنہ بریلوی

مرسلہ: نرگس نسیم صاحبہ۔ موہڑہ چکوال

## سنہری باتیں

☆ دوستوں کو خوشی بھی دو تو یوں لگے حق دیا ہے احسان نہیں کیا۔

☆ کسی سے اتنی توقعات وابستہ نہ کرو کہ توقعات ٹوٹ جائیں تو آپ بھی ٹوٹ جائیں۔

☆ "دریا اور زندگی" دونوں کو مضبوط بند کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ دریا کو مٹی کا بند اور انسان کو ضبط کا بند درکار ہوتا ہے۔

مرسلہ: فرحت احمد۔ کراچی

پاکیزہ کی تمام تبصرہ نگار بہنوں کے نام

## دعا

تم جس خواب میں آنکھ کھولو
اس کا روپ امر ہو جائے
تم جس پھول کو ہنس کر دیکھو
کبھی وہ نہ مرجھائے
تم جس چہرے کو پیار سے دیکھو
کبھی اس پر اداسی نہ چھائے
تم جس دعا کو ہاتھ اٹھاؤ
وہ منظورِ خدا ہو جائے

آمین، یارب العالمین

مرسلہ: نگینہ ضیا بخش۔ کراچی

## قابلِ اعتبار

انسان خود قابلِ اعتبار نہیں ہوتا
بلکہ اس کا کردار
اور
اس کی سچائی اسے قابلِ اعتبار بناتی ہے۔

مرسلہ: منور شہزادی۔ گوجرانوالہ

☆☆☆

# جلترنگ

انجم انصار

## پریشانیاں

اُف، میرے خدا، کس قدر سمجھایا تھا، کس قدر تو مثالیں دی تھیں مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔

اب نقصان تو ہونا ہی تھا۔

گو کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جب، جب وہ میرے ابرو پر چلے تھے، کبھی نقصان نہیں اٹھایا تھا مگر اس دن نہ جانے کہاں سے بہادری سمیٹ لائے، میرے ہر مشورے کو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا۔

بات گو اتنی معمولی نہیں تھی جتنی کہ وہ سمجھ رہے تھے، میں نے...... صرف یہی کہا تھا۔" اس دفعہ آپ کے خاندان میں شادیوں کا ٹورنامنٹ ہو رہا ہے، کیا خیال ہے، کچھ دنوں کے لیے دوسرے شہر گھوم پھر آتے ہیں، خواہ مخواہ کے بھتے دینے سے جان چھوٹ جائے گی۔"

"ارے، ان شادیوں میں شرکت کریں گے، بڑے قریبی عزیزوں کے ہاں شادیاں ہو رہی ہیں، ہم نہیں جائیں گے تو تقریب سونی سی ہو جائے گی۔" (احمق کہیں کے)

"اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ جس جگہ سے لڑکی کی شادی کا کارڈ آیا ہے، اس کے صرف ولیمے میں شرکت کر لیتے ہیں اور لڑکے والوں کے جو شادی کارڈز آئے رکھے ہیں ان میں صرف بارات میں شریک ہو جائیں گے، یوں کوئی گلہ بھی نہیں کر سکے گا اور بھتا دینے سے بھی بچ رہیں گے۔" تجویز خاصی معقول تھی۔

"پاگل ہوگئی ہو تم، آخر لوگ کیا کہیں گے......؟" ان کی پریشانی دیدنی تھی۔

"سنیے اگر آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دیجیے۔" میرا لہجہ پھنکاریں لیے ہوئے تھا۔

"کمال کرتی ہو تم بھی، کیا اپنے عزیزوں اور دوستوں کے بغیر بھی خوش رہنے کا کوئی جواز ہو سکتا ہے......" کر لو گل۔

"اگر آپ کی خوشیاں ایسی ہی نچلی سطح پر ڈبکیاں لینے سے جنم میں آتی ہیں تو یونہی سہی۔ میرا کیا ہے، میں بھی چلی جاؤں گی کہ آخر ہم صبح شام بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں، جن کی شکل دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔" میں نے کاندھے اچکا کر کہا تھا۔

اور پھر ہم روزانہ شادیوں میں جاتے کہ روزانہ ہی کہیں نہ کہیں کا بلاوا ہوتا، شام سات بجے بارات کا بلاوا ہوتا اور رات گیارہ بجے کے بعد بارات آتی اور پھر مووی اور تصاویر کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا کہ میزبان تاریخ بدلنے کے بعد کھانا کھلانے پر بمشکل تیار ہوتے۔ ایسے میں نہ تو سجائی دلہن کو دیکھنے کو دل کرتا اور نہ ہی حواس باختہ دولھا میاں سے خوش گپیاں کرنے کو جی چاہتا...... بوریت کا گراف آہستہ آہستہ اتنا بلند ہوتا رہا کہ مووی اور تصاویر کھنچوانے کو بھی دل نہ چاہتا۔ آیئے بھائی، آیئے باجی کی سریلی آوازیں بھی کان میں زہر گھولتی سی لگتی تھیں، پہلے تو ٹھسّے سے ساری کی فال چٹکی میں پکڑ کر چلتے ہوئے دلہن کے برابر بیٹھ کر بڑے کر وفر سے مووی بنواتے تھے مگر پانچ چھ شادیوں میں شرکت کے بعد یہ شوق بھی ہوا ہو گیا تھا کہ جس سیٹ سے اٹھ کر آتے، واپسی پر اس پر کوئی اور قبضہ کر چکا ہوتا۔

"دیکھیے، روزانہ ہی رات کو ایک بجے کے بعد واپسی ہوتی ہے، صبح بچوں سے اسکول بھی نہیں جایا جاتا، آپ جلدی سے اٹھنے کی کوشش کیا کیجیے ناں۔" ایک شب میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا" ورنہ چھوٹے بچے اس سال بھی فیل ہوں گے۔" اور میاں جی، میرے آخری جملے پر چونک سے گئے۔

"ان کی ہیڈ مسٹریس نے کہا تھا کہ آپ کے بچے کو کچھ نہیں آتا، کیونکہ آپ اسے بالکل نہیں پڑھاتے ہیں۔"

"کیا تم نے یہ نہیں کہا کہ آپ نے تو پورے سال پڑھایا ہے، آپ لوگوں نے اسے کیا سکھایا؟"

”ہاں کہا تھا مگر ان کا کہنا ہے کہ بچہ اسکول میں فیس دینے کے لیے آتا ہے، بچوں سے دھینگا مشتی سیکھتا ہے اور بریک میں آلو کے چپس کھاتا ہے اور فروٹو پیتا ہے، ہماری ٹیچرز بچوں کو بہت اچھا پڑھاتی ہیں مگر آج کے طالب علم اچھی چیز سیکھنا نہیں چاہتے، تو اس میں ہمارا کیا قصور...... سارا قصور تو والدین کا ہے، جن کے اتنے بدشوق اور نکمے بچے ہوتے ہیں، جن کی سزا فیل کے سوا دوسری ہو ہی نہیں سکتی۔“ میں نے ہنستے ہوئے اطلاع پہنچائی۔

”ٹھیک ہے کل سے جلدی واپس آئیں گے، ان سالوں کو کچھ پڑھاؤ، اگر فیل ہو گئے تو خواہ مخواہ دوسرے اسکول میں ایڈمیشن دلوانا پڑے گا، یہ اسکول بہت بے ڈھنگا نکلا۔“

اگلے دن دو لڑکیوں کی شادی تھی۔ پہلی بارات بہ مشکل گیارہ بجے آئی، دوسری لڑکی کی بارات میں تاخیر ہو رہی تھی معلوم ہوا کہ دولھا، اپنے تایا کو منانے سکھر گیا ہوا ہے، ٹرین لیٹ ہو گئی ہے، جب ٹرین آئے گی تب نکاح ہوگا۔ دولھا کو لانے کے لیے نہ صرف سٹی اور کینٹ پر میزبان کھڑے تھے بلکہ ملیر اور ڈرگ روڈ تک پر کھڑے کر دیے گئے تھے کہ اگر وہاں دو منٹ کے لیے بھی ریل رکے تو دولھا کو اسی حال میں پنڈال تک لے آؤ، نکاح کے بعد اپنا حلیہ درست کرلے گا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہم نے میزبان سے جانے کی اجازت مانگی، بیچارے بہت شریف لوگ تھے، نیوتے کے لفافے ہاتھ میں لینے کے بعد بصد خوشی جانے کی اجازت دے دی۔

”یہ سلسلہ آخر کب تک جاری رہے گا، اس سال تو اس قدر شادیاں ہو رہی ہیں کہ لگ رہا ہے کہ شادی کا ہیضہ پھوٹ پڑا ہے۔ جس کو دیکھو اسی کا شکار ہے۔ میں تو جا، جا کر تھک چکی ہوں، ایک جیسا مینیو ایسا لگتا ہے کہ روز باسی کھانے کھا رہے ہیں۔“

”بور تو خیر میں بھی ہو گیا ہوں، پوری تقریب میں کوئی ایسی شکل نظر نہیں آتی کہ جس کو دیکھ کر فرحت سی ہو۔“ وہ شکایتی انداز میں بولے۔

”جن کو دیکھ کر آپ کو فرحتیں اور شگفتگی سی ہوتی تھی، اب ان سب کی شادیاں ہو چکی ہیں، اب تو لڑکیوں کی نانیوں اور دادیوں کو دیکھ کر خوش ہوا کیجیے کہ وہ آپ کو دعائیں بھی دیں گی۔“ میں نے ہنسی ہی ہنسی میں وار کیا۔

”خیر، اب کل آخری شادی ہے، کسی سبزہ زار پر جانا ہے، مزہ تو کل آئے گا، وہاں کی جیوگرافی بہت اچھی ہوگی۔“ انہوں نے بہت اچھی پر زور دے کر کہا۔

مگر اس شب بڑی حیرانی ہوئی، جب سبزہ زار کا لان ڈھونڈتے، ڈھونڈتے تھک گئے اور مطلوبہ میزبان نظر نہیں آئے۔ نہ جانے کہاں چھپ گئے تھے۔

”امی، لان نمبر 4 میں چلیے ناں وہاں کھانا بھی شروع ہو گیا ہے۔“

”امی لان نمبر 3 میں چلیے، وہاں ورائٹی پروگرام بھی ہو رہا ہے۔“ بچے اپنی، اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ حالانکہ دل میرا بھی یہی چاہ رہا تھا مگر میاں صاحب کی پریشان صورت دیکھ کر، میں بھی منہ بنائے ہوئے تھی۔

”خدا جانے، ایسا کیا سانحہ ہو گیا، جو یہ شادی ملتوی ہو گئی اور ہمیں علم ہی نہیں ہو سکا۔“ سارے ہی لان چھان تک آئے تھے مگر مطلوبہ لان دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ گھر آ کر فون کیا تو معلوم ہوا کہ دولھا میاں کو اچانک چیچک نکل آنے کے سبب شادی ملتوی کر دی گئی ہے۔

”سنیے، پاکستان میں تو اب چیچک نکلتی ہی نہیں، شہر کی تمام دیواروں سے سنا ہے، آپ دولھا میاں کو پکڑوا دیجیے کم از کم چھ ہزار انعام ہی مل جائے گا۔ اتنی بہت سی شادیوں میں نیوتے دے دے کر جو تباہ ہوئے ہیں، کچھ آنسو تو پونچھ جائیں گے اور پھر ثواب کا کام بھی ہے کہ چیچک کے مریض کو ہم نے پکڑوایا۔“

”پاگل ہو گئی ہو تم...... کیا رشتے دار بھی رشتے داروں کو زک پہنچایا کرتے ہیں......؟“

”اچھا تو پھر کون پہنچاتے ہیں؟“ میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

”بکواس مت کرو، ویسے ہی بہت پریشان ہوں، سارا بجٹ تباہ ہو چکا ہے، قرضے لے، لے کر تھک چکا ہوں۔“

”ہونہہ...... اب جان جلاتے رہنا اپنی کام کی بات تو کبھی سمجھ میں نہیں آئی۔“ میں بڑبڑاتے ہوئے اپنے بدشوق بچوں کو پڑھانے کے لیے بیٹھ گئی تھی جو روز اسکول جانے کے باوجود باقاعدگی سے فیل ہو رہے تھے اور اس سال بھی یہی امید تھی۔

☆☆☆




☆ساجدہ ظفر......کمالیہ

کون کیا ہے یہی فکر رہی تمام عمر
خود کیسا ہوں کبھی بھول کر بھی سوچا نہیں

☆ملکہ شوکت......سعودی عرب

یقیں نہ ہو تو ایک بار پوچھ کر دیکھو
جو ہنس رہا ہے وہ زخموں سے چُور نکلے گا

☆جبیں نیاز......ملتان

چند خوابوں کے عطا کر کے اجالے مجھ کو
کر دیا وقت نے دنیا کے حوالے مجھ کو
جن کو سورج میری چوکھٹ سے ملا کرتا تھا
اب وہ خیرات میں دیتے ہیں اجالے مجھ کو

☆شہناز قدیر......کراچی

سکونِ قلب تو طیبہ میں چھوڑ آیا ہوں
میں کیا بتاؤں کہ لایا ہوں کیا مدینے سے

☆نادیہ علی......اسلام آباد

جلا رہے ہیں جو میرے مقابلے میں چراغ
وہ جگنوؤں سے زیادہ ضیا نہیں رکھتے

☆صبا سجاد......دبئی

کس کو ہے فرصتِ آرائش گیسوئے خیال
ورنہ اتنا تو میں ناواقفِ انجام نہیں
بن گیا آپ ہی میں اس کا پیامی ماہر
جانبِ یار سے ورنہ کوئی پیغام نہیں

☆عرشیہ جنید......کراچی

کس جرم کی سزا میں ہے یہ حالِ آدمی
جس کو بھی دیکھیے وہ کسی ابتلا میں ہے

☆ناظرہ علی......سیالکوٹ

بڑے یقیں سے کیا تھا مظاہرہ جس کا
ترا وہ عہدِ محبت کہاں گیا ساقی

دل و دماغ میں جب تک کہ ارتباط نہ ہو
بڑی کٹھن ہے رہِ منزلِ وفا ساقی

☆ارم کمال......فیصل آباد

ٹوٹ جائیں نہ رگیں، ضبطِ مسلسل سے کہیں
چُھپ کے تنہائی میں کچھ اشک بہالے تو بھی

☆کرن کمال......کراچی

ٹوٹے رشتے وہ جوڑ دیتا ہے
بات رب پہ جو چھوڑ دیتا ہے
اس کے لطف و کرم کا کیا کہنا
لاکھ مانگو کروڑ دیتا ہے

☆حمنیٰ قندیل......کمالیہ

بہت مشکل سے ہوتی ہے تجارت تری یادوں کی
منافع کم سہی لیکن گزارہ ہو ہی جاتا ہے

☆ایمن رانی......ٹوبہ ٹیک سنگھ

کتنا معصوم بنا دیتا ہے انساں کو خلوص
دشمنوں کو بھی محبت کا گماں ہوتا ہے

☆عروبہ باز......کوٹلی

جو بات کرتے ہیں کم اور مختصر سی عدمؔ
وہ لوگ کتنے قرینے کی بات کرتے ہیں

☆ایمن زرناب......ٹوبہ ٹیک سنگھ

یہ شرط ہے دستک ہو اگر دستِ یقیں سے
در چھوڑ کے دیوار بھی کھل جائے کہیں سے

☆مہرین ضیا بخش......کیماڑی

کتنے معصوم ہوتے ہیں یہ آنکھوں کے آنسو بھی
یہ نکلتے ہیں ان کے لیے جنہیں پروا نہیں ہوتی

☆نگینہ ضیا بخش......کراچی

گھروں پہ نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

☆ماہ نور خان...... بہارہ کہو

تم اُدھر رخصت ہوئے، اِدھر جان نکلی میری
یہ کیسے حادثے سادگی سے ہو گئے
کچھ ہمیں بھی موت کی آرزو تھی عشق میں
راستے آساں بھی تری بے رخی سے ہو گئے

☆ثوبیہ ظہور...... ضلع اٹک

حرف حرف رٹ کر بھی آگہی نہیں ملتی
آگ نام رکھنے سے روشنی نہیں ملتی
آدمی سے انساں تک آ گئے تو سمجھو گے
کیوں چراغ کے نیچے روشنی نہیں ملتی

☆لاریب...... چونیاں

موسم کو بدلنا ہے بدل جائے گا آخر
سورج ہے کوئی شخص تو ڈھل جائے گا آخر
آنکھیں ہیں تو ہو جائیں گی بے آب کسی روز
دل ہے تو کسی روز سنبھل جائے گا آخر

☆ماہ زیب...... چونیاں

دیوانگی سے کم نہ تھی کچھ اپنی جستجو
ہم بے وفا جہاں میں وفا ڈھونڈتے رہے

☆فرح طاہر قریشی...... ملتان

یارب اب تو کوئی تعبیر بخش دے
کہ تھک گئی ہیں آنکھیں خواب بُنتے، بُنتے

☆زرینہ مشتاق...... منڈی بہاؤالدین

وہ اب جو دیکھ کے پہچانتے نہیں امجد
ہے کل کی بات یہ لگتے تھے کچھ ہمارے بھی

☆رابعہ شاہد...... راس الخیمہ

سرِ محفل جو بولوں تو زمانے کو کھٹکتا ہوں
رہوں چپ تو اندر کی بغاوت مار دیتی ہے

☆ممتاز خانم...... کراچی

ہمارے نام تو رسوائیاں ہی لکھی ہیں
وہ معتبر ہے اسے معتبر ہی رہنا ہے
کسی کے گھر کو گرا کے بنانا اپنا مکان
ہنر ہے یہ تو ہمیں بے ہنر ہی رہنا ہے

☆ماہ نور ارسلان...... لاہور

تصورات کی دولت نصیب ہوتی ہے
شبِ فراق بھی کتنی عجیب ہوتی ہے
مزہ تو تب ہو کہ غربت میں ساتھ دے کوئی
خوشی میں تو ہر اک شے قریب ہوتی ہے

☆فرح افتخار...... کراچی

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی راہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

☆آسیہ میر...... میانوالی

ہنستے بولتے لوگ بھی ہم کو حیراں، حیراں تکتے ہیں
تو ہی بتا اے راوِ تمنا ہم کس دیس سے آئے ہیں
تم اک چاکِ گریباں دیکھ کے ہم کو رسوا کرنے لگے
اچھا کیا جو ہم نے تم سے دل کے چاک چھپائے ہیں

☆زرینہ...... حیدر آباد

خاک میں ملتے دیکھے ہم نے کیا کیا راج دلارے لوگ
کیسی سندر سندر کلیاں کیسے پیارے، پیارے لوگ
میر ملیں تو ان سے کہیو اب بھی اس دکھ نگری میں
تیرے بہانے، اپنے فسانے، کہتے ہیں دکھیارے لوگ

☆امینہ مشیر...... نئی دہلی

لہو میں رنگ کی صورت بسا ہے تیرا خیال
میں کس طرح تیری یادوں سے فاصلہ رکھوں
کسی بھی شخص سے کوئی غرض نہیں ہے مجھے
میں صرف تیرے لیے سب سے واسطہ رکھوں

☆فاطمہ بلال...... امریکا

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

☆ثنا مرتضیٰ...... کراچی

ماہر میں دانہ چینِ زمیں تو ضرور تھا
لیکن بلندیوں پہ میرا آشیاں رہا

☆☆☆

# منتخب غزلیں

**ماہِ نومبر، شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبالؒ کا ماہِ پیدائش ہے...... اقبالؒ کی بیدار کن نظموں کے علاوہ غزلیات بھی بہت متاثر کن ہیں۔ اسی مناسبت سے اس عظیم شاعر کی دو منتخب غزلیں نذرِ قارئین ہیں۔**

زندگی انساں کی اک دم کے سوا کچھ بھی نہیں
دم ہوا کی موج ہے، رم کے سوا کچھ بھی نہیں

گُل، تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر
شمع بولی، گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو
کُھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

زائرانِ کعبہ سے اقبالؔ یہ پوچھے کوئی
کیا حرم کا تحفہ زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

دلِ مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

ترا بحر پُر سکوں ہے یہ سکوں ہے یا فسوں ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیِ کنارہ

تُو ضمیرِ آسماں سے ابھی آشنا نہیں ہے
نہیں بے قرار کرتا تجھے غمزۂ ستارہ

ترے نیستاں میں ڈالا مرے نغمۂ سحر نے
مری خاک پے سپر میں جو نہاں تھا اک شرارہ

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا
جسے آ گئی میسر مری شوخیِ نظارہ





# خوش ذائقہ
## پاکیزہ بہنیں

### چکن بروسٹ

اشیا: چکن، ڈیڑھ سے دو کلو۔(کھال سمیت) لیمو... کا رس، چار کھانے کے چمچے۔نمک، ایک چائے کا چمچ۔میدہ، ایک کپ۔مسٹرڈ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔سفید مرچ، ایک چائے کا چمچ۔پیپریکا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔چائنیز نمک، ایک چائے کا چمچ۔دار چینی،(پسی ہوئی) آدھا چائے کا چمچ۔انڈا، ایک عدد۔آئل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: مرغی کے بارہ ٹکڑے کروالیں۔ان ٹکڑوں کو دھو کر خشک کرلیں پھر ان پر نمک اور لیمو... کا رس لگا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔میدے میں نمک، مسٹرڈ پاؤڈر، سفید مرچ، پیپریکا پاؤڈر، چائنیز نمک، دار چینی پسی ہوئی ملا لیں۔انڈا اور دودھ پھینٹ لیں۔اب مرغی کے ٹکڑے، انڈے اور دودھ کے مکسچر میں ڈبو کر سوکھے میدے میں لپیٹ لیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔کڑاہی میں آئل ڈال کر آنچ درمیانی کردیں۔اب دو دو کر کے ان ٹکڑوں کو تلیں چکن کے ٹکڑے گولڈن براؤن ہوجائیں تو براؤن پیپر پر نکال لیں اور گرم، گرم پیش کریں۔

مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

### تلوں والا چکن

اشیا: مرغی کے سینے کا گوشت، آدھا کلو۔(لمبائی میں کٹا ہوا) چاول کا آٹا، دو کھانے کے چمچ۔تیل، دو چائے کے چمچ۔سفید تل، تین کھانے کے چمچ۔میدہ، ایک کپ۔چکن کیوبز، دو عدد۔بیکنگ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔زیرہ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔پانی، ایک کپ۔تیل، تلنے کے لیے۔سیاہ مرچ اور نمک، حسب ذائقہ۔

ترکیب: مرغی کے باریک اور لمبے کٹے ہوئے ٹکڑوں پر تھوڑا میدہ، نمک اور سیاہ مرچ چھڑک دیں۔پانی گرم کر کے چکن کیوبز گھول لیں اور پھر ٹھنڈا ہونے دیں۔باقی میدہ، بیکنگ پاؤڈر، چاولوں کا آٹا، زیرہ پاؤڈر ایک پیالے میں ڈال کر کیوبز والے پانی میں گھول لیں۔اب سفید تل اس میں ملا کر ڈھانپ کر رکھ دیں۔تیل گرم کریں، میدے کے مرکب میں چکن کے ٹکڑے ڈبو کر نکال لیں اور گولڈن براؤن فرائی کرلیں۔اس کے لیے آنچ درمیانی ہونی چاہیے۔ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: سنبل ملک، شاہدرہ

### چکن نگٹس

اشیا: چکن بریسٹ پیس آدھا کلو چوکور ٹکڑے کرلیں۔مسٹرڈ پاؤڈر ایک کھانے کا چمچ۔سفید پسی ہوئی مرچ، ایک کھانے کا چمچ۔چینی، آدھا چائے کا چمچ۔سویا ساس، دو کھانے کے چمچ۔سرکہ، ایک کھانے کا چمچ۔انڈے، تین عدد۔(پھینٹ لیں) آئل، تلنے کے لیے۔نمک، حسب ذائقہ۔میدہ، دو کھانے کے چمچ۔

ترکیب: ایک بڑے پیالے میں چکن کے ٹکڑوں میں سویا ساس، سرکہ اور خشک مسالے لگا کر آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔کڑاہی میں آئل گرم کر کے چکن کے ٹکڑوں کو پہلے میدے اور پھر انڈے اور بریڈ کرمز میں لپیٹ کر پندرہ منٹ رکھ کر گولڈن فرائی کرلیں اور براؤن پیپر پر نکال کر پھیلا دیں۔چکن نگٹس تیار ہیں، فرنچ فرائز اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: عظمیٰ علی، لاہور

### پالک پنیر

اشیا: پالک، ڈیڑھ کلو۔(کاٹ کر ابال لیں اور پیس لیں) پالک اپنے پانی میں ابلے گی۔سویا، تھوڑا سا خوشبو کے لیے۔دودھ، ایک کپ۔فریش کریم، ایک

کپ۔ لہسن، ایک کھانے کا چچ۔ پیاز، ایک عدد۔ (درمیانے سائز کی) کالی مرچ، پسی ہوئی ایک چائے کا چچ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کاٹیج چیز، پچاس گرام۔ آئل، حسبِ ضرورت۔ املی کا گودا، ایک چچ۔

ترکیب: آئل گرم کر کے پیاز کو تل لیں۔ جب پیاز نرم ہو جائے تو اس میں املی اور پسی ہوئی پالک ڈال کر اچھی طرح بھونیں پھر اس میں دودھ شامل کر کے پکائیں۔ گاڑھا ہو جائے تو آنچ ہلکی کر دیں، نمک اور کالی مرچ شامل کر لیں۔ اب کریم ڈال کر مکس کر لیں پھر دیگچی کو چولھے پر سے اتار لیں۔ اب کڑاہی میں تیل گرم کریں اور کاٹیج چیز کو چوکور ٹکڑے کر کے براؤن ہونے تک تلیں۔ جب براؤن ہو جائے تو اس کو ٹھنڈے پانی میں ڈال دیں تاکہ نرم ہو جائے۔ اب پانی سے نکال کر تیار پالک پر ڈال کر اوپر سے ہرا سویا شامل کر لیں۔ لیجیے مزیدار پالک پنیر تیار ہے۔

مرسلہ: نکہت سلیم، کراچی

## کھجور کی پڈنگ

اشیا: خشک کھجور، دو پیالی۔ اسفنج کیک کے ٹکڑے، دو پیالی۔ دودھ، چار پیالی۔ مکھن، ایک کھانے کا چچ۔ انڈے، تین عدد۔ شکر، دو کھانے کے چچ۔ کارن فلور، ایک کھانے کا چچ۔ فوڈ سیرپ، (کسی بھی فلیور میں) ڈیڑھ پیالی۔ ونیلا ایسنس، آدھا کھانے کا چچ۔

ترکیب: رات بھر بھیگی ہوئی کھجوروں سے گٹھلیاں نکال کر انہیں ٹکڑے کریں اور ٹین کے سانچے میں رکھ دیں۔ کیک کے ٹکڑوں کو تین منٹ کے لیے دودھ میں بھگو دیں تاکہ نرم پڑ جائیں اور اسی دوران شکر، مکھن، ونیلا ایسنس اور انڈے ملا کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں اور اس میں دودھ میں بھیگے ہوئے کیک کے ٹکڑے شامل کر سانچے میں رکھے کھجوروں پر ڈال دیں۔ اب سانچا ڈھک دیں۔ ایک بڑے برتن میں پانی ابال کر اس میں بند کیا ہوا یہ سانچہ اس طرح رکھیں کہ وہ آدھا پانی میں ڈوبا ہوا ہو، اب اسے بیس منٹ تک بھاپ میں پکائیں اور پھر سانچہ نکال کر ٹھنڈا کر لیں اور کھول کر اندر موجود پڈنگ آہستہ سے کسی

## دہی

دہی کے بہت سے فوائد ہیں، یہ ایک اچھا کلینزر بھی ہے۔ اسے کچھ دیر چہرے پر لگا کر رکھیں اور پھر نیم گرم پانی سے چہرہ دھو لیں۔ یہ کیل مہاسوں کو صاف کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہے۔ داغ دھبوں والی جلد پر اگر دہی لگائی جائے تو اس سے جلد صاف شفاف ہو جاتی ہے۔ نہانے سے قبل اگر دہی کو سر پر لگایا جائے تو خشکی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ دہی بالوں میں لگانے سے بالوں کو غذائیت ملتی ہے۔

مرسلہ: صدف نورین، لاہور کینٹ

ڈش میں الٹ لیں۔ کارن فلور کو فوڈ سیرپ میں حل کر کے گاڑھا ہونے تک پکائیں اور پھر اسے پڈنگ پر پھیلا دیں۔ ٹھنڈا کر کے پیش کریں، موسمِ سرما کے لحاظ سے یہ ایک بہترین ڈش ہے۔

مرسلہ: بشریٰ زرین...... کراچی

## ماخوتی

اشیا: دودھ، ایک کلو۔ دال مونگ، دو سو گرام۔ کھویا، آدھا پاؤ۔ شکر، تین کپ۔ چھوٹی الائچی، تین سے چار عدد۔ پستہ، بارہ عدد۔ بادام بارہ عدد۔ کیوڑا، حسبِ پسند۔

ترکیب: مونگ کی دال کو نرم ابال کر تھوڑا سا پیس کر باریک کر لیں۔ بادام اور پستہ باریک کتر لیں اور الائچی کے دانے بھی نکال لیں۔ سب سے پہلے دودھ کو ابال کر اس میں الائچی شامل کر لیں اور پھر دال بھی ڈال کر اسے 20 سے 25 منٹ تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب گاڑھا پن محسوس ہونے لگے تو شکر بھی شامل کر دیں اور مزید پکاتے ہوئے کھویا بھی ڈال دیں اور جب یہ آمیزہ کھیر کی طرح گاڑھا ہو جائے تو چولھے سے اتار کر اس میں تھوڑا سا کیوڑا ڈال دیں اور پانچ منٹ تک ڈھکن بند کر کے رکھ دیں اور بعد میں بادام اور پستہ چھڑک کر فریج میں ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

مرسلہ: مسرت کنول، حیدر آباد



# حسن نکھارئیے

مہ جبیں

پیاری بہنو! گزشتہ ماہ ہم نے آپ سب کی دلکشی اور رعنائی کے لیے آپ کے ہی باورچی خانے سے چند اشیا لے کر ان کے متعلق بتایا تھا تو اس مرتبہ بھی ہم سلسلہ وہیں سے جوڑ رہے ہیں...... تاکہ آپ بلاوجہ بازاری کریموں کے پیچھے پریشان نہ ہوں۔

## گاجر

اس سبزی میں رنگ روپ میں نکھار پیدا کرنے کی خاصیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ گاجر خون کو صاف کرنے اور جلد کو سرخی مائل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لہٰذا خواتین کو یہ سبزی بہت زیادہ خوراک کے طور پر استعمال کرنی چاہیے۔ گاجر کو اگر بھاپ یا پانی میں ابال کر استعمال کیا جائے تو جلد میں حیران کن حد تک دلکشی اور جاذب نظری پیدا ہو جاتی ہے۔ کچی گاجر کا عرق بہت جلد اثر کرتا ہے۔ اس سے مساج بھی کریں۔

## انڈا

انڈا بہت فائدہ مند ہے۔ اس کو پروٹین کا خزانہ کہا جاتا ہے۔ انڈے کی سفیدی میں شہد ملا کر لگانے سے جلد میں رونق آتی ہے۔ بالوں کو چمک دار بنانے اور خشکی سے پاک کرنے کے لیے انڈا اپھینٹ کر لگائیں اور آدھے گھنٹے بعد سر دھولیں۔

## شہد

شہد جلد کی بیماریوں، سوزش، جلن کے لیے بہترین ہے۔ یہ جلد میں نمی کی مقدار کو برقرار رکھ کر اسے جھریوں، چھائیوں اور داغ دھبوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ عرق گلاب میں شہد ملا کر چہرے پر لگا کر مساج کریں۔ کم از کم بیس سے پچیس منٹ تک لگا رہنے دیں پھر ہلکے ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھولیں، جلد نکھر جائے گی۔

## ملتانی مٹی

ملتانی مٹی کیل، مہاسوں کے ساتھ، ساتھ چہرے کے داغ دھبے بھی صاف کر دیتی ہے۔ جس سے چہرہ چمک دار اور پُرکشش ہو جاتا ہے۔ رات کو سونے سے پہلے ملتانی مٹی سے منہ دھولینا جلد کے لیے فائدہ مند ہے۔ اس سے دن بھر کا گرد و غبار صاف ہو جاتا ہے۔ گلاب کے عرق میں ملتانی مٹی بھگو کر رکھ دیں اور جب نرم پڑ جائے تو اس کا ماسک چہرے پر لگائیں۔ چہرہ نکھر جائے گا (ہفتے میں دو بار کریں)

## گلاب کا پھول

گلاب کی تازہ پتیوں کو ایک بالٹی میں بھگودیں۔ چند گھنٹوں کے بعد پانی کو چھان کر اس سے نہائیں تو جسم تازہ دم اور نکھرا، نکھرا ہو جائے گا۔ گلاب کی تازہ پتیوں کو باریک پیس کر چہرہ پر لگا کر آہستہ، آہستہ مالش کریں اس سے جلد نکھر جاتی ہے۔ عرق گلاب بہترین موئسچرائزر بھی کہلاتا ہے۔ شدید دھوپ سے آکر عرقِ گلاب سے چہرہ دھونا چاہیے۔

## لیمو

لیمو غذائی اہمیت کے علاوہ اپنی جمالیاتی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ اس میں حیاتین اے، بی اور سی دوسرے پھلوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ جن خواتین کے چہرے کی جلد بے حد چکنی اور کھلے ہوئے مسام والی ہو ان کو چاہیے کہ چہرہ دھونے سے پہلے لیمن کلینزنگ لوشن سے جلد صاف کریں۔ اس سے چہرے کی چکنائی ہٹ جائے گی اور جلد کے کھلے ہوئے مسام یکسر بند ہو جائیں گے۔

جن خواتین کی رنگت دھوپ میں نکلنے کے باعث سانولی ہونے لگے وہ صبح کے وقت آدھا لیمو نیم گرم پانی کے ایک گلاس میں نچوڑ کر پئیں اور رات کو سونے سے پہلے لیمو... چہرے پر ملیں۔ اس سے رنگت نکھرنے لگے گی۔

## چہرے کے داغ دھبے دور کرنے کے لیے

لیمو... کے چھلکے دودھ میں پیس کر رات کو لگائیں۔ اس کے علاوہ بالائی میں لیموں کے رس کے چند قطرے ڈال کر ملنے سے یا دیسی سنگترے کے سوکھے ہوئے چھلکے پیس کر ابٹن بنا کر لگانے سے بھی چہرے کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔





# بزمِ پاکیزہ پاکیزہ بہنیں

## پہلا انعام یافتہ سوال

☆ نگینہ ضیا بخش......کراچی
سوال: اگر ساس بھڑک جائے......تو پھر کیا کریں......؟
جواب: محبت کی برکھا بن کر اس پر چھا جاؤ۔

## دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ ناظمہ شاہین اعوان......واہ کینٹ
سوال: شک کی دیوار کو آخر کیسے گرایا جائے؟
جواب: بھروسے کی کلہاڑی سے۔

☆ حمنیٰ قندیل......کمالیہ
سوال: کس قسم کے نام دل کی ڈائری میں نشر ہوا کرتے ہیں؟
جواب: جنہیں آپ سننا پسند کرتی ہیں۔

☆ فلک بنتِ ندیم......حیدر آباد
سوال: عقل کے ناخن کس عمر تک نکل آتے ہیں؟
جواب: بعض لوگ تو ساری عمر ہوش کے ناخن نہیں لیتے۔

☆ رفعت محمد یونس خادم......ملتان
سوال: سلسلے محبتوں کے کبھی نہ ہوں گے کم......ایسے جملے کون بولا کرتا ہے؟
جواب: ہر سیاسی جماعت اپنی پریس کانفرنس کے آخر میں اس قسم کے جملے بولا کرتی ہے۔

☆ صبا نور......لیہ
سوال: ساون میں بھی بھلا کوئی آگ لگا سکتا ہے؟
جواب: ہاں اکثر جب تقاریب میں خواتین ایک سے بڑھ کر ایک کے تحت تیار ہو کر آتی ہیں......تو ہر موسم میں آگ لگ جایا کرتی ہے۔ان سے جلنے والیوں کو۔

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ
سوال: یادوں کو اپنے چہرے پر سجانا ہوتا تو کیسے سجاتے؟
جواب: ان کا جھومر بنا کر چہرے پر لگائے پھرتے بلکہ بعض لوگ تو یہ جھومر کانوں اور گلے میں بھی پہنے ہوتے۔

☆ نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ
سوال: تنہائی کی بکواس بازی بھی اچھی لگتی ہے......مگر کب؟
جواب: جب اپنے آپ سے ہمدردی کرنے کو دل چاہے۔

☆ شہلا نواز......لاہور
سوال: اگر چڑچڑی ساسیں نہ ہوتیں تو......؟
جواب: بعض چڑچڑے شوہر بھی ظالم ساسوں کی کمی پوری کر دیتے ہیں۔

☆ صائمہ سجاد بخش......کوہاٹ
سوال: بعض خواتین اتنی دبلی ہوتی ہیں......جیسے کسی نے ہینگر پر کپڑے لٹکا دیے ہوں؟
جواب: اور وہ اپنے دبلے پن پر ناز کرتی ہیں اور موٹی خواتین کا مذاق اڑاتی ہیں۔

☆ پروین افضل شاہین......بہاول نگر
سوال: میرے سعادت مند شوہر کو میری سہیلیاں جورو کا غلام کیوں کہتی ہیں؟
جواب: مارے حسد کے کہتی ہوں گی...... کہ

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



فرمانبردار اور سعادت مند شوہر تو قسمت والیوں کو ملا کرتے ہیں۔

☆ حلیمہ سعدیہ......مدینہ آباد

سوال: بھری بہار میں امیدوں کے پھول اگر نہ کھلیں تو......؟

جواب: صبر کریں۔

☆ سیدہ غزالہ عالم......لانڈھی کراچی

سوال: یہ 2016ء سال گزر ہی گیا......یہ کس کا سال تھا؟

جواب: یہ ہم سب کا ہی تھا......سب نے اپنے اپنے رنگ اور ڈھنگ دکھائے۔

☆ کنول......پنجاب

سوال: وہ مجھے اپنی آنکھوں کا خار ہی سمجھا کرتے ہیں، کیا کروں؟

جواب: اب تم ان کی آنکھوں کا موتیا (کیٹرک) بن جاؤ۔

☆ عظمیٰ زہری......اوستہ محمد

سوال: آواز کی رفتار بتائیں؟

جواب: لڑائی جھگڑوں میں آواز کی رفتار......روشنی کی رفتار کے برابر جاتی ہے۔

☆ نسرین بیگم......کراچی

سوال: وہ کس کیٹیگری کے شوہر ہوتے ہیں......جو کہیں پر جاتے ہی اپنی بیوی کی تعریفیں کرنی شروع کر دیتے ہیں؟

جواب: عادی مجرم......جن کے دل کا چور انہیں ڈراتا رہتا ہے کہ کہیں کسی کو پتا نہ چل جائے۔

☆ فریدہ بانو......پنجاب

سوال: دل خون کے آنسو کب روتا ہے؟

جواب: جب کلیجا جلتی اور جگر پارہ، پارہ ہوتا ہے۔

☆ انیسہ حامد......کراچی

سوال: باجی آپ ٹی وی پر ڈرامے زیادہ شوق سے دیکھتی ہیں یا ٹاک شوز؟

جواب: میں ٹاک شوز زیادہ رغبت سے دیکھتی ہوں......مگر اب تو وہ بھی ڈرامے ہی لگتے ہیں۔

☆ شاہینہ ناز......راول پنڈی

سوال: برقعے میں لڑکیاں کتنی خوب صورت لگتی ہیں، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہاں، واقعی لگتی ہیں......مگر بعض میکسی کی طرح چست برقع دیکھ کر لگتا ہے کہ انہیں اس پر ایک اور برقع پہننا چاہیے۔

☆ مسز روزینہ عابد......کراچی

سوال: اگر لڑکیاں اپنے پرس میں چاقو اور چھریاں بھی رکھنے لگیں تو؟

جواب: اکثر خواتین سنڈے بازار سے شاپنگ کرتے ہوئے بہت سی چیزیں اپنے پرس میں ہی رکھا کرتی ہیں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

☆ ماہ رخ......حیدر آباد

سوال: مینڈکی کو زکام کب ہوتا ہے؟

جواب: جب وہ آئس کریم زیادہ کھالیتی ہے۔

☆ مسز واجد......لاہور

سوال: اب دل توڑنے کی وارداتیں کیوں بڑھ گئی ہیں؟

جواب: ہم ان لوگوں پر بھروسا کرنے لگے ہیں......جن سے ہمیں گفتگو کرتے ہوئے بھی محتاط رہنا چاہیے۔

☆ سلمیٰ......سیالکوٹ

سوال: وہ مجھے دیکھ کر راستہ کیوں بدل دیتے ہیں؟

جواب: تا کہ تم سمجھ جاؤ......اور کسی بھی غلط فہمی میں نہ رہو۔

☆ سدرہ کلثوم......پشاور

سوال: شوہر بیوی کا غلام ہو تو اسے زن مرید کہتے ہیں اور بیوی اگر مرد کی غلام ہو تو......؟

جواب: اسے نیک بیوی کہا جاتا ہے......کہ شوہر کی مرضی کے بغیر آنکھ نہیں اٹھاتی۔

☆☆☆

# ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

## ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

### نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com



# روحانی مشورے

ادارہ

## نماز اوابین

نفلی نماز کم از کم دو رکعت پڑھی جاتی ہے اور یہ نفل مغرب کے بعد پڑھے جاتے ہیں۔

نماز اوابین کے بارے میں صحابی عمار بن یاسرؓ نے کہا۔ میں نے رسول کو دیکھا کہ آپؐ مغرب کے بعد چھ رکعت پڑھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو یہ نماز پڑھے اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس کے گناہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مغرب کے بعد 20 رکعتیں پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک محل تعمیر کروائے گا، نیز لکھا ہے کہ جنت کے ایک دروازے کا نام اواب ہے جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے درخواست کرے گا کہ اے اللہ! جس نے میرے نام والی نماز پڑھی اس کو مجھ میں داخل فرما۔ اللہ تعالیٰ اس کی درخواست قبول کرے گا۔

## ہر شر سے حفاظت کا طریقہ

حضرت عبد اللہ ابن خبیبؓ سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی اور سخت اندھیرا تھا۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش کرتے ہوئے نکلے۔ پس ہم نے آپ کو پالیا۔ ہم سخت پریشانی کے عالم میں تھے۔

آپؐ نے فرمایا سورۂ اخلاص، سورۂ فلق اور سورۂ ناس صبح شام تین مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ یہ تجھے ہر چیز کے لیے کافی ہو جائے گی۔

آپ سب اپنا یہ معمول بنالیں، یہ جو ہر نیا دن نئی نئی پریشانیاں لے کر آرہا ہے۔ آپ کو مخلوق کے ہر شر سے نجات حاصل ہوگی۔ انشاء اللہ۔

## امتحان میں آسانی ہو

آج کے طالب علموں کا یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ پرچے آسان آئیں، جنھیں وہ بہ آسانی حل کر سکیں اور انہیں اس میں فتح اور کامیابی حاصل ہو۔ امتحان کے دنوں میں پیپر دینے سے پہلے سات مرتبہ گھر سے پڑھ کر جائیں۔ (پارہ نمبر 10...... سورۂ انفال، آیت نمبر 62)

## کند ذہن طالب علموں کے لیے

اگر طلبا و طالبات کند ذہن ہیں اور امتحان میں نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس نہیں ہو پاتے تو انہیں 121 مرتبہ پانی پر (پارہ نمبر 5۔ آیت 113، سورۂ نساء) دم کر کے روزانہ پلائیں۔ انشاء اللہ اس کی برکت سے وہ عالم اور فاضل ہو جائیں گے۔

## بخار اتر جائے گا

بخار کی تیزی ختم کرنے کے لیے یہ دعا پڑھ کر مریض پر دم کر دیں۔ غصہ ضد کو ختم کرنے کے لیے بھی اس دعا کا استعمال مفید ہے۔ یہ پارہ نمبر 17 میں سورۂ انبیا کی آیت نمبر 69 ہے۔ یٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ

## ہر جائز کام کے لیے

اگر کسی شخص کا کوئی کام اٹکا ہوا ہو اس کے لیے اور اس کے علاوہ ہر جائز کام کے لیے اس دعا کو عقیدے کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے پڑھیں۔ یہ دعا فتح کے دروازے کھول دیتی ہے۔ بے حد آزمودہ دعا ہے۔ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (پارہ 30 آیت 5 سورۃ والضحیٰ

## بے قصور

اگر کوئی شخص کسی کے مکرو فریب میں پھنس گیا ہو اور وہ بے قصور ہو تو پارہ نمبر 12 کی سورۂ یوسف کی آیت نمبر 34 کو کثرت سے پڑھے۔ وہ مکاری کے جال سے نکل آئے گا۔ اس کے ساتھ، ساتھ ہم سب کو صبح شام سورۂ بقرہ بھی ضرور پڑھنی چاہیے، چاہے چند

صفحات ہی پڑھیں یا چند سطریں...... مگر پڑھیں ضرور۔

## فتوحات کے دروازے

جو شخص سیدھی راہ سے بھٹک گیا ہو...... یا برے کاموں میں پڑ گیا ہو۔ وہ روزانہ 101 مرتبہ پارہ نمبر 30 کی سورۃ النزاعت کی آیت نمبر انیس پڑھ کر پانی پر دم کرکے پیں۔ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى

## بچے بد زبان ہوجائیں تو

اب زیادہ تر گھرانوں کے والدین اس لیے پریشان رہتے ہیں کہ ان کے بچے نہ صرف ان سے ہتک آمیز لہجے میں بات کرتے ہیں بلکہ ان کا کہنا بھی نہیں مانتے ایسے بچے اپنی ہر بات صحیح اور دوسروں کی غلط سمجھا کرتے ہیں۔ غصہ ہر وقت ان کے سر پر سوار رہتا ہے۔ گھر کا ماحول کشیدہ رہتا ہے۔ ایسے تمام بچوں کے بگاڑ کا سبب آپ خود ہی ہیں۔ جن کے والدین ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں یا ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتے یا جن کے گھروں میں اپنے بزرگوں کی عزت نہیں کی جاتی، ان کے اپنے بچے بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ وہ والدین جو بچوں کو ٹی وی اور انٹرنیٹ کے حوالے کرکے خود پُرسکون رہتے ہیں ان کے بچے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایسے تمام بچوں کو سورۃ فاتحہ کا دم شدہ پانی پلائیں اور جب وہ سوجائیں تو ان کی پیشانی پر تین مرتبہ سورۃ فاتحہ کے ساتھ تین مرتبہ سورۃ کوثر بھی دم کردیں۔ عمل کی مدت تین ماہ ہے۔

## بچے آپس میں لڑتے ہیں

اکثر گھرانوں کے بچے چھوٹے ہوں یا بڑے ان میں آپس میں اتنی لڑائیاں ہوتی ہیں جیسے وہ ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔ میری فلاں چیز کیوں چھوئی، میری شرٹ کیوں پہن لی، میری بائیک کو کیوں ہاتھ لگایا...... میرے کمرے میں کیوں آئے، میری کرسی پر کیوں بیٹھے، میری بات میں کیوں بولے یا کوئی بھی معمولی بات جس کو وہ غیر معمولی بنانے میں ماہر ہوتے ہیں ان کی آپس کی لڑائیاں والدین کی زندگی کو عذاب بنادیا کرتی ہیں۔ جب بچے گہری نیند سوجائیں تو ان کے سرہانے سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر 28 اول و آخر تین، تین مرتبہ درود شریف کے ساتھ پڑھ کر دم کردیں اور بچوں کو کبھی اشتعال میں نہ آنے دیں۔ کسی کی بات کسی کو نہ بتائیں۔ اگر بات بھی کریں تو تعریف کی ہو کہ تمہاری بہن تمہاری تعریف کررہی تھی یا تمہارا بھائی تو ہمارے لیے بڑے اچھے خیالات رکھتا ہے۔ تم خواہ مخواہ اس سے لڑا کرتے ہو۔ یہ مائیں ہی ہوتی ہیں جو اپنے بچوں کو یکجا رکھنے میں معاون ہوتی ہیں۔ اور وہ بھی مائیں ہوتی ہیں جن کی بے وقوفی کے طفیل سگے بہن، بھائی (عمر کے کسی بھی حصے میں) ایک دوسرے کی شکلوں سے بدظن ہوجاتے ہیں۔ ان پر بھروسا نہیں کیا کرتے۔ اس لیے کبھی اپنے بچوں کے معمولی سے بھی راز ایک دوسرے کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ بچوں کے سامنے ہمیشہ مثبت گفتگو کریں۔ لڑائی جھگڑوں کی باتیں...... خاندانی جھگڑوں کے قصے بھی اپنے بچوں کے سامنے نہ دہرائیں۔

## اولادِ نرینہ ہو

جن کو اولادِ نرینہ کی خواہش ہو بعد نمازِ عصر صرف ایک مرتبہ سورۃ محمد پڑھا کریں بچے کے نام سے پہلے محمد ضرور لگائیں اور اسلامی نام رکھیں۔ پڑھنے کی مدت پہلے ماہ سے آٹھ ماہ تک کی ہے۔

## حمل کی حفاظت کے لیے

روزانہ صبح شام چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کریں اور ایک مرتبہ سورۃ محمد پڑھا کریں۔ گرم مسالاجات سے پرہیز کریں۔

## بانجھ پن کو ختم کرنا

اس کے لیے آپ پیاز کا درمیانی سفید حصہ روزانہ نہار منہ سورۃ فاتحہ تین بار دم کرکے کھائیں، تین ماہ میں امید پوری ہوگی۔

## محرومی ختم ہوئی

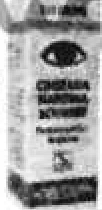
جو شخص اولاد سے محروم ہو وہ روزانہ 101 دفعہ سورۃ کوثر بسم اللہ کے ساتھ پڑھے۔ انشاء اللہ اسے کامیابی ہوگی۔ مرد حضرات نہار منہ اچھی قسم کے تین چھوہارے سات مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر تین ماہ تک کھائیں۔ انشاء اللہ کرم ہوگا۔

☆☆☆




# شوابے ہومیو کلینک






اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تا کہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تا کہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

## پولیپس اور سائنو سائٹس

راحیلہ.......بہاول پور

میں پاکیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں اور ہومیو کلینک ضرور پڑھتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ دس سال سے الرجی ہے۔ پہلے پہل مجھے زکام لگا اور ناک بند ہوگئی۔ میں نے بہت علاج کروایا۔ ایکسرے بھی کروائے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ناک میں بائیں طرف کی ہڈی بڑی ہوئی ہے۔ میں نے آپریشن نہیں کروایا۔ لیکن ڈاکٹری، حکیموں اور ہومیو علاج کروایا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ مجھے سردی گرمی زکام نزلہ رہتا ہے، کوئی دن ایسا نہیں جو مجھے ریشہ نہ آیا ہو۔ اب جب الرجی کا دورہ ہوتا ہے تو ناک میں جلن ہوتی ہے۔ چھینکیں آتی ہیں۔ ناک فوراً بند ہو جاتی ہے۔ جلن اتنی زیادہ ہوتی ہے جیسے آگ لگی ہو یا مرچیں لگ جائیں۔ ریشہ اتنا ہوتا ہے کہ قطرے گرتے ہیں۔ صبح جب سو کر اٹھتی ہوں تو سر کے سائڈ اور پیچھے کی طرف درد ہوتا ہے۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے سر میں ہتھوڑے پڑ رہے ہوں۔ سجدے میں جاتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ ماتھا کھنچ رہا ہو۔ اور چکر آتے ہیں۔ ریشہ گلے میں گرتا ہے تو کھانسی ہونے لگتی ہے۔ لیکن کھانسی کچھ دن کے بعد ختم

### ٹوکن

**برائے شوابے ہومیو کلینک**

**دسمبر 2016ء**

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____________

ہوجاتی ہے۔

ریشہ بعض اوقات گٹھلیوں کی طرح منہ کے راستے نکلتا ہے۔ کبھی سبز اور کبھی سفید ہوتا ہے۔ لیکن ریشہ ختم نہیں ہوتا۔ اب تو ناک بھی زیادہ بند ہونے لگی ہے۔ میں نے ہر قسم کی گولیاں، ناک بند ہونے کے اسپرے، قطرے سب استعمال کرلیے ہیں لیکن آرام نہیں آیا۔ وزن بہت زیادہ ہوگیا ہے اور روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مجھے ہائی بلڈ پریشر ہے جو کہ موروثی ہے۔ تقریباً 160/95 تو رہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میں نے بڑی امید سے یہ خط لکھا ہے۔ میں اب دوائیاں کھا کھا کر تھک گئی ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی ایسی دوائی دیں کہ میں بھی نارمل زندگی گزار سکوں۔

جواب: بی بی آپ کو کرانک سائنو سائٹس اور پولیپس ہے۔ اس کے لیے دھول مٹی سے بچیں، ماسک کا استعمال کریں، نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر ناک میں اوپر چڑھائیں صبح اور شام، ساتھ میں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Marum Varum 30 کے 5 قطرے 3 مرتبہ لیں، Viscum Pentarkan Ptk89 کے 10 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ لیں۔ Cinabaris Pentarkan Ptk 31 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چوسیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کریں۔

چہل قدمی کی عادت ڈالیں، کھانے میں مرغی، نمک اور ٹھنڈی، کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔

## چہرے پر بال

### زریں..........فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب کچھ دنوں میں میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا مسئلہ ایک تو یہ ہے کہ میرے چہرے پر بال ہیں، تھریڈنگ کرا کرا کے تنگ آگئی ہوں، دوسرا مسئلہ میرے بازوؤں پر نشان ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرے یہ مسائل جلد از جلد حل ہوجائیں۔ برائے مہربانی میرے لیے کوئی اچھا نسخہ تجویز کریں۔




جواب: بی بی ہارمونز کی خرابی کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ اپنے ماہانا نظام کے متعلق بھی لکھیں، آپ نے یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کا وزن کتنا ہے اور بازوؤں پر جو نشان پڑے وہ کب سے ہیں، کیسے ہیں۔ پہلے کے مقابلے اب ان کا سائز اور کلر وغیرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Oleumjec 30 5, 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ Graphites -30 اور Pulsatilla 30 کے بھی 5،5 قطرے ایک گھونٹ پانی دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد تفصیلی خط لکھ کر اپنی کیفیت سے آگاہ کریں۔

## خون کی کمی

### روزینہ..........حیدرآباد

ڈاکٹر صاحب ایک ماہ کا مجھے حمل تھا جو کہ ضائع ہوگیا یعنی (ابارشن) اس بات کو تقریباً 12 سال ہوگئے ہیں۔ اس کے بعد سے کمزوری بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ صبح اور دوپہر کو سو کر اٹھتی ہوں تو طاقت نہیں ہوتی۔ آدھا گھنٹا پڑی رہتی ہوں پھر اٹھتی ہوں۔ اگر فوراً اٹھوں تو دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے۔ میرے ہاتھوں کے ناخنوں پر لکیریں بھی ہیں۔ خون کی کمی بھی بہت زیادہ ہے۔

جواب: صحیح علاج کے لیے صحیح تشخیص ضروری ہے اور صحیح تشخیص کے لیے مرض کی علامات و کیفیات، معائنہ، متعلقہ رپورٹس کا ہونا ضروری ہے، الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹس کا ذکر تو آپ نے کیا ہے لیکن وہ رکھنا بھول گئیں...... بہر حال ایک ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کر کے تازہ الٹرا ساؤنڈ اور کیفیات لکھ کر بھیجیں۔ Sabina6-




, Bovista30 کے 5 قطرے دن میں 3 مرتبہ ایک گھونٹ پانی میں لیں اور Thlaspi BursaQ, AlfalfaQ دن میں 3 بار 5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں لیں۔

## ڈپریشن

**مائی اختراں..........راجن پور**

عرض ہے کہ میرا بیٹا محمد علی عمر 26 سال غیر شادی شدہ، میٹرک پاس اور کوئی روزگار نہیں۔ ایک سال پہلے بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ روزگار نہ ہونے کی وجہ سے ٹینشن کا شکار ہے اور اب چھوٹی چھوٹی باتوں کی ٹینشن لیتا ہے اس وجہ سے کافی ڈپریشن کا شکار ہے۔ کبھی روتا ہے اور کبھی ہنستا ہے، کبھی گالیاں بھی بکنے لگتا ہے۔ سر میں سخت درد ہوتا ہے، نیند بہت کم آتی ہے، ذہنی اور جسمانی لحاظ سے کافی کمزور ہے، یادداشت بھی بری طرح سے متاثر ہوئی ہے۔ بچپن سے اسے شدید قبض رہتا ہے۔ ایلوپیتھی علاج کروا رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میرا ایک ہی بیٹا ہے اور میں بیوہ ہوں۔ پاکیزہ کی پرانی قاری ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ میرے بیٹے کا ٹھیک علاج تجویز کریں گے۔

جواب: آپ اور آپ کا بیٹا دو رکعت صلوۃ الحاجات پڑھ کر دعا کریں، صبح فجر کے بعد سورۃ یٰسین اور مغرب کے بعد سورۃ الواقعہ کی تلاوت کریں، نماز کی سختی سے پابندی کریں، ہر چیز کا مالک اللہ ہے اور کوئی کام اس کی رضا کے بغیر نہیں ہوتا۔ کوئی بڑا کام کرنے کے بجائے کوئی چھوٹا موٹا کام کریں۔ گھر میں رہ کر جب کھائے پیے گا تو قبض تو ہوگا۔ بلڈ پریشر چیک کرائیں، ناک کا معائنہ کرائیں۔ کیا اس کو نزلہ ہوتا ہے؟ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات حسبِ ہدایات استعمال کریں۔ 15 دن کے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

,Belladona 30 Stramonium30 اور Carbo.veg 30 کے 5,5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں 3 مرتبہ اور Passiflora Q کے 20 قطرے ایک گھونٹ پانی میں رات سونے سے ایک گھنٹا پہلے لیں۔

## وزن کی زیادتی

**عافیہ..........پتوکی**

میرا وزن 115 کلوگرام ہے۔ میں ناشتے میں ایک کپ دہی، گیارہ بجے ایک کپ چائے، دوپہر میں کبھی ایک اور کبھی دو روٹیاں لیتی ہوں۔ رات میں بہت ہی کم، کبھی کبھی چکن پیس کھاتی ہوں (مہینے میں دو بار) فروٹ میں آم کا موسم ہو تو روزانہ 2 آم اور خربوزے یا تربوز کا موسم ہو تو 2 سے 3 قاشیں کھاتی ہوں اور بس۔ بیماری مجھے کوئی نہیں ہے الحمدللہ۔ ڈاکٹر صاحب میں بڑھتے وزن سے بے حد پریشان ہوں۔ فی سبیل اللہ میری مدد کریں۔

جواب: اتنا وزن آپ کا کیسے ہو گیا؟ یہ نہیں لکھا۔ بچوں کی پیدائش کے بعد یا کوئی بیماری ہوئی؟ ورزش کیا کرتی ہیں؟ یہ خوراک جو آپ نے بتائی ہے کتنے عرصے سے لے رہی ہیں؟ کوئی ہارمونز کے ٹیسٹ وغیرہ کرائے یا نہیں؟ ان سب کی تفصیل بھیجیں۔ فی الحال 3 ماہ مندرجہ ذیل ادویات ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی استعمال کریں۔ Calc. Carb-200 ہفتے میں ایک مرتبہ لیں۔ یہ دوا لینے سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لینی۔ اس دوا کے ایک دن بعد Fucus ves-Ø اور Phytolaca e baccis-Ø کے 11-11 قطرے ایک گلاس پانی میں ڈال کر ہر کھانے سے پہلے لیں، دن میں 3 مرتبہ۔ کھانے میں تمام پھل اور سبزیاں لیں، ابلی ہوئی بھی لے سکتی ہیں۔ چاول آلو بھی لے سکتی ہیں۔ آم اور کیلا کنٹرول کر کے کھائیں۔ سوپ بھی لیا کریں۔ چہل قدمی ایک گھنٹا ضرور کریں۔

## نظر کی کمزوری

### فاطمہ..........چونیاں

میرا مسئلہ نظر کی کمزوری کا ہے۔ اکثر سر درد کی شکایت رہتی تھی۔ مگر معمولی سر درد سمجھ کر کبھی پیناڈول ٹیبلٹ لے لیتی تھی، مستقل درد رہنے پر ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ نظر کمزور ہو رہی ہے اور ڈیڑھ نمبر کا چشمہ تجویز کیا۔ اس کے بعد یہ ہونے لگا کہ ہر چند ماہ بعد چشمے کا نمبر بڑھتا رہا۔ اب یہ صورتِ حال ہے کہ نظر ساڑھے تین نمبر کے چشمے تک آ گئی ہے۔ میرے لیے یہ بہت پریشانی کی بات ہے۔ سمجھ نہیں آتا ایسا کیا کیا جائے کہ تیزی سے گرتی ہوئی نظر ٹھہر جائے بلکہ ٹھیک ہونا شروع ہو جائے لیکن یہ ہے کہ میری خوراک بھی کافی کم ہے جس کی وجہ سے میں جسمانی طور پر قدرے کمزور ہوں۔ دوسرے مجھے نظر خراب ہونے کی ٹینشن بھی بہت ہے اس وجہ سے اکثر رونے لگ جاتی ہوں۔ قبض کی شکایت بہت زیادہ رہتی ہے۔ آپ کوئی اچھی سی اور فوری اثر دکھانے والی دوا تجویز کر دیجیے جس سے نہ صرف نظر گرنا ٹھہر جائے بلکہ بہتر ہونا شروع ہو جائے۔

جواب: آپ نے وزن اور قد نہیں لکھا جس سے ہم اندازہ کرتے کہ آپ کی نظر کتنی کمزور ہے؟ نظر کی کمزوری کی مندرجہ ذیل وجوہات ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً آپ میں۔ (1 آنکھ کے پردے میں پیدائشی نقص۔ ماہر امراضِ چشم آنکھ کے معائنے کے بعد بتا سکتا ہے۔ اس میں مکمل جوان ہونے تک نظر کمزور ہوتی رہتی ہے۔ (2 وٹامن A کی کمی، اس میں بھی رات کو اندھیرے میں نظر نہیں آتا۔ گاجر، سیب، چقندر، شلجم، بادام، آم اور دیگر موسم کے پھل باقاعدگی کے ساتھ مناسب مقدار میں کھائیں۔ (3 پڑھنے کا طریقہ، سورج کی روشنی میں براہِ راست نہ پڑھیں، لیٹ کر نہ پڑھیں، پڑھتے ہوئے خیال کریں کہ کتاب کاپی اور آنکھ کے درمیان ایک فٹ




کا فاصلہ ہو۔ روشنی اوپر سے کتاب کاپی پر پڑے ڈائریکٹ آنکھوں پر نہ آئے۔ (4 ٹی وی اور کمپیوٹر کو مسلسل نہ دیکھیں۔ ٹی وی جتنے انچ کا ہے اتنے فٹ کا فاصلہ رکھیں (کم از کم 12 فٹ) (5 سر پر کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟ (6 کوئی بیماری؟ (7 خون کی کمی کا ٹیسٹ ضرور کرائیں۔ (8 آنکھوں کی ورزش کرائیں۔ خصوصاً صبح سویرے سورج نکلتے وقت 2 سے 3 منٹ دیکھیں۔ بالکل صبح سویرے کی دھوپ 15 منٹ تک جسم کو لگائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل میڈیسن 3 ماہ تک مسلسل استعمال کر کے حال بتائیں۔ Physostigma-30، Calc. phos-30 اور Calc flour-30 ہر شیشی میں سے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ صبح دوپہر اور شام استعمال کریں۔

## منہ سے بدبو آنا

### مسز شر جیل..........پاکپتن

میرے دو مسائل ہیں ان کے لیے دوائی تجویز کریں۔ مسئلہ نمبر 1: میرے بریسٹ کا سائز نارمل سے زیادہ ہے۔ ورکنگ woman ہوں اس لیے پریشان ہوں۔ پلیز دوا تجویز فرمائیں تاکہ میری پریشانی دور ہو۔ مسئلہ نمبر 2: صبح اٹھنے پر اور زیادہ دیر منہ بند رہے یا کھایا پیا نہ جائے تو منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔

جواب: اپنا قد اور وزن لکھیں۔ احتیاطاً U/S Breast کرائیں۔ ویسے عموماً ہارمونز کی کمی یا زیادتی کی وجہ سے بریسٹ کا سائز کم ہو جاتا ہے یا بڑھ جاتا ہے جو قابلِ علاج ہے۔ آپ رات کو کھانے کے بعد برش کیا کریں اس کے بعد دھاگے یا خلال یا ڈینٹل فلاس سے دانتوں کے درمیان خالی جگہوں کو صاف بھی کیا کریں۔ دونوں مسائل کے لیے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات استعمال کریں۔ ,Mercsol-30

## پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

| | | | |
|---|---|---|---|
| عُمیرہ احمد | صائمہ اکرام | عُشنا کوثر سردار | اشفاق احمد |
| نمرہ احمد | سعدیہ عابد | نبیلہ عزیز | نسیم حجازی |
| فرحت اشتیاق | عفت سحر طاہر | فائزہ افتخار | عنایت اللہ التمش |
| قُدسیہ بانو | تنزیلہ ریاض | نبیلہ ابر راجہ | ہاشم ندیم |
| نگہت سیما | فائزہ افتخار | آمنہ ریاض | مُمتاز مُفتی |
| نگہت عبدُاللہ | سباس گُل | عنیزہ سید | مُستنصر حُسین |
| رضیہ بٹ | رُخسانہ نگار عدنان | اقراء صغیر احمد | علیم الحق |
| رفعت سراج | اُم مِریم | نایاب جیلانی | ایماے راحت |

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

## پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

5-5 کے Chimaphila-30, Fragaria ves-30 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

## خوبصورتی

### رابعہ.........سرگودھا

میرا مسئلہ یہ ہے کہ 13 سال کی عمر میں ہی مجھے ماہانہ ایام آ گئے اور اس وقت سے لے کر اب تک ان کی کوئی ترتیب نہیں۔ مجھے لیکوریا کی شکایت بھی ہے۔ پچھلے ایک سال سے میرے بال تیزی سے جڑوں سمیت نکل رہے ہیں۔ بال بے حد باریک، چھوٹے ہیں، سر میں خشکی، بال روکھے اور دو منہ کے ہیں۔ میرے جسم پر اکثر الرجی ہو جاتی ہے۔ خارش کر کر کے وہ جگہ سوج جاتی ہے۔ دھپڑ بن جاتے ہیں۔ ایک دو ماہ دوائی لی ہے۔ صافی بھی پی لیکن مسئلہ حل نہ ہوا۔ معدے میں بے حد جلن ہوتی ہے۔ پٹھوں میں کھنچاؤ ہوتا ہے۔ درد بھی ہوتا ہے۔ ایک جگہ پر زیادہ دیر نہیں بیٹھا جاتا۔ پٹھے اکڑ جاتے ہیں۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے جس نے مجھے احساس کمتری کا شکار بنا دیا ہے کہ میرے نسوانی حسن میں کمی ہے۔ میرے چہرے پر عرصہ چھ سال سے دانے اور کیل مہاسے ہیں۔ چہرے پر خارش بھی ہوتی ہے۔ اکنی سوپ، ٹیوب ڈاکٹر نے دیں لیکن ایک ماہ استعمال کے دوران آرام رہا۔ پھر اسی طرح ہو گیا۔ میرے چہرے پر کوئی رونق نہیں ہے۔ مرجھایا ہوا ہے۔ چپٹے گال، سانولی رنگت، ہر وقت آنکھوں میں نیند اور تھکی تھکی رہتی ہوں۔ جب میں نے پاکیزہ میں آپ کے بارے میں پڑھا تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے مجھے راستہ دکھایا ہے۔ مہربانی فرما کر میری رہنمائی کریں، شکریہ۔

جواب: تمہاری اب تک صحیح تشخیص و علاج نہیں ہوا یا تم نے نہیں کیا۔ ذہنی آسودگی بہت سارے جسمانی افعال پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ڈائریکٹ وان ڈائریکٹ دونوں طرح سے ذہنی آسودگی کے لیے صبر شکر اور قناعت کرو اور نماز اور قرآن پڑھ کر اپنے مسائل کے حل کے لیے دعا کیا کرو۔ متوازن خوراک دودھ، دہی، مکھن، پنیر، انڈے، گوشت (گائے بکرا و مرغی)، مچھلی، دالیں، سبزیاں اور پھلوں کو اپنی غذا میں شامل کرو۔ واک کیا کرو۔ ابتدا 5 منٹ، پھر ایک گھنٹا، آہستہ آہستہ بڑھاؤ۔ بچوں کو اپنے والدین سے اپنے مسائل ضرور شیئر کرنے چاہئیں۔ غذا ہلکی پھلکی سادہ لو۔ تلی ہوئی بھنی ہوئی اور تیز مرچ مصالحوں سے پرہیز کرو۔ کھانا خوب اچھی طرح چبا کر کھاؤ۔ جلدی جلدی نہ نگلو اور اس کے ساتھ پانی کا استعمال نہ کیا کرو۔ پانی ہمیشہ کھانے سے پہلے یا پھر 2 گھنٹے بعد پیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ کے استعمال کے بعد تمام حالات تفصیل سے بتائیں۔

Bismutum Pentarkan Ptk-16 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔

Magnsium phosphoricum Pentarkan Ptk-60 ایک گولی دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔

Ferrum Pentarkan Ptk-45 دو گولیاں دن میں 3 مرتبہ تھوڑے سے پانی کے ساتھ لیں۔

Rhustoxicodendrom Pentarkan Ptk-73 اور Urtica Pentarkan Ptk-86 دونوں کے 10-10 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

☆☆☆